

صحابہ کرامؓ کی حیات و خدمات پر مبنی مجموعہ

معارف صحابہؓ

مُصَنَّف
(مولانا) محمد عارف قادری برکاتی ضوی

دوم

ناشر
امام محمد رضا ایجوکیشنل فاؤنڈیشن انڈیا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الصلوة والسلام عليك وعلى آهلك وأصحابك يا رسول الله ﷺ

صحابہ کرام کی حیات و خدمات پر مستند مجموعہ

معارف صحابہ

جلد دوم

(مولانا) محمد عارف قادری برکاتی رضوی
استاذ الجامعة الغوثية، غريب نواز، کهجرانہ
خطیب و امام، امام احمد رضا مسجد، شری نگر، اندور (ایم پی)

ناشر
امام احمد رضا، ایجوکیشن فاؤنڈیشن
شری نگر، اندور (ایم پی)

کتاب :	معارف صحابہ (جلد دوم)
مصنف :	(مولانا) محمد عارف قادری برکاتی ضوی
نظر ثانی :	☆ حضرت مولانا مفتی رضی الدین احمد صاحب قبلہ فیضی
	بانی و مہتمم جامعہ اہلسنت فاطمہ کلینیۃ البنات، سرسیا، سدھارتھ نگر، یوپی
	☆ حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب قبلہ مصباحی
	☆ حضرت مفتی محمد شمس الدین صاحب قبلہ مصباحی
	☆ حضرت مفتی محمد فیض صاحب قبلہ مصباحی
تصحیح :	☆ حضرت مولانا انظار احمد صاحب امجدی، مولانا محمد سلمان صاحب ازہری،
	مولانا محمد رمضان صاحب قادری
حسب فرمائش :	☆ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب قبلہ نظامی، حافظ اسلام صاحب نوری
کمپوزنگ :	☆ حضرت مولانا قاری بدر الدین احمد مصباحی صاحب،
	حافظ محمد عمر فاروق صاحب قادری، حافظ محمد عمران صاحب
پروف ریڈنگ :	☆ طلبہ جامعہ غوثیہ غریب نواز، کھجرانہ، اندور
ناشر :	☆ امام احمد رضا، ایجوکیشن فاؤنڈیشن، اندور (ایم پی)
بار اول :	☆ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۴ھ مطابق جنوری ۲۰۲۳ء
تعداد :	☆ گیارہ سو (۱۱۰۰)
صفحات :	720
قیمت :	

تقسیم کار:

- خواجہ بک ڈپو، میا محل، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- مجلس برکات، میا محل، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- جامعہ اہلسنت فاطمہ کلینیۃ البنات، سرسیا، سدھارتھ نگر، یوپی

کلماتِ دُعا

وارثِ علوم اعلیٰ حضرت، قاضی القضاۃ فی الہند، تاج الشریعہ
حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں صاحب قبلہ قادری ازہری دامت برکاتہم القدسیہ بریلی شریف

Hazrat Aliana Moukarram Mulla

MOHAMMED
AKHTAR RAZA KHAN QADRI AZHARI
President: All India Sunni Jamiatul Ulama
Head Mulla: Central Darul Ifta - Bareilly,
83, Baza Nagar, Saundagar, Bareilly Sharif
U.P. 243003, (INDIA) - Tel: 0581- 2472144, 2455543

49 499

AP

Ref. No. _____

Date: _____

۷۸۶
۳۳

میں مدعوں کو ان عزیز القدر مولانا قادیان قادری رضوی سلمہ
استاذ جامعہ خورشید قریب نواز کھولہ اندور
سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پر ایک کتاب "معارف صحابہ" کا
کافی تعانی قبول دیا ہے۔ ہر مولانا سلمہ کو مزید خدمت دہی کی فوٹو مطافرا کے (آمین)
قال بصدقہ ۱۰ امر و قبحہ
قید اختر رضا قادری ازہری

مرکز اسلامی

AP

نوٹ: حضرت تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے دُعا کی کلمات جلد اول سے منقول ہیں۔

اجمالی فہرست

۱	مکی مدنی مؤاخات	37
۲	حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	54
۳	حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	98
۴	حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	168
۵	حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	225
۶	حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ	291
۷	حضرت بلال بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	337
۸	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	416
۹	حضرت ابوالایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	523
۱۰	حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	604
۱۱	حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ	691

فہرست مضامین

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ	23	انتساب
54	24	ارمغانِ خلوص
54	26	تحفہ ثواب
55	27	عرض حال
55	30	اپنی باتیں
56		کئی مدنی مؤاخذات
59	38	مؤاخذات مکہ
62	38	مؤاخذات مدینہ
64	39	مواخذات کتنے صحابہ کے درمیان قائم ہوئی
64	39	سب سے الگ
66	40	مؤاخذات مدینہ کا وقت اور مقام
67	41	مؤاخذات مکہ کے مقاصد
67	42	مؤاخذات مدینہ کے مقاصد
68	43	تنبیہ
68	49	وضاحت
70	51	اعتراض
70	51	دوسرا اعتراض
71	51	جواب
71	52	مؤاخذات مکہ کا انکار
73	53	بدر کے بعد مؤاخذات
اجمالی تعارف		
نام و نسب		
حلیہ و مزاج		
حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مصاحبت		
قریش کی گھبراہٹ		
آپ کا قبول اسلام		
آپ کب ایمان لائے		
کعبہ میں دعائے حمزہ		
بحیثیت مسلمان		
ہجرت و مؤاخذات		
غزوات میں شرکت		
حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پہلا غزوہ		
غزوہ ذی العشیرہ		
بدر میں شجاعت		
علامتی نشان		
کفار کا غم		
حضرت حمزہ کفار کے نشانے پر		
قتل کا سودا		
احد میں شجاعت		

90	مسلمانوں کا غم	73	شہادت جنگ کے کس مرحلے میں ہوئی
91	ازواج و اولاد	74	بیان شہادت
93	قبر کے اندر تروتازہ	76	کان، ناک اور کلیجے کا حال
94	شہدا، سلام کا جواب دیتے ہیں	76	بارگاہ رسالت میں وحشی کی حاضری
94	قبر کے اندر سے سلام کا جواب	77	میرے سامنے نہ آنا
94	اپنے بیٹے کا نام میرے نام پر حمزہ رکھنا	77	وحشی نے مسلمانوں کو قتل کیا
95	تبصرہ	78	فائدہ
96	قبر سے آواز آئی ہم تمہیں پہچانتے ہیں	78	وحشی کو سامنے آنے سے کیوں منع کیا
96	حضرت حمزہ نے سلام کا جواب دیا	79	ہند کے اشعار
96	حضور اور صحابہ حضرت حمزہ کی قبر پر جاتے	79	نعش کی تلاش
	حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ	81	حضرت صفیہ خواہر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہما
98	اجمالی تعارف	82	کفن کے لیے ایک چادر
98	نام و نسب	82	غم رسول صلی اللہ علیہ وسلم
99	کنیت	84	شہادت اساس عدالت
99	پیدائش	85	حمزہ غسیل الملائکہ
99	بچپن میں گم ہونا	85	تکفین و نماز جنازہ
99	حلیہ	85	حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر
99	حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پسند	86	عمر و تاریخ شہادت
100	حضرت حمزہ و حضرت عباس کی ذمہ داریاں	86	جنگ احد کی تاریخ
101	ایمان لانے سے پہلے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ساتھ دینا	86	دیدار جبرئیل
101	بیعت عقبہ اولیٰ	87	کوئی رونے والی نہیں
	بیعت عقبہ ثانیہ اور حضرت مصعب بن عمیر کی مدینہ روانگی	87	عادات و اطوار
102		88	قرآن میں حمزہ
		89	احادیث میں حمزہ

103	حضرت عباس کی گفتگو	131	چچا کی خاطر دلی خواہش کو ترک کیا
104	اسلام میں داخلہ	131	تکریم پر تواضع کو اختیار کیا
106	حضرت عباس کے اسلام سے حضور کی خوشی	132	حضور کے بچپن پر عباس کی شفقت
106	حضرت عباس مسلمانوں کے مددگار	134	حضرت عباس کی تکلیف سے حضور بے قرار
107	حضرت عباس بدر میں کیوں شریک ہوئے	135	فدیہ معاف کرنے کی ادھوری خواہش
107	حضرت عباس کو ابو جہل کا طعنہ	136	فدیہ معاف کیوں نہیں کیا
110	بدر میں شرکت	136	حضرت عباس وسیلہ مقبولہ
111	کیا حضور ﷺ نے رشتہ داری نبھائی	138	حریم کے ساقی کے بو سے
111	ابو بکر کی قاتل	138	شان عباس بزبان حسان
112	کیا میرے چچا کا چہرہ تلوار کے لائق ہے	142	تنبیہ
113	حضرت ابو حذیفہ کے جذبہ ایمان کی آزمائش	142	جتنا اٹھا سکو لے لو
117	حضرت عباس گرفتار	144	حضرت عباس قرآن میں
118	میں تو مسلمان تھا	146	مناقت حضرت عباس
118	پیغمبر تو رکھتا ہے دلوں کی بھی خبر داری	147	حضرت عباس کی مرویات
119	عباس کا فدیہ	148	حضرت عباس کی تعظیم حضور فرماتے
120	اسلام کی فتح مندی پر حضرت عباس کی خوشی	148	جنت میں عباس منزل
122	ہجرت	149	حضرت عباس کو عامل زکوٰۃ نہیں بنایا
123	غزوات میں شرکت	149	حضرت عباس سے حضرت ابو بکر کی محبت
124	غزوہ حنین اور حضرت عباس	150	حضرت عباس سے حضرت عمر کی محبت
127	غزوہ طائف اور حضرت عباس	150	تعظیم حضرت عباس اور حضرت عثمان
128	حرم کی سقایت و عمارت	151	تعظیم حضرت عباس اور حضرت علی
128	زم زم حضرت عباس کے حوالے	152	خافا گھوڑے سے اتر جاتے
130	حضرت عباس کا حضور کو پانی پلانا	152	خصوصی اعمال کی ترغیب
130	منی کی راتیں مکہ میں	153	مسلمانوں پر شفقت اور کفار کی نظر میں آپ کی حرمت

173	دور آزمائش	154	حضرت عباس نے امت کو آسانی دلائی
174	ظلم سے بچاؤ کی تدبیر	155	حضرت عباس کی فراست
174	ہجرت	157	بیٹے کو نصیحت
175	وقت ہجرت رخصت کیا اور دعا سکھائی	157	حضور کی بشارت
175	حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت	158	حضرت عباس کا پر نالا اور حضور کی نسبت
176	حبشہ بہترین پناہ گاہ	159	حضرت عباس کا گھر حضرت عمر اور مسجد نبوی
176	قریش کی مکاری اور حضرت جعفر کی حاضر جوابی	160	بیٹے کی نظر میں باپ
184	احسان کا بدلہ احسان	162	قمیص کے بدلے قمیص
185	جعفر کے ہاتھ پر نجاشی کا ایمان	162	آپ کا غلام آزاد فرمانا
186	نجاشی نے حضور کا نکاح ام حبیبہ سے کیا	162	صحابہ نے حضرت عباس کی تعزیت کی
186	نجاشی نے حضور کے نکاح کا خطبہ پڑھا	162	حضرت عباس اور ادب رسالت
187	حضور کے خطوط کو نجاشی نے محفوظ کر دیا	164	ازواج و اولاد
187	حضور نے نجاشی کی نماز جنازہ پڑھی	165	وفات
189	ایک شبہ کا جواب	166	تجهیز و تدفین
190	حضرت جعفر کی حبشہ سے روانگی	166	جنازے میں اثر دھام
191	حضرت جعفر کی مدینہ آمد پر حضور کی خوشی	حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	
192	حضور کی زیارت پر جعفر کا انداز	168	اجمالی تعارف
192	ہر مسلمان کو جعفر کے آنے کی خوشی	169	نام و نسب
193	حضور نے جعفر کو خیر کی غنیمت سے حصہ دیا	169	کنیت و لقب
193	حضور نے جعفر کو گھر دیا	169	مؤاخات
194	حضور نے جعفر کو اپنے نکاح کا وکیل بنایا	169	حلیہ
194	حضور، حمزہ، عباس، جعفر آپس میں ہم زلف	170	حضرت جعفر چچا حضرت عباس کی پرورش میں
194	حضور کا فیصلہ جعفر کے حق میں	171	حضرت جعفر کا اسلام لانا
195	فائدہ	173	حضرت جعفر کی اہلیہ ایمان لے آئیں

213	جنت میں ملائکہ کے ساتھ مصروف پرواز	195	حضرت جعفر حضور کے گرد جھومنے لگے
213	حضرت جعفر کے پروں کی کیفیت	196	حضور نے جعفر کے پاس جبہ بھیجا
214	آل جعفر کی تعزیت و غم خواری	196	جعفر کے جذبات
216	حضور نے اسماء کا سوگ کم کر دیا	197	حضرت جعفر کی بہادری اور حق گوئی
217	حضرت جعفر کی اولاد پر حضور کی شفقت	198	روایت حدیث
218	فضائل و مناقب	198	جعفر کی اہلیہ
219	سب سے افضل	199	حضرت اسماء کا فیصلہ
219	صحابہ جعفر کی اولاد کا احترام کرتے	199	جعفر کی اہلیہ حضرت عمر پر ناراض ہوئیں
220	بدروخیبر سے حصہ	202	غزوات میں شرکت
220	استقبال کیا گلے لگایا آنکھوں کو چوما	202	جنگ موتہ
220	حضور سے مشابہت	202	جنگ موتہ کا سبب، موتہ میں جنگ کا حال
	حضرت جعفر نے بعد شہادت جبرائیل و	204	جنگ موتہ میں دشمن کی تعداد اور نتیجہ جنگ
220	میکائیل کے ساتھ حضور کو سلام کیا	205	حضرت جعفر کی تربیت
222	ازواج و اولاد	206	حضور کے فرمان پر یہودی کا تبصرہ
223	وفات	206	جنگ میں حضرت جعفر کی جاں بازی و شہادت
	حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	208	نوے سے زیادہ زخم سینے پر کھائے
225	اجمالی تعارف	208	اسلام میں سب سے پہلے حضرت جعفر
226	نام و نسب		نے گھوڑے کی کوچیں کاٹیں
227	والدہ کا نام	209	شیطان کا حملہ اور حضرت جعفر کی ثابت قدمی
227	کنیت	210	حضور ﷺ کا علم غیب اور صحابہ کی قوت ایمانی
227	لقب	210	حضور نے مسجد نبوی میں بیٹھ کر جنگ کی خبر دی
227	حلیہ	212	اگر تم چاہو تو میں تمہیں خبر دوں
227	مؤاخات	212	زمین موتہ حضور کے سامنے
228	زید نہال میں	212	جنت میں جاتے دیکھا

250	ابوالعاص کا ایمان	229	زید دشمن کی قید میں
251	سریہ طرف	229	زید بازار عکاظ میں
251	سریہ جسمی	230	فائدہ
253	سریہ ام قرفہ	230	زید کا شانہ خدیجہ میں
254	سریہ بنو سلیم	231	زید کا شانہ نبوت میں
254	زید بن محمد سے زید بن حارثہ	231	غلامی یا سرداری
255	حضرت زید حضور کے محبوب نظر	232	ماں باپ کا حال
257	حضور اور صحابہ کی محبت حضرت زید کی نسل سے	234	ہم وطنوں کی زید سے ملاقات
258	حضور کی ایک زانوں پر امام حسن دوسرے پر اسامہ	235	والدین کے لیے مشردہ جاں فزا
258	بیٹے سے زیادہ وظیفہ اسامہ کا	236	حارثہ بامید کرم پاہر کا ب
259	پوتے کو دیکھ کر گردن جھکا لی	238	مقام ہنگی دے کر نہ لوں شان خداوندی
259	زید کی پوتی اور عمر بن عبدالعزیز	239	زید بن حارثہ سے زید بن محمد
260	حضور اپنے ہتھیار زید کو عطا فرماتے	240	جس پر چاہے فضل فرمائے
260	کمال قرب	241	دامن اسلام میں
260	فضائل	241	اسلام میں آپ کا نمبر
261	زید امیر بنانے کے لائق ہیں	242	مصائب و آلام
262	زید میرے بھائی ہیں	244	طائف میں حضور کے ساتھ
262	زید اللہ اور اس کے رسول کے انعام یافتہ ہیں	245	حضرت زید کی جان حضور پر قربان
263	حضور کا انعام دینا، غنی فرمانا اور تقسیم فرمانا	248	ہجرت
263	قرآن میں نام زید کی خصوصیت	249	غزوات میں شرکت
264	فرشتے حضرت زید کا نام لیتے ہیں	249	فوجی مہمات میں زید کی سرداری
264	زید کا نام قرآن میں کیوں ذکر ہوا	249	زید کے غزوات کی تفصیل
		250	سریہ قردہ
		250	سریہ عیص

279	زینب کی طلاق اور ام المؤمنین بننے کی تفصیلات	265	قرآن میں زید کے لیے جنت کی بشارت
282	حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مختصر سوانح	265	حضرت علی و جعفر کا حضور کی محبت کے بارے میں سوال
284	تیسری زوجہ	266	حضور کے اہل بیت کو مکہ سے لانے کی ذمہ داری
284	چوتھی زوجہ	268	حضور کی بارگاہ میں زید کا سیاسی قدمدبر
284	پانچویں زوجہ	269	بڑے زید میں پیدائش میری پہلے
284	بدر کی فتح کی بشارت اور زید	269	میرے بھائی کا فیصلہ میرے فیصلے سے بہتر تھا
286	جنگ موتہ اور حضرت زید	270	زید کے والد اور بھائی صحابی تھے
286	موتہ میں حضرت زید امیر لشکر	270	زید کا انفاق فی سبیل اللہ
287	جنگ موتہ میں دشمن کی تعداد	271	گھوڑا بیٹے کا ہوا صدقہ باپ کا
287	حضرت زید کا جہاد اور حضور کا بیان	271	نماز کی برکت اور دعا کی قبولیت
288	جنگ موتہ کے میدان میں شیطان کو زید کی لکار	273	حضور کی ملاقات زید کی حور سے
288	شہادت، استغفار اور زید کا دوڑتے ہوئے جنت میں داخل ہونا	274	شرف اہل بیت
289	تاریخ شہادت اور عمر	274	ازواج و اولاد
289	زید کی شہادت پر حضور کا غم	274	پہلی زوجہ
289	یہ محبوب کا محبوب کے لیے اشتیاق ہے	275	حضور ام ایمن کی ملاقات کو تشریف لے جاتے
	حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	276	اسامہ بن زید
291	اجمالی تعارف	277	دوسری زوجہ
292	نام و نسب	278	حضور نے زید کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن سے کرا دیا
292	کنیت و لقب	278	زید کے پیغام نکاح پر آیت کا نزول
293	پیدائش		

314	اہل مدینہ کو جاں نثار بنادیا	293	قبل اسلام
315	مصعب بارگاہ حضور میں	293	اسلام میں داخلہ
315	ماں نہیں حضور اول ہیں	296	پوشیدہ ملاقات
	ماں کے غلط ارادے پر مصعب کا	297	ماں کا خوف
316	جواب	297	راز راز نہ رہا
317	ماں کو دعوت اسلام اور ماں کا انکار	298	ماں کی حالت
317	ایمان کی مضبوطی اور کفر کی سختی	298	حضرت مصعب کی آزمائش
318	حضرت مصعب کی ہجرت	299	حبشہ کی طرف ہجرت
318	مؤاخات	300	مصعب کی حبشہ سے واپسی
319	غزوات میں شرکت	301	مصعب بن عمیر کی حالت
319	ایک اونٹ پر تین سوار	303	حضور سے اہل مدینہ کی طلب
319	بدر میں علم بردار	303	حضرت مصعب بن عمیر کی مدینہ روانگی
320	مشرک سے تعلقات منقطع	304	مدینہ منورہ میں سب سے پہلے کون
322	سگہ کا فر بھائی پر سختی	305	مصعب کی قیام گاہ
323	ابوعزیز مومن یا کافر	306	اہل مدینہ کے امام
323	حضرت مصعب کا خاندان میدان احد میں	306	مدینہ منورہ کا پہلا جمعہ
324	حضرت مصعب میدان احد میں اسلام کے علم بردار	307	بعض روایات میں اسعد بن زرارہ کا نام
325	علم اسلام کی حفاظت اور شوق جہاد	308	خلبان کا حل
325	شہادت	308	دعوت کی کامیابی کا راز
326	حضور سمجھ کر قتل کیا	309	مدینہ میں تبلیغی سرگرمیاں
326	مصعب کی جان حضور پر قربان	310	اسید بن حضیر دامن اسلام میں
328	مصعب کے بعد علم کس کے ہاتھ میں	311	سعد بن معاذ دامن اسلام میں
	عرب کے چاند مصعب کے سر ہانے	313	پورا قبیلہ دامن اسلام میں
328	آئے ہیں	313	قیام گاہ منتقل

346	بھائی بہن	329	عاشق کا منہ چھپانا
346	مواخات	329	شہداء، سلام کا جواب دیتے ہیں
346	اسلام لانا	329	تم سے حسین کوئی نہ تھا
349	آپ کب اسلام لائے	330	دنیا سے کچھ حاصل نہیں کیا
351	ظلم کا سلسلہ کلاتنا ہی	331	تجہیز و تکفین
352	حضرت بلال کو دی جانے والی سزائیں	331	نماز جنازہ
354	آپ کس کے غلام تھے	332	تدفین
356	ابوبکر کا شوق اور سودے کی عظمت	332	تاریخ شہادت
357	ابوبکر نے خرید کر آزاد کر دیا	332	نزول قرآن
358	ہجرت	333	فضائل
359	مدینہ میں قیام گاہ	334	اصحاب رسول کی نظر میں
362	حضرت بلال کا صحابہ کو نماز کے لیے بلانا	335	ازواج و اولاد
363	بلند نصیبہ	حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ	
364	اذان مسلمان کی پہچان	337	اجمالی تعارف
365	اسلام کی پہلی اذان	338	نام و نسب
366	بلال اسلام کے پہلے مؤذن	338	اعزازات و القابات
367	بلال در رسول پر کھڑے ہو کر یا رسول اللہ کہتے	339	پیدائش
367	جھوٹی روایات	339	جائے پیدائش
368	حضرت بلال فصیح ترین لوگوں میں ہیں	339	جائے ولادت میں اختلاف
368	حضرت بلال کے فصیح ہونے کے دلائل	341	رفع ابہام
369	حدیث میں موجود لفظ اندی کی لغوی تحقیق	342	مسکن
370	سیدنا بلال رضی اللہ عنہ فصیح اللسان تھے	343	قبیلہ اور والدین
372	غزوات میں شرکت	344	والدین
		345	حلیہ

395	حضور کے لیے سایہ کرتے	372	حضرت بلال نے امیہ سے اپنا بدلہ لے لیا
395	جذبہ جاں نثاری	375	حضور کی خدمت و معیت
396	عاجزی و انکساری	375	حضرت بلال حضور کے نیزہ بردار
397	مبالغہ آرائی سے مکمل پرہیز	376	بلال اور صحابہ پر نیند کا غلبہ
398	روایت حدیث	376	نماز صبح کا قضا ہونا
398	آپ کی مرویات کی تعداد	378	نماز کے قضا ہونے میں حکمت
399	اذان سے پہلے درود پڑھنے کی دلیل	378	فتح مکہ دخول کعبہ اور حضرت بلال
400	عشق مصطفیٰ نے مدینہ چھڑا دیا	381	فتح مکہ اور اذان بلال
	حضرت ابوذر غفاری کا حضرت بلال سے معافی طلب کرنا	383	اذان بلال
401	تربیت صحابہ	384	حضرت بلال کے علاوہ حضور کے مؤذن
402	ابوذر را اور ایسا کلام	384	حضور کا وصال اور اذان بلال
403	حضرت بلال نے معاف کر دیا	385	بلال اور قبر رسول
403	حضور کی گواہی بلال سچے ہیں	385	حضور کے بعد حضرت بلال نے اذان پڑھی؟
404	حضرت بلال کا زوجہ کے ساتھ حسن سلوک	387	اذان کی روایات میں اختلاف اور تطبیق کی صورت
405	حضرت بلال کی عرض پر معجزے کا ظہور	389	ایک مدت کے بعد مدینہ طیبہ میں اذان بلال
405	فضائل و مناقب	390	فتح بیت المقدس اور اذان بلال
405	قرآن کریم اور حضرت بلال	391	میدان محشر میں اذان
407	احادیث میں بلال	392	حضرت بلال کو جنت کا حلہ پہنایا جائے گا
408	حدیث کے بعض لطائف	392	حضور کی قربت و عنایات
409	معمولات اہلسنت کی دلیل	392	سرکار مدینہ کے خازن
410	فضائل کا اختصار	393	غنسالہ عطا فرمایا
410	شوق وصال اور عشق رسول	394	خاص مواقع پر حضور کے ساتھ
411	وفات	395	حضور کے لیے عمدہ کھجوریں لائے

433	قبیلہ اسلم میں چراغ حق کی روشنی	412	وقت وفات عمر شریف
434	دو قبیلے بارگاہ رسالت میں	412	مزار مبارک
435	مدینہ کب حاضر ہوئے اور کب تک رہے	413	ازواج
436	بعثت سے پہلے خدا کی عبادت	414	اولاد
436	غزوات میں شرکت	414	بخت آور بلال
437	حنین میں غفار کا جھنڈا	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	
437	جنگ تبوک اور حضرت ابوذر غفاری	416	اجمالی تعارف
439	حضور کی نیابت	418	نام و نسب
440	غزوہ غابہ اور ابوذر	419	ماں کا نام
441	فتح بیت المقدس	419	کنیت
441	علم و فضل	420	حلیہ
442	اصحاب رسول کے مفتی	420	مؤاخذات
442	مرویات کی تعداد	421	صراط مستقیم کی تلاش
443	تربیت مصطفیٰ	421	جلاوطنی
445	نصیحتیں جس نے دنیا بدل دی	422	ماموں کے یہاں سے روانگی
446	قوت لایموت پر گزارا	423	مکہ کی طرف رخ کرنا
446	تارک الدنیا ابوذر	423	در بار نبوی تک باریابی کے اسباب
448	آگ کا انگارہ	426	گوہر مراد قریب ہوا
448	اچھے مکانات سے بیزاری	427	اسلام میں داخلہ
449	حساب کا ڈر	430	خانہ کعبہ میں پہلی صدائے حق
449	ہر مال میں تین حصے دار ہیں	431	سب سے پہلے اسلامی سلام
449	علوم میں برتری اور خوف خدا	431	اسلام میں آپ کا نمبر
450	فکر آخرت	432	مبلغ مصطفیٰ بن کر مکہ سے رخصت
451	کعبہ میں خطابت و نصیحت	432	تبلیغ اسلام اور اس کا اثر

478	تربیت صحابہ	451	ایک آیت کا وظیفہ
479	ابو ذر اور ایسا کلام	452	ابو ذر کے سوالات رحمت عالم کے جوابات
480	محبوب کی ڈانٹ محبوب اور تلخی فخر تھی:	456	انسان بھی شیطان ہوتا ہے
481	شرف رداقت اور تلقین صبر	456	جذبہ ایثار
482	کریمانہ نوازشات	457	شرف خدمت اور غیب کی خبر
483	سادگی	458	محرم راز ابو ذر
483	عاجزی	459	ذکر محبوب کی حلاوت
484	حق گوئی	460	اگر محبوب کے عمل کی طرح عمل نہ ہو
485	حق گوئی پر حضرت علی کی گواہی	461	عنایات محبوبانہ
485	عہدے داروں سے دوری	462	ذوق عبادت اور امت کے لیے بشارت
486	مہمانوں اور ہمسایوں کا خیال	465	دوران سفر سواری پر نماز
486	خود بھوکے رہ جاتے لیکن مہمانوں اور پڑوسیوں کو کھلاتے	466	انتہائے شوق پر برہم مزاجی
487	سب سے محبوب اور سب سے مبغوض	467	خود نمائی اور بڑائی سے دور رکھنے والا خطاب
487	بیوی کے ساتھ بردباری	470	امت کے سب سے بڑے زاہد
488	روزہ اور کھانا دونوں ساتھ ساتھ	471	رہبانیت سے پاک زہد
489	حضرت ابو ذر کی کل کائنات	472	ابو ذر کے زہد کی نمایاں خوبیاں
489	گلے پر چھری ہوتی بھی حدیث بیان کروں گا	473	کیفیت مجذوبانہ
490	شرعی مسائل میں اختلاف	473	حضرت ابو ذر کا وظیفہ
491	حضرت ابو ذر غفاری کا منفرد فقہی مذہب	474	امت میں سب سے سچے
491	حضرت ابو ذر کا مذہب جمہور صحابہ کے خلاف تھا	476	امارت طلب فرمانا
492	حضرت ابو ذر کا حضرت معاویہ سے اختلاف	477	حضور کے ہر فرمان پر عمل کر کے دکھایا
		477	آقا اور غلام دونوں کا لباس ایک
		478	ابو ذر غفاری کا بلال سے معافی طلب کرنا

516	ربذہ کی تنہائی میں ابن مسعود کی آمد	492	اختلاف کی تفصیل
517	سنہ وفات		صحابہ کے ذریعے کنز کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش
517	حضرت ابوذر غفاری کا ترکہ	494	
518	فضائل کا اختصار، علم فنا اور بقاء کے موجد	495	حضرت معاویہ نے امتحان لیا
519	ازواج و اولاد	496	مال سے متعلق حدیث سختی کے ساتھ سناتے
519	اولاد کے انتقال پر اللہ کی حمد	496	حضرت ابوذر کے نظریہ سے سوشلزم پر استدلال
519	دوسری شادی سے انکار	499	کعب احبار کو لاٹھی مار دی
519	بیوی کی ایک نہ مانی	500	حضرت ابوذر کا مارنا حالت جذب میں تھا
520	ساز و سامان آخرت کے گھر بھیج دیا	01	لوگ ابوذر پر ناراض نہیں ہوتے تھے
520	برے ساتھی سے تنہائی بہتر		کیا آپ کو ربذہ میں رہنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا
521	بے مثال ابوذر	501	
	ابوذر کے اہل و عیال کی حضرت عثمان نے کفالت کی	503	تنبیہ
521	کھجور پر پانی پی کر تمہاری طرح جیتا ہوں	503	اطاعت شعار ابوذر
	حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ	504	بھڑکانے کی کوشش
523	اجمالی تعارف	505	حاکم کی اطاعت کی ایک اور مثال
524	نام و نسب	506	جذبات کا عالم یہ خیالات کا عالم
524	والدہ کا نام	509	جو منہ سے کہہ دیا بے شک وہ بات ہو کے رہی
524	کنیت	509	وقت وصال بیوی کو تسلی دی
525	مؤاخات	512	وقت وصال مہمانوں کا خیال
525	حضرت ابوایوب کا خاندان	512	ابوذر قبلہ روا اور خیمہ معطر
526	خاندان مصطفیٰ سے قدیم مراسم	513	تجہیز و تکفین
528	حضور کے والد بنو نجار کے مہمان بنے	513	ابن مسعود نماز جنازہ کے امام
		515	بیٹی نے کھانا کھلایا
		515	کون ہے جو مجھ سے اسی حالت میں ملے

557	حضور کی انگلیوں کے نشان کی تلاش کیوں	529	حضور بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ بنو نجار کے مہمان بنے:
558	مجدی حکومت کی رسول دشمنی		حضور نے ابویوب کے خاندان کو سب سے بہتر بتایا
559	بزرگوں کے آثار سے تبرک حاصل کرنا	531	خاندان ابویوب کا ایک اور شرف
559	پسند اور ناپسند کا معیار		مدینے میں صبح نور اور ابویوب کا اسلام میں داخلہ
560	جو آپ کو ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند	532	بیعت عقبہ اولیٰ:
561	جو حضور کو پسند ہے وہ مجھے بھی پسند ہے	533	بیعت عقبہ ثانیہ
	اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے جب تک حضور نہ کھا لیتے	533	حضور کی ہجرت اور ابویوب کی قسمت
561	ابویوب کے گھر قیام کی مدت		سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبائیں تشریف آوری
562	غزوات میں شرکت	538	مسجد قبا کی تعمیر
564	جنگ خیبر اور ابویوب انصاری	539	قبا میں مدت قیام
565	ابویوب انصاری کی پاسبانی اور حضور کی خوشی	540	قبا سے روانگی
565	حجۃ الوداع میں حضور کے ساتھ	548	انتخاب دار ابی ایوب انصاری کی وجہ تنبیہ
567	زمانہ اختلاف میں حضرت علی کے ساتھ صلح کے بعد حضرت امیر معاویہ کے ساتھ فتح مصر اور خوارج کے خلاف جنگ میں شرکت	551	حضور اپنے ہی مکان میں ٹھہرے
567	حضرت ابویوب کا شوق جہاد	552	ادب رسول میں میاں بیوی کا اضطراب
568	مسجد نبوی کے امام	554	حضور کے آرام کے لیے ٹھنڈی رات برداشت
568	مدینہ کے گورنر	555	حضرت ابویوب انصاری کے بعد وہ مکان جہاں حضور ٹھہرے
569	زمانہ علی اور وظیفہ میں زیادتی		حصول برکت کے لیے وہیں سے کھاتے جہاں سے حضور نے کھایا ہوتا
569	حضور ابویوب کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے	556	
	بھوک کی شدت میں مسجد نبوی سے ابو ایوب کے گھر		
569	حضور کے ساتھ ابو بکر و عمر		

588	ابوایوب نے انداز دے سکھایا	572	حضور نے تحفہ دیا
589	”اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو“ کا مطلب		وصیت پر عمل کرنے کے لیے باندی
589	ازواج	573	آزاد کردی
590	اولاد	573	حضرت ابن عباس نے اپنا گھر نذر کر دیا
591	روح اطہر کے لیے آیا ہوں پتھر کے پاس نہیں	574	حضرت ابوایوب کی ام المؤمنین سے عقیدت
592	ہمیں حضرت ابوایوب مبارک اور وہابیہ کو مروان	575	حق گوئی و بے باکی
592	معمر کہ قسطنطنیہ اور مرض وصال	576	حاکم وقت کے سامنے حق گوئی
593	وصال	577	حاکم مدینہ کو کھرا جواب
594	فصیل قسطنطنیہ کے پاس دفن کی خواہش	577	امیر لشکر کے سامنے حق بیانی
594	نماز جنازہ اور تدفین	578	ایسے تو جانوروں کو بھی نہیں مارتے
595	وفات کا سال	579	حسن اخلاق کی ایک مثال
595	وصال سے پہلے حدیث سنائی	580	حکم رسول پر شدت سے عمل
595	رومیوں نے آپ کی قبر کی حفاظت کی	581	ناراض ہوئے کھانا نہ کھایا
596	رومیوں نے آپ کا مزار بنایا	582	علمی مقام
597	بارگاہ رب میں حضرت ابوایوب کا وسیلہ	582	پہلی شہادت
598	مزار زمین میں مستور	583	دوسری شہادت
599	مزار کی بازیافت	584	دیگر صحابہ کے ہوتے ہوئے آپ سے مسئلہ پوچھا جاتا
601	مزار کی موجودہ حالت	585	سماعت حدیث کا شوق
	حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	586	روایت حدیث
604	اجمالی تعارف	586	وقت وصال اشاعت حدیث کا خیال
605	نام و نسب	587	حدیث کیوں چھپالی
605	آپ کی ماں کا نام	588	حضور کی دعا ابوایوب کے لیے

623	حضرت عثمان اور حضرت معاویہ	605	کنیت
624	حضرت معاویہ خلیفۃ المسلمین	605	پیدائش
627	تنبیہات	605	حلیہ
627	انتباہ	605	خاندانی وجاہت
631	حدیث بخاری اور امیر معاویہ	606	قبل اسلام
633	دوسرا جواب	606	قبول اسلام
	حضرت علی کے امیر معاویہ کے متعلق	607	ایک اعتراض
634	دعاۓ کلمات و احادیث	607	جواب
637	حضرت علی کے قصاص عثمان نہ لینے کی وجوہ	608	مفتی احمد یار خان علیہ الرحمہ کی تحقیق
	حضرت معاویہ کے باغی نہ ہونے پر	609	مؤاخذات
637	مزید دلائل	609	ہوازن کا مال غنیمت
640	بحری فوج کی اجازت نہیں ملی	610	امیر معاویہ کا تب و جی
641	حضرت عثمان نے اجازت دی	613	کتابت و جی میں امیر معاویہ کا خاص مقام
642	حضرت معاویہ کی عظیم فضیلت	613	امیر معاویہ کو حضور کی دعا
644	اعتراف اسلاف	614	امارت کی بشارت
645	حضرت علی کا فرمان	614	منصب کتابت کی طلب
645	حضرت عمیر کا فرمان	616	قرآن میں فضیلت معاویہ
645	حضرت ابن عمر کا نظریہ	617	مسلمانوں کے ماموں
645	حضرت ابن عباس کا نظریہ	618	غزوات میں شرکت
646	حکومت کے کاموں میں مشغولیت	619	امیر معاویہ کے عروج کا تعارف
647	حضرت امیر معاویہ کا دربار	620	امیر معاویہ والی شام
649	قیام امن کے لیے وسائل کا انتخاب	620	والدین کا خط معاویہ کے نام
649	پہرے داری کا انتظام	621	حضرت ابوبکر اور حضرت معاویہ
649	پولس کا عمدہ انتظام	622	حضرت عمر اور حضرت معاویہ

663	نہی عن المنکر کا جذبہ	650	حسن انتخاب
664	معتزین کو مطمئن کرنا	650	نرمی اور سختی کا امتزاج
666	حسن تدبیر سے معاملے کو نپٹانا	651	محکمہ سراغ رسانی
668	عفو و درگزر	651	مشتبہ لوگوں کی سخت نگرانی
669	ذہانت و تدبیر	651	اسلامی لشکر کا قیام
673	عاجزی و انکساری	652	معاویہ اور رائے کی آزادی
675	اطاعت رسول	653	لوگوں کی ضروریات کا خیال
676	حضور کے فرمان کا احترام	653	مساجد اور چشموں کا انتظام
678	خشیت الہی سے رونا		حج باج کرام اور روزہ داروں کے
681	عشق رسول اور نسبتوں کا احترام	654	لیے کھانے کا انتظام
682	شوق دیدار	654	علمی خدمات
682	محبوب کی خواہش	654	علم تاریخ
682	آخری ایام اور ولی عہد کا انتخاب	655	حضرت معاویہ کی اہم صفات
685	حضرت معاویہ کی وصیت	655	آپ مجتہد تھے
685	حضرت معاویہ کا آخری خطبہ	656	آپ کے اجتہاد پر اعتماد
686	مرض وصال	656	روایت حدیث
687	وصیت میں عشق رسول	657	تبلیغ کا جذبہ
687	وصال	658	سنت سیکھنے کا جذبہ
688	نماز جنازہ	659	اتباع سنت کا جذبہ
688	تاریخ وصال	660	نماز میں حضور سے مشابہت
688	وقت وصال آپ کی عمر	660	احترام نسبت
688	مدت خلافت	662	سخاوت
689	امارت و خلافت کی کل مدت	662	ام المؤمنین کا قرض ادا کیا
689	ازواج و اولاد	662	حسنین کریمین کی بارگاہ میں نذرانہ

حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ	
691	اجمالی تعارف
692	نام و نسب
693	والد کا انتقال
694	قبول اسلام
695	جنگ تبوک اور اثیار صحابہ
696	شان رسالت میں جلاس کی گستاخی
697	ولی نعمت
698	حضرت عمیر کی استقامت
699	اللہ و رسول کے ساتھ وفاداری
700	قرآن نے حضرت عمیر کے حق میں گواہی دی
701	جلاس کی توبہ
701	حضرت عمیر حمص کے گورنر
702	کل کائنات لے کر بارگاہ عمر میں حاضر
704	حضرت عمیر کی جانچ
705	حضرت عمیر کے گھر کا حال
706	دربار عمر میں دوبارہ طلب
707	بے مثال سیرت
708	حضرت عبداللہ بن عمر کی نظر میں عمیر
708	عمر اور ان کے ساتھیوں کی تمنا
709	وفات
709	اقوال زریں
709	فرمان رسول پر یقین
711	ماخذ و مراجع



انتساب

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

محبوب پروردگار، وجہ تخلیق کائنات، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کے نام

آل رسول، ازواج رسول، اصحاب رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اور
تمام مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین
کے نام

تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، اولیاء، اصفیاء اور صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین
کے نام

علماء، محدثین، مفسرین، مصنفین اور مجددین رحمہم اللہ اجمعین
کے نام

مشائخ مکہ المکرمہ، مدینۃ المنورہ، بغداد معلیٰ، اجمیر مقدسہ، دہلی، بلگرام، مارہرہ، کچھوچھو،
خیر آباد، بریلی اور مشائخ اندور رحمہم اللہ اجمعین کے نام

گر قبول افتد زہے عز و شرف
شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدارا

محمد عارف قادری برکاتی رضوی

ارمغان خلوص

تمام محامد و ستائش ذات پروردگار کے لیے جس نے اپنے فضل سے مجھے یہ کتاب لکھنے کی توفیق بخشی اور میری خصوصی مدد فرمائی۔

✽ یہ کتاب نذر ہے میرے تمام مربی اساتذہ کی بارگاہوں میں جنہوں نے مجھ ان پڑھ کو اس خدمت کے لائق بنایا۔

✽ یہ نذر ہے میرے شفیق والدین کی بارگاہ میں جنہوں نے شداوند پر صبر کرتے ہوئے میری تعلیم کو جاری رکھا اور اپنی مخصوص دعاؤں میں فراموش نہیں فرمایا۔

✽ یہ کتاب پیش ہے جامعہ قادریہ رچھا بریلی شریف کے علمی دیار میں جہاں میں نے قلم پکڑنا سیکھا اور یہاں تک پہنچا۔

✽ یہ کتاب پیش ہے جامعہ غوثیہ غریب نواز اندور کے علمی گلستان میں جس نے مجھے لکھنے کا ماحول فراہم کیا۔

✽ یہ کتاب پیش ہے گلشن فاطمہ نوریہ پبلی بھیت کے عفت مآب صحن میں جو دختران اسلام کی بہترین تربیت گاہ ہے۔

✽ یہ کتاب پیش ہے امام احمد رضا مسجد کے تمام مصلین کی بارگاہ میں جنہوں نے مجھے ہر قدم آسانیاں فراہم کیں۔

✽ یہ کتاب پیش ہے میرے بھائیوں (محمد یعقوب، محمد وسیم) بہنوں اور تمام اہل خانہ کو جو میرے ظاہری سہارا اور دست و بازو ہیں۔

✽ یہ کتاب نذر ہے میری بیٹی حمیرہ فاطمہ، طلعت فاطمہ، سیرت فاطمہ اور بیٹے عبدالقادر ان کی والدہ حنا فاطمہ، حنا فاطمہ کے والدین اور گھر والوں کے لیے جو مجھے لکھنے پر ابھارتے رہے اور قلم کی زنجیر نہ بنے۔

✽ یہ کتاب نذر ہے میرے تمام احبا، اصدقاء، اعزا اور اقربا کی بارگاہوں میں جو اپنے اپنے انداز میں میرے مددگار رہے۔

چند الفاظ کے موتی ہیں میرے دامن میں
ہے مگر ان کی محبت کا تقاضا کچھ اور
اپنا دل پیش کروں اپنی وفا پیش کروں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا پیش کروں
چند خوشبو کے دیے ساتھ میں لے آئے ہیں
شاخ گل دامن سوغات میں لے آئے ہیں



تحفہ ثواب

یہ کتاب تحفہ ثواب ہے میرے تمام مرحوم اساتذہ و اقارب کی روحوں کے لیے خاص کراستا ذگرامی مرحوم قاری امیر الدین صاحب کی روح کو مولانا مرحوم دین محمد صاحب کی روح کو، میرے دادا، دادی، نانا، نانی، ماموں، خالہ اور پھوپھا کی روحوں کو کتاب کے کمپوزر حافظ عمر فاروق کے والد مرحوم تاج محمد صاحب کی روح کو، مرحوم حاجی صدیق صاحب نورانی اور ان کی اہلیہ مرحومہ حجابی آمنہ بانی کی روح کو، مرحوم حاجی امین صاحب، مرحوم حاجی ہاشم صاحب یا غوث والے، مرحومہ حجابی حلیمہ بانی، مرحوم حاجی حیات صاحب، مرحوم ڈاکٹر صادق صاحب، مرحوم محمد سلیم نظامی، مرحوم گھیسہ خاں، مرحومہ حجابی خازن بانی، مرحوم حاجی عبدالستار صاحب، مرحوم محمد صادق بھائی، مرحوم حاجی ہارون صاحب، مرحوم حاجی مقصود صاحب، مرحومہ حجابی شکیلہ بی، مرحومہ حجابی گلاب بی، مرحوم حاجی سلیم نورانی، مرحوم حاجی محمد بھائی نورانی، مرحوم سید صابر علی، مرحومہ رضیہ بی، مرحوم حاجی عرفان صاحب، مرحوم افسر حسین، مرحوم محمد الیاس، مرحومہ شمیم بانو اور تمام مرحومین امت کی روحوں کو۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ابر رحمت ان کی قبروں پر گوہر باری کرے

عرض حال

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بے حد اور بے شمار کرم و احسان کہ اس نے محبوب پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے مجھے ”معارف صحابہ جلد دوم“ لکھنے کی توفیق بخشی۔ پہلی جلد جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ میں منظر عام پر آئی تھی اور دوسری جلد ۱۴۴۲ھ میں طباعت کے لیے جارہی ہے۔ اس طرح دوسری جلد کے لکھے جانے اور زیور طباعت سے آراستہ ہونے میں آٹھ سال گزر گئے، اس تاخیر میں کچھ دخل تو میری مصروفیت و مشغولیت کا ہے، کچھ کورونا وائرس کی ہلاکت خیزیوں کا اور باقی حصہ میری سہل پسندی تن آسانی اور آرام پسندیوں کے ساتھ ساتھ ان احباب کا ہے جنہوں نے کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور اصلاح کی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ سن کر ہمارے قارئین ضرور متعجب ہوں گے کہ اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں ایک سال سے زیادہ کا وقت لگا ہے۔ معارف صحابہ اول پڑھنے کے بعد اہل سنت کے کئی ذمہ دار، قدآور علما اور اصحاب قلم نے دوسرا حصہ جلد لکھنے کا مطالبہ فرمایا، ان کے مطالبے نے میری مہمیز اور ہمت افزائی کا کام کیا اور کرم خداوندی سے دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

مجھے اپنی علمی بے مائیگی اور قلم کی بے بسی کا مکمل احساس و اعتراف ہے، اس لیے میں کتاب کے ناقدین سے عرض گزار ہوں کہ مجھے بغرض اصلاح ہر صحیح تنقید منظور ہے، ان

شاء اللہ اصلاح قبول کرنے میں آپ مجھے راہ فرار اختیار کرتا نہیں پائیں گے۔

میں اس خدمت کے لائق تو نہیں مگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا کا طالب ہو کر ذرا صاحب رسول کے طور پر ان پاک بازوں کی سیرت نگاری کر رہا ہوں جن کی عزت افزائی خدائے پاک نے اپنی کتاب مبین میں فرمائی اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے احادیث میں ان کے عظیم فضائل بیان فرمائے۔ معارف صحابہ کی ترتیب و تصنیف کے ذریعے میں اپنے کان حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی علیہ الرحمہ کے ان الفاظ پر دھرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو آپ نے تقریباً پچاس سال پہلے اپنی کتاب میں تحریر فرمائے تھے، آپ رقم طراز ہیں:

”تذکرہ کرامت کے سلسلے میں میرے نزدیک ایک سانحہ بہت ہی حیرت ناک بلکہ انتہائی المناک ہے کہ متاخرین اولیاء کرام بالخصوص مجذوبوں اور باباؤں کے کشف و کرامات اور خاص کر دور حاضر کے پیروں کی کرامتوں کا تو اس قدر چرچا ہے کہ ہر کوچہ و بازار بلکہ ہر مکان و دکان، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں، کتابوں اور رسالوں کے اوراق میں ہر جگہ اس کا ڈنکا بج رہا ہے اور ہر طرف اس کی دھوم مچی ہوئی ہے مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ امت مسلمہ کا وہ طبقہ علیاً جو یقیناً تمام امت میں ”افضل الاولیاء“ ہے یعنی ”صحابہ کرام“ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان کی ولایت و کرامت کا کہیں بھی کوئی تذکرہ اور چرچا نہ کوئی سناتا ہے نہ کہیں سننے میں آتا ہے، نہ کتابوں اور رسالوں کے اوراق میں ملتا ہے، حالانکہ ان بزرگوں کی ولایت و کرامت کا عظیم درجہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ اگر تمام دنیا کے اگلے اور پچھلے اولیاء کو ان کے نقش قدم چوم لینے کی سعادت نصیب ہو جائے تو ان کی ولایت و کرامت کو معراج کمال حاصل ہو جائے۔ کیونکہ درحقیقت یہی حضرات تومدار ولایت و کرامت ہیں کہ ان کے نقش پا کی پیروی کے بغیر ولایت و کرامت تو کجا؟ کسی کو ایمان بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ بلا واسطہ آفتاب رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نور معرفت حاصل کر کے آسمان ولایت میں ستاروں کی طرح چمکتے اور گلستان کرامت میں گلاب کے پھولوں کی طرح مہکتے ہیں اور تمام دنیا کے اولیاء ان کی ولایت کے شاہی محلات کی چوکھٹ

پر بھکاری بن کر نور معرفت کی بھیک مانگتے رہتے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ وہ فضیلت مآب اور مقدس ہستیاں ہیں جو حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جلال و جمال نبوت کو اپنی ایمانی نظروں سے دیکھ کر اور حبیب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے سرفراز ہو کر تمام اولیاء امت میں اسی طرح نظر آ رہے ہیں جس طرح ٹٹماتے ہوئے چراغوں کی محفل میں ہزاروں پاور کا جگمگاتا ہوا بجلی کا بلب یا ستاروں کی بارات میں چمکتا ہوا چاند۔

افسوس کہ نہ تو ہمارے واعظین کرام نے اپنی تقریروں میں صحابہ کرام کی کرامتوں کو بیان کیا نہ ہمارے مشائخ عظام نے اپنے مریدوں کو اس سے آگاہ کیا، نہ ہمارے علماء اہل سنت نے اس عنوان پر کبھی قلم اٹھانے کی زحمت گوارا کی، حالانکہ رافضیوں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ اس عنوان پر لکھنے اور اس کا تذکرہ اور چرچا کرنے کی ضرورت تھی اور آج بھی ہے کیونکہ ہماری غفلتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہماری عوام جانتی ہی نہیں کہ صحابہ کرام بھی اولیاء ہیں اور ان بزرگوں سے بھی کرامتوں کا صدور و ظہور ہوا ہے۔ (کرامات صحابہ، ص: ۱۶، ۱۷)

الحمد للہ! میرا دل ذکر صحابہ کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی آرزو سے معمور ہے، اس لیے قارئین سے خصوصی دعاؤں کا طلبگار ہوں کہ وہ قادر و قیوم رب، محبوب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے آپ کے آل و اصحاب کے صدقے، اولیاء کرام کے صدقے، حضرت امام اعظم، سرکار غوث اعظم، خواجہ اعظم، امام اہل سنت اعلیٰ حضرت، حضور مفتی اعظم ہند اور حضور تاج الشریعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے صدقے مجھے اس خدمت کے لائق بنائے، لکھنے کا موقع نصیب فرمائے، قبول فرمائے اور مقبول انا بنائے۔

اپنا شرف دعا سے بے باقی رہا قبول
یہ جانیں ان کے ہاتھ میں کنجی اثر کی ہے

محمد عارف قادری برکاتی رضوی

بروز جمعہ: ۲۰ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۲ھ مطابق ۱۳ جنوری ۲۰۲۳

اپنی باتیں

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلی الہ واصحابہ اجمعین
یہ کوئی ۱۹۹۶ء، ۹۷ء کی بات ہے جب میں الجامعۃ القادریہ رچھاریلوے اسٹیشن ضلع
بریلی شریف میں جماعت ثانیہ کا طالب علم تھا اس وقت وہاں کے نصاب میں صور من حیۃ
الصحابہ داخل درس تھی، سیرت صحابہ کے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جو میرے درس اور
مطالعہ کا حصہ بنی، کتاب پڑھی تو بہت اچھی لگی اور کیوں کراچی نہ لگتی اس کا موضوع بھی تو بڑا
اچھا تھا، کتاب میں اللہ تعالیٰ اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مذہب اسلام سے
محبت، دین کی خدمت اور دین پر مر مٹنے کا جذبہ جا بجا نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ صحابہ کرام کی
قربانیاں پڑھ کر دل ہل جاتا اور مچل بھی جاتا لیکن جماعت ثانیہ کا طالب علم اس کتاب کو یا
کسی بھی عربی کتاب کو از خود کتنا حل کر سکتا ہے یہ اہل علم پر خوب واضح ہے۔ یہ تو جامعہ
قادریہ کا عمدہ نظام اور اساتذہ کرام کی خصوصی توجہات تھیں کہ ذوق بیدار ہو گیا تھا۔

بار بار خیال آتا تھا؛ اے کاش! اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب مل جاتی جس سے
دل کھول کر استفادہ کیا جاتا اور صحابہ کرام کے حالات جانے جاتے پھر کبھی کبھی یہ صداے
دل بھی بلند ہوتی کہ اگر اللہ تعالیٰ کا کرم اس کے نبی کے صدقے ہوا اور میں اس لائق بنا
تو اردو زبان میں ایک ایسی کتاب ضرور لکھوں گا۔ ماہ و سال گزرتے چلے گئے تعلیمی سفر آگے
بڑھتا رہا ذہن کبھی کبھار اس بات کو دہراتا بھی رہا یہاں تک کہ میں اکتوبر ۲۰۰۲ء میں
جامعہ سے فاضل کی سند لے کر فارغ ہو گیا اور دسمبر ۲۰۰۲ء سے الجامعۃ الغوثیہ غریب نواز
کبھرانہ اندور میں تدریسی خدمات پر مامور ہوا۔ یہ جامعہ وسط ہند کا عظیم الشان ادارہ ہے جو
اپنی تعلیم و تربیت اور تعمیر کے اعتبار سے خواص و عوام سب میں اپنی خاص پہچان رکھتا ہے اور
بانی جامعہ حضرت علامہ مفتی انوار احمد صاحب قبلہ قادری کی سربراہی میں ترقی کی طرف

رواں دواں ہے۔ تدریسی دنیا کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں میں بھی انہیں کا حصہ بن گیا اور مکمل آٹھ سال گزر گئے اس موضوع پر ایک حرف بھی نہ لکھا جاسکا۔ لیکن اس آٹھ سالہ دور میں میرے کرم فرما دوست حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب قبلہ نظامی بانی و سربراہ اعلیٰ گلشن فاطمہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ نیوریا پیلی بھیت مجھ سے کچھ لکھنے کے لیے تقاضے پر تقاضہ اور اصرار پر اصرار کرتے رہے نہ جانے کیوں انہوں نے مجھ جیسے بیچ مداں سے کچھ لکھنے کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ جب انہوں نے مجھے زیادہ ہی تنگ کیا تو میں نے معلوم کیا کس عنوان پر لکھوں؟ فرمایا جو چاہو لکھو مگر لکھو۔

اپنی علمی بے سروسامانی کے باوجود میں کمر ہمت باندھ کر تیار ہوا موضوع تو ذہن میں ایک زمانے سے متعین تھا اس پر کچھ لکھنے کا عزم کر لیا۔ جامعہ غوثیہ غریب نواز کی لائبریری میں جب موضوع سے متعلق کتب پر نظر ڈالی تو لائبریری اپنی کشادگی کے باوجود بھی میرے موضوع پر تنگ دکھائی دینے لگی۔ جن کتابوں کی مجھے ضرورت تھی وہ کافی مہنگی تھیں جنہیں خرید پانا میرے بس میں نہ تھا لیکن عزم کر چکا تھا۔ ۱۳ جنوری ۲۰۱۱ء کو کام شروع کر دیا اب میرے پاس صرف صور من حیۃ الصحابہ تھی اس کتاب میں سب سے پہلے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت بیان کی گئی ہے میں نے اسی طرز پر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت کا مختصر اردو خاکہ تیار کر دیا لیکن جب اہل قلم سے مشورہ ہوا تو انہوں نے فرمایا: اس فن کی امہات الکتاب کا ہونا تو اشد ضروری ہے پھر طبیعت حیران ہوئی اور میں پریشان ہو گیا کہ آخر کیا کروں اسی کشمکش میں بریلی شریف اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگری چلا گیا جس کا ایک گاؤں سمراوہ میرا وطن اصلی ہے۔ اس بار کت شہر کی برکتیں ظاہر ہوئیں اور مجھ پر خدا کی خصوصی مدد نازل ہوئی۔ کسی کام سے بیہڑی گیا تو وہاں میری ملاقات میرے عزیز دوست مولانا محمد شاہد صاحب قبلہ سے ہوئی میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک وی ڈی ڈی ہے۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس میں بہت ساری کتابیں لوڈ ہیں اصل میں یہ وی ڈی وی ڈی انہیں میرے عظیم دوست حضرت مولانا عطاء

المصطفیٰ صاحب قبلہ ازہری نے دی تھی وہ اسے جامعہ ازہر قاہرہ مصر سے لے کر آئے تھے۔ مولانا شاہد صاحب سے میں نے کہا: کہ اس ڈی وی ڈی کی ایک کاپی میرے لیے تیار کرا لیجیے گا میں ان کے اس احسان کو نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے یہ ڈی وی ڈی کاپی کرا کر مجھے دے دی میں واپس اندور آیا اور محترم و سیم بھائی اندوری کی خدمات حاصل کر کے جب میں نے کمپیوٹر پر اس میں موجود کتابوں کو دیکھا تو میری خوشیوں کی انتہا نہ رہی کیوں کہ مجھے جو کتابیں درکار تھیں وہ زیادہ تر اس میں موجود تھیں لیکن اب دشواری یہ تھی کہ اس میں کتابیں تو تھیں لیکن پی، ڈی، ایف، نہیں تھیں لہذا حوالہ جات کے اندراج میں دقت باقی رہی، خیر میں نے کتاب کا نام، باب، صاحب تذکرہ کا نام اور تذکرہ نمبر لکھ کر حوالہ جات کو بیان کرنا شروع کیا اور پی ڈی ایف کتب کی تلاش میں لگا رہا میری یہ ضرورت میرے استاذ مکرم ادیب شہیر حضرت علامہ مفتی اشتیاق قادری صاحب قبلہ اور مولانا محمد اسلم ازہری صاحب قبلہ نے کافی حد تک پوری کر دی۔ الحمد للہ! آج پی ڈی ایف کتب میرے پاس معتد بہ مقدار میں موجود ہیں اس کے لیے مولانا سلمان صاحب قادری ازہری خصوصی دعاؤں اور شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے قیام ازہر کے دوران مجھے خاصی مقدار میں پی ڈی ایف کتب فراہم کیں، کتابوں کی فراہمی میں میرے محسن و مکرم حضرت علامہ مفتی محمد اشفاق قادری صاحب قبلہ دہلوی اور میرے کرم فرما دوست حافظ اسلام احمد صاحب نوری دہلوی کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عنایات سلامت رکھے۔

میں جو بھی لکھتا ہوں وہ کاپیوں پر لکھتا ہوں، اس کو صاف کرنا بھی ایک بڑا کام ہوتا ہے کیوں کہ میری تحریر کچھ ہی لوگ پڑھ پاتے ہیں۔ پہلی جلد میں تبہیض کا کام حضرت علامہ مولانا رضی الدین صاحب قبلہ اور حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قبلہ نے انجام دیا تھا لیکن اب یہ لوگ اندور سے کافی دور جا چکے ہیں، پھر بھی مولانا رضی الدین صاحب قبلہ نے اپنی مشغولیت کے باوجود پروف ریڈنگ کی خدمات کو انجام دے کر مجھ فقیر پر احسان عظیم فرمایا، اس کتاب کی کچھ کمپوزنگ قاری مقری حضرت مولانا بدر الدین صاحب

مصباحی استاذ جامعہ غوثیہ غریب نواز نے کی ہے، بقیہ کمپوزنگ حافظ عمر فاروق صاحب کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔ اس جلد میں میرے سابق نائب امام محترم حافظ عمران صاحب رضوی کی بڑی محنتیں شامل ہیں، کتاب کا بڑا حصہ اس طور پر کمپوز ہوا ہے کہ پہلے میں اپنے لکھے ہوئے کا آڈیو رکارڈ کر کے حافظ عمران کو دیتا تھا کہ وہ لکھے ہوئے کو سمجھ سکیں، پھر وہ اسے بول کر کمپوز کرتے پھر حافظ عمر فاروق کو بھیجتے اور وہ اسے ان ٹیچ میں سیٹ کرتے، اس طریقہ کار سے کمپوزنگ میں غیر معمولی غلطیاں پیدا ہو گئیں، اور انہیں بقدر طاقت دور کرنے میں ایک سال سے زیادہ وقت صرف ہو گیا۔

جامعہ غوثیہ غریب نواز کے سربراہ اعلیٰ پیر طریقت حضرت علامہ مفتی انوار احمد قادری صاحب قبلہ کا میں تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جن کی عنایات خاصانہ و الطاف کریمانہ ہمیشہ میرے اوپر سایہ فگن رہے اور سفر آسان ہوتا رہا، جامعہ کے تمام اساتذہ اور طلباء میری طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کتاب کو بہتر بنانے میں بھرپور مدد فرمائی، خاص کر جامعہ کے صدر مفتی حضرت علامہ مفتی عبدالقیوم صاحب مصباحی، مولانا امین احمد قادری، مولانا انظار صاحب امجدی، مولانا سلمان صاحب ازہری، مولانا رمضان صاحب قادری، قاری افضل صاحب، قاری حبیب صاحب، قاری مصطفیٰ رضا صاحب، مولانا مجتبیٰ اشرف صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے اپنی گونہ گونہ مصروفیات کے باوجود کتاب کو وقت دیا اور ضروری مشورہ جات سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ دارین میں بہتر جزا عطا فرمائے۔ حضرت علامہ مفتی رفیق الاسلام صدر مفتی دارالعلوم رضائے مصطفیٰ کلکتہ کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے، وہ اس سفر میں میرے بہترین مشیر و معاون ثابت ہوئے ہیں، مفتی شمس الدین صاحب قبلہ رضوی مصباحی اور مفتی فیض صاحب قبلہ مصباحی کی محبتوں کے بیان کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، یہ حضرات کتاب کی اصلاح کے لیے بھیونڈی سے اندور تشریف لائے اور حرف بحرف کتاب کو پڑھ کر مناسب تبدیلیاں فرمائی، میں شکر گزار ہوں سنی ویلفیر کمیٹی کی پوری ٹیم کا خاص کر حضرت علامہ و مولانا صدیق صاحب قبلہ نورانی

ڈاکٹر طیبہ کالج اندور، مولانا تبریز عالم صاحب قادری ازہری کا، عالی جناب سیدناظم علی صاحب، محترم انیس بھائی اور محمد ندیم بھائی ملتانی، محمد صدام بھائی وغیرہم کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے اچھے ساتھی ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

ای لا تبریری کو بہتر ڈھنگ سے چلانے کے لیے محترم محمد وسیم بھائی، محمد افروز بھائی، محمد پرویز ملتانی اور سمیر بھائی پترکار صاحب نے خصوصی تعاون پیش فرمایا یہ لوگ وقت بے وقت میری پکار پر حاضر ہوتے رہے۔ محترم عمران انجینئر صاحب، محترم مظفر انجینئر صاحب، محترم مرشد انجینئر صاحب نے بھی اپنے کمپیوٹر اور پرنٹر پر مجھے کام کرنے کی پوری آزادی فراہم کی۔ عزیزم مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب گوالیاری، حافظ بلال احمد، حافظ محمد اظہر، محمد مظہر، محترم محمد مدثر بھائی اور میرے عزیز محترم اکبر بیگ صاحب اور محمد عابد بھائی (فوٹوکاپی والے) بھی اپنے حسب حال خدمت انجام دیتے رہے۔ جب بات ای لا تبریری کی ہو رہی ہے تو ناسپاسی ہوگی کہ میں مرحوم حاجی محمد امین نورانی (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) اور ان کے بیٹے محترم حاجی احمد صاحب کا ذکر نہ کروں کیوں کہ انہوں نے مجھے ایک کمپیوٹر عطا فرمایا یہ پہلا کمپیوٹر تھا جس پر میں نے کام شروع کیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے راہیں کھول دیں میں خصوصی شکر گزار ہوں اپنی مسجد کے صدر عالی جناب محترم محمد تنگی صاحب نورانی کا کہ انہوں نے روز اول سے ہی مجھے حوصلہ دیا اور مجھے بھرپور آسانیاں فراہم کیں (اللہ تعالیٰ ان کے والد مرحوم حاجی صدیق صاحب نورانی اور والدہ مرحومہ حاجی آمنہ کو جنت الفردوس عطا فرمائے)۔ حوصلہ دینے والوں میں محترم حافظ محمد فہیم، حاجی عبد الرزاق صاحب، حاجی عبد القادر صاحب، حاجی اصغر صاحب، محترم شبیر بھیا، حاجی مستقیم صاحب، چاند بھائی، حسن بھائی اور اختیار بھائی انجینئر، محمد ظفر بھائی، محترم مقصود حسین غوری، محترم محمد نور الہدیٰ و محمد بابر بھائی، عبد الوحید بھائی اور میرے چھوٹے بھائی محمد یعقوب و محمد وسیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر صلہ عطا فرمائے میرے والدین کو کہ انہوں نے جس دن سے کتاب کے بارے میں سنا اس دن سے کبھی بھی اپنی دعاؤں میں اس کو

فراموش نہیں کیا میری بہنیں اور شریکۂ حیات کو اللہ جزا عطا فرمائے کہ کام میں تیزی لانے کے لیے یہ مجھ سے برابر مطالبہ کرتی رہیں اور اللہ تعالیٰ سلامت رکھے امام احمد رضا مسجد شری نگر اندور کو اس کے بانیان و کارکنان کو اور جملہ نمازیوں کو کہ اس کتاب کا اکثر کام اسی مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر انجام پایا اور مجھے وہاں جملہ سہولیات فراہم رہیں۔ مسجد کے مؤذن محترم محمد نواب صاحب بھی لائق قدر خدمت انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ محترم حاجی عبدالعزیز عرف اعلیٰ بھائی اور ان کے تمام گھر والوں پر خاص کرم فرمائے ان کے والد مرحوم حاجی ہاشم یا غوث والوں کو جنت عطا فرمائے، انہوں نے معارف صحابہ اول بہت سے علما و ائمہ کو بطور تحفہ پیش فرمائی۔

دلی خواہش تھی کہ میرے پیر و مرشد حضور تاج الشریعہ علامہ مفتی اختر رضا خان صاحب قبلہ ازہری علیہ الرحمہ کے دعائیہ کلمات اس کتاب کی زینت بنیں میری یہ خواہش بھی پوری ہوئی اس کے لیے میں خصوصی شکر گزار ہوں اپنے استاذ مکرم حضرت علامہ مفتی محمد افضل صاحب قبلہ، مفتی مرکزی دارالافتا بریلی شریف کا کہ جن کی مہربانیوں سے مجھے یہ نعمت ملی میں ان کلمات کو کتاب کی مقبولیت کی ضمانت سمجھتا ہوں۔ دوسری جلد کی طباعت سے پہلے حضرت علیہ الرحمہ وصال فرما گئے، لہذا پہلی جلد والے دعائیہ کلمے سے ہی اس کتاب کو بھی مزین کر دیا گیا۔

وبائی مرض کرونا وائرس کا شکار ہو کر میرے کئی احباب دنیا سے روانہ ہو گئے، ان میں مرحوم ڈاکٹر صادق نظامی ان کے حقیقی چھوٹے بھائی سلیم نظامی خاص طور پر قابل ذکر ہے، میرا دل ان کے جانے کا صدمہ آج بھی محسوس کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو ان کے والد مرحوم حاجی حیات صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، ان کی والدہ اور بھائی محمد جاوید و محمد سلمان کو صحت و سلامتی، رحمت و برکت عطا فرمائے اور تمام اہل خانہ پر خاص کرم فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم سلیم بھائی نورانی اور محمد بھائی نورانی کو بھی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، یہ دونوں بھائی بھی کرونا کے دور میں لقمۂ اجل بنے، یہ تمام حضرات کسی

نہ کسی مرحلے میں اس سفر کے ساتھی تھے۔ اخیر میں اپنے ان محسنین کا تذکرہ کر دوں جن کے بغیر اس کام کے پورا ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا یہ حضرات ضرورت و حاجت کے وقت میری رہنمائی کرتے رہے۔

استاذ مکرم مناظر اہل سنت حضرت علامہ مفتی صغیر احمد صاحب قبلہ جو کھن پوری، حضرت علامہ مفتی انوار احمد صاحب قبلہ بانی جامعہ غوثیہ غریب نواز اندور، استاذ مکرم حضرت علامہ مفتی محمد عاقل صاحب قبلہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث جامعہ منظر اسلام بریلی شریف، استاذ مکرم حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب قبلہ رضوی راہپوری، استاذ مکرم حضرت علامہ مفتی اشفاق صاحب قبلہ راہپوری، استاذ مکرم حضرت علامہ نفیس احمد صاحب قبلہ، استاذ مکرم حضرت علامہ فرید صاحب قبلہ، استاذ مکرم حضرت مولانا حافظ وقاری فخر الدین صاحب قبلہ رضوی (اُتر کھنڈ) مولانا یوسف تحسینی و مولانا محمد صادق بلاس پوری مولانا محمد عمر رضوی و مولانا محمد ادیس صاحب و اساتذہ جامعہ غوثیہ غریب نواز۔ اللہ تعالیٰ میرے مربی اساتذہ، مشفق والدین اور ان تمام احباب کو اپنی رحمت و غفران کی چادر میں ڈھانپ لے جنہوں نے اس کتاب میں کسی بھی طور پر تعاون فرمایا۔ پروردگار سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اپنے محبوب کی نظر رحمت میں اس کو مقبول بنا کر مفید نام بنائے۔

آمین بجا ہ سید المرسلین علیہ و علی آلہ واصحابہ از کی التحیات

والتسلیمات

محمد عارف قادری برکاتی رضوی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

مکی، مدنی مواخات اور اس کے اغراض و مقاصد

مواخات: مواخات کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عینی فرماتے ہیں: ”ہی اتخاذ الاخوة بین اثنین“ دو لوگوں کے درمیان اخوت و بھائی چارگی قائم کرنے کو مواخات کہا جاتا ہے۔

دوسری جگہ امام قرطبی کے حوالے سے لکھتے ہیں: مواخات کا معنی ہے ”دو شخصوں کا آپس میں ایک دوسرے کی امداد اور غم خواری کا معاہدہ کر لینا یہاں تک کہ دونوں نسبی بھائیوں کی طرح ہو جائیں“۔ (عمدة القاری، ج: ۱۱، ص: ۱۶۳)

دونوں تعریفوں میں الفاظ اگرچہ جدا جدا ہیں لیکن حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے درمیان جو مواخات قائم فرمائی وہ تاریخ اسلام کا درخشندہ باب ہے۔ اصحاب سیر و تاریخ نے اپنی کتابوں میں مواخات کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ہے لیکن بعض کتب تاریخ میں مواخات کا ذکر کچھ اس طور پر کیا گیا کہ قارئین میں عمومی تصور یہ قائم ہو کر رہ گیا کہ مواخات وہ رشتہ اخوت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصاری صحابہ کے درمیان قائم فرمایا، جس کے نتیجے میں مہاجرین و انصار کے درمیان محبت کا ایسا رشتہ استوار ہوا اور خلوص و وفا کی ایسی باد بہاری چلی جس سے باغ اسلام لہلہا یا اور خوب برگ و بار لایا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مواخات کا ادھورا تصور ہے۔ خود راقم الحروف کا ذہن بھی کافی عرصے تک اسی فکر کا ترجمان رہا لیکن دوران مطالعہ کچھ تناقض و تعارض سامنے آئے اور اعتراضات نے سر اٹھایا، خدائے تعالیٰ نے مزید توفیق مطالعہ بخشی اور کرم خداوندی نے دستگیری فرمائی تو مواخات سے متعلق کچھ

نئے پہلو سامنے آئے اور مسئلہ ’مواخات‘ کچھ اس طرح منکشف ہوا۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات کا عمل دو مرتبہ انجام دیا، ایک مرتبہ ہجرت سے قبل اور دوسری مرتبہ ہجرت کے بعد۔ پہلی کو مکی مواخات اور دوسری کو مدنی مواخات کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ قسطلانی تینوں شارحین بخاری شریف نے مذکورہ بالا دونوں مواخات کو اپنی کتابوں میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے عمدۃ القاری، ج: ۱۱، ص: ۸۰، فتح الباری، ج: ۴، ص: ۲۱۰، ارشاد الساری، ج: ۶، ص: ۲۳۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

علامہ مغلطائی نے فرمایا: اس بات کو کثیر علما نے بیان فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے مہاجرین کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔ (اکمال تہذیب الکمال، ج: ۱۱، ص: ۲۴۵)
علمائے مذکورین سے بھی پہلے علامہ محمد بن حبیب متوفی ۲۴۵ھ نے اپنی کتاب المحجر میں مواخات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ”مواخات مکہ“ سرخی قائم فرمائی اور اس کے تحت لکھتے ہیں:

مواخات مکہ: مواخات مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مہاجرین صحابہ کے درمیان مکۃ المکرمہ میں ہجرت سے پہلے قائم فرمائی۔ یہ مواخات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات اور حضرت علی کے درمیان قائم فرمائی، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت زید بن حارثہ کے درمیان، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے درمیان، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف کے درمیان، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان، عبیدہ بن الحارث اور حضرت بلال کے درمیان، حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص کے درمیان، حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور حضرت سالم کے درمیان، حضرت سعید بن زید اور حضرت طلحہ کے درمیان قائم فرمائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

مواخات مدینہ: دوسری سرخی آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ”مواخات مدینہ“ کے نام سے قائم فرمائی اور پھر اس کے تحت لکھتے ہیں:

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو آپ نے مہاجرین اور انصار صحابہ کے درمیان مؤاخذات قائم فرمائی۔

مؤاخذات مدینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت سہل بن حنیف کے درمیان، زید بن حارثہ اور حضرت اسید بن حضیر کے درمیان، حضرت ابی مرثد غنوی اور حضرت عبادہ بن صامت کے درمیان، حضرت مرثد بن ابی مرثد اور حضرت اوس بن صامت کے درمیان، حضرت عبیدہ بن الحارث اور حضرت عمیر بن حمام سلمی وغیرہم کے درمیان قائم فرمائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم (المحجر، ص: ۷۱)

مؤاخذات کتنے صحابہ کے درمیان قائم ہوئی: مؤاخذات کتنے صحابہ کے درمیان قائم کی گئی اس سلسلے میں مؤرخین نے الگ الگ اقوال بیان فرمائے ہیں:

امام ابن سعد نے فرمایا: مؤاخذات ایک سو صحابہ کے درمیان عمل میں آئی جس میں پچاس (۵۰) مہاجرین اور پچاس (۵۰) انصاری صحابہ تھے۔

علامہ بلاذری نے فرمایا: مؤاخذات ۹۰ صحابہ کے درمیان قائم ہوئی، جس میں ۴۵ مہاجرین اور ۴۵ انصاری صحابہ تھے لیکن اس کے بعد جو قول بلاذری نے نقل فرمایا ہے، وہ مؤاخذات کے مقاصد سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے اس لیے ہماری نظر میں یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں: مہاجرین میں سے کوئی ایک صحابی باقی نہ رہا جس کی مؤاخذات کسی نہ کسی انصاری کے ساتھ قائم نہ کر دی گئی ہو۔ (خیال رہے کہ تعداد کے تمام اقوال مؤاخذات مدینہ سے متعلق ہیں)۔

(انساب الاشراف، ج: ۱، ص: ۷۱، ۷۲، سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۳، ص: ۳۶۳، ارشاد الساری، ج: ۶، ص: ۲۳۶)

کئی مؤرخین نے اپنی کتابوں میں ان اصحاب کے نام بھی شمار کرائے ہیں جن کے درمیان مؤاخذات قائم کی گئی تھی، ہم نے المحجر کے حوالے سے چند نام ذکر کر دیے ہیں، تفصیل کے لیے المحجر وغیرہ کی جانب رجوع فرمائیں۔

سب سے الگ: مؤاخذات کے تعلق سے علامہ ابوزہرہ کی رائے سب سے جدا

دکھائی دیتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

مؤاخذات کا مقصود اول جماعت مؤمنین کے درمیان وحدت کو پروان چڑھانا تھا اس لیے سب سے پہلے مؤاخذات مہاجرین اور انصار کے درمیان وقوع پزیر ہوئی، دوسرے مرحلے میں مہاجرین کی مؤاخذات مہاجرین کے ساتھ قائم ہوئی اور تیسرے مرحلے میں انصار کی مؤاخذات انصار کے ساتھ وجود میں آئی۔ (خاتم النبیین، ج: ۲، ص: ۲۹۱)

علامہ ابو زہرہ کے نظریے کی تائید میں مجھے کوئی اور قول نظر نہیں آیا لہذا یہ ان کی منفرد رائے شمار کی جائے گی۔

مؤاخذات مدینہ کا وقت اور مقام: مؤاخذات کا عمل قول رائج کی بنیاد پر مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد وجود میں آیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس وقت مسجد نبوی کی تعمیر جاری تھی۔ علامہ ابن عبد البر نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ تشریف لانے کے پانچ ماہ بعد صحابہ کرام کے درمیان مؤاخذات قائم ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے درمیان مؤاخذات حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک مکان میں قائم فرمائی۔

(ارشاد الساری، ج: ۶، ص: ۲۳۶، عمدۃ القاری، ج: ۱۱، ص: ۱۶۳)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخذات کا معاہدہ ہمارے گھر میں انجام دیا۔ (مسند احمد، حدیث: ۱۲۸۹)

علامہ صالحی نے فرمایا: اس حدیث کو امام احمد، شیخین اور امام ابو داؤد نے روایت فرمایا ہے۔ (سبل الہدی والرشاد، ج: ۳، ص: ۳۶۳)

علامہ حلبی نے امام ابن جوزی کے حوالے سے ایک روایت ذکر فرمائی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ مؤاخذات مسجد نبوی میں عمل میں آئی۔ (السیرۃ الخلیبہ، ج: ۲، ص: ۱۲۴)

حقیقت کے اعتبار سے دونوں روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ مدینہ طیبہ میں مؤاخذات کا عمل متعدد مرتبہ انجام دیا گیا۔ (اس کو ہم ان شاء اللہ عنقریب ذکر کریں گے)

لہذا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں بھی مؤاخذات قائم ہوئی اور مسجد نبوی

میں بھی۔

مؤاخات مکہ کے مقاصد: علامہ ابن حجر عسقلانی مؤاخات مکہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: بعض مہاجرین دوسرے مہاجرین کے مقابلے میں مال و دولت، طاقت و قوت اور خاندان کے اعتبار سے اقویٰ و اعلیٰ تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان مؤاخات قائم فرمادی تاکہ ادنیٰ اعلیٰ سے فائدہ حاصل کرے اور اعلیٰ ادنیٰ سے (کام وغیرہ میں) مدد لے سکے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مؤاخات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قائم فرمائی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچپن سے ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگہداشت اور پرورش کر رہے تھے۔ (فتح الباری، ج: ۷، ص: ۷۱۰)

علامہ عینی فرماتے ہیں: ہجرت سے پہلے مہاجرین کے درمیان جو مؤاخات قائم فرمائی گئی یہ مؤاخات باہمی ہمدردی اور تعاون کی بنیادوں پر قائم کی گئی۔ (عمدة القاری، ج: ۱۱، ص: ۸۰)

پروفیسر محمد یوسف مؤاخات مکہ کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مؤاخات کا عمل دو مرتبہ پیش آیا۔ پہلی مرتبہ مؤاخات مکہ مکرمہ میں کرائی گئی، یہ مؤاخات ان لوگوں کے درمیان کرائی گئی تھی جو اسلام قبول کر چکے تھے، ان میں زیادہ تر لوگ مکہ مکرمہ ہی کے رہنے والے تھے لیکن کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو حبشہ، فارس اور دیگر دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مکی زندگی میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا خواہ ان کا تعلق سرزمین مکہ سے تھا یا بیرون مکہ سے، وہ مختلف قبائل اور گھرانوں کے ایک ایک دو دو افراد تھے، ان میں صاحب ثروت بھی تھے اور غریب و نادار بھی، قریش جیسے سیاسی و معاشی طور پر مستحکم قبیلے کے لوگ بھی تھے اور دیگر نسبتاً کمزور قبائل کے لوگ بھی تھے چونکہ وہ مختلف قبائل کے اکا دکا لوگ تھے اس لیے انہیں حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے خمیازے کے طور پر اپنے ہی خاندان کی دشمنی مول لینا پڑی تھی، اپنے گھر والے ہی منہ موڑ لیتے تھے اور رشتہ دار اور احباب نہ صرف قطع تعلق کر لیتے بلکہ سخت رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے خلاف ظالمانہ کاروائیاں کرنے لگتے تھے۔ قبائلی نظام میں

خاندان کی سرپرستی اور ضمانت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ سرپرستی اور تحفظ کی ضمانت ختم ہو جائے تو اس سے جو خلا پیدا ہوتا ہے یا عدم تحفظ کا جو احساس ابھرتا ہے وہ بہت سے معاشرتی مسائل پیدا کرتا ہے۔ اس صورت حال میں یہ لوگ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ مصائب و ابتلا کے دور میں یہ احساس شدت سے ابھر رہا تھا کہ کوئی ان کا قریبی دوست ایسا ہوتا جس سے وہ حال دل کہہ سکیں، کوئی ایسا شریک غم ہوتا جس کے سامنے اپنے غم کو ہلکا کر سکیں، خونی رشتوں کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے جس انس و محبت اور تعلق کے فقدان کا احساس ہو رہا تھا وہ کسی طرح ختم ہو جائے۔

یہ ایک معاشرتی مسئلہ تھا جسے حل کرنا ضروری تھا، اس کے ساتھ ایک دوسرا مسئلہ بھی درپیش تھا جو اس سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ مسئلہ ان غلاموں کی تعلیم و تربیت کا تھا جو اسلام قبول کر کے مسلم معاشرے کا حصہ بن گئے تھے لیکن علمی اور فکری طور پر بہت پیچھے تھے، ان کی ذہنی سطح بھی بہت پست تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں معاشرے میں کبھی بھی انسانیت کے مقام پر فائز نہیں سمجھا گیا تھا، نہ انہیں کبھی ایسے مواقع ہی مہیا کیے گئے تھے جس میں وہ علم و تربیت کی طرف متوجہ ہو سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ غلاموں کی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کر کے انہیں معاشرے میں انسانیت کے قابل احترام مقام پر لایا جائے تاکہ ان کی ان صلاحیتوں سے معاشرے کو استفادہ کا موقع ملے جو اللہ تعالیٰ نے ان میں ودیعت کر رکھی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں مسائل کو حل کرنے کے لیے اسلام قبول کرنے والے بھائیوں کے درمیان مواخات کرائی۔ (سوشل ذرائع سے ماخوذ)

مواخات مدینہ کے مقاصد: علامہ قسطلانی فرماتے ہیں: مواخات مدینہ

مہاجرین و انصار کے درمیان باہمی ہمدردی، غم خواری اور حق کی پاسداری کی بنیادوں پر قائم کی گئی تھی۔ (مواخات کی خاص بات یہ تھی کہ) اس مواخات کے ذریعے یہ لوگ ایک دوسرے کی وراثت میں حصہ پانے کے مستحق تھے۔ میت کے مال میں ذوی الارحام کی جگہ مواخاتی بھائی حصہ پانے کے حقدار تھے، واقعہ بدر کے بعد آیت کریمہ: ”وَأُولُوا الْأَرْحَامِ

بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ“ نازل ہوئی، اس حکم خداوندی نے مواخات کے ذریعے دیا گیا حق وراثت منسوخ کر دیا۔ (ارشاد الساری، ج: ۶، ص: ۲۳۶)

علامہ عینی لکھتے ہیں: مواخات کے دو سبب تھے، پہلا یہ کہ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں کچھ معاہدات کیا کرتے تھے اور وہ اس کے ذریعے ایک دوسرے کے مال کے وارث ہو جاتے تھے۔ (زمانہ جاہلیت میں جائز و ناجائز تمام قسم کے معاہدات ہوا کرتے تھے) اسلام نے ناجائز تمام معاہدات کو ختم فرما دیا اور ارشاد ہوا: ”لَا حِلَّ فِي الْأَسْلَامِ“ اسلام میں کسی (ناجائز) معاہدے کی اجازت نہیں لہذا زمانہ جاہلیت کے ناجائز معاہدات سے بچا کر اسلام نے صحابہ کرام کو مواخات کی شکل میں نعم البدل عطا فرمایا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ مہاجرین حضرات بے سر و سامان مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تھے، انہیں مال اور مکان دونوں کی ضرورت تھی۔ مہاجرین کے لیے ان کی ضروریات کے سارے انتظامات انصار مدینہ ہی انجام دے رہے تھے لہذا مواخات کے ذریعے ان کی خدمات کو اور مؤکد کر دیا گیا۔ اس مواخات کے ذریعے یہ لوگ ایک دوسرے کے مال کے وارث بنتے تھے۔ اقربا کی جگہ مواخاتی بھائی میراث کے حقدار ہوتے تھے لیکن سورہ انفال کی آیت نمبر: ۵۷ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ حکم میراث منسوخ کرنے کی ایک حکمت یہ تھی کہ بدر کے بعد مال غنیمت نے مہاجرین کی مالی حاجت کو پورا کر دیا تھا چنانچہ میراث کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ (عمدة القاری، ج: ۱۱، ص: ۱۶۳)

آیت کریمہ: ”وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ“ نازل ہو جانے کے بعد حق میراث اہل مواخات کے لیے ختم ہوا اور ذوی الارحام کے لیے ثابت ہو گیا۔ (المجر، ص: ۷۱) تنبیہ: آپ نے ملاحظہ کیا کہ مواخاتی بھائیوں کے درمیان وفات ہو جانے کی صورت میں حق وراثت ثابت کیا گیا تھا، یہ حکم واقعہ بدر کے بعد قرآن کریم نے منسوخ کر دیا لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے عجائب میں سے ہے، سورہ انفال (جس کی مذکورہ آیت کریمہ کے ذریعے حکم میراث منسوخ ہوا) کے نزول تک ایسے دو بھائیوں میں سے کسی

ایک کا انتقال نہیں ہوا جن کے درمیان مواخات قائم تھی۔ (المحرم: ۷۱)

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی مواخاتی بھائی نے اپنے دوسرے مواخاتی بھائی کی میراث سے حصہ نہیں پایا۔

پروفیسر محمد یوسف مواخات مدینہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے جو منصوبہ بندی فرمائی تھی اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ انصار و مہاجرین کے مابین اس تہذیبی اختلاف کو جلد از جلد ختم کیا جائے اور کسی گروہ کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ اس اختلاف سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھائے، چنانچہ مواخات کے عمل کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انصار و مہاجرین مل جل کر ایک ساتھ رہیں، ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھیں اور ایک دوسرے کی اچھی عادات و اطوار کو اپنائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے ان حضرات کا عقیدہ اس قدر مضبوط کر دیا کہ اس کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب وجود میں آنے لگی اور انصار و مہاجرین کے مابین تہذیبی اختلاف بتدریج ختم ہو گیا۔ عبد اللہ بن ابی اور اس کے گروہ کے علاوہ یہودی بھی اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے درمیان باہمی نسلی تعصب کو ابھار کر، یا مقامی اور غیر مقامی کا مسئلہ اٹھا کر ایک دوسرے سے لڑا دیا جائے لیکن منافقین اور یہودیوں کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس چیز کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا، چنانچہ آپ نے مواخات کرا کے منافقین اور یہودی کی اس قسم کی سازشوں کا سد باب کر دیا۔

مواخات اولیٰ ہو یا مواخات ثانیہ، اس منصوبے کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعے سے موالی (آزاد شدہ غلام) کی ذہنی و فکری تعلیم و تربیت کا ایسا اہتمام کیا جائے کہ وہ لوگ جو صدیوں سے ذہنی و فکری پستی کا شکار چلے آ رہے تھے، انہیں آزاد لوگوں کے ہم پلہ کیا جائے اور غلامی نے جو ان کی فکر اور نفسیات کو متاثر کیا ہوا تھا، وہ ختم ہو جائے تاکہ یہ لوگ بھی معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

غلامی کی تاریخ پر نظر رکھنے والے افراد اچھی طرح جانتے ہیں کہ جن لوگوں کے ساتھ مال و متاع کے جیسا سلوک کیا جاتا ہو اور جو فکری آزادی سے محروم رکھے گئے ہوں ان کی ذہنی و فکری سطح کس قدر پست ہو جاتی ہے۔ جدید دور میں بھی بھارت میں ایسے گروہ ملتے ہیں جنہیں نیچی ذات قرار دے کر دھتکار اور نسلی طور پر کمتر قرار دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک ہوتا ہے اس وجہ سے یہ زیادہ تر احساس کمتری کا شکار اور ذہنی و فکری اعتبار سے بہت پیچھے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو جسمانی طور پر غلام چلے آرہے تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان آزاد شدہ غلاموں کی تعلیم و تربیت کی بہت فکر تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ لوگ احساس کمتری کے جال سے نکل آئیں اور فطرت نے انہیں جو صلاحیتیں عطا کی ہیں انہیں اجاگر کیا جائے تاکہ یہ لوگ بھی اس قابل ہو جائیں کہ وہ کردار ادا کر سکیں جو قائدانہ صلاحیت رکھنے والے آزاد لوگ انجام دے رہے تھے۔

موالی کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان میں سے کچھ کو ایسے لوگوں کے ساتھ مؤاخذات میں منسلک کیا تھا جو قریش میں نمایاں قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے، مثلاً سیدنا بلال بن رباح کو سیدنا عبیدہ بن الحارث کا بھائی بنا دیا گیا، سیدنا سالم مولیٰ ابی حذیفہ کو سیدنا ابو عبیدہ کا بھائی بنایا گیا، مدنی مؤاخذات میں سیدنا سالم کو سیدنا معاذ بن معص کا بھائی بنایا گیا، سیدنا صہیب بن سنان سیدنا حارث بن صمہ کے بھائی قرار پائے، سیدنا خباب بن الارت سیدنا جبار بن صحر کے بھائی بن گئے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ سیدنا اسید بن حضیر کے بھائی قرار پائے۔ ان حضرات میں آزادی اور مساوات کی بنیاد پر آزاد لوگوں کی صحبت میں رہنے اور ان کے ساتھ افکار و خیالات کا تبادلہ کرنے سے نفسیاتی طور پر زبردست تبدیلی آئی، ان کی ذہنی و فکری سطح بلند ہوئی اور غلامی کے اثرات دھل گئے، ان کے عزائم اور طبیعت میں قائدین کا سا ولولہ پیدا ہو گیا، خیالات میں وسعت و بلندی پیدا ہوئی اور بہت جلد یہ لوگ

اعلیٰ درجے کی قائدانہ صلاحیتوں کے مالک بن گئے۔ سیدنا ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام کا مقام تو اس قدر بلند ہوا کہ اس کا اندازہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنی وفات کے وقت سیدنا سالم کے بارے میں فرمایا تھا کہ ”کاش! اگر آج سالم مولیٰ ابی حذیفہ زندہ ہوتے تو میں انہیں مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کر دیتا۔“

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان الفاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیدنا سالم میں کس قدر تبدیلی آگئی تھی کہ وہ بہت سے آزاد اور نمایاں حیثیت رکھنے والوں سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ منصب خلافت کوئی معمولی عہدہ نہ تھا، سیدنا عمر کی رائے میں سیدنا سالم میں وہ تمام صلاحیتیں پیدا ہوگئی تھیں جو اس عظیم الشان منصب کے لیے ضروری ہیں۔ نو آزاد غلاموں میں اتنا بڑا انقلاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کامیاب منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا، اسلامی نظام زندگی ہی یہ عظیم الشان انقلاب پیدا کر سکتا تھا، عہد نبوی کے بعد بھی یہی اسلامی روح کا رفرمانظر آتی ہے۔ موالی کو اسلامی معاشرے میں وہ تمام سہولیتیں میسر تھیں جو کسی بھی آزاد فرد کو حاصل ہو سکتی تھیں، سہولتوں سے زیادہ اہم مسئلہ معاشرے میں ان کے ساتھ سلوک اور طرز عمل کا ہے۔

اسلامی معاشرے میں ان کے ساتھ باعزت سلوک ہوتا تھا، ان کی عزت نفس اور وقار کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ علم و فکر کے میدان میں موالی نے شاندار خدمات انجام دیں۔ چند مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلم معاشرے میں انہیں کیا مقام حاصل رہا اور انہوں نے کس طرح اپنا کردار ادا کیا؟ مثلاً مدینہ منورہ میں سیدنا نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر، امام مالک کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں عطاء بن رباح، یمن میں طاؤس بن کیسان، بصرہ میں حسن البصری، خراسان میں ضحاک بن مزاحم، شام میں امام مکحول، مصر میں یزید بن حبیب، جزیرہ میں میمون بن مہران وغیرہ اور اسی طرح مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمہ مولیٰ عبداللہ بن عباس، وہ حضرات ہیں جو علم حدیث اور علم تفسیر کے ائمہ شمار ہوتے ہیں اور ان کے بغیر علم حدیث اور علم تفسیر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ بڑے بڑے حکمران اپنے

مجاہد بن جابر کہتے ہیں کہ انہوں نے سیدنا عبداللہ بن عباس سے تیس مرتبہ قرآن کریم پڑھا، تین مرتبہ تو اس طرح پڑھا کہ ایک ایک آیت پر رک رک کر اس کی تفسیر کی وضاحت معلوم کی اور مقام و کیفیت نزول کے بارے میں علم حاصل کیا۔ ابو نادر عبد الرحمن بن ذکوان موالیٰ میں سے تھے، یہ بھی امام مالک کے اساتذہ میں رہے، عمر بن عبد العزیز نے انھیں عراق میں وصولی خراج کا افسر علیٰ مقر فرمایا تھا۔ عبدالملک بن الماحیشون بنو تمیم کے موالیٰ میں سے تھے، علم فقہ میں ان کا اہم مقام تھا۔ شرجیل بن سعد بھی آزاد کردہ غلام تھے، سیرت و فتاویٰ میں ان کو بلند مقام حاصل ہے۔ سعید بن جبیر نے جمع تدوین حدیث و آثار پر بڑا کام کیا ہے۔ ابوعبید القاسم بن سلام (متوفی ۲۳۰ھ) بھی ابتدا میں غلام تھے بعض نے انہیں الانصار کا غلام لکھا ہے، وہ اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں سب سے زیادہ شہرت کتاب الاموال کو حاصل ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوا کہ مؤاخات کے عمل نے آزاد اور غلام کے درمیان فرق کو ختم کر کے نفسیاتی طور پر موالیٰ کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین ماحول مہیا کر دیا تھا۔

مؤاخات کا ایک پہلو معاشی مسائل کا حل بھی تھا۔ مہاجرین مکہ مکرمہ سے ترک وطن کر کے مدینہ منورہ آئے تو یہ لوگ اپنا تمام مال و متاع مکہ مکرمہ چھوڑ آئے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کی آباد کاری کا مسئلہ تھا، نیز شہر مدینہ کے وسائل محدود تھے، چند سو مہاجرین کی آمد سے یہاں معاشی مشکلات بڑھ گئیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان مسائل کو احسن طریقے پر حل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ انصار و مہاجرین کے درمیان مؤاخات کے ذریعے سے غریب مہاجرین کو وقتی طور پر انصار کے اموال میں شریک کر دیا گیا اور وفات کی صورت میں ایک دوسرے کی وراثت میں بھی شریک قرار دیے گئے۔ اس عمل کا فوری طور پر اقتصادی فائدہ یہ ہوا کہ بے خانماں مہاجرین کی آباد کاری کا مسئلہ حل ہو گیا۔

مدینہ منورہ کے معاشی وسائل کو وسعت دینا بھی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے

منصوبے کا حصہ تھا۔ اہل مدینہ (اوس و خزرج) زراعت پیشہ لوگ تھے، ان کی ساری معاشی جدوجہد زراعت تک محدود تھی، تجارت اور اس کے اصول و ضوابط سے یہ لوگ ناواقف تھے۔ مدینہ منورہ میں تجارتی سرگرمیاں محدود تھیں، ان پر بھی مکمل طور پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ اوس و خزرج کے لوگ عام طور پر یہودیوں کے مقروض رہتے تھے، یہودی انہیں سود پر قرضہ دیا کرتے تھے۔ عمل مؤاخات کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انصار و مہاجرین ایک دوسرے کے معاشی تجربات اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ مہاجرین نے انصار کے تعاون سے یہاں نہ صرف تجارتی سرگرمیاں شروع کیں بلکہ زراعت کو بھی بہتر بنانے کی کوششیں کیں۔

قرآن کریم نے تجارت کے ذریعے حصول معاش کو اپنی نعمت اور فضل قرار دیا اور لوگوں کو آمادہ کیا کہ تجارت کو فروغ دیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تجارت کو حصول معاش کا ذریعہ بنایا۔ دوسری طرف زراعت کو اس قدر اہمیت دی کہ ایک پودا لگانا بھی عبادت قرار پایا اور اس کا پھل خواہ انسان کھائے، پرندہ یا چوپایہ، درخت لگانے والے کے لیے صدقہ قرار دیا گیا۔

انصار و مہاجرین کی مشترکہ کوششوں سے مدینہ منورہ کے معاشی وسائل میں اضافہ ہوا اور جلد ہی تجارت پر یہودیوں کی اجارہ داری بھی ختم ہو گئی۔ اس طرح مؤاخات کا عمل معاشی مسائل کو حل کرنے اور معاشی بنیادوں کو از سر نو منظم کرنے میں بہت مفید اور مؤثر ثابت ہوا۔

مؤاخات کا تعلیمی پہلو بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مؤاخات کے ذریعے سے مدینہ منورہ کے ہر مسلم گھرانے کو ایک تعلیمی ادارہ میں ڈھال دیا تھا۔ دراصل تعلیم کے میدان میں مہاجرین اور انصار کے درمیان فرق پیدا ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس فرق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مہاجرین تیرہ برس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے، انہوں نے کئی دور میں بھی نزول وحی

کا مشاہدہ کیا تھا وہ مقامات وحی سے بھی واقف تھے، یہ لوگ تیرہ برس تک وحی کی تعبیر و تشریح رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنتے رہے اور یہ تمام عرصہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت میں گزارا اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کو دیکھتے اور سنتے رہے اور انہیں اپنی زندگی میں منتقل کرتے رہے۔ صحابہ کرام صرف عمل ہی کو اپنے اندر منتقل نہیں کرتے تھے بلکہ جذبات و احساسات کو بھی منتقل کرتے تھے، اس صحبت کی وجہ سے ان کے اعمال میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اعمال کی روح جھلکتی تھی، اس تقدیم ایمانی کی وجہ سے انہیں علم کے میدان میں بھی سبقت حاصل تھی اور وہ انصار سے تیرہ برس آگے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ معرفت و علم کا یہ فرق ختم ہو جائے اور مہاجرین کے پاس جو مکی دور کا علم ہے وہ تمام کا تمام انصار کو منتقل کیا جائے تاکہ نہ صرف یہ کہ شرح تعلیم میں اضافہ ہو جائے بلکہ مسلم معاشرے کے تمام افراد کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بھی نشوونما دی جاسکے۔ مؤاخذات کے عمل کی وجہ سے ہر گھر غیر رسمی تعلیمی ادارے کی شکل اختیار کر گیا۔ مہاجرین نے نہ صرف یہ کہ مکی دور کے علم وحی کو انصار تک منتقل کیا بلکہ وہ علم و تجربہ بھی منتقل کیا جو انہیں تجارت کے میدان میں حاصل تھا، اسی طرح صنعت و زراعت سے متعلق جو علم اہل مدینہ کے پاس تھا مہاجرین نے وہ ان سے حاصل کیا، یوں علم و ہنر کے میدان میں بہت بڑی تبدیلی آئی اور یہ اُمّی قوم جلد ہی علمی و فکری میدان میں دنیا کی قیادت کے لیے تیار ہو گئی۔ (سوشل ذرائع سے ماخوذ)

وضاحت: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشہور واقعہ جو مؤاخذات سے متعلق ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان مؤاخذات قائم کر چکے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھائی کسی کو نہ بنایا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روتے ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: آپ نے ہر صحابی کا بھائی بنادیا لیکن میرا بھائی کسی کو نہ بنایا؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”یا علی انت اخي في الدنيا“

والاخرۃ“ اے علی! تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ جس کو کئی محدثین و مؤرخین نے اپنی کتابوں میں تخریج کیا ہے، امام حاکم نے المستدرک میں ایک روایت بیان کی ہے جس میں یہ صراحت موجود کہ یہ واقعہ مؤاخذات مدینہ سے متعلق ہے۔ (حدیث نمبر: ۴۲۸۸)

حالانکہ مؤرخین نے مؤاخذاتی بھائیوں کی جو فہرست اپنی اپنی کتابوں میں درج فرمائی ہے ان میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخذات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ قائم فرمائی وہ قبل ہجرت مکہ مکرمہ میں واقع ہوئی ہے۔

حاصل کلام یہ نکلا کہ مستدرک کی حدیث پاک کے مطابق یہ واقعہ مدینہ طیبہ کا ہے اور مؤرخین کے بیان کے مطابق یہ واقعہ مکہ مکرمہ کا ہے۔ بلکہ مستدرک ہی میں ایک اور حدیث پاک مؤاخذات سے متعلق موجود ہے جس میں کچھ مؤاخذاتی بھائیوں کے نام بھی ذکر فرمائے گئے ہیں۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے درمیان مؤاخذات قائم فرمائی تو حضور نے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر کا، حضرت طلحہ کو حضرت زبیر کا، حضرت عثمان کو حضرت عبدالرحمن کا بھائی بنایا۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) نے عرض کیا: آپ نے اپنے اصحاب کے درمیان مؤاخذات قائم فرمادی، میرا بھائی کون ہے؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں تمہارا بھائی رہوں؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ یا رسول اللہ! حضور نے فرمایا: اے علی! تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔

(المستدرک، حدیث نمبر: ۴۲۸۹)

اس حدیث پاک میں جتنے مؤاخذاتی بھائیوں کا ذکر ہے وہ سب کے سب مہاجر صحابہ کرام ہیں، ایک بھی انصاری صحابی کا نام نہیں ہے، لہذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث پاک مؤاخذات مکہ سے متعلق ہے۔ یہ واقعہ مؤاخذات مکہ سے متعلق ہے یہ صرف ہم ہی نہیں کہہ رہے بلکہ علامہ محمد بن یوسف صالحی نے اس کو پوری صراحت کے ساتھ مؤاخذات مکہ کے تحت روایت فرمایا ہے۔ (سبل الہدی والرشاد، ج: ۳، ص: ۳۶۳)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مؤاخذات کے بارے میں لوگوں میں یہی مشہور ہے کہ وہ مدینہ طیبہ میں قائم ہوئی، زیادہ تر لوگ اسے مدینہ طیبہ کا واقعہ ہی شمار کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کے سامنے یہ دونوں روایات آتی ہیں تو ذہن میں خلجان ضرور پیدا ہوتا ہے، ہم اس خلجان کو امام ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر کے حوالے سے دور کر رہے ہیں، آپ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان مکہ میں مؤاخذات قائم فرمائی، مدینہ طیبہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخذات قائم فرمائی اور دونوں مؤاخذات (مکی، مدنی) کے وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ”انت اخي في الدنيا والاخره“ اے علی! تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔

(الاستيعاب، ج: ۱، ص: ۵۲۷، تہذیب الکمال، ج: ۲۰، ص: ۴۸۳، الریاض النضرہ، ج: ۱، ص: ۲۸)

امام ابو عمر کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی مؤاخذات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مکہ مکرمہ اور مدینہ المنورہ دونوں مقامات پر قائم فرمائی۔

اعتراض: ہم ابھی المجبر کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخذات حضرت سہیل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قائم فرمائی، حالانکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مدینہ طیبہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخذات اپنی ذات کے ساتھ قائم فرمائی، جیسا کہ مکہ شریف میں بھی ان کی مؤاخذات حضور نے اپنے ساتھ قائم فرمائی تھی۔

دوسرا اعتراض: علامہ محب الدین طبری نے امام طبرانی کے حوالے سے بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان مؤاخذات قائم فرمائی، اس روایت کے سامنے آجانے سے مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔

جواب: مذکورہ اعتراضات اور ان جیسے بہت سارے اعتراضات کا جواب علامہ

محب الدین طبری علیہ الرحمہ نے اپنی آنے والی عبارت کے ذریعے دیا۔

اختلاف الروایات فی المؤاخذات یدل علی تکررها حتی یکون الواحد احوالا ثنین وثلاثة۔

مؤاخذات کے سلسلے میں روایات کا اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ مؤاخذات کا عمل متعدد مرتبہ جاری ہوا، اس لیے ایک صحابی کے دو یا تین بھائی بھی ہو سکتے ہیں۔

(الریاض النضرہ، ج: ۱، ص: ۲۸)

اس تناظر میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخذات مکہ مکرمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی ذات کے ساتھ قائم فرمائی پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قائم فرمائی، مدینہ طیبہ میں بھی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخذات حضور نے پہلے اپنے ساتھ قائم فرمائی پھر حضرت سہیل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بھی قائم فرمائی۔ اسی طرح بعض صحابہ کے مؤاخذاتی بھائیوں کے نام الگ الگ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ایک سے زیادہ بھائی بنائے گئے تھے، جس طرح نسبی بھائیوں کی تعداد میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا اسی طرح مؤاخذاتی بھائیوں کی تعداد کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مؤاخذات مکہ کا انکار: ابن تیمیہ (جو ضال اور مضل ہے) نے مہاجرین کے درمیان واقع مؤاخذات مکہ کا انکار کیا ہے۔ اس نے اپنے دعوے پر دلیل پیش کی ہے کہ مؤاخذات ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور دل جوئی کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی لہذا حضور کی مؤاخذات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یا مہاجرین کی مؤاخذات مہاجرین کے ساتھ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ علامہ ابن حجر نے ابن تیمیہ کے اس قول کو رد کرتے ہوئے فرمایا: ابن تیمیہ نے قیاس کے ذریعے نص کو رد کیا ہے (جو درست نہیں ہے) اور ایسا کہنے والا مؤاخذات کی حکمت سے غافل ہے کیونکہ بعض مہاجرین دوسرے بعض سے مال اور قوت میں زیادہ تھے تو اعلیٰ کی مؤاخذات ادنیٰ کے ساتھ قائم کر دی گئی تاکہ ادنیٰ اعلیٰ سے فائدہ حاصل کرے اور اعلیٰ ادنیٰ سے (جسمانی) مدد حاصل کرے۔ (فتح الباری، ج: ۷، ص: ۲۷۱)

بدر کے بعد مؤاخذات: امام واقدی نے امام زہری سے روایت کیا ہے کہ وہ واقعہ بدر کے بعد مؤاخذات کا انکار کرتے تھے۔ (عمدة القاری ج ۱۱، ص: ۸۰، فتح الباری ج: ۴، ص: ۲۱۰)

اس طرح کئی علمائے کرام نے اپنی کتابوں میں بعض صحابہ کرام کی مؤاخذات پر اعتراض کیا ہے کہ فلاں صحابی (جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بدر کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور مؤاخذات بدر کے بعد ختم ہو گئی تو بدر کے بعد آنے والے صحابہ کی مؤاخذات کا کیا معنی ہے؟ حالانکہ واقعہ بدر کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہونے والے صحابہ کرام کی مؤاخذات کی روایات موجود ہیں۔

اس کا جواب علامہ عینی اور علامہ عسقلانی دونوں نے یہ دیا، واقعہ بدر کے بعد وہ مخصوص مؤاخذات ختم ہو گئی جس کے ذریعے مؤاخذاتی بھائی کی میراث میں حق وراثت حاصل ہوتا تھا لیکن اس مخصوص مؤاخذات کے ختم ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر قسم کی مؤاخذات ختم ہو جائے۔ لہذا واقعہ بدر کے بعد جو مؤاخذات قائم کی گئیں، ان کی بنیادیں غمخواری اور معاونت پر تھیں جیسے حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخذات حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ۔ (عمدة القاری، ج: ۱۱، ص: ۸۰، فتح الباری، ج: ۴، ص: ۲۱۰)

دونوں شارحین بخاری کے اس جواب سے ان سارے صحابہ کرام کی مؤاخذات پر ہونے والے اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں جو واقعہ بدر کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ ایسے کئی صحابہ کرام ہیں، جن کی مؤاخذات روایات کی صحت کے ساتھ قائم ہے، حالانکہ وہ واقعہ بدر کے بعد مدینہ طیبہ تشریف لائے جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (فتح الباری ایضاً)

مؤاخذات سے متعلق اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں جو کچھ معلومات جمع کر سکا، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور قارئین کے لیے فائدہ مند بنائے۔ (آمین)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَعَلَى اٰلِهِ وَآخِصَائِهِ اَجْمَعِیْنَ

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ خالق عالم، قادر مطلق، حکیم اور علیم ہے، اس کے ہر فعل میں حکمت و موعظت کے بے شمار پھولوں کا چمن آباد ہے، اس نے اپنے محبوب کو مکہ میں مبعوث فرمایا، اعلان نبوت کا حکم دیا، کٹھن اور دشوار گزار راہوں سے گزار کر آپ کے مشن کو کامیاب فرمایا، جب شمع نبوت کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تو رفتہ رفتہ پر وانوں نے اس کے گرد منڈلانا شروع کر دیا، کبھی ابوبکر نے نذرانہ دل لٹایا تو کبھی عسلی و عثمان اس شمع پر نثار ہوئے، کبھی ابو عبیدہ نے اپنا دست طلب بڑھایا، کبھی سعد بن ابی وقاص اس کے حریم ناز میں داخل ہوئے، کبھی عبدالرحمن بن عوف اس پر سوجان سے قربان ہوئے۔

آخر ایک دن عرب کا وہ غیور اور طاقتور انسان بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت پناہ میں آیا جس کا مشغلہ صحرا نوردی، جو جنگل کے جانوروں کا عمدہ شکاری، جس کی فطرت ثانیہ تیر اندازی و تیغ زنی، پہلوانی میں پنچہ آزمائی کرنا اس کے شوق میں شامل۔ ہاں وہی جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کا سگ بھائی، جس کی والدہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ماں کی چچا زاد بہن، جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا رضاعی بھائی، وہی جس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جوش انتقام میں ابو جہل کو لہو لہان کیا، وہی جو دارا رقم میں عمر کی آمد پر ذرہ برابر ڈرانہ جھجکا بلکہ اس نے سہمے ہوئے مسلمانوں کو حوصلہ دیا کہ ڈرو نہیں! میری تلوار عمر کے لیے کافی ہے۔ وہی جو اسد اللہ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا شیر ہے، لقب جس کا سید الشہد ہے، جس کا نام نامی حمزہ ہے۔

نام و نسب: آپ کا نام حمزہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی ہے۔

ابو یعلیٰ اور ابوعمارہ کنیت قرار پائی، آپ کی والدہ کا نام ہالہ بنت وہیب بن عبد مناف بن زہرہ ہے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ماں ہالہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی چچا زاد بہن ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سگے چچا اور رضاعی بھائی بھی ہیں کیونکہ دونوں نے ابولہب کی کنیز ثویبہ کا دودھ پیا ہے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ظاہری عمر کے اعتبار سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دو یا چار سال بڑے تھے، دو سال والا قول زیادہ صحیح ہے، اہل اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سید الشہدائے کلب سے پکارتے ہیں۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۷ الاصابۃ، ج: ۲، ص: ۳۷)

حلیہ و مزاج: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بہادر اور جری انسان تھے۔ طبیعت میں جلال تھا، جس کا اندازہ ابو جہل کو لہو لہان کرنے سے لگایا جاسکتا ہے، قبل اسلام شکار کے بڑے شائق تھے۔ مضبوط جسم اور متوسط قد والے تھے۔ حضرت ابن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”وَكَانَ رَجُلًا لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَلَا بِالْقَصِيرِ“ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ میانہ کاٹھی کے مالک تھے، نہ ہی انہیں لمبا کہا جاسکتا ہے اور نہ پست قد۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۹)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مصاحبت: ابھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی عمر میں بہت زیادہ تفاوت نہ تھا بلکہ صرف دو سال کا فرق تھا، یہی وجہ تھی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا بچپن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ہی گزرا، نسل ایک، اصل ایک، مقام سکونت ایک، پروان چڑھنے کا زمانہ ایک، عمر متقارب لہذا بچپن میں سنگت بنی رہی۔ جب دونوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو راستے جدا جدا ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اپنے امثال و اقربان کے درمیان ایک نمایاں مقام حاصل کرنے اور پر لطف زندگی کی تعمیر میں لگ گئے جبکہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اعلان نبوت کے جتنا قریب ہوا اتنا ہی اپنے معبود حقیقی کی یاد میں مستغرق ہوتا رہا، آخر ایک دن حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرما دیا۔ خفیہ، آہستہ اور پوشیدہ طور پر

دعوت و تبلیغ کا کام بھی شروع کر دیا لیکن مکہ والوں کے دل کفر و شرک کی بھٹیوں میں تپ تپ کر اتنے سخت اور مضبوط ہو چکے تھے کہ پتھر کی شدت بھی ان کے آگے کم تر تھی۔ جو دل زمانہ دراز سے توہمات پرستی کا شکار رہے ہوں ان کو معبود حقیقی کے جلووں سے آشنا کر دینا یا پتھر سے زیادہ سخت دلوں کو مسخر کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ابھی تک دعوت و تبلیغ کا یہ دور مکہ والوں پر عمومی طور پر اثر انداز تو نہ ہوا تھا تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محمد عربی کی بے داغ سیرت نے ان کے دلوں پر جو گہرے اثرات قائم کیے تھے ان کو پس پشت ڈال دینا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے معبودوں کی طرف داری کرتے ہوئے محبوب پروردگار پر طعنہ کشی کرتے اور انہیں غیر مہذب الفاظ سے یاد کرتے تھے اس سب کے باوجود بھی ان کے نہاں خانہ دل میں کہیں نہ کہیں ضرور اس محسن انسانیت اور مکارم اخلاق ذات کی قدریں چھپی ہوئی تھیں بلکہ مکہ میں بسنے والے کتنے انسان ایسے تھے جو دل سے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تائید کرتے تھے مگر عزت نفس، معاشرتی رسم و رواج، تقلید جامد، متکبرانہ روش اور آباؤ اجداد کی پیروی جیسی اشیاء ان کے گلے کا طوق اور پیروں کی بیڑیاں بنی ہوئی تھیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اگرچہ راستہ تبدیل کر لیا تھا لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے بعد اس عدیم المثال ہستی سے متعلق جو تاثرات و تصورات ان کے دل و دماغ میں قائم تھے وہ مٹے نہیں تھے، انہیں معلوم تھا کہ ان کا بھتیجا جن اخلاق کا پیکر اور جن خصائص کا خوگر ہے وہ ضرور اس کو لوگوں کے دلوں پر حاکم بنا کر رہیں گے اور مستقبل میں ضرور ان کا بھتیجا عظیم شان کا مالک ہوگا۔

(رجال حول الرسول، ص: ۱۲۱)

قریش کی گھبراہٹ: پیغمبر اسلام اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اپنی نبوت کا

اعلان فرما چکے ہیں۔ قریش مکہ اس دعوت کو بے اثر بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے باہمی مشورے بھی شروع ہو چکے ہیں۔ ایک دن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کن کعبہ میں داخل ہوئے دیکھا کہ اشراف قریش کی محفل سبھی ہوئی ہے خود کو محفل کی زینت بنا لینا بھلا معلوم ہوا تو

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اشرف قریش کے درمیان جا بیٹھے، سنجیدگی کے ساتھ قریش کی گفتگو کان لگا کر سننے لگے، آپ نے محسوس کیا کہ قریش مکہ کی گفتگو کا محور و مرکز ذات محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے، یہ پہلا موقع تھا جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اہل مکہ کے دل و دماغ پر ان کے بھیجے کی دعوت چھائی ہوئی ہے۔ اس دعوت نے قریش کو کرب و اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے، اس کرب و اضطراب کی وجہ سے غیض و غضب اور مخالفت و مناقشت کی جو آگ اہل مکہ کے سینوں میں جل رہی تھی وہ ان کے انداز گفتگو سے خوب ظاہر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا تجربہ کچھ الگ تھا یا تو اہل مکہ دعوت اسلام کو خاطر میں نہیں لاتے تھے یا پھر وہ دلوں کے درد کو زبان پر لانا نہیں چاہتے تھے لیکن اب حالت بدلی ہوئی تھی آج تو ان کے چہرے گویا قلق و اضطراب کا موزن دریا تھے اور اس دعوت کا گلا گھونٹ دینا ان کی سب سے بڑی خواہش بلکہ ذمہ داری تھی۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ان کی لمبی گفتگو سن کر ایک زوردار قہقہا لگایا اور اہل مکہ سے کہا: تم نے اپنی گفتگو میں بہت مبالغہ آرائیاں کی ہیں اور اس دعوت سے متعلق تمہارے اندازے بالکل درست نہیں ہیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اس تبصرہ پر ابو جہل بغیر تاخیر کیے ہوئے بول اٹھا: حاضرین محفل! آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حمزہ اس دعوت کے اثرات و خطرات سے ناواقف و جاہل نہیں ہے بلکہ میرے علم کے مطابق اس دعوت کے خطرات کا سب سے زیادہ علم جس ذات کو حاصل ہے وہ حمزہ ہی کی ذات ہے لیکن حمزہ سب کچھ جانتے ہوئے اس دعوت کو اہل مکہ کی نظر میں ہلکا بنانا چاہتا ہے تاکہ قریش غفلت کی نیند سوتے رہیں اور دعوت پر وان چڑھتی رہے، پھر آنے والے وقت کا سورج ان شعاعوں کے ساتھ طلوع ہو کہ قریش کے لیے اس میں خرابی کے سوا کچھ نہ ہو اور اس کا بھیجا قریش کا سردار بن چکا ہو۔ اہل مکہ گفتگو کرتے رہے، ایک دوسرے کو دعوت کے خطرات سے ڈراتے رہے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی پیشانی کی رنگت بدلتی رہی، کبھی غضب کے اثرات نمودار

ہوئے تو کبھی زیر لب تبسم مچل جاتا، یہاں تک کہ مجلس برخاست ہو گئی۔

مجلس کے شرکاء اپنا اپنا راستہ لے کر روانہ ہو چکے تھے لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سر نئے افکار کے ہيجان سے بوجھل ہوا جا رہا تھا، نت نئے خیالات حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ذہن پر اپنا اثر جما رہے تھے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عالم تصور میں اپنے بھتیجے کے مشن کا استقبال کر رہے تھے اور از سر نو اپنے نفس کے ساتھ مکالمہ بھی کر رہے تھے۔ دن گزرتے رہے، حالات بدلتے رہے، آنے والا ہر دن قریش کے سینے میں رنج و الم کا نشتر چھوٹا رہا، غم بڑھا تا رہا یہاں تک کہ قریش کی گھبراہٹ اور باہمی مشورے محفلوں سے نکل کر ظلم و تعدی کی شاہ راہوں اور چوراہوں تک آپہنچے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس پورے منظر نامے کو دور کھڑے ہو کر دیکھتے رہے لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا شعور بار بار انہیں اس بات کا یقین دلاتا رہا کہ ان کے بھتیجے کی ثابت قدمی ضرور ایک دن اسے غالب کر کے رہے گی۔

کفار مکہ کی طرف سے پھیلانے جانے والے شکوک و شبہات کسی اور کو تو محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متعلق فریب خوردہ بنا سکتے تھے لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس پیکر صدق و صفا اور مخزن خیر و حیا سے متعلق کسی دھوکے میں آجاتے اس کا امکان تو دور دور تک نظر نہیں آتا تھا کیونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بچپن کی نزاہت و معصومیت، جوانی کی پاکیزگی و طہارت، عمر کی پختگی پر بلند عزائم اور پر نور امیدوں کو جس قرب سے دیکھا تھا اس قرب سے عام قریش میں سے کسی نے نہ دیکھا تھا، وہ تو ذات محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معرفت تقریباً اتنی ہی رکھتے تھے جتنا وہ خود اپنے آپ کو پہچانتے تھے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہ دونوں ایک ہی ساتھ پروان چڑھے اور جوان ہوئے، ان کی نظر کے سامنے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی سورج کی شعاعوں سے زیادہ اجلی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اپنی یادداشت پر زور دینے کے بعد بھی یاد نہیں آتا تھا کہ محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صاف و شفاف زندگی پر شبہ کا ایک نقطہ بھی لگایا جاسکتا ہے، ان کے حافظے کی دنیا میں کوئی ایسا منظر نہ تھا جس میں محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی پر غضب ناک ہوئے ہوں،

مایوسی کے شکار ہوئے ہوں، جھگڑا فساد یا واہیات سے ان کا کوئی تعلق رہا ہو۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ صرف حضور بالا کے جسم کی ہی معرفت نہ رکھتے تھے بلکہ وہ آپ کی عقل کی پختگی اور غیر متزلزل قوت ارادی کو بھی اچھے طریقے سے پہچانتے تھے۔ اس حال میں فطرۃً ایک انسان ایسی مکارم اخلاق ذات کی اتباع سے کیسے باز رہ سکتا ہے، جس کے صدق و امانت کی قدریں روز روشن سے زیادہ واضح ہوں۔ اب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا دل اپنے اندر جذبات کا تلاطم سیٹے کسی خاص موقع کے انتظار میں تھا وہ موقع عنقریب انہیں میسر آ گیا۔

(رجال حول الرسول، ص: ۱۲۲)

آپ کا قبول اسلام: اس موقع کو ہم پیر کرم شاہ ازہری کی زبان میں پیش کر رہے ہیں؛ آپ رقم طراز ہیں: اسلام کا نور تاباں آہستہ آہستہ سلیم الفطرت لوگوں کے اذہان و قلوب کو منور کرتا جا رہا تھا، اسلام نے اپنے فطری حسن و جمال سے بڑی بڑی جلیل القدر اور نادر روزگار ہستیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی عظیم شخصیت اسلام قبول کر کے اس کی قوت میں اضافہ کا باعث بن رہی تھی، اسلام کے خلاف اگرچہ مشرکین مکہ کا اجتماعی ردّ عمل ابھی شروع نہیں ہوا تھا لیکن اگا دگا ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے جس سے اس بغض و عداوت کا اظہار ہوتا رہتا جو اسلام کے بارے میں ان کے دلوں میں سلگ رہا تھا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جس بے رحمی سے کفار نے پیٹا اس کے بارے میں آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اسی طرح بے سہارا اور بے آسرا لوگ جو دین حق کو قبول کرتے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے میں وہ قطعاً تامل نہ کرتے یہاں تک ان میں سے جو زیادہ شقی القلب تھے انہوں نے محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی دست تعدی دراز کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صفا کی پہاڑی پر تشریف فرما تھے، ابو جہل کا ادھر سے گزر رہا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا تو اس کے سینے میں بغض و عناد کا جولا وا سلگ رہا تھا پھٹ پڑا۔ اس نے سب و شتم کے تیر برسوں نے شروع کر دیے، حلم و وقار کے اس

کوہ گراں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، اس بے اعتنائی پر ابو جہل کا غصہ اور تیز ہو گیا اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اس نے اس سے مارنا شروع کیا، پے در پے ضربوں سے جسم نازک و اطہر سے خون رسنے لگا لیکن اس پیکر تسلیم و رضا نے صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اور اُف تک نہ کی۔ دل کا غبار نکال کر ابو جہل اتراتا ہوا اپنے مداحوں کی اس محفل میں جا بیٹھا جو صحن حرم میں اس کے قبیلہ والوں نے منعقد کی ہوئی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی خاموشی سے اپنے گھر تشریف لے گئے۔ عبد اللہ بن جدعان کا گھر کوہ صفا کے قریب تھا۔ اس کی ایک لونڈی نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس روز جنگل میں شکار کے لیے گئے ہوئے تھے۔ چاشت کے وقت ایک کامیاب شکاری کی طرح شاداں و فرحاں واپس آ رہے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ شکار سے واپسی پر پہلے حرم شریف میں حاضری دیتے، بیت اللہ شریف کا طواف کرتے پھر صحن حرم میں رؤسائے قریش نے اپنی اپنی محفلیں جہاں جمارکھی ہوتی تھیں وہاں جاتے۔ سب سے علیک سلیک کرتے، مزاج پرسی کرتے تب گھر واپس جاتے۔ اس روز بھی اسی ارادے سے وہ حرم شریف کی طرف جا رہے تھے کہ کوہ صفا کے پاس سے گزر ہوا۔ عبد اللہ بن جدعان کی جس کنیز نے ابو جہل کی تعدی کا دلخراش منظر دیکھا تھا وہ ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور کہا: ”اے ابوعمارہ! آج تیرے بھتیجے کے ساتھ ابو جہل نے یہ وحشیانہ سلوک کیا ہے، پہلے گالیاں دیتا رہا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کیے رکھی پھر مار مار کر لہو لہان کر دیا۔“ یہ سن کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی، غصہ سے آگ بگولہ ہو کر ابو جہل کی تلاش میں آگے بڑھے۔ آج ان کی کیفیت ہی نرالی ہے نہ کسی سے پرسش احوال کر رہے ہیں نہ کسی محفل میں کھڑے ہو کر سلام کہہ رہے ہیں، ابو جہل کی تلاش میں سیدھے آگے بڑھے چلے جاتے ہیں آخر کار آپ کی نظر ابو جہل پر پڑ گئی جو اپنے اہل قبیلہ کی محفل میں بڑی تمکنت سے بیٹھا ہے۔ لوگ سراپا ادب بن کر اس کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہیں، آپ اس مجمع میں گھس گئے اپنی کمان سے اس مردود کے سر پر پے در پے

ضربیں لگائیں کہ خون کا فوارہ پھوٹ نکلا اور غصہ سے گرجتے ہوئے کہا: ”اے ابو جہل! تیری یہ مجال کہ تو میرے بھتیجے کو گالیاں نکالے حالانکہ میں نے اس کا دین قبول کر لیا ہے اگر تجھ میں ہمت ہے تو آ! اور مجھے روک کر دیکھ۔“

بنو مخزوم قبیلہ کے لوگ اپنے سردار کی اس رسوائی پر سیخ پا ہو گئے، اٹھے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اس کا بدلہ لیں۔ ابو جہل بڑا کایاں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے شیر دل کا مقابلہ ان لومڑیوں سے نہیں ہو سکے گا، خواہ مخواہ کئی جانیں ضائع ہوں گی اپنے قبیلے والوں کو کہا کہ ”ابو عمارہ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ) کو کچھ نہ کہو بخدا میری غلطی ہے کہ میں نے اس کے بھتیجے سے بدکلامی کی ہے۔“

رشتہ داری کے جوش میں یہ سب کچھ ہو گیا، ابو جہل سے اپنے پیارے بھتیجے کا انتقام بھی لے لیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کر دیا لیکن جب گھر واپس آئے تو نفس امارہ نے ملامت کرنا شروع کر دی، اے حمزہ! تو نے یہ کیا کیا؟ فرط غضب میں تو اتنا دور چلا گیا کہ اپنے آباؤ اجداد کے عقیدے کو بغیر سوچے سمجھے ترک کر دیا اور ایک نئے دین کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ تو نے جلد بازی میں بڑا غلط فیصلہ کیا ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ گوگو کے عالم میں ہیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا کریں؟ انہیں یہ بات اپنی شان کے سراسر خلاف معلوم ہوئی کہ انہوں نے ایک ایسے دین کو قبول کر لیا ہے جس کے بارے میں انہوں نے پوری طرح سے غور و خوض ہی نہیں کیا۔ ساری رات بڑے قلق و اضطراب میں کٹی۔ ایسی پریشان رات انہوں نے آج تک نہیں گزاری تھی اور ایسے ذہنی کرب سے انہیں کبھی پالا نہیں پڑا تھا جب صبح ہوئی تو بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے عرض کی: ”اے میرے بھتیجے! میں ایک ایسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں جس سے نکلنے کا راستہ میں نہیں جانتا اور ایسی بات پر میرا قائم رہنا بڑا مشکل ہے جس کے بارے میں مجھے یہ علم نہیں کہ یہ ہدایت ہے یا گمراہی؟ اس لیے مجھے اس بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے؛ میرے بھتیجے! میری خواہش ہے کہ آپ اس سلسلہ میں گفتگو کریں“ (سبل الہدی، ج: ۲، ص: ۴۴۴)

عقل و دل و نگاہ کے مرشد کامل نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بے تاب دل کی طلب پر توجہ فرمائی اور بڑے دلنشین انداز میں اسلام کی صداقت و حقانیت کے بارے میں چند ارشادات فرمائے، ویز کیہد کی شان والے نبی کی نگاہ التفات کی دیر تھی کہ سارے حجابات اٹھ گئے، ساری ظلمتیں کافور ہو گئیں، شک و شبہ کا غبار چھٹ گیا، دل کی دنیا نور ایمان سے جگمگ جگمگ کرنے لگی اور عرض کی: میں دل کی گہرائیوں سے گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں۔ ”اے میرے بھائی کے فرزند! آپ اپنے دین کا اظہار فرماتے رہیے، بخدا! میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ مجھے ہر وہ نعمت دے دی جائے جس پر آسمان سایہ فگن ہے تاکہ میں اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤں۔“

آپ کے ایمان لانے سے عالم کفر پر ایک رعب طاری ہو گیا، بے آسرا مسلمانوں پر ان کی ستم رانیوں میں بڑی حد تک کمی آگئی، آپ کے اشعار جو آپ نے اپنے ایمان لانے کی خوشی میں بطور شکر و حمد کہے ہیں، آپ بھی ان کا ترجمہ پڑھیں اور لطف اٹھائیں:

”میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں، جب اس نے میرے دل کو ہدایت دی اسلام قبول کرنے کے لیے جو دین حنیف ہے۔“

”وہ دین جو رب کریم کی طرف سے آیا ہے، جو عزت والا ہے جو اپنے بندوں کے حالات سے باخبر اور ان کے ساتھ لطف و احسان فرمانے والا ہے۔“

”جب اس کے پیغاموں کی ہم پر تلاوت کی جاتی ہے تو ہر عقل مند اور زیرک انسان کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔“

”یہ ایسے پیغامات ہیں جو احمد مجتبیٰ لے کر آئے ہیں ایسی آیات کے ساتھ جن کے حروف روشن ہیں۔“

”احمد مصطفیٰ وہی ہیں جن کی ہم میں اطاعت کی جاتی ہے کوئی کمزور قول اور عقل و فہم سے گری ہوئی کوئی بات ان کا گھراؤ نہیں کرتی۔“

آپ کب ایمان لائے: اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے

کہا ہے کہ اعلان نبوت کے پانچویں سال اور بعض نے اعلان نبوت کے چھٹے سال لیکن علمائے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ آپ اعلان نبوت کے دوسرے سال مشرف باسلام ہوئے چنانچہ علامہ ابن حجر، جوہن رجال کے امام ہیں، تحریر فرماتے ہیں: ”آپ بعثت کے دوسرے سال ایمان لائے، دم واپسی تک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نصرت میں کمر بستہ رہے اور مکہ سے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی۔“

انہوں نے ۶ھ کا قول بھی لکھا ہے لیکن ”قیل“ کے ساتھ جو ضعف پر دلالت کرتا ہے۔ علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: ”آپ بعثت کے دوسرے سال ایمان لے آئے۔“ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۲۶)

علامہ احمد بن زینی دحلان السیرۃ النبویہ میں لکھتے ہیں: ”صحیح قول یہ ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اعلان نبوت کے دوسرے سال ایمان لائے اور بعض نے چھٹا سال لکھا ہے۔“ (سیرۃ النبویہ زینی دحلان، ج: ۱، ص: ۲۱۳)

فضیلۃ الشیخ محمد الصادق العرجون اپنی سیرت کی کتاب میں رقمطراز ہیں؛ دعوت اسلامی نے وحی رسالت کے آغاز میں دوسرے سال اپنی آغوش میں قریش کے معزز ترین جوان، بڑے طاقتور، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شیر، سارے شہیدوں کے سردار، میدان بدر میں شرک اور بت پرستی کے لشکروں کو تھس تھس کر دینے والے، اسلام اور توحید کے پرچم کو بلند کرنے والے، مشہور شہسوار ابوعمارہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کھینچ لیا۔

علامہ ابن حجر کی یہی قطعی رائے ہے، علامہ ابن عبد البر نے استیعاب میں اور علامہ قسطلانی نے مواہب میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی تھے اور نسب کے اعتبار سے خالہ کے بیٹے بھی تھے۔ بلاشبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے مرد میدان بہادر اور نڈر اور قریش کے معزز نو جوان کا بغیر کسی جبر اور بغیر کسی لالچ کے اسلام کو بطیب خاطر قبول کر لینا اسلام کی

صداقت کی ناقابل تردید دلیل ہے اور نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ ہے۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۲۵۱ تا ۲۵۸)

کعبہ میں دعائے حمزہ: رجال حول الرسول کے مصنف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ایمان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگرچہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سیرت و کردار کے بے داغ ہونے کا یقین تھا لیکن پھر بھی ایک نیا دین اپنا لینا کوئی آسان کام نہ تھا، وہ بھی ایسا دین کہ موجودہ معاشرہ اس کا دشمن ہے اور وہ خود اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ جوش غضب اور بر محل حمیت کی بنیاد پر کلمہ تو پڑھ لیا لیکن دل کا اضطراب ختم ہونے کا نام نہیں لیتا، دل مضطرب کو دولت قرار بخشنے کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کعبہ کی چھاؤں میں آگئے، کعبہ کے سائے میں آکر، پیکر عجز و نیاز بن کر رب کعبہ سے گڑگڑا کر حق و ہدایت پر دل جمعی کی دعا کی۔ خود انہیں سے سنیے، کیا فرماتے ہیں: جب مجھے میری قوم کے دین کو ترک کر دینے پر ندامت ہوئی اور اس امر عظیم (اسلام) سے متعلق شکوک و شبہات کے بادل چھانے لگے، یہاں تک کہ دل کا قرار جاتا رہا، آنکھوں کی نیند اڑ گئی تو میں کعبہ میں حاضر ہوا، اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ وہ میرے سینے کو حق کے لیے کشادہ فرمادے اور ہر شک و شبہ زائل فرمادے، اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، میرا سینہ یقین کی دولت سے مالا مال ہو گیا، میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا، طبیب درد لا دو اکو اپنی پوری روداد سنائی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میرے قلب کو ثبات رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دولت اسلام و دولت یقین دونوں سے مالا مال ہو گئے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۲۴)

بحیثیت مسلمان: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ایمان لانے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ثابت ہوئے، جب تک دنیا میں رہے ایک مخلص مؤمن اور شیدائے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہو کر زندہ رہے۔

علامہ ابن حجر کی زبانی اس کو بطور اجمال ملاحظہ کریں ”حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

اعلان نبوت کے دو سال بعد ایمان لائے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت و نصرت کو اپنے اوپر لازم کر لیا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع میں ہجرت بھی فرمائی۔

(الاصابہ، ج: ۲، ص: ۳۷)

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے قریش کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مضبوط و مامون ہو گئے ہیں اور عام مسلمان بھی کفار کے ظلم و ستم سے کچھ حد تک محفوظ ہو گئے تھے۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۸)

اب ہم اس اجمال کی قدرے تفصیل کرتے ہیں، یہ تو ممکن نہ تھا کہ تنہا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ذات اسلام، پیغمبر اسلام اور پیروکاران اسلام سے ہر قسم کی زیادتی و تعدی اور ظلم و ستم کو روک سکے تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ذات اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط ڈھال ثابت ہوئی تھی، ان کی ذات اپنوں کے لیے حفاظت تھی تو غیروں کے لیے دعوت، ان کے اسلام لے آنے نے بہت سے قبیلوں کو قبولیت اسلام کے لیے براہیچختہ کیا بلکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے پہلے اسلام لا کر دوسرے قبیلوں کے لیے راہ ہموار کر دی اور بعد میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام نے اس راہ کو مزید بہتر بنا دیا تھا، جس دن سے اسلام لائے تب سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے سکون و عافیت، رعب و شوکت، حیات و ممات سب کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین پر قربان کر دیا، اس لیے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں اسد اللہ و اسد رسول اللہ کے مبارک خطابات عطا فرمائے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس سریہ کے لیے مسلمانوں کو اسلام میں سب سے پہلے روانہ فرمایا، اس کی امارت کا سہرا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے سر باندھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے اگر کسی مسلمان کو سب سے پہلے جھنڈا دیا گیا تو وہ خوش نصیب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہی ہیں، جس دن حق و باطل کی معرکہ آرائی جنگ بدر کے نام پر ہوئی اس دن بھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسد اللہ اور اسد رسول اللہ کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر

نظر آئے اور بہت ہی عجیب المنظر واقعات و حادثات آپ کی ذات اور تلوار نے کر دکھائے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۲۴)

ہجرت و مواخات: جس وقت مسلمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت کی خاطر اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لیے اسلام کو دوسرے بندگان خدا تک پہنچانے کے لیے اپنے وطن عزیز مکہ شریف کو چھوڑ کر مدینۃ المنورہ میں فقر و فاقہ کی زندگی اپنانے پر خوش ہو رہے تھے، ایمان کی حفاظت نے مال و دولت، اعزاء و اقرباء کی قربانی ان کے لیے آسان بنا دی تھی، اس وقت حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر محبوب دو عالم پر نذرانہ جان و دل لٹانے مدینۃ المنورہ میں حاضر ہو گئے۔ امام ابن سعد بیان فرماتے ہیں: ”حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے مدینۃ المنورہ ہجرت فرمائی اور کلثوم بن ہدم کا دولت کدہ آپ کی قیام گاہ بنا۔ بعض حضرات نے آپ کی قیام گاہ کے طور پر سعد بن خنیثمہ کے گھر کا ذکر فرمایا ہے۔ جب مدینۃ المنورہ میں رشتہ مواخات پروان چڑھا اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں باہمی محبت کو مضبوط کرنے کے لیے ایک کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت کلثوم بن ہدم کا رشتہ اخوت جوڑا گیا۔ آپ کے مدنی بھائی کے طور پر حضرت کلثوم کا نام یقینی نہیں ہے دوسرا نام بھی ممکن ہے۔ (انساب الاشراف، ج: ۱، ص: ۲۷۰)

اس طرح حضرت کلثوم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بھائی قرار پائے۔ اس سے پہلے مکہ المکرمہ میں حضرت زید بن حارثہ کو آپ کا بھائی بنایا گیا تھا۔ (حضرت زید بنی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور بڑے ہی چہیتے صحابی ہیں بلکہ یہ ایک مدت تک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے کی حیثیت سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور بعد میں قرآن پاک نے عرب کے اس دستور کو منسوخ کر دیا) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قائم کردہ رشتہ کی بہت تعظیم فرماتے بلکہ آپ نے حق اخوت ادا کر دیا، حد تو یہ ہے کہ جب آپ جنگ احد میں شرکت کی

غرض سے حاضر ہونے کی تیاری کر رہے تھے تو آپ نے حضرت زید کے حق میں وصیت فرمائی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۸)

غزوات میں شرکت: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے اور انہوں نے اپنی ذات کو خدمت دین کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی بہادری اور شیر دلی کو اچھے طریقے سے پہچانتے تھے لہذا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حسب ضرورت استعمال فرمایا، ہجرت کے سات مہینے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو مہاجرین کی ایک جماعت کا امیر بنا کر بھیجا، اس سریہ میں تیس مہاجرین شریک تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں ان حضرات کو قریش کے قافلے کی راہ روکنے کے لیے روانہ فرمایا، تین سو سواروں پر مشتمل کفار کا یہ قافلہ شام سے واپسی کرتے ہوئے مکہ جا رہا تھا، اس قافلے میں ابو جہل بھی موجود تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو سفید رنگ کا جھنڈا عطا فرمایا تھا، یہ پہلا جھنڈا تھا جسے اسلام میں سب سے پہلے کسی کو دیا گیا تھا (جس کے بارے میں اجمالاً آپ پہلے پڑھ چکے ہیں) اس جھنڈے کو اٹھانے کی ذمہ داری حضرت ابو مرثد کو سونپی گئی تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس قافلے کی تلاش میں سیف البحر تک پہنچے اور ساحل سمندر پر کفار کے قافلے کو پالیا، حملے کی تیاری ہوئی اور دونوں طرف سے صف بندی کر لی گئی لیکن اس بیچ میں مجدی بن عمرو جہنی نے دونوں جماعتوں کو ٹکرانے سے روک دیا، مجدی بن عمرو دونوں فریقوں کا حلیف تھا اس لیے دونوں فریقوں نے اس کی بات مان لی اور نوبت قتال تک نہ پہنچ سکی۔ (السیرۃ الخلیفہ، ج: ۳، ص: ۱۳۶)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پہلا غزوہ: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس غزوے میں سب سے پہلے شرکت فرمائی اس غزوے کو غزوہ ابواء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کا دوسرا نام غزوہ ودان بھی ہے۔ مدینہ منورہ میں آمد کے ایک سال بعد یہ غزوہ

پیش آیا، اس کا مقصد بھی قریش کے قافلوں کی آمد و رفت کو روکنا تھا، اس میں صرف مہاجرین ہی شریک تھے کوئی انصاری اس میں شریک نہ تھا (انصار کی غزوات میں شرکت جنگ بدر سے شروع ہوئی) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس غزوے کی وجہ سے پندرہ دن مدینہ منورہ سے باہر تھے، آپ نے حضرت سعد بن عبادہ کو مدینہ شریف پر اپنا نائب مقرر فرمایا تھا، غزوہ ابواء میں بھی قتال کی نوبت نہ آئی اس موقع پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جن مضبوط ہاتھوں میں اسلام کا عظیم علم عطا فرمایا تھا، وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مقدس ہاتھ تھے، غزوے میں قتال کی نوبت تو نہ آئی لیکن مسلمان وہاں کے سردار منجشی بن عمرو ضمیری سے صلح کر کے لوٹے تھے کہ یہ قبیلہ مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کی مدد نہیں کرے گا۔ (غزوات الرسول و سراہہ، ج: ۱، ص: ۱۲، المقتفی فی سیرۃ المصطفیٰ، ج: ۱، ص: ۳۹)

غزوہ ذی العشرہ: دو ہجری جمادی الآخرہ میں غزوہ ذی العشرہ پیش آیا، اس میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نہ صرف شریک رہے بلکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عظیم جھنڈے کے آپ ہی علمبردار تھے، اس غزوے کے وقت آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوسلمہ بن عبد الاسد کو مدینہ منورہ پر اپنا نائب بنایا تھا اس موقع پر دو سو پچاس (۲۵۰) مہاجرین حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھے لیکن یہاں بھی کفار سے مڈبھڑ نہ ہوئی اور جنگ کی نوبت نہ آئی۔ (المقتفی فی سیرۃ المصطفیٰ، ج: ۱، ص: ۴۰)

بدر میں شجاعت: تاریخ اسلام کا یہ وہ معرکہ ہے جب اسلام و کفر، حق و باطل سچ اور جھوٹ کے درمیان پہلی ٹکڑ ہوئی اس معرکہ میں فرزندان اسلام کی تعداد لشکر کفار کی تعداد سے ایک تہائی تھی، وسائل اور اسلحہ کے اعتبار سے بظاہر بہت کمزور تھے، جزیرہ عرب کا اجتماعی ماحول سراسر ان کے خلاف تھا، انتہائی خوش فہمی کے باوجود اسلام کے غلبہ اور فتح مند ہونے کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی، کفر بڑے کروفر کے ساتھ حق کی بے سروسامانی سے نبرد آزما ہونے کے لیے تین گنا فوج لے کر بڑے غرور اور رعونت سے میدان میں آیا تھا لیکن اسے ایسی فیصلہ کن ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جس نے اس کی کمر توڑ دی پھر اسے کبھی

ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس شان سے حق کو لکا کر سکے۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۳، ص: ۲۹۳)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں اپنی خداداد شجاعت کی دھاک بٹھا دی تھی، جنگ بدر میں پہلا جہنم رسید ہونے والا کافر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تلوار کا ہی مقتول تھا، مشہور زمانہ بدخلق اسود بن عبدالاسد مخزومی مسلمانوں کے حوض کو خراب کرنے کے لیے آگے بڑھا اور اس نے بلند آواز سے کہا: میں نے قسم کھائی ہے کہ مسلمانوں کے حوض سے پانی پی کر رہوں گا یا پھر اس پانی کو خراب کر دوں گا ورنہ اس چشمے کے پاس ہی جان دے دوں گا۔ اسلام کے شاہین حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کافر کی یہ ڈینگیں سنتے ہی اپنی تلوار سنبھال لی، حملہ کیا اور اس کی پنڈلی کاٹ دی، یہ ظالم ریگلتا ہوا چشمے کی طرف بڑھا، تاکہ اپنے خون سے پانی خراب کر کے اپنی قسم پوری کر لے لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے دوسرے وار نے اس کو جہنم رسید کر دیا، اسود بن عبدالاسد کی لگائی ہوئی یہ چنگاری میدان بدر میں شعلہ جوالا بن چکی تھی اور دونوں طرف کے بہادر ایک دوسرے سے برسریکا رہونے کے لیے میدان عمل میں اتر چکے تھے۔

اس وقت کی جنگوں میں بالخصوص کفار قریش کا یہ دستور تھا کہ پہلے فرداً فرداً ایک سے ایک کا مقابلہ ہوتا پھر عام لڑائی شروع ہوتی، کفار کی طرف سے امیر لشکر عتبہ، شیبہ اور ولید مقابلے کے لیے ابتداءً نکلے، ان کے مقابلے کے لیے تین انصاری جوان عون، معوذ اور عبداللہ بن رواحہ میدان میں آئے لیکن کفار گھمنڈ کے پتلوں نے کہا: تم کون ہو؟ غلامان مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواب دیا: ہم انصار ہیں، ان سرکشوں نے کہا: تم ہمارے مد مقابل نہیں ہو، ہمیں ہمارے ہم قوم ہمسر چاہیے تب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم کو ان کے مقابلے میں بھیجا، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ (جو عمر میں ان دونوں سے بڑے تھے) نے عتبہ کو لکا را، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عتبہ کے بیٹے ولید کو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مد مقابل کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیا اور ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی شمشیر خارا شگاف سے وار کیا اور

اس سے پہلے کہ شیبہ سنبھل پاتا آپ کی شمشیر براں نے اسے دو ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیا اور اس کا سر غرور ہمیشہ کے لیے تن سے جدا کر دیا پھر یہ دونوں حضرات، حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے بجلی کی تیزی سے بڑھے اور ان کی تلواریں بجلی کی سرعت سے کوندیں اور عتبہ کی لاش کو پارہ پارہ کر دیا۔ (اکمل فی التاريخ، ج: ۲، ص: ۲۲، سیرت الرسول، ج: ۳، ص: ۳۳۷)

علامتی نشان: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ میدان بدر میں ممتاز نظر آرہے تھے، وجہ یہ تھی کہ آپ نے اپنے جسم پر بطور علامت شتر مرغ کا پر لگا رکھا تھا، جوش جہاد سے اتنے سرشار تھے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آگے آگے دو تلوار لے کر جہاد فرما رہے تھے، جنگ کے اختتام پر کفار کے قیدیوں نے مسلمانوں سے پوچھا: یہ کون شخص تھا؟ جس نے اپنے اوپر شتر مرغ کا پر لگا رکھا تھا، لوگوں نے جواب دیا: یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو اب سن کر پوچھنے والے نے کہا تھا: اچھا! یہ حمزہ ہیں، جنہوں نے ہمارے لشکر کے ساتھ یہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۸)

اوپر ذکر کردہ سوال و جواب سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنگ بدر میں اپنی کارکردگی اور کفار کو تیغ کرنے کی وجہ سے کفار کی نظروں میں چڑھ گئے تھے کیونکہ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے کفار کو تہس نہس کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی اور اس کے نتیجے میں کفار کو ناقابل تلافی ہزیمت و نقصان جھیلنا پڑا تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مشرکین کی نظروں میں چڑھ جانا ہی ان کی شہادت کا سبب بنا۔

کفار کا غم: قریش اپنی ہزیمت خوردہ تلواروں کے ساتھ میدان بدر سے مکہ لوٹ ضرور آئے تھے لیکن ذلت و رسوائی ان کی تلواروں سے ابھی بھی ٹپک رہی تھی۔ ذمہ داران قریش پھٹا دل اور لٹکا منہ لے کر مکہ آگئے تھے لیکن میدان بدر میں سرداران قریش کے سرد لاشے چھوڑ آئے تھے۔ ابو جہل، عتبہ، شیبہ، امیہ، عقبہ بن ابی معیط، اسود بن عبد الاسد، ولید بن عتبہ، نضر بن حارث، عاص بن سعید، طعیمہ بن عدی اور ان کے علاوہ درجنوں کفار کے خاک و خون سے آلود لاشے درندوں، پرندوں یا کیڑے مکوڑوں کے شکار ہو چکے تھے اتنی

رسوا کن شکست کفار کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ انہوں نے مکہ پلٹنے کے بعد ہی انتقامی جذبے کے تحت تیاری شروع کر دی تھی وہ جلد از جلد اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔

(رجال حول الرسول، ص: ۱۲۵)

معمر کہ بدر سترہ رمضان المبارک دو ہجری میں پیش آیا اور اس کے تقریباً ایک سال بعد ہی شوال ۳ھ میں کفار نے مدینہ شریف پر حملہ کی تیاری کی اور ایک عظیم جنگ پیش آئی جسے جنگ اُحد کہا جاتا ہے۔ (السیرۃ النبویہ لابن کثیر، ج: ۳، ص: ۱۲۵)

حضرت حمزہ کفار کے نشانے پر: کفار قریش اُحد میں مسلمانوں سے بدلہ لینے آئے تھے، عمومی حیثیت سے تو ہر مسلمان ان کے نشانے پر تھا مگر خصوصیت کے ساتھ اس جنگ میں دو ہستیاں ایسی تھیں جو کفار کا ہدف اصلی تھیں، وہ اپنے اس ہدف کو کامیاب بنا کر اپنے غیض و غضب کی آتش کو سرد کرنا چاہتے تھے اور اپنی جبینوں پر لگی ہوئی رسوائی کی کالک ہٹانا چاہتے تھے، ان میں ایک ذات تو رحمت عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تھی اور دوسرا نام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

قتل کا سودا: اگر جنگ سے قبل ان کی تیاری کا جائزہ لیں گے تو ہمارے ذکر کردہ دعوے کی پوری تائید ہو جائے گی۔ انہوں نے اُحد روانہ ہونے سے پہلے ایک شخص سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے متعلق سودے بازی کی تھی اور اس سودے بازی میں اس شخص کو صرف ایک ہی کام سونپا گیا تھا اور وہ کام تھا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا۔ کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟ جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ اس شخص کو وحشی کہا جاتا ہے لیکن وحشی نے اتنی بڑی ذمہ داری یوں ہی نہیں لے لی تھی بلکہ قریش نے اس کے لیے بھاری قیمت چکانی تھی۔ ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس ذمہ داری کے لیے وحشی ہی کا انتخاب کیوں عمل میں آیا تھا، وحشی عرب کا وہ مشہور نیزہ باز و نشانچی تھا کہ اس کا نشانہ خطا نہیں کرتا تھا۔ اب وہ اجرت بھی پڑھتے چلیے جو وحشی کو دینا قرار پائی تھی، وحشی کو اجرت دینے والے ایک سے زائد لوگ تھے اور اجرت بھی کئی طرح کی تھی، اجرت دینے

والوں میں ایک نام تو جبیر بن مطعم کا ہے جس کے چچا طعیمہ بن عدی کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے میدان بدر میں ذلت کے ساتھ قتل کیا تھا لہذا اپنے چچا کا بدلہ لینے کے لیے جبیر نے وحشی سے کہا تھا ”أُخْرِجْ مَعَ النَّاسِ وَإِنْ أَنْتَ قَتَلْتَ حَمَزَةَ فَأَنْتَ عَتِيقٌ“ تم احد میں شرکت کرو، اگر تم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تو تم میری طرف سے آزاد ہو جاؤ گے۔ وحشی جبیر بن مطعم ہی کا غلام تھا۔ اتنی بڑی قیمت ٹھہرا کر بھی کفار بدکار حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل پر مطمئن نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس کے علاوہ بھی تدبیریں کی تھیں۔ وحشی کا معاملہ ہند بنت عتبہ کو سونپا گیا تھا اور ہند کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ برابر وحشی کو قتل حمزہ پر برا بھینٹہ کرے اور وحشی کی مکمل ذہن سازی کرتی رہے۔ قریش اس امکان کے وقوع سے محفوظ ہونا چاہتے تھے کہ وحشی اپنے ہدف سے غافل ہو جائے، ہند نے بھی اس موقع کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کیونکہ ہند نے بھی تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے بڑے غم اٹھائے تھے۔ یہ ہند زوجہ ابوسفیان وہی تو ہے جس نے میدان بدر میں اپنے باپ، چچا، بھائی اور بیٹا سبھی کو تو کھو دیا تھا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان سب کو یا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے خود موت کے گھاٹ اتارا ہے یا پھر ان کی موت کا سامان فراہم کیا ہے۔ اس لیے ہند نے وحشی کو بڑی سخت تاکید کی تھی کہ وہ جنگ میں کسی اور چیز میں ہرگز مشغول نہ ہو اور اپنی نظریں صرف اور صرف حمزہ پر جمائے رکھے، اتنا ہی نہیں ہند نے قتل حمزہ کو یقینی بنانے کے لیے وحشی کو اور بھی بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

ہند نے وحشی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو وہ اسے اپنا سب سے قیمتی زیور اسے نذر کر دے گی۔ اس نے وحشی سے زبانی کہہ ہی نہیں دیا تھا بلکہ قیمتی ہیروں سے جڑی بالیاں اور سونے کا ہار اپنے ہاتھوں میں لے کر لہرایا، اس کی نظریں وحشی کے چہرے پر جمی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی: وحشی یہ سب کچھ تمہارے لیے ہے اگر تم حمزہ کو قتل کر سکو۔ لالچی وحشی کے منہ سے مال کی مٹھاس کا پانی ٹپکنے لگا، دماغ معرکہ احد میں شرکت کر کے آزادی کے خواب دیکھنے لگا، کیا وہ اب غلام نہ رہے گا؟ وہ ایک آزاد اور مالدار

آدمی بن کر معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا؟ مکہ کی عورتوں کی سردار، سردار کی بیوی اور سردار کی بیٹی اپنا وہ زیور جو کبھی اس کے جسم کی زینت ہوا کرتا تھا اس کے لیے نکال کے رکھ دے گی؟ اور وہ اس کا مالک بن جائے گا؟ یہ سب خواب دیکھ کر اس نے یہ مہنگا سودا کر لیا اور اس کے لیے خود کو تیار بھی کر لیا تھا۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۲۶)

احد میں شجاعت: شوال ۳ھ میں وہ دن آگیا جس کے لیے کفار نے پورے سال زوردار تیاریاں کی تھیں۔ دولشکر آمنے سامنے ہوئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ میدان جنگ بلکہ میدان شہادت میں جنگی لباس زیب تن کیے ہوئے پورے کروفر کے ساتھ موجود تھے، وہ حسب عادت شتر مرغ کے پر کو بطور علامت اپنے سینے پر لگائے ہوئے تھے، جیسا کہ میدان بدر میں بھی انہوں نے یہی شعار اپنایا تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسد اللہ اور اسد رسول اللہ کی حیثیت سے میدان احد میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے، جس کا قصد کرتے اسے خاک و خون میں تڑپا دیتے، ان کی تلوار گویا موت بنی ہوئی تھی جو مسلسل کفار کو اپنا شکار بنا رہی تھی۔ میدان احد مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا اگر اس تیر انداز دستے نے وہ درہ نہ چھوڑا ہوتا، جہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں لگایا تھا تو میدان احد کفار قریش کا قبرستان بن جاتا ان کے مردوں کا، ان کی عورتوں کا بلکہ ان کے اونٹ اور گھوڑوں کا بھی، لیکن تیر انداز وہاں سے ہٹ کر مال غنیمت لوٹنے لگے اور کفار نے پلٹ کر حملہ کر دیا، اس ناگہانی حملے نے مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی طرف سے زوردار مدافعت کی لیکن وحشی آپ کی تاک میں لگا ہوا تھا۔

(رجال حول الرسول، ص: ۱۲۶)

شہادت جنگ کے کس مرحلے میں ہوئی: رجال حول الرسول کے مصنف

کے بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت جنگ کے دوسرے مرحلے میں ہوئی، بعض دوسرے محققین کی رائے ہے کہ شہادت جنگ کے پہلے مرحلے میں ہوئی اور بعض نے توقف کیا ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بیان پیر کرم شاہ ازہری نے

اپنی کتاب میں عمدہ حوالوں کے ساتھ کیا ہے لہذا ہم شہادت کی تفصیلات ان کی کتاب سے نقل کر رہے ہیں:

بیان شہادت: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شیر سیدنا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت یوم احد کے اہم ترین اور الم انگیز واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ واقعہ جنگ کے کس مرحلے میں پیش آیا اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے، البتہ یہ بات ثابت ہے کہ جب اسلام کے مجاہدین اہل مکہ کے علمبرداروں سے یکے بعد دیگرے نبرد آزما تھے، اس وقت آپ خیر و عافیت سے تھے اور ان میں سے ابوشیبہ، عثمان بن ابی طلحہ، ارطاہ بن شرحبیل کو آپ کی شمشیر خارا شکاف نے لقمہ اجل بنایا تھا۔ البتہ امام حسین بن محمد بن حسن الدیاربکری نے اپنی تصنیف لطیف ”تاریخ النہیس“ میں صراحت سے یہ لکھا ہے کہ جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ لشکر کفار کے ایک علمبردار ارطاہ بن شرحبیل کو تہ تیغ کر چکے تو ان کا سامنا ایک اور مشرک سباع بن عبد العزی الغبشانی سے ہوا تو آپ نے اس کو لکارا اور فرمایا: ”اے لڑکیوں کا ختنہ کرنے والی کے بیٹے! آؤ حمزہ کا مقابلہ کر“۔ جب سباع سامنے آیا تو آپ نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ وحشی اس وقت آپ کی تاڑ میں تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مست اونٹ کی طرح جس طرف بڑھتے جو سامنے آتا اس کو لتاڑتے ہوئے آگے نکل جاتے، اس وقت جب آپ ہمہ تن کفار کو تہ تیغ کرنے میں مصروف تھے، پیچھے سے وحشی نے حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ علامہ مذکور کی اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپ کی شہادت جنگ کے ابتدائی مرحلے میں ہوئی۔ (تاریخ النہیس، ج: ۱، ص: ۴۲۵)

امام بخاری، ابوداؤد الطیالسی اور ابن اسحاق اور دیگر اہل تحقیق نے آپ کی شہادت کا واقعہ آپ کے قاتل وحشی کی زبان سے یوں نقل کیا ہے وحشی کا بیان ہے: جنگ بدر میں سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے طعیمہ بن عدی کو قتل کیا تھا۔ جب قریش مکہ جنگ احد کے لیے روانہ ہوئے تو میرے مالک جبیر بن مطعم (جو بعد میں مشرف باسلام ہو گئے) نے مجھے کہا

کہ اگر تم میرے چچا طیمہ کے عوض حضور کے چچا حمزہ کو قتل کر دو تو تم آزاد ہو۔ چنانچہ میں بھی لشکر کفار میں شامل ہو کر روانہ ہوا۔ میں حبشی الاصل تھا اور حربہ (چھوٹا نیزہ) مارنے میں کمال مہارت رکھتا تھا۔ شاذ و نادر ہی میرا وار کبھی خطا جاتا تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی اور دونوں فریق ایک دوسرے سے مصروف پیکار ہو گئے تو میں صرف حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرگرمیوں کو تاڑتا رہا۔ آپ ایک مست خاکستری اونٹ کی طرح دندناتے پھرتے تھے، جدھر سے گزرتے اپنی تلوار آبدار سے صفوں کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتے، آپ کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ جو جدھر رخ کرتا ہے، لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں نے مجھے بتایا: یہی حمزہ ہیں۔ میں نے دل میں کہا: میرے مطلوب تو یہی ہیں۔ میں نے ان کو اب پہچان لیا تھا، اب میں ان پر ضرب لگانے کی تیاری کرنے لگا، کبھی کسی درخت اور کبھی کسی چٹان کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا میں ان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا، اسی اثناء میں سباع بن عبد العزی الغبشانی سامنے آ نکلا، جب حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دیکھا تو اسے لکارتے ہوئے کہا: ”اے ختنہ کرنے والی کے بیٹے! آمیری طرف دو دو ہاتھ ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دشمنی رکھتا ہے“ یہ کہہ کر آپ نے اس پر حملہ کر دیا اور آن واحد میں اسے موت کی آغوش میں سلا دیا اور اس کے بے جان لاشے سے زرہ اتارنے کے لیے اس پر جھکے۔ میں ایک چٹان کی اوٹ میں تاڑ لگائے چھپا بیٹھا تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پاؤں پھسلا تو زرہ سرکنے سے آپ کا پیٹ ننگا ہو گیا۔ میں نے اپنے چھوٹے نیزے کو پوری قوت سے اپنی گرفت میں لے کر لہرایا، جب مجھے تسلی ہوگئی تو میں نے تاک کر وہ نیزہ آپ کے شکم پر دے مارا جو ناف کے نیچے سے اندر گھسا اور پار نکل گیا۔ آپ نے غضب ناک شیر کی طرح مجھ پر جھپٹنا چاہا لیکن زخم کاری تھا آپ اٹھ نہ سکے۔ میں وہاں سے چلا آیا جب آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو میں پھر وہاں گیا اور اپنا نیزہ اٹھالایا۔

کان، ناک اور کلیجے کا حال: صاحب امتناع نے مزید لکھا ہے کہ وحشی نے آپ کو شہید کرنے کے بعد آپ کا پیٹ چاک کیا، آپ کا کلیجہ نکالا اور ہند کے پاس لے آیا اور کہا: یہ حمزہ کا کلیجہ ہے۔ اس نے اسے چبایا اور نگلنا چاہا لیکن تھوک دیا شاید نگل نہ سکی، ہند نے اپنے کپڑے اور زیورات تار کر وحشی کو بطور انعام دیے اور وعدہ کیا کہ مکہ جا کر وہ اسے مزید دس دینار بطور انعام دے گی، پھر اسے کہا: چلو میرے ساتھ اور مجھے حمزہ کی لاش دکھاؤ، وہاں پہنچ کر اس سنگ دل عورت نے آپ کے اور دیگر شہدائے کان ناک کاٹے پھر انہیں پرویا، ان کے کڑے بازو بند اور پازیب بنائے اور مکہ میں جب داخل ہوئی تو یہ زیور پہن کر داخل ہوئی۔ (تاریخ الخلفاء، ج: ۱، ص: ۴۲۶)

وحشی کہتا ہے: مجھے اس سے زیادہ جنگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، میں نے اپنی آزادی کا راستہ ہموار کر لیا تھا، واپس آ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا اور لوگوں کی جنگ کا تماشا دیکھنے لگا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو میں اپنے مالک کے ہمراہ مکہ واپس آیا، اس نے حسب وعدہ مجھے آزاد کر دیا۔

بارگاہ رسالت میں وحشی کی حاضری: اس کے بعد میں مکہ میں ہی رہائش پذیر رہا۔ جب مکہ فتح ہوا تو میں بھاگ کر طائف آ گیا لیکن جب اہل طائف کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے جانے لگا تو مجھ پر دنیا تار یک ہو گئی اور میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا، پھر مجھے خیال آیا کہ میں کیوں یمن یا شام نہ چلا جاؤں اور زندگی کے بقیہ ایام آرام سے گزاروں؟ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ایک شخص نے مجھے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کو ہرگز قتل نہیں کرتے جو دین اسلام کو قبول کر لے۔ (سبل الہدی، ج: ۴، ص: ۳۱۹)

اس کی یہ بات سن کر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مدینہ طیبہ جا کر اپنے آپ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دوں چنانچہ میں طائف سے روانہ ہو کر مدینہ منورہ پہنچا، لوگوں نے جب مجھے دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں میری آمد کی اطلاع دی۔ اس داعی حق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بہادر اور از حد عزیز چچا کے

قاتل کو اپنے قابو میں پانے کے بعد فرط غضب سے اس کے پر نچے اڑانے کا حکم نہیں دیا بلکہ حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے وہی بات نکلی جو ہادی برحق کی شان رفیع کے شایاں تھی۔ فرمایا: ”دعوہ“ اسے رہنے دو، اسے کچھ نہ کہو، ایک آدمی کا مشرف باسلام ہونا مجھے اس بات سے بہت عزیز ہے کہ میں ایک ہزار کفار کو تیغ کر دوں۔

میرے سامنے نہ آنا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب مجھے اپنے بالکل قریب کھڑے ہوئے کلمہ شہادت پڑھتے دیکھا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بڑی حیرت ہوئی، پوچھا: کیا تم وحشی ہو؟ میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! فرمایا: بیٹھ جاؤ اور مجھے سناؤ کہ تم نے حمزہ کو کیسے قتل کیا؟ میں نے بالتفصیل سارا واقعہ سنایا، سن کر فرمایا: تیری خیر ہو، اپنے چہرے کو مجھ سے چھپائے رکھنا مجھے نظر نہ آنا۔

وحشی نے مسلمان کذاب کو قتل کیا: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد ہمایوں میں جب انکار ختم نبوت کے فتنہ کی آگ سارے جزیرہ عرب میں بھڑک اٹھی تو جو لشکر اسلام خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے عجب بھیجا گیا اس میں یہ وحشی بھی تھے، یہ خود اس واقعے کا ذکر کرتے ہیں کہ اس جھوٹے نبی کی بیخ کنی کے لیے جو لشکر خلیفۃ الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھیجا اس میں شریک تھا اور میرے ہاتھ میں وہی حربہ (چھوٹا نیزہ) تھا جس سے میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شیر کو شہید کیا تھا۔ جنگ میں گھمسان کارن پڑا، میں نے دیکھا کہ مسلمہ ہاتھ میں تلوار لیے اپنی فوجوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ اسے اپنے حربے کا نشانہ بناؤں گا۔ میں اس پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کرنے لگا، میں اس نیزہ کو ہاتھوں میں لے کر تول رہا تھا اور اس کی شست باندھ رہا تھا کہ میں نے ایک انصاری کو دیکھا وہ بھی اس پر تار لگائے ہوئے ہے اور اسے اپنی تلوار کی ضربت قاہرہ کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ جب میں مطمئن ہو گیا تو میں نے اپنا حربہ کھینچ مارا، اس لمحہ میرے بھائی انصاری نے بھی اپنی تلوار کا وار اس پر کیا، وہ اب خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کس کے وار نے اسے جہنم رسید کیا۔ وحشی کہا کرتے تھے کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد

سب سے بہتر آدمی (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ) کو شہید کیا تو میں نے سب سے شریر آدمی (مسلمہ کذاب) کو قتل کرنے کا بھی شرف حاصل کیا ہے۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۳، ص: ۴۸۹ تا ۴۹۲)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے میدان احد میں شہید ہونے سے پہلے اپنی شمشیر خارا شکاف سے اکتیس کفار کو واصل جہنم کیا تھا۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۸)

فائدہ: علامہ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان ”تم مجھے نظر نہ آنا“ اس کے بعد طیالیسی کی روایت میں اتنا اور زائد ہے کہ وحشی اس کے بعد اپنے آپ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بچانے لگے کہ کہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ ابن عساکر کی روایت میں اتنا اور زائد ہے کہ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے وصال تک مجھے نہیں دیکھا (ان دونوں روایتوں کا حاصل یہ ہوا کہ پھر وحشی تمام عمر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے نہ جاسکے) اور طبرانی کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وحشی سے فرمایا: جاؤ! جہاد کرو، جیسے تم پہلے اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ (فتح الباری، کتاب المغازی، باب قتل حمزہ)

وحشی کو سامنے آنے سے کیوں منع کیا: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وحشی کو اپنے سامنے آنے سے کیوں منع کر دیا، اس کا جواب میں کسی قابل ذکر ماخذ میں تلاش نہیں کر سکا البتہ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ حضرت وحشی پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت تھی کیونکہ اگر وحشی سامنے آتے اور تقاضہ بشریت کی بنا پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے چچا کی یاد بے تاب کرتی اور پھر حضرت وحشی سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایذا ہوتی تو یہ ایذا وحشی کے حق میں خطرناک ثابت ہوتی کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خوشی سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور ان کی ایذا سے پروردگار غضب فرماتا ہے۔

نہیں وہ میٹھی نگاہ والا خدا کی رحمت ہے جلوہ فرما

غضب سے ان کے خدا بچائے جلال باری عتاب میں ہے

پھر میرے خیال کی تائید شرح بخاری کی اس عبارت سے ہوئی ”فیہ ما کان علیہ

من الرفق وان المراءى يكره ان يرى قاتل وليه“ اس فرمان کی حکمت حضور کی وحشی پر رحمت ہے کیوں کہ انسان اپنے سرپرست کے قاتل کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

(الفجر الساطع علی الصبح الجامع کتاب المغازی، ج: ۴، ص: ۶۳)

ہند کے اشعار: ہند بنت عتبہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو کیا وہ آپ پڑھ آئے ہیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل سے اس کو بے حد خوشی حاصل ہوئی تھی جس کو اس نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔

نحن جزيناكم بيوم بدر والحرب بعد الحرب ذات سعر
ماكان عن عتبة لي من صبر ولا اخي و عمه و بكري
شفيت نفسي وقضيت نذري ازاح وحشي غليل صدرى
اے مسلمانو! ہم نے تم سے جنگ بدر کا بدلہ لے لیا ہے۔ ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ تو بھڑکتی ہی ہے۔

میرے باپ، بھائی اور چچا وغیرہ کے قتل ہو جانے کے بعد میرے نفس میں یارائے ضبط نہ رہا تھا۔

لیکن (حمزہ کے قتل سے) میں نے اپنے نفس کو شفا بخش دی ہے اور میں نے اپنی نذر پوری کر لی ہے، وحشی نے میرے سینے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۲۷) یاد رہے کہ ہند بعد میں فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گئی تھیں۔

اسلام ما قبل کے تمام جرائم معاف کروا دیتا ہے لہذا اب حضرت ہند کو مطعون کرنا جائز نہیں اب وہ ایک صحابیہ ہیں ان کی وہی عزت کی جائے گی جو حضور کے تمام اصحاب کی کرنی چاہیے۔

نعرش کی تلاش: پیر کرم شاہ ازہری لکھتے ہیں: سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بار بار پوچھتے: میرے چچا نے کیا کیا؟ یعنی ان کی کوئی خبر بتاؤ۔ حارث بن الصممہ ان کی تلاش میں نکلے دیر تک ڈھونڈتے رہے کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تلاش کے لیے تشریف لے گئے، تلاش بسیار کے بعد وادی کے وسط میں آپ کا جسد اطہر خون میں نہایا ہوا دیکھا۔ واپس آ کر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اطلاع دی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے، سرفروشی اور جانبازی کی اقلیم کا سلطان جس تخت خاک پر جلوہ فرما تھا وہاں پہنچے تو عاشق صادق کی قابل رشک حالت دیکھ کر حضور دم بخود کھڑے ہو گئے، پیٹ چاک ہے، وہ دل جو اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گاہ تھا کاٹ کر نکال لیا گیا ہے اور اسے پرزہ پرزہ کر دیا گیا ہے، روئے تاباں کی ساری آرائشیں ناک، آنکھیں اور کان سب توڑ پھوڑ دی گئی ہیں، اتنا غم انگیز منظر حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چشمان مبارک سے آنسوؤں کے گوہر ہائے تابدار ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

جب لشکر اسلام میں بھگدڑ مچی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پوچھا: حمزہ کہاں ہیں؟ ایک شخص نے عرض کی: اس وقت میں نے انہیں ان چٹانوں کے پاس دیکھا وہ کہہ رہے تھے ”میں اللہ تعالیٰ کا شیر ہوں اس کے رسول کا شیر ہوں۔ اے اللہ! میں ان کفار کی کارستانیوں سے برأت کا اظہار کرتا ہوں اور ان مسلمانوں نے جو راہ فرار اختیار کی ہے اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان چٹانوں کے پاس پہنچے وہاں آپ کی مثلہ شدہ لاش دیکھ کر آنکھیں اشک بار ہو گئیں، یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی پھر آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، آپ جس طرح کہ میں جانتا تھا بھلائیاں کرنے والے تھے، صلہ رحمی کرنے والے تھے اور اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ آپ کی بہن یا ہمارے خاندان کی عورتیں غمزدہ ہوں گی تو میں ان کی لاش کو یوں ہی چھوڑ دیتا تا کہ قیامت کے دن ان کا حشر درندوں کے شکموں اور پرندوں کے پوٹوں سے ہوتا“ پھر فرمایا: مبارکباد، ابھی جبرئیل آئے ہیں انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ساتوں آسمانوں میں یہ شہید راہ حق کے نام سے مشہور ہے ”یعنی حمزہ بن عبدالمطلب اللہ تعالیٰ کا شیر ہے اور اس کے رسول کا شیر ہے۔“

پھر فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مشرکین پر غلبہ دیا تو میں ان میں سے ستر مقتولوں کا اس سے بھی بدتر مسئلہ کروں گا۔ فوراً جبریل امین بارگاہ رب العزت سے یہ پیغام لے کر نازل ہوئے: **وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبْتُمْ أَجْمَلُ مَا عَوْقَبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ** ○ ”اور اگر تم انہیں سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے اور اگر تم ان کی ستم رانیوں پر صبر کرو تو یہ صبر ہی بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے“۔ (سورۃ النحل، آیت: ۱۲۶) چنانچہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صبر کو اختیار فرمایا اور کسی لاش کو مسئلہ کرنے سے اپنے سارے امتیوں کو روک دیا۔

حضرت صفیہ خواہر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہما: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کی سگی بہن تھیں جب انہیں آپ کی شہادت کی خبر ملی تو بھائی کی غش دیکھنے کے لیے میدان جنگ میں پہنچیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں دور سے آتے دیکھا تو پہچان لیا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت زبیر بن عوام کو حکم دیا کہ اٹھو اور اپنی ماں کو آگے آنے سے منع کر دو، ایسا نہ ہو کہ اپنے بھائی کی پھٹی کٹی غش دیکھ کر وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھیں۔ حضرت زبیر اس تعمیل ارشاد کے لیے دوڑتے ہوئے گئے، وہاں پہنچنے سے پہلے اپنی والدہ کو جالیا اور انہیں آگے جانے سے روکنا چاہا تو ماں نے بیٹے کے سینے پر گھونسنے مارا اور گرج کر کہا: ہٹ جاؤ! میرے سامنے سے۔ انہوں نے ادب سے گزارش کی: امی جان! حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ واپس چلی جائیں وہ بولیں مجھے علم ہے کہ میرے بھائی کا مسئلہ کیا گیا ہے لیکن یہ سب کچھ راہ خدا میں ہوا ہے ”میں اس مصیبت پر صبر کروں گی اور اس کے ثواب کی امید رکھوں گی، ان شاء اللہ“۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا جواب پیش کیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں کچھ نہ کہو انہیں جانے دو۔ صبر و استقامت کی پیکر یہ خاتون آئیں ان کی پارہ پارہ شدہ غش کو دیکھا، **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** ”پڑھا اور ان کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا یہ

بے مثل صبر دیکھ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے دماغ پر اثر نہ پڑ جائے اس لیے اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھا چنانچہ آنسو ٹپکنے لگے اور غم کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

کفن کے لیے ایک چادر: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کفن کے لیے دو چادریں لے آئی تھیں۔ ایک میں آپ کو کفن دیا گیا اور دوسری میں ایک انصاری شہید کو کفنایا گیا، جن کی لاش مبارک کے ساتھ کفار نے اسی بے دردی کا برتاؤ کیا تھا جیسے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان کی لاش آپ کے قریب پڑی تھی۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ گوارا نہ ہوا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دو چادروں میں کفن دیا جائے اور ایک دوسرا شہید راہ حق بے گور و کفن رہے۔

جس چادر میں آپ کو کفن دیا گیا وہ چھوٹی تھی، سر پر ڈال دی جاتی تو پاؤں ننگے ہو جاتے اگر پاؤں پر ڈالی جاتی تو سر ننگا ہو جاتا چنانچہ سر ڈھانپ دیا گیا اور مبارک قدموں پر ذخیر گھاس ڈال دی گئی۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۳، ص: ۵۳۲ تا ۵۳۵، سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۴، ص: ۳۳۰)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسرے انصاری صحابی جنہیں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی عطا کردہ چادر میں کفن دیا گیا تھا ان کا نام سہیل تھا۔ (ایضاً)

یہ ہیں اسلام کے وہ سپوت جنہوں نے چین اسلام کو اپنے خون سے سینچا ہے، گردنیں کٹا کر اسلام کو نہ صرف بچایا ہے بلکہ اسے بام عروج تک پہنچایا ہے۔ یہ کام انہوں نے ایسے مخالف حالات میں کر دکھایا جب دنیا ان کی دشمن، حالات ناسازگار اور غربت و افلاس کا یہ عالم کہ اسلام کے ان جانبازوں کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لیے الوداع کہنے والے ان کے عزیز واقارب بلکہ قوم مسلم پورا کفن بھی نہ دے سکی اور اس بے سروسامانی کی حالت میں انہیں جنت کا دولہا بنا کر سپرد خاک کر دیا گیا۔

ابر رحمت ان کی مرقد پر گہر باری کرے

حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

غم رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: جنگ کے اختتام پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس حال میں دیکھا جو آپ نے پڑھا تو آپ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شارح بخاری حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں ”حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان سے بے پناہ محبت تھی۔ فرماتے تھے: ”میرے چچاؤں میں سب سے بہتر حمزہ ہیں“ اختتام جنگ پر جب ان کی نعش کو دیکھا تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتنا روئے کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ بے ہوش ہو گئے۔ دردناک الفاظ میں یہ کلمات ادا فرمائے۔ **يَا حَمْزَةُ عَمَّ رَسُولِ اللَّهِ يَا أَسَدَ اللَّهِ وَأَسَدَ رَسُولِهِ يَا حَمْزَةُ يَا فَاعِلَ الْخَيْرَاتِ يَا حَمْزَةُ يَا كَاشِفَ الْكُرْبَاتِ يَا حَمْزَةُ يَا ذَا أَبٍ عَنْ وَجْهِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ**۔

”اے اللہ کے رسول کے چچا حمزہ! اے اللہ اور اس کے رسول کے شیر! اے اچھے کام کرنے والے حمزہ! اے پریشانیاں دور کرنے والے حمزہ! اے وہ ذات جو حضور کے چہرے کی مدافعت کرنے والی ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کو دیکھا تو فرمایا: بخدا! اگر یہ لوگ مجھے مل گئے تو ان میں سے ستر کا یہی حال کروں گا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: **وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ**۔ ترجمہ: اگر تم بدلہ لو تو اسی کے مثل لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

(سورہ نحل، آیت: ۱۲۶)

اس پر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں صبر کروں گا اور قسم کا کفارہ ادا فرما دیا، اور شہدا پر ان کی نماز جنازہ میں چار تکبیریں پڑھیں اور ان (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ) کے جنازے پر سات تکبیریں۔ (نزہۃ القاری، ج: ۷، ص: ۳۰۰ تا ۳۰۱، السیرۃ الحلبيۃ، ج: ۲، ص: ۵۳۲۔ ذخائر العقبی، ص: ۳۰۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کو اتنا گریہ کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا جتنا سخت گریہ آپ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کیا تھا۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۰۷)

ایک روایت میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مثلہ شدہ جسم کو دیکھ کر اتنا روئے کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی اور فرمایا: اگر مجھے صفیہ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن) کا خیال نہ ہوتا اور یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ میرے بعد رسم بن جائے گی تو میں حمزہ کو یوں ہی پڑا چھوڑ دیتا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حمزہ کا حشر درندوں پرندوں کے پیٹ سے فرماتا۔ (السیرۃ النبویہ، عرض وقائع وتحلیل احداث، ج: ۳، ص: ۱۷۸)

ابن ہشام نے روایت کیا ہے جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے جنازے کے پاس کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا: مجھے اس سے بڑی مصیبت کبھی نہیں پہنچی اور اس سے زیادہ کرب ناک منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۰۵)

شہادت اساس عدالت: اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو مقام شہادت سے سرفراز فرمایا اور ایک عظیم سعادت سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہمکنار ہوئے، کیونکہ

شہادت آخری منزل ہے انسانی سعادت کی

وہ خوش قسمت ہے مل جائے جسے منزل شہادت کی

اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کی شہادت کو اساس عدالت بھی بنا دیا، آپ کی شہادت کئی اعتبار سے وجہ عبرت ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اساس عدالت کیسے ہے؟ اس کا جواب آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ اگر یہ لوگ مجھے مل گئے تو میں حمزہ کے بدلے ستر کا یہی حال کر دوں گا۔ اس پر اصحاب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پکار لگائی تھی: ہمیں آنے والے زمانے میں جب بھی موقع ملے گا تو ہم مشرکین کا ایسا مثلہ بنائیں گے کہ ایسا مثلہ کسی عربی نے کبھی کسی کا نہیں بنایا ہوگا۔ تب مذکورہ آیت نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور قسم کا کفارہ ادا

فرمایا لہذا آپ کی شہادت ہمیشہ ہمیش کے لیے عدل و انصاف کی اساس بھی ہے اور عفو و درگزر کی عمدہ مثال بھی۔ یہاں تک کہ قصاص عقوبات میں بھی آپ کی شہادت درس عبرت ہے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۲۸)

حضرت حمزہ غسيل الملائكة: روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے ملائکہ کو دیکھا کہ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غسل دے رہے تھے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۹)

تکفین و نماز جنازہ: جس کس میرسی کی حالت میں حضرت سید الشہید اکو کفن دیا گیا وہ آپ پڑھ آئے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے سب سے محبوب اور شفیق چچا کو سب سے بہتر و داعی تحفہ پیش کرنے کی تیاری کر رہے تھے اور وہ تحفہ تھا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ، تمام شہدائے احد کی نماز جنازہ پڑھی جانا تھی، سب سے پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کی نماز جنازہ میں سات تکبیریں کہیں، بعض میں نو تکبیروں کا ذکر ہے اور بعض میں ستر کا۔ (یہ آپ کی خصوصیت رہی)۔ پھر ایک ایک شہید کو لایا جاتا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں رکھ کر اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی، اس شہید کو ہٹا لیا جاتا اور دوسرے شہید کو لایا جاتا لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نہیں ہٹایا جاتا۔ اس طرح ستر مرتبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ (یہ بھی آپ کی خصوصیت رہی)۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰، مغازی الواقدي، ج: ۱، ص: ۳۰۸)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بھانجے حضرت عبد اللہ بن جحش کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ (غزوہ احد میں دو دو تین تین شہیدوں کو ایک قبر میں دفن کیا گیا تھا جس کو زیادہ قرآن یاد تھا اس کو قبر میں مقدم رکھا گیا) حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین

نے قبر میں اتر کر انہیں سپرد خاک کیا اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر انور کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر انہیں اعزاز رحمت بخشا۔ (مغازی للواقدی، ج: ۱، ص: ۳۱۱)

عمر و تاریخ شہادت: علامہ ابن اثیر نے تاریخ شہادت کے بارے میں فرمایا: ”وكان مقتل حمزة للنصف من شوال من سنة ثلاث“ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ۳ھ نصف شوال میں ہوئی اور جنہوں نے یہ کہا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی عمر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ظاہری عمر سے دو سال زیادہ تھی ان کے نزدیک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت ۵۷ سال تھی اور جو حضرات چار سال بڑا بتاتے ہیں ان کے نزدیک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی عمر ۵۹ سال تھی۔ ایک قول کے مطابق آپ کی عمر ۵۴ سال تھی۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۷۰)

جنگ احد کی تاریخ: صحیح بات یہ ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ شہادت میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف جنگ احد کی تاریخ کے اختلاف پر متفرع ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ جنگ احد بروز ہفتہ سات شوال المکرم ۳ھ میں واقع ہوئی، دیگر بعض کا خیال ہے کہ یہ جنگ گیارہ شوال کو لڑی گئی، بعض حضرات نے نصف شوال (۱۵) کا قول کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (امتاع الاسماع، ج: ۱، ص: ۱۱۳)

بہر حال اتنا طے ہے کہ جو تاریخ جنگ احد کی ہے وہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تاریخ شہادت ہے۔

دیدار جبرئیل: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انک لا تستطیع ان تراہ“ آپ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے مزید خواہش ظاہر کی، اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی جگہ بیٹھ جاؤ! اب حضرت جبرئیل کعبہ مقدس میں موجود اس لکڑی پر نازل ہوئے جس پر کفار بوقت طواف اپنے کپڑے ڈالا کرتے تھے، جب حضرت جبرئیل علیہ

السلام نازل ہو چکے تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: چچا! نظر اٹھا کر حضرت جبرئیل کا دیدار کیجئے، جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے نظر اٹھائی تو حضرت جبرئیل کے دونوں قدموں کو دیکھا وہ سبز رنگ کے زبرجد (ایک قیمتی پتھر) کی طرح تھے، دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱)

کوئی رونے والی نہیں: جنگ احد کے بعد اپنے شفیق چچا اور دیگر شہداءے احد کو زمین کو سونپنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گھر تشریف لائے، راستے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنی عبد شہل کی کچھ عورتوں کی آواز سنی، جو اپنے شہداء کے غم میں رو رہی تھیں، رونے والیوں کی آواز سن کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرط غم و محبت سے فرمایا: حمزہ پر کوئی رونے والی تک نہیں! یہ جملہ انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذ نے سن لیا۔ آپ نے سمجھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خواہش ہے کہ ان کے چچا کے غم میں رونے والیاں روئیں۔ آپ فوراً ہی بنی عبد شہل کی عورتوں کے پاس پہنچے اور انہیں حکم دیا کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا کے غم میں روئیں، حکم پا کر عورتیں دردِ دولت پر حاضر ہو کر رونے لگیں جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باہر آ کر ان عورتوں کا رونا سنا تو فرمایا: میرے فرمان کا یہ مقصد نہیں تھا۔ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ واپس اپنے گھروں کو چلی جائیں اور آج کے بعد کوئی رونا دھونا نہ ہوگا۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۲۹، طبقات ابن سعد، ص: ۱۲۳)

امام واقدی نے فرمایا: اس دن کے بعد جب بھی انصاری عورتیں کسی پر روتیں تو اس کی شروعات حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے کرتیں۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۹)

عادات و اطوار: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی عمدہ عادات اور نفیس خوبیوں کا اس سے بڑا تعارف اور کیا ہو سکتا ہے جو خود پیغمبر اسلام نے ان کی شہادت کے بعد ان کی نعلین کے پاس آ کر کرایا تھا۔ ان الفاظ کو سن کر زمانے کا غم آج بھی تازہ ہو جاتا ہے اور اس کی نبض ڈوبنے لگتی ہے۔

آپ کے الفاظ تھے 'يَا حَمْزَةُ فَاعِلِ الْخَيْرَاتِ يَا حَمْزَةُ يَا كَاشِفَ الْكُرْبَاتِ يَا

حَمْزَةُ يَا ذَا ابْنِ عَنْ وَجْهِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -

ترجمہ: اے حمزہ! اے نبی کیاں کرنے والے، اے حمزہ! اے پریشانیوں دور کرنے والے، اے حمزہ! اے میری ذات کی ڈھال۔
دوسری روایت کے الفاظ ہیں ”وَصُولًا لِلرَّحْمِ فَعُولًا لِلْخَيْرَاتِ“ چچا! آپ رشتہ داری جوڑنے والے اور اچھائیاں کرنے والے تھے۔

(السيرة الحلبية، ج: ۲، ص: ۵۳۴، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۸)

قرآن میں حمزہ: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شان بڑی بلند و بالا ہے ان کے حق میں قرآن پاک کی کئی آیات کا نزول ہوا۔

(۱) أَفْتَنَ وَعَدْنَهُ وَعَدًّا حَسَنًا فَهُوَ لَا يَأْتِيهِ كَمَنْ مَتَّعْنَاهُ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿۶۱﴾

کیا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا، جس کو وہ حاصل کرنے والا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے، جس کو ہم نے دنیوی زندگی کی چیزیں دیں پھر وہ قیامت کے دن (مجرموں کے ساتھ) حاضر کیا جائے گا۔ (سورہ قصص، آیت: ۶۱)

اس آیت کریمہ میں جس سے اچھا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ اسے حاصل کرے گا اس شخص سے مراد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ذات ہے۔ (روح المعانی، تفسیر طبری، تفسیر سراج المیر، بحر محیط، ابن کثیرہ درمنثور، تبیان القرآن)

(۲) يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۶۲﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۶۳﴾

اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ جا تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی ہے۔ (سورہ فجر، آیت: ۲۷/۲۸)

اس آیت کریمہ میں کثیر مفسرین نے نفس مطمئنہ سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ذات کو بھی مراد لیا ہے۔ (درمنثور، التکت والعیون، الوسیط، تفسیر ابن ابی حاتم، ابن کثیر، خازن، قرطبی، زاد المسیر، غرائب القرآن، تبیان القرآن)

(۳) مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَّنْ

قَطَعَىٰ نَجَبَهُ (سورہ احزاب، آیت: ۲۳)

مؤمنین میں کچھ ایسے حضرات ہیں جنہوں نے اس عہد کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا تو ان میں سے بعض نے (شہید ہو کر) اپنی نذریں پوری کر دیں۔ وہ ذاتیں جنہوں نے شہید ہو کر اپنی نذریں پوری کر دیں ان میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ (الکشف والبيان، الباب فی علوم القرآن، تفسیر بغوی، تفسیر بیضاوی، کشاف، تفسیر مقاتل بن سلیمان، تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس)

احادیث میں حمزہ: ایمان لانے کے بعد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ شرف کیا کم تھا کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا اور رضاعی بھائی تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم کی مزید بارشیں ان پر برسیں اور ان کی ذات مجمع محاسن و کمالات بن گئی، اللہ تعالیٰ کے محبوب نے ان کے جو مناقب احادیث پاک میں ذکر فرمائے ان میں سے کچھ ملاحظہ ہوں۔

(۱) اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن حضرت حمزہ سید الشہداء ہوں گے۔ (المستدرک علی الصحیحین، کتاب الجہاد حدیث نمبر: ۲۵۵۷، المعجم الکبیر، حدیث نمبر: ۲۹۵۸، شرح ابی داؤد اللعینی، کتاب الجنائز باب شہید یغسل، شرح مسند ابی حنیفہ ج: ۱، ص: ۱۸۷، عمدۃ القاری، کتاب الجنائز باب الکفن من جمیع المال، فتح الباری، کتاب المغازی باب قتل حمزہ، مرقات المفاتیح کتاب الجنائز باب غسل المیت)

(۲) معجم صغیر طبرانی کی روایت میں ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے فاطمہ! تمہارے والد خیر الانبیاء ہیں اور ہمارا شہید خیر الشہداء ہے اور وہ تمہارے والد کے چچا حضرت حمزہ ہیں“۔ (حدیث نمبر: ۹۴)

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میں گزری ہوئی رات جنت میں داخل ہوا تو وہاں حمزہ اپنے اصحاب کے ساتھ موجود تھے۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۲۹۹)

(۴) حضرت عبدالرحمن بن عابس نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میرے چچاؤں میں سب سے بہتر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ (ایضاً)

(۵) اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اس ذات کی قسم! جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، ساتویں آسمان پر لکھا ہوا ہے کہ حمزہ بن عبدالمطلب اللہ اور اس کے رسول کے شیر ہیں۔ دوسری روایت میں ہے سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جبریل علیہ السلام نے مجھے آکر خبر دی کہ ساتویں آسمان والوں میں لکھا ہوا ہے (مشہور ہے) کہ حمزہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شیر ہیں۔“ (بخاری العقبیٰ ص: ۲۹۸)

مسلمانوں کا غم: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کوئی معمولی سانحہ نہ تھی بلکہ یہ شہادت مسلمانوں پر بڑی شاق تھی کیونکہ آپ کی شہادت سے مسلمانوں کو دہرا غم لاحق ہوا تھا۔ ایک غم تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے مرد میدان کا شہید ہو جانا تھا اور اس سے بڑا غم یہ تھا کہ ان کی وجہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بہت مغموم ہو گئے تھے۔ آپ کے غم کا تذکرہ کئی صحابہ نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ دربار رسالت کے مشہور نعت گو شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک طویل قصیدہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جدائی پر آنے والی بحر میں لکھا:

دَعُ عَنَّا دَارًا قَدْ عَفَا رَسْمُهَا

وَابَاكَ عَلَى حَمَزَةٍ ذِي النَّائِلِ

فانی دنیا کا غم چھوڑ دو اور سخی حمزہ کے غم میں روؤ۔

أَظْلَمَتِ الْأَرْضُ لِفَقْدِ إِيَّاهِ

وَأَسْوَدَ نُورُ الْقَبْرِ النَّاصِلِ

جس کے جانے سے دنیا تاریک ہو گئی، چڑھتے چاند کی روشنی گل ہو گئی۔

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ فِي جَنَّةٍ

عَالِيَةٍ مُكْرَمَةٍ الدَّاحِلِ

اللہ تعالیٰ انہیں مکرم معظم جنت میں داخل فرما کر رحمت نازل فرمائے۔

كُنَّا نَرَى حَمَزَةَ حَزْزًا لَنَا

مِنْ كُلِّ أَمْرٍ نَبَا نَازِلٍ

ہم ہر اس معاملے میں جو ہم پر نازل ہوتا ہے حمزہ کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے آنے والی بحر میں اپنے غم کا اظہار فرمایا اور

ایک قصیدہ لکھا:

بَكَتْ عَيْنِي وَحَقَّ لَهَا بُكَاهَا

وَمَا يُغْنِي الْبُكَاءُ وَلَا الْعَوِيلُ

عَلَى أَسَدٍ إِلَّا لَهُ غَدَاةٌ قَالُوا

لِحَمَزَةٍ ذَالِكُمْ الرَّجُلُ الْقَتِيلُ

أُصِيبَ الْمُسْلِمُونَ بِهِ جَمِيعًا

هُنَاكَ وَقَدْ أُصِيبَ بِهِ الرَّسُولُ

میری آنکھیں حضرت حمزہ پر رو رہی ہیں اور انہیں رونے کا حق ہے اور اس رونے

سے کچھ ہونے والا نہیں۔

وہی جنہیں اسد اللہ کہا جاتا تھا آج شہید ہو چکے ہیں۔

ان کے جانے سے تمام مسلمان مصیبت زدہ ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے حضور صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچی ہے۔

بعض حضرات کے خیال میں یہ اشعار حضرت عبداللہ بن رواحہ کے ہیں جیسا کہ

رجال حول الرسول کے مصنف کا خود یہی نظریہ ہے۔

(اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۶۹، رجال حول الرسول، ص: ۱۲۹)

ازواج و اولاد: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے متعدد شادیاں فرمائیں اور ان

بیویوں سے اولادیں بھی ہوئیں، آپ کی بیویوں کے نام اس طور پر ہیں۔ (۱) بنت الملتہ (۲) خولہ بنت قیس (۳) سلمیٰ بنت عمیس۔ اولاد کے نام اس طرح ہیں، (۱) یعلیٰ (۲) عامر، ان کی والدہ بنت الملتہ ہیں۔ (۳) عمارہ، ان کی والدہ خولہ بنت قیس ہیں۔ (۴) ایک بیٹی جس کا نام امامہ تھا ان کی والدہ سلمیٰ بنت عمیس تھیں۔ (اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ آپ کے یہاں تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔) (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۷۰)

امامہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وہی بیٹی ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے بعد مدینۃ المنورہ واپس آ رہے تھے، جس کا تذکرہ بخاری شریف کی اس حدیث پاک میں ہے:

جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس جگہ سے باہر نکلے جہاں ٹھہرے ہوئے تھے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی آپ کے پیچھے آئیں وہ پکار رہی تھیں، اے چچا! اے چچا! تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اٹھا لیا اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: آپ اپنے چچا کی بیٹی کو لے لیں تو حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو لے لیا پھر (مدینہ پہنچ کر) ان کی پرورش میں حضرت علی، حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم کا نزاع ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کو رکھوں گا، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے عقد میں ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے (حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا رشتہٴ مواخات قائم فرمایا تھا) تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کا فیصلہ ان کی خالہ کے حق میں کر دیا اور فرمایا: خالہ ماں کے درجے میں ہوتی ہے۔

(صحیح البخاری کتاب المغازی باب عمرة القضاء)

علامہ بدرالدین محمود عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں؛ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اس بیٹی کے نام میں پانچ اقوال ہیں۔ (۱) عمارہ (۲) فاطمہ (۳) امامہ (۴) امۃ اللہ

(۵) سلمیٰ۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو چچا کہہ کر پکارا حالانکہ آپ ان کے چچا زاد بھائی تھے، یہ آپ کی تعظیم کے لیے تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی بھی تھے، اس رشتہ سے آپ ان کے رضاعی چچا ہوئے۔ (اسی رشتہ کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے چچا کی بیٹی کہا)۔ (عمدة القاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء، نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۴۲)

بخاری شریف کی مذکورہ حدیث میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح نہیں کریں گے؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواب دیا: وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے (اس سے نکاح کرنا جائز نہیں)۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ وہ قریش میں سب سے خوب صورت لڑکی ہے، اس پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے علی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ میرے رضاعی بھائی کی لڑکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام فرمادیے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔ اس کو امام بغوی نے اپنی مجمع میں روایت کیا ہے۔

(ذخائر العقبی، ص: ۳۱۲)

قبر کے اندر تر و تازہ: قرآن پاک شہدا کے بارے میں فرماتا ہے: ”وہ زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کو سمجھ نہیں سکتے“۔ تاریخ بارہا اس حقانیت کی تصدیق کر چکی ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش نے بھی اس حقیقت کی تائید فرمائی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہل مدینہ کے لیے ایک نہر کا پلان بنایا جو شہدائے احد کی قبروں کے پاس سے ہو کر گزری۔ کھدائی میں شہدائے احد کی لاشیں برآمد ہوئیں، سب تر و تازہ تھیں، ایک پھاوڑا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں پر پڑا تو پاؤں

سے تازہ خون ابل پڑا۔ (الاصابة، ج: ۲، ص: ۳۸، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۷۱)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مولائے کائنات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد میں پوری سلطنت اسلامیہ کے امیر بنے۔ اس سے پہلے مکہ المکرمہ اور مدینہ المنورہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدود خلافت میں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وصال ۴۰ھ میں ہوا اور جنگ اُحد ۳ھ میں ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ تقریباً چالیس سال کے بعد نمودار ہوا۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۱۳)

چالیس سال کے بعد بھی تازگی کا یہ عالم تو پھر ان کی حیات میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے؟
بل احیاء آیت پہ ہے میرا ایسا
منافق نے اب تک یہ مانی نہیں ہے

شہدا، سلام کا جواب دیتے ہیں: آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! شہداے احد کو الوداعی سلام کرلو۔ اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، قیامت تک جو مسلمان بھی انہیں سلام کرے گا یہ سلام کرنے والوں کا جواب دیتے رہیں گے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۳، اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۷۷۱ دلائل النبوة للبیہقی، ج: ۳، ص: ۲۰۷، الخصائص الکبریٰ، ج: ۱، ص: ۳۶۳)

قبر کے اندر سے سلام کا جواب: حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی علیہ الرحمہ نے ”حجة اللہ علی العالمین“ سے بحوالہ بیہقی نقل فرمایا ہے:

حضرت فاطمہ خزاہیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے ”میں ایک دن سید الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار اقدس کی زیارت کے لیے گئی، میں نے قبر منور کے سامنے کھڑے ہو کر ”السلام علیک یا عم رسول اللہ“ کہا تو آپ نے باواز بلند قبر کے اندر سے میرے سلام کا جواب دیا۔ (حجة اللہ، ج: ۲، ص: ۸۶۳)

اپنے بیٹے کا نام میرے نام پر حمزہ رکھنا: علامہ اعظمی علیہ الرحمہ مزید لکھتے ہیں: اسی طرح شیخ محمود کردی شیخانی نزہت مدینہ منورہ نے آپ کی قبر انور پر حاضر ہو کر

سلام عرض کیا تو آپ نے قبر منور کے اندر سے باواز بلند ان کے سلام کا جواب دیا اور ارشاد فرمایا: اے شیخ محمود! تم اپنے لڑکے کا نام میرے نام پر حمزہ رکھنا چنانچہ جب خداوند کریم نے ان کو فرزند عطا فرمایا تو انہوں نے اس کا نام حمزہ رکھا۔

(حجۃ اللہ علی العالمین، ج: ۲، ص: ۸۶۳، بحوالہ کتاب الباقیات الصالحات)

تبصرہ: اس روایت سے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چند کرامتیں معلوم ہوئیں: (۱) یہ کہ آپ نے قبر کے اندر سے شیخ محمود کے سلام کو سن لیا اور دیکھ بھی لیا کہ سلام کرنے والے شیخ محمود ہیں پھر آپ نے سلام کا جواب شیخ محمود کو سنا بھی دیا حالانکہ دوسرے قبر والے سلام کرنے والوں کے سلام کو سن تو لیتے ہیں اور پہچان بھی لیتے ہیں مگر سلام کا جواب سلام کرنے والوں کو سنا نہیں سکتے۔

(۲) سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی قبر شریف کے اندر رہتے ہوئے یہ معلوم تھا کہ ابھی شیخ محمود کے یہاں کوئی بیٹا نہیں ہے مگر آئندہ ان کو خداوند کریم فرزند عطا فرمائے گا جبھی تو آپ نے حکم دیا کہ شیخ محمود! تم اپنے لڑکے کا نام میرے نام پر حمزہ رکھنا۔

(۳) آپ نے جواب سلام اور بیٹے کا نام رکھنے کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ اس قدر بلند آواز سے فرمایا کہ شیخ محمود اور دوسرے حاضرین نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا۔ مذکورہ بالا کرامتوں سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے کہ شہداے کرام اپنی قبروں میں پورے لوازم حیات کے ساتھ زندہ ہیں اور ان کے علم کی وسعت کا یہ حال ہے کہ وہ یہاں تک جان اور پہچان لیتے ہیں کہ آدمی کی پشت میں جو نطفہ ہے اس سے پیدا ہونے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ یہی تو وجہ ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے شیخ محمود! تم اپنے لڑکے کا نام میرے نام پر رکھنا اگر ان کو بالیقین یہ معلوم نہ ہوتا کہ لڑکا ہی پیدا ہوگا تو آپ کس طرح لڑکے کا نام اپنے نام پر رکھنے کو کہہ دیتے؟ واللہ تعالیٰ اعلم (کرامات صحابہ، ص: ۱۰۱)

قبر سے آواز آئی ہم تمہیں پہچانتے ہیں: علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے ابن ابی الدنیا اور بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عطف فرماتے ہیں: مجھے میری خالہ نے بتایا، میں نے شہدائے احد کی قبروں کی زیارت کی، میرے ساتھ صرف دو بچے تھے جو میری سواری کے پاس کھڑے تھے، میں نے شہدا کو سلام کیا تو میں نے سلام کا جواب سنا اور یہ بھی سنا کہ انہوں نے فرمایا: خدا کی قسم! ہم تمہیں ایسے پہچانتے ہیں جیسے ہم ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، کہتی ہیں: یہ سن کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا لہذا میں واپس آ گئی۔

(الخصائص الکبریٰ، ج: ۱، ص: ۳۶۴، دلائل النبوة للبیہقی، ج: ۳، ص: ۳۰۷)

حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سلام کا جواب دیا: حضرت فاطمہ خزاہیہ فرماتی ہیں: میں اپنی بہن کے ساتھ شہدائے احد کی قبروں پر حاضر ہوئی، میں نے کہا: چلو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سلام کر لیں، ہم دونوں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کے پاس پہنچے اور ہم نے کہا: ”السلام علیک یا عم رسول اللہ“ ہم نے سنا کہ ہمارے سلام کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ”علیکم السلام ورحمة اللہ“ جب کہ یہ شام کا وقت تھا اور ہمارے آس پاس کوئی شخص نہ تھا۔ (دلائل النبوة للبیہقی، ج: ۳، ص: ۳۰۹، خلاصة الوفاق، ج: ۱، ص: ۲۶۵)

حضور اور صحابہ حضرت حمزہ کی قبر پر جاتے: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر سال شہدائے احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے، وادی احد میں پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آواز بلند فرماتے: ”سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار“ (حضور کے بعد) حضرت ابوبکر کا بھی یہی طریقہ رہا پھر حضرت عمر اور حضرت عثمان بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ سیدہ زاہرہ طیبہ طاہرہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ بھی حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر انور پر ہر دو تین دن بعد جایا کرتی تھیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص خود بھی حاضر ہوتے، شہدائے احد کو سلام کرتے اور اپنے احباب کو بھی اس بات پر ابھارتے کہ وہ بھی ان کی بارگاہ میں سلام پیش کریں۔ آپ فرماتے تھے: کیا آپ لوگ ان کو سلام نہیں کرتے جو تمہارا جواب دیتے ہیں؟ حضرت ابوسعید خدری، حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور

حضرت ابو ہریرہ بھی شہدائے احد کی قبور پر حاضر ہوتے تھے۔ (دلائل النبوة للبیہقی، ج: ۳، ص: ۳۰۸)

۳۰۸، السيرة النبوية على ضوء القرآن والسنة، ج: ۲، ص: ۲۱۶، خلاصة الوفاء، ج: ۲، ص: ۴۰۶)

یہ تھی سید الشہداء، اسد اللہ، اسد رسول اللہ اور عم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت فاخرہ جو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں سے ہدایت کے اجالوں میں پناہ گزین ہونے کا مطالبہ کر رہی ہے اور صاحبان عشق و محبت کو ذات ذوالجلال کے حکم اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ناموس پر مر مٹنے کا پیہم درس دے رہی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان کے آگے وہ حمزہ کی جانبازیاں
شیر غران سطوت پہ لاکھوں سلام
جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
(اعلیٰ حضرت)



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ مالک الملک اور فعال لمایرید ہے۔ اس نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سر پر تاج رسالت سجا کر پوری کائنات کے لیے مکرم و محترم بنایا، ان کی تعظیم و تکریم ایمان کی جان ٹھہری۔ ذات پاک تو رہی ذات پاک، اس ذات پاک کا دیدار کرنے والے صحابہ قیامت تک مسلمانوں کے امام ٹھہرے، اگرچہ ان صحابہ کو صحبت کا قلیل وقت ہی میسر آیا ہو، ان کا حضور سے کوئی نسب تعلق بھی نہ ہو، پھر ان کا کیا کہنا؟ جنہوں نے صحبت طویل سے حصہ پایا، نسب میں حضور سے کمال قربت بلکہ باپ کے قائم مقام رہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں جن کی محبت کے چشمہ ایلتے ہوں، وہ اگر کسی کی شکایت کر دیں تو حضور غضب میں آجائیں۔ جنہیں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قریش میں سب سے زیادہ کشادہ دست کہہ کر پکارا۔ جنہیں خاتم ہجرت کا لقب عطا فرمایا۔ جو زمانہ جاہلیت سے لے کر زمانہ اسلام تک منتظم زم زم ہو کر ساقی زم زم کہلائے، زمانہ عمر بن خطاب میں اہل حرین نے انہیں ساقی حرین کہہ کر پکارا۔ امیر المؤمنین اور جملہ صحابہ نے بالاتفاق انہیں بارگاہ رب تعالیٰ میں وسیلہ بنایا اور رب تبارک و تعالیٰ نے ان کے وسیلے کو سند قبول عطا فرما کر حرین کو سیراب فرمایا۔ جن کی شوکت کے اظہار کے لیے حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما نے خلیفہ وقت ہوتے ہوئے اپنے گھوڑوں سے اتر کر سلام پیش کیا، وہی جو حضور کے عم محترم ہیں جن کے بارے میں حضور نے فرمایا ”وہ مجھ سے اور میں ان سے ہوں“ جن کا مبارک نام عباس بن عبدالمطلب ہے۔

نام و نسب: آپ کا نسب اس طور پر ہے: عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد

مناف بن قصى بن كلاب بن مره بن كعب بن لؤى بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن كنانہ بن خزيمہ۔ (طبقات ابن سعد ج: ۴، ص: ۵)

والدہ کا نام تنیلہ بنت جناب ہے۔

کنیت: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ان کے بیٹے فضل کے نام پر ابوالفضل مشہور ہوئی۔ (اسد الغابہ ج: ۳، ص: ۱۶۳)

پیدائش: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دو سال پہلے مکہ شریف میں پیدا ہوئے اس اعتبار سے ان کی ظاہری عمر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر سے دو سال زیادہ تھی اور بعض حضرات نے تین سال زیادہ ہونے کا قول کیا ہے۔ (ایضاً) آپ عام الفیل سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ (سیر اعلام النبلاء ج: ۲، ص: ۷۹)

بچپن میں گم ہونا: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بچپن میں گم ہو گئے تھے، ان کی والدہ نے نذرمانی کہ اگر میرا بیٹا مل جائے گا تو میں خانہ کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھاؤں گی، اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ حضرت عباس گھر آ گئے، والدہ نے اپنی نذر پوری کرتے ہوئے خانہ خدا پر ریشمی غلاف چڑھایا، مؤرخین کے بیان کے مطابق وہ پہلی ایسی عربی خاتون ہیں جنہوں نے خانہ کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھایا۔ (ایضاً)

حلیہ: آپ کا قد لمبا، چہرہ خوبصورت، رنگ اجلا اور آواز بلند تھی، حلم و بردباری، بزرگی و عقل مندی آپ کے چہرے سے عیاں تھی۔ (سیر اعلام النبلاء ج: ۲، ص: ۷۹)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پسند: آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دو یا تین سال ہی بڑے تھے۔ دو سال کا فاصلہ کوئی بڑا فاصلہ نہیں ہوتا، اتنی عمر کے فاصلے والے بچے ہم جولی اور ہم عمر ہی کہلاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اور یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اعلان نبوت سے پہلے بھی دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ تعلقات کی عمدگی میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمدہ عادتوں اور اچھے اخلاق کا

خاصا دخل تھا کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود مکارم اخلاق کے پیکر تھے اور مکارم اخلاق کو پسند بھی فرماتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رشتہ قرابت تو حاصل تھا ہی ساتھ ہی ان کی اچھی عادتوں نے بھی انہیں حضور کی نظر میں محبوب بنا دیا تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک خاص خوبی رشتہ داروں کی دل جوئی بھی تھی۔ وہ رشتہ داری نبھانے میں کوشش کرتے، رشتہ داروں کی عزت افزائی اور بذریعہ مال ان کی خیر خواہی کرنے میں قطعاً کن جوس نہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ خلاق عالم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ذہانت و فطانت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اپنے انہیں اوصاف کے باعث وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر میں محبوب تھے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۳۰۵)

حضرت حمزہ و حضرت عباس کی ذمہ داریاں: حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و جاں نثاری آپ پچھلے اوراق میں پڑھ آئے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لانے سے پہلے بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بڑے حامی اور محافظ تھے، گودونوں چچاؤں کی ذمہ داریاں اپنے فطری میلان اور ذاتی رجحان کی بنیاد پر جدا جدا تھیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تیر و تلوار سے زیادہ شغف تھا تو وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اسی اعتبار سے مدد فرماتے، یہ اسی حمیت طبعی کا نتیجہ تھا کہ ایمان لانے سے پہلے انہوں نے ابو جہل کو لہو لہان کر دیا تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سنجیدہ طبیعت اور بردبار فطرت انسان تھے، ساتھ ہی ان کو اعلیٰ درجے کی پختہ عقل سے بھی نوازا گیا تھا چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خداداد عقل و خرد کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے مدافعت کرتے لہذا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کو علانیہ طور پر شروع کیا اور کفار نے راہ مسدود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، کمزور مسلمانوں پر ہر ظلم و ستم جائز کر دیا گیا اس وقت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی ذہانت و فطانت سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے راہیں آسان کرنے کی کوششیں کیں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی جن گتھیوں کے

کھولنے میں تلوار ناکام ہوتی ہے انہیں عقل کے جادو سے کھول لیا جاتا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اس کوشش میں کچھ حد تک کامیابی بھی حاصل کی اور اسلام نے ان کی عقل سے فائدہ اٹھایا۔ (رجال حول الرسول ص: ۳۰۵)

ایمان لانے سے پہلے حضور ﷺ کا ساتھ دینا: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کب ایمان لائے؟ اس کو ہم ان شاء اللہ آئندہ سطور میں لکھیں گے لیکن اتنا طے ہے کہ وہ ایمان لانے سے پہلے بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حامی اور رازدار تھے کیونکہ وہ ایمان لانے سے پہلے ایک رازدارانہ بیعت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جسے بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اسلام میں تین بیعتیں بہت مشہور ہیں پہلی بیعت عقبہ اولیٰ، دوسری بیعت عقبہ ثانیہ اور تیسری بیعت حدیبیہ۔ بیعت حدیبیہ کو آپ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تذکرے میں تفصیل سے پڑھ آئے ہیں اب ان دونوں بیعتوں کا تعارف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے لہذا ہم مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی زبانی ان کا تعارف پیش کرتے ہیں:

بیعت عقبہ اولیٰ: حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ ہر سال ایام حج میں مختلف قبائل کے پاس جا کر ان کو اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے، ۱۰ ربیعی میں جب آپ اسی غرض سے اس عقبہ (وادی منی) کے پاس پہونچے تو یہاں انصار کے قبیلہ خزرج کے چند اشخاص موجود ملے جو مکہ معظمہ اس غرض سے آئے تھے کہ قریش سے امداد باہمی کا معاہدہ کر کے ان کے حلیف بن جائیں۔ انہیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی، ان لوگوں نے مدینے کے یہود سے نبی آخر الزماں کی آمد آمد کی خبر سن رکھی تھی، اسلام کی دعوت سن کر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا: یہ وہی نبی ہیں، کہیں یہود ایمان لانے میں تم پر سبقت نہ کر جائیں اور کہا: ہم جس کے لیے آئے ہیں اس سے یہ بہتر ہے، ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ حضرات تھے۔

ابو الہیثم بن تہان، اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک بن حارث

جنگ احد میں شہید ہوئے، قطبہ بن عامر جنگ یمامہ میں شہید ہوئے اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ مدینہ طیبہ واپس گئے اور آئندہ سال پھر آنے کا وعدہ کر گئے۔ مدینہ پہنچ کر وہاں اسلام کی تبلیغ کی، جس سے متعدد سعادت مندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حسب وعدہ دوسرے سال بارہ حضرات مدینہ سے آئے، انہیں میں حضرت عبادہ بن صامت بھی تھے اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔

بیعت عقبہ ثانیہ اور حضرت مصعب بن عمیر کی مدینہ روانگی: ان لوگوں نے درخواست کی کہ مدینہ کے نو مسلموں کو دین سکھانے اور تبلیغ کے لیے کوئی صاحب ہمارے ساتھ کر دیے جائیں۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سیدنا مصعب بن عمیر شہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا۔

تیسرے سال سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ بہتر افراد خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ سبھی نے اسی عقبہ میں بیعت کی۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان میں سے بارہ حضرات کو ان کا نقیب بنایا۔ نوقبیلہ خزرج کے اور تین اوس کے، انہیں میں ایک نقیب عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔

اسلام کی تاریخ میں ان دونوں خصوصاً بیعت عقبہ ثانیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی دوسری بیعت کے موقع پر مدینہ طیبہ ہجرت کرنا طے ہوا تھا۔ انصار کرام نے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عہد کیا۔ اور رحمت عالم نے ان میں ہمیشہ رہنے کا وعدہ فرمایا۔ بعد میں ہونے والی ساری فتوحات اور کامیابیوں کی یہ بیعت مقدمہ تھی۔ حضرت کعب بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فخر یہ فرمایا کہ میں لیلۃ العقبہ میں حاضر تھا۔ جب ہم نے اسلام پر میثاق کیا تھا، میں بدر کی شرکت سے بڑھ کر اس کو اہم سمجھتا ہوں اگرچہ لوگوں میں

بدر کا چرچہ زیادہ ہے۔ (نزہۃ القاری، ج: ۱، ص: ۲۶۷/۲۶۸)

حضرت عباس کی گفتگو: بیعت عقبہ ثانیہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور انہوں نے گروہ انصار سے کتنی با وزن اور حمیت و محبت سے پر گفتگو کی ہے اس کو آپ پیر کرم شاہ ازہری کی زبانی ملاحظہ کریں: کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہم سب شعب عقبہ میں جمع ہو گئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد کا انتظار کرنے لگے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے آئے، حضور کے ہمراہ حضور کے چچا عباس بن عبدالمطلب بھی تھے، جو ابھی تک مشرف باسلام نہیں ہوئے تھے، محض پچھا ہونے کے رشتہ کے باعث وہ آئے تھے تاکہ اپنے بھتیجے کے اس اہم کام میں شرکت کریں اور انصار کے ساتھ جو معاہدہ طے پائے وہ ہر لحاظ سے مستحکم اور مضبوط ہوتا کہ آگے چل کر کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ علامہ برہان الدین حلبی نے اپنی سیرت میں یہ روایت تحریر کی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ حضرت ابوبکر اور سیدنا علی المرتضیٰ بھی تھے لیکن جب اس وادی میں حضور تشریف لے جانے لگے جہاں انصار سے ملاقات ہونی تھی تو ازارہا احتیاط حضرت ابوبکر کو اس سڑک کی نگرانی کے لیے ایک جگہ کھڑا کر دیا گیا اور سیدنا علی المرتضیٰ کو وادی کے دہانہ پر مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس کی نگہبانی کریں۔ جب تمام لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا ”اے گروہ خزر ج! محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو مقام ہماری نگاہوں میں ہے اس سے تم باخبر ہو، اپنی قوم قریش کے ساتھ ہم عقیدہ ہوتے ہوئے بھی ہم نے قریش کے مقابلے میں آپ کا دفاع کیا ہے، وہ اپنی قوم میں معزز ہیں اور اپنے شہر میں محفوظ ہیں انہوں نے اب یہ طے کر لیا ہے کہ مکہ چھوڑ کر تمہارے ہاں منتقل ہو جائیں اور تمہارے ساتھ رہائش پذیر ہوں گے اگر تم یہ دیکھتے ہو کہ جو معاہدہ تم نے ان سے کیا ہے اس کو ہر قیمت پر پورا کرو گے اور ان کے دشمنوں سے ان کا دفاع کرو گے تو تم جانو اور تمہارا کام، لیکن اگر یہ تمہارا خیال ہے کہ کسی مرحلہ پر بھی تم ان سے دست کش ہو جاؤ گے اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دو گے تو آج ہی ان سے دست بردار ہو جاؤ

کیونکہ وہ اپنی قوم اور شہر میں معزز بھی ہیں اور محفوظ بھی۔

انصار نے جواب دیا: اے عباس! جو آپ نے کہا ہم نے سن لیا، یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! اب آپ ارشاد فرمائیے اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو شرائط آپ پسند فرماتے ہیں وہ ہم سے منوالیجیے۔ ابھی تک رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دوسروں کی باتیں سن رہے تھے اب حضور خود گویا ہوئے پہلے آیات قرآنی کی تلاوت فرمائی پھر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کے احکام کی اطاعت کی ترغیب دی پھر دین اسلام کی بنیادی تعلیمات پر روشنی ڈالی اور انہیں شوق دلایا کہ ان کو وہ دل سے تسلیم کر لیں پھر فرمایا: ”میں اپنے رب کے لیے تم سے یہ شرط منوانا چاہتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراؤ گے اور اپنے لیے تم سے یہ شرط منوانا چاہتا ہوں کہ تم میرا ہر اس دشمن سے دفاع کرو گے جس سے تم اپنی مستورات اور اولاد کا اور جانوں کا دفاع کرتے ہو۔“

اس موقع پر حضرت عبداللہ بن رواحہ نے جھٹ عرض کی ”فاذا فعلنا فما لنا“ اگر ہم ان شرطوں کو پورا کریں تو ہمیں کیا ملے گا؟ حضور نے فرمایا: تمہیں جنت ملے گی۔ ”عرض کرنے لگے: یہ سودا بڑا نفع بخش ہے نہ ہم خود اس کو توڑیں گے نہ کسی کو توڑنے دیں گے۔“ (سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۵۹۸/۶۰۰)

اسلام میں داخلہ: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کب دامن اسلام میں پناہ گزین ہوئے یہ بات علما کے نزدیک مختلف فیہ ہے لیکن محققین کی رائے یہی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کافی پہلے اسلام لا چکے تھے اور انہوں نے مصلحتاً اپنے ایمان کو چھپائے رکھا تھا۔

امام حافظ محب الدین احمد بن عبد اللہ طبری تحریر فرماتے ہیں:

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قدیم الاسلام صحابہ میں شامل ہیں لیکن یہ اپنے ایمان کو چھپاتے رہے اور یہ (مجبوراً) جنگ بدر میں کفار مکہ کے ساتھ شریک رہے اسی لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی فرما

دیا تھا: ”اگر عباس کسی کے نشانے پر آجائیں تو انہیں قتل مت کرنا وہ اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً جنگ میں شریک ہوئے ہیں۔“

ابوسعبد نے بیان کیا ہے کہ وہ بدر کے دن ہی اسلام لائے تھے اور جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مقام ابواء میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا استقبال کیا اور فتح مکہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور ہجرت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ختم ہو گئی۔

حضرت ابو عمر کے بیان کے مطابق خیبر فتح ہونے سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے تھے اور اس کے بعد جب بھی مسلمانوں کو کوئی فتح نصیب ہوتی تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس سے دلی خوشی ہوتی تھی، البتہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتح مکہ کے وقت اپنے ایمان کو ظاہر کیا تھا۔ یہ فتح مکہ سے پہلے مکہ کے مشرکین کی نقل و حرکت لکھ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کرتے تھے اور مکہ میں آباد مسلمان ان سے قوت پاتے تھے۔ انہوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی اجازت بھی چاہی لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے کہ ”تمہارا مکہ میں رہنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے“ ہجرت کرنے سے روک دیا۔ (ذخائر العقبیٰ ص: ۳۲۱)

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبول اسلام سے متعلق طبقات ابن سعد میں ذکر کردہ روایت ہمیں با وزن اور فیصلہ کن دکھائی دیتی ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور فیصلہ فرمائیں: حضرت ابورافع جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں، بیان فرماتے ہیں کہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غلام تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے کہ ہم اہل بیت پر اسلام داخل ہو چکا تھا۔ میں، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی بیوی ام الفضل سب اسی وقت اسلام لا چکے تھے لیکن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی قوم کی مخالفت سے ڈرتے تھے لہذا انہوں نے اپنے اسلام کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا تھا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مالی حالت بھی ان دنوں بہت اچھی تھی، اسی اثنا میں معرکہ بدر

پیش آگیا۔ لہذا عباس (مجبوراً) کفار کے ساتھ بدر میں شریک ہوئے حالانکہ اس وقت وہ اسلام لا چکے تھے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۹)

یہ روایت ابورافع کی ہے اور وہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام تھے (بعد میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی غلامی میں آئے) لہذا وہ اپنے آقا کے بارے میں جتنے و ثوق اور اعتماد سے کسی بات کو بتا سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا اس لیے یہ روایت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلے میں ہمیں فیصلہ کن دکھائی دیتی ہے۔

سیر اعلام النبلاء میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے سے پہلے ایمان لائے تھے۔ (اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے) (ج: ۲، ص: ۸۰)

حضرت عباس کے اسلام سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خوشی: شرجیل بن سعد سے روایت ہے جس دن ابورافع نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کی خبر سنائی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی کا جشن مناتے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابورافع کو آزاد کر دیا۔

(ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۲۱)

حضرت عباس مسلمانوں کے مددگار: صاحب استیعاب امام ابو عمر نے بھی آپ کے اسلام لانے کے سلسلے میں مذکورہ اقوال میں سے زیادہ تر کو اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایا کہ ابوطالب کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے سب سے بڑے مددگار تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ بیعت عقبہ میں شریک تھے اور انصار پر (حفاظت کی) شرط لگائی تھی جبکہ اس وقت یہ ایمان نہ لائے تھے بلکہ اپنی قوم کے دین پر تھے۔ (الاستیعاب، ص: ۵۵۷)

(ابوطالب نے صحیح قول پر ایمان قبول نہ کیا تاہم وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے دل سے حامی تھے)۔

حضرت عباس بدر میں کیوں شریک ہوئے؟: آپ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کے سلسلے میں کئی اقوال ملاحظہ کیے اب اگر اسی بات کو تسلیم کیا جائے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر سے پہلے ایمان لا چکے تھے تو یہاں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے پھر وہ مومن ہوتے ہوئے کفار کے ساتھ جنگ میں کیوں شریک ہوئے اس کا جواب ”رجال حول الرسول“ کے مصنف نے یہ دیا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لا چکے تھے اور وہ اپنے اسلام کو اپنی قوم سے چھپائے ہوئے تھے لیکن کفار مکہ آپ کے رہن سہن اور مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کو بڑی گہری نظر سے دیکھ رہے تھے اور وہ یہ سب دیکھنے کے بعد عباس سے متعلق ضرور شک و شبہ میں تھے آخر عباس ہم میں سے ہیں یا ان (مسلمانوں) میں سے؟ لیکن وہ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ آپ کا ظاہر حال قریش ہی کی تائید کرتا ہے۔ بالآخر کفار کو بدر کے نام پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزمانے کا ایک بہترین موقع ہاتھ آیا تھا، اس لیے کفار نے پوری کوشش کی کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جنگ میں شامل ہونے کا دباؤ بنایا جائے، اگر شامل جنگ ہوتے ہیں تو انہیں یقین آجائے گا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں کے ہم نوا ہیں ورنہ ان کا مسلمان ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ ادھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر میں ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اپنا مسلمان ہونا ظاہر کریں اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو جو فائدہ حاصل ہو رہا تھا وہ ختم ہو جاتا اس لیے مجبوراً حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدر میں کفار کی طرف سے شریک رہے اور اس بات کی تصدیق خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی کہ عباس کو مجبور کر کے جنگ میں شریک کیا گیا ہے وہ از خود نہیں آئے ہیں، جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آرہی ہے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۳۰۵)

حضرت عباس کو ابو جہل کا طعنہ: پیر کرم شاہ ازہری رقم طراز ہیں: حضرت عبدالمطلب کی صاحبزادی عاتکہ نے ایک خواب دیکھا جس نے انہیں ہراساں کر دیا انہوں

نے اپنے بھائی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا بھیجا آپ آئے تو عاتکہ نے کہا: بھائی جان! بخدا میں نے آج رات ایک خواب دیکھا ہے جس نے مجھے حد درجہ خوف زدہ کر دیا ہے، مجھے یہ اندیشہ ہے کہ آپ کی قوم پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ وعدہ کریں کہ آپ اس راز کو افشا نہ کریں گے تو میں آپ کو بتاتی ہوں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے راز افشا نہ کرنے کا وعدہ کیا آپ نے اپنا خواب یوں بیان کرنا شروع کیا: ”میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک شترسوار آیا اور ابطح وادی میں آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بلند آواز سے چیخ کر کہا: ”اے دھوکا بازو! اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دنوں کے اندر اندر دوڑ کر آؤ“ میں نے دیکھا کہ لوگ اس شترسوار کے پاس جمع ہو گئے پھر وہ مسجد میں داخل ہوا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کا اونٹ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہے اس شخص نے وہی نعرہ بلند کیا۔ پھر میں نے اس اونٹ کو جبل ابی قنیس کے اوپر کھڑا دیکھا وہاں جا کر اس شترسوار نے پھر وہی نعرہ لگایا اور ایک بھاری بھر کم چٹان کو نیچے لڑھکا دیا جب وہ لڑھکتی ہوئی نیچے پہونچی تو اچانک پھٹ گئی مکہ کا کوئی ایسا گھر نہ رہا جس میں اس چٹان کا کوئی ٹکڑا نہ گرا ہو۔“

یہ خواب سن کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کو کہا کہ یہ تو بڑا اہم خواب ہے عاتکہ! کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کرنا، اس کو پوشیدہ رکھنا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کہہ کر وہاں سے نکلے راستے میں ان کی ملاقات ولید بن عتبہ سے ہوئی یہ ان کا دوست تھا۔ انہوں نے اس خواب کا ذکر ولید سے کر دیا اور اسے مخفی رکھنے کی تاکید کی۔ ولید نے اس کا ذکر اپنے باپ عتبہ سے کیا۔ اس طرح یہ راز افشا ہو گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں شام کو حرم شریف میں طواف کرنے کے لیے گیا تو وہاں ابو جہل کو دیکھا کہ قریش کی ایک مجلس میں بیٹھا ہے وہاں اس خواب کا تذکرہ ہو رہا ہے ابو جہل نے مجھے دیکھا اور کہا: ابو الفضل! طواف سے فارغ ہو کر میرے پاس آنا چنانچہ میں طواف سے فارغ ہوا تو اس کے پاس چلا گیا ابو جہل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے بنو

عبدالمطلب! تم میں یہ نبیہ کب پیدا ہوئی ہے؟ میں نے اسے کہا: تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟ اس نے کہا: میں اس خواب کا ذکر کر رہا ہوں جو عاتکہ نے دیکھا ہے، میں نے انجان بنتے ہوئے کہا: اس نے کیا دیکھا؟ ابو جہل نے کہا: اے عبدالمطلب کی اولاد! تم اس پر مطمئن نہیں کہ تم میں ایک نبی ظاہر ہوا اور اب تمہاری عورتوں نے نبوت کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ پھر اس نے کہا: عاتکہ کا کہنا ہے کہ اس شترسوار نے تین دن کے اندر نکلنے کے لیے کہا۔ ہم تین دن انتظار کریں گے۔ اگر ان تین دنوں کے اندر اس کا یہ خواب سچا نہ ہوا تو ہم یہ لکھ کر ہر جگہ چسپاں کر دیں گے کہ ”ملک عرب میں تمہارا گھرانہ سب سے جھوٹا گھرانہ ہے“ مجھے بے بس ہو کر اس خواب کا انکار کرنا پڑا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غصے سے کہا کہ اے بزدل! جھوٹ تجھ میں ہے یا تیرے خاندان میں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ شام کو میں گھر گیا بنی عبدالمطلب کی کوئی خاتون باقی نہ رہی جس نے مجھے یہ کہہ کر ڈانٹ نہ پلائی اور یہ نہ کہا ہو کہ ”پہلے وہ خبیث فاسق تمہارے مردوں پر الزام تراشی کرتا رہا تو تم نے اسے برداشت کر لیا اب وہ تمہارے خاندان کی خواتین پر بہتان لگا رہا ہے اور تم خاموشی سے سن رہے ہو تم میں اتنی غیرت بھی نہیں کہ اس کا منہ توڑ جواب دے سکو“۔

(سیرت ابن کثیر، ج: ۲، ص: ۳۸۲)

میں نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں اور اگر اس نے پھر کوئی ایسی بات کہی تو میں اس کا کام تمام کر دوں گا۔

اس واقعے کے تیسرے روز میں پھر حرم شریف میں گیا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اگر ابو جہل سے میری ملاقات ہوئی تو میں اس سے بدلہ لے کر رہوں گا۔ جب میں مسجد حرام میں داخل ہوا تو مجھے ابو جہل نظر آیا میں اس کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھا میں کیا دیکھتا ہوں کہ ابو جہل بھاگا ہوا مسجد کے دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میرے خوف سے باہر بھاگا جا رہا ہے، در

حقیقت یہ بات نہ تھی۔ اس نے مضمم بن عمرو الغفاری کی چیخ سن لی تھی اور وہ ادھر دوڑا جا رہا تھا میں بھی باہر آ گیا وہاں میں نے مضمم کو وادی کے درمیان اپنے اونٹ پر سوار کھڑا دیکھ لیا اس نے اپنے اونٹ کی ناک اور کان کاٹ دیے تھے، اپنے کجاوے کو الٹا کر دیا اور اپنی قمیص آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالی تھی اور چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہا تھا۔ ”اللطیمہ اللطیمہ“ اپنے اس قافلہ کو بچاؤ جس پر خوشبو بزازی اور دیگر اموال تجارت لدے ہوئے ہیں، ابوسفیان کے اس قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اور آپ کے صحابہ نے چڑھائی کر دی ہے۔ میرے گمان میں یہ نہیں کہ تم بروقت وہاں پہنچ جاؤ گے۔ فریاد پھر فریاد۔ اس نئے حادثہ نے مجھے بھی اور اسے بھی یوں مصروف کر دیا کہ پھر ہم اس موضوع پر کوئی بات نہ کر سکے۔ (سیرت ابن کثیر، ج: ۲، ص: ۳۸۳، سیرت دحلان ج: ۱، ص: ۳۶۲، بحوالہ سیرت الرسول، ج: ۳، ص: ۲۹۶ تا ۲۹۹)

بدر میں شرکت: جنگ بدر میں دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہیں، تلواریں میان سے باہر ہیں، نیزے اور برچھیاں سنبھال لی گئی ہیں اور ہر جماعت اپنے جنگ جو سپاہیوں کو آخری احکام سنارہی ہے۔ اس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ندا فرمائی، اے لوگو! کچھ بنی ہاشم اور بنی ہاشم کے سوا کچھ دوسرے افراد اپنی رضا و رغبت سے جنگ میں شریک نہیں ہیں بلکہ انہیں مجبور کر کے میدان بدر میں لایا گیا ہے وہ ہم سے قتال کا ارادہ نہیں رکھتے لہذا ہمیں ان سے لڑنے کی حاجت نہیں، اگر دوران جنگ ان لوگوں سے تمہارا سامنا ہو جائے تو انہیں قتل مت کرنا، ابوالخثری بن ہشام کو قتل مت کرنا۔ عباس بن عبدالمطلب کو قتل مت کرنا، عباس کو جبراً شریک جنگ کیا گیا ہے۔ ابوالخثری کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس لیے مستثنیٰ قرار دیا کہ اس نے مکہ میں کبھی بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تکلیف نہیں پہنچائی اور جس قرارداد کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا تھا اس قرارداد کو منسوخ کرانے میں بھی ابوالخثری کا نمایاں کردار تھا، لہذا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے اس احسان کا بدلہ دینے کے

لیے یہ حکم جاری کیا: اگرچہ ابوالختری مشرک تھا اور شرک کی حالت میں قتل کیا گیا۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۱۰، سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۶۲۹)

کیا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رشتہ داری نبھائی؟: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عین لڑائی کے وقت یہ کہنا کہ عباس کو قتل مت کرنا، کیا اس لیے تھا کہ وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا تھے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متعلق یہ گمان کون کر سکتا ہے کہ ایسے عالم میں جبکہ آپ کے جاں نثار اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہوں، اپنے مشرک باپ داداؤں کو تہ تیغ کر رہے ہوں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چچا کو مشرک جانتے ہوئے اس سے رشتہ داری نبھا رہے ہوں ہرگز نہیں۔ یہ حکم تو صرف انہیں وجوہ کی بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ یا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی حقیقت ایمان سے واقف تھے کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسلام کے لیے ان کے جذبہ ایثار اور مسلمانوں کے لیے ان کی ہمدردی سے بخوبی واقف تھے۔ (یا پھر بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسا کہنے کا حکم دیا تھا۔)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو پریشان نہ کرنے اور قرار داد کو منسوخ کرنے میں کوشش کرنے کی وجہ سے اگر ابوالختری کو جان بخشی کا انعام دیا جاسکتا ہے جبکہ اس کے بارے میں یہ یقین تھا کہ وہ مشرک ہے تو پھر عم نبی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے بارے میں یہ حکم نافذ کریں، کیوں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے حق میں ابوالختری سے کہیں زیادہ خیر خواہ، قربانیاں دینے والے، مسلمانوں کی حفاظت کرنے والے اور اسلام کی مدد کرنے والے واقع ہوئے تھے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ ان کے اسلام لانے کی شہرت بھی ان کو قتل نہ کرنے کا حکم دینے کی بڑی وجہ تھی۔

(رجال حول الرسول، ص: ۳۰۶)

ابوالختری کا قتل: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابوالختری کے قتل کو بھی منع

فرمایا تھا لیکن جنگ کے دوران صحابی رسول حضرت مجذربن زیاد کا سامنا ابوالختری سے ہو گیا، ابوالختری کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا، صحابی رسول نے ابوالختری سے فرمایا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں تمہارے قتل سے منع فرمایا ہے۔ اس نے پوچھا: اور میرے دوست کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کو میں قتل کروں گا کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے قتل کو منع نہیں فرمایا ہے، ابوالختری نے کہا: ایسا نہیں ہو سکتا، اسے چھوڑ کر میں زندہ نہیں رہ سکتا، اگر میں نے ایسا کر لیا تو مکہ کی عورتیں مجھے طعنہ دیں گی، پھر ابوالختری اور اس کے دوست نے صحابی رسول پر حملہ کر دیا (مجبوراً) حضرت مجذربن ابوالختری کو قتل کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۶۳۰)

کیا میرے چچا کا چہرہ تلوار کے لائق ہے؟ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عباس کو جبراً لایا گیا ہے، انہیں قتل نہ کیا جائے تو مخلص صحابی رسول حضرت ابو حذیفہ یہ بات سن رہے تھے، غصے میں ان کی زبان سے نکل گیا کہ ہم تو اپنے باپوں، بیٹوں اور بھائیوں کو قتل کریں اور عباس ملیں تو انہیں چھوڑ دیں، بخدا! اگر عباس مجھے مل گئے تو میں ان کے منہ میں تلوار کی لگام ضرور ڈالوں گا۔ ان کی بات جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو فرمایا: ”یا اباحفص! ایضرب وجہ عمر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بالسیف؟“ اے ابوحفص! کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چہرے پر تلوار کا وار کیا جائے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو حذیفہ یقیناً منافق ہو گیا ہے۔ مجھے اجازت فرمائیں تو میں اس کا سر قلم کر دوں۔ بے دھیانی میں یہ جملہ حضرت حذیفہ کی زبان سے نکل تو گیا لیکن عمر بھر اس پر پچھتاتے رہے۔ آپ کہتے: ”ما انا بامن من تلك الكلمة التي قل بها يومئذ“ وہ بات جو اس روز میری زبان سے نکل گئی تھی مجھے اس کے باعث اپنے انجام کے بارے میں خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ”ولا ازال خائفا منها الا ان تكفرها عنى الشهادة“ وہ جملہ جو اس روز میری زبان سے نکلا، اس کا مجھے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے،

میرے دل کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا اگر میں شہید ہو جاؤں تو شاید میری شہادت اس گناہ کا کفارہ بن جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمنا پوری فرمادی، جنگ یمامہ میں دشمنان ختم نبوت کا مقابلہ کرتے ہوئے انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ پہلا دن تھا جب میرے دلنواز آقا نے مجھے ابو حفص کی کنیت سے سرفراز فرمایا۔ (سیرت الرسول، ج: ۳، ص: ۳۴۹، ۳۵۰، بل الہدیٰ والرشاد ج: ۴، ص: ۷۴، سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۶۲۹)

حضرت ابو حذیفہ کے ان جملوں سے کسی صاحب ایمان کو ان سے متعلق کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو جائے اس لیے ہم پیر کرم شاہ ازہری کی کتاب سیرت الرسول کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں اقتباس اگرچہ لمبا ہے لیکن فوائد سے پر ہے آپ رقم طراز ہیں:

حضرت ابو حذیفہ کے جذبہ ایمان کی آزمائش: حضرت ابو حذیفہ کا شمار ان چند سعداء میں ہوتا ہے جنہوں نے ہادی برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت حقہ کو اس وقت دل و جان سے قبول کیا تھا۔ جب کہ ابھی دار ارقم کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز بننے کا شرف نصیب نہیں ہوا تھا۔ آپ مکہ کے سربراہ و درہ خاندان کے چشم و چراغ تھے، آپ عتبہ بن ربیعہ کے بیٹے تھے وہ عتبہ جو خاندانی وجاہت، دولت و ثروت کے علاوہ اپنی عقل و دانش اور اپنے ذاتی فضائل کے اعتبار سے قریش کے جملہ خاندانوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا تھا لیکن ان جملہ خوبیوں اور صفات کے باوجود اسلام اور نبی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا، کا دشمن تھا اگرچہ اس کی عداوت میں ابو جہل کا اندھا تعصب اور اکھڑپن اور عقبہ بن ابی معیط جیسے کفار کی کمینگی اور دنیایت نہ تھی اس کا شمار مکہ کے زیرک، دانشمند اور عاقبت اندیش سرداروں میں ہوتا تھا لیکن اسلام کی بدخواہی میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھا۔

اسلام کے شاہین نے اس خانوادہ سے جہاں دولت، ریاست، شہرت اور دین حق سے عداوت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، ابو حذیفہ کوتا کا، اسے جھپٹا اور آغوش نبوت میں ڈال دیا۔ باپ، چچا بھائی سارے خاندان کا ہر فرد لات و ہبل کا پرستار اور اس کی سطوت و عظمت

کا پاسبان بنا ہوا تھا ایسے خاندان کے ایسے مختتم سردار کے بیٹے کا ان کے معبودوں کی خدائی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دینا کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ اس سے سارے قبیلے میں کہرام برپا ہو گیا، کون سی ایسی کوشش اور حیلہ تھا جو انہوں نے اپنے خاندان کے ایک اہم فرد کو اپنے حلقہ میں واپس لانے کے لیے استعمال نہ کیا، پیدائش سے اب تک جس ناز و نعم کا وہ خوگر تھا ساری بساط ہی الٹ دی گئی، محرومیوں اور مایوسیوں نے ابو حذیفہ کو اپنے حصار میں لے لیا، اسے ہر وقت ستایا جاتا، نت نئی اذیت سے اس کا دل دکھایا جاتا لیکن اس مرد حق پسند کی استقامت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا، جب مکہ کی سرزمین تنگ ہو گئی تو پہلے اس نے حبشہ کی طرف ہجرت کی وہاں کئی سال تک غریب الوطنی کے چر کے برداشت کیے، ان کی رفیقہ حیات بھی حزن و الم سے بھرپور جلا وطنی میں ان کے ساتھ رہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں وہاں ایک فرزند عطا فرمایا، جس کا نام اپنے محبوب کریم کے اسم گرامی کے مطابق محمد رکھا۔ اس طرح اپنے قلب حزن کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا چند سال بعد حبشہ سے مکہ واپس آئے یہاں کی فضا انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی، ان کے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ہجرت فرمائی تو یہ بستہ فتراک وفا پھر اپنے اہل و عیال کو لے کر مرکز دین و ایمان مدینہ طیبہ میں آکر آباد ہو گیا۔ یہاں انہیں اپنے محبوب آقا کی دید کی سعادت نصیب ہو جاتی تھی۔ یہی چیز ان کے بے تاب دل اور بے قرار نگاہوں کے لیے تسکین و اطمینان کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، جرم عشق میں تیرہ چودہ سال کا عرصہ گونا گوں اذیتیں سہتے سہتے جذبہ عشق جواں ہو گیا۔ اسی اثناء میں غزوہ بدر پیش آیا وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے اپنے حبیب مکرم کی معیت میں میدان بدر کی طرف روانہ ہوئے یہاں انہیں دوزید آزمائشوں سے گزرنا پڑا وہ دونوں آزمائشیں اتنی بھیا نک اور سخت تھیں کہ اگر ان سے پہاڑوں کو آزمایا جاتا تو وہ ہول امتحان سے ریزہ ریزہ ہو جاتے لیکن یہ ان کے رب کریم کی توفیق اور ان کے ایمان کی بے پایاں قوت تھی جس کے باعث وہ ان دونوں امتحانوں میں سرخرو ہو کر نکلے۔

پہلی آزمائش کا انہیں اس وقت سامنا کرنا پڑا، جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقتول کفار کی لاشوں کو ایک پرانے گڑھے میں پھینک دینے کا حکم دیا، وہ گھسیٹ کر لائی جارہی تھیں اور اس گڑھے میں پھینکی جارہی تھیں، اسی اثناء میں ان کے باپ عتبہ کی لاش لائی گئی جس کو حضرت حمزہ کی تلوار جو ہر دار نے دولخت کر کے زمین پر پھینک دیا تھا اسے بھی اس گڑھے میں لڑھکا دیا گیا، یہ منظر ابوحنظیفہ کے لیے بڑا حوصلہ شکن اور صبر آزمائش تھا، ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا، ان کی اس کیفیت کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا، ان کے دل میں غم و اندوہ کا جو طوفان برپا تھا۔ اس پر آگاہی پاتے ہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا: اے ابوحنظیفہ! اپنے باپ کی یہ حالت دیکھ کر تمہارے دل میں کچھ خیال تو پیدا نہیں ہو گیا؟ اس سراپا ادب و نیاز غلام نے عرض کی: یا رسول اللہ! بخدا مجھے اپنے باپ اور اس کے انجام کے بارے میں کوئی شک نہیں لیکن اپنے باپ کو صاحبِ رائے، حلیم اور اچھی صفات کا مالک خیال کرتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی یہ خوبیاں اسے اسلام کی طرف لے آئیں گی جب میں نے اس کے انجام کو دیکھا اور حالت کفر میں اس کے مرنے کو دیکھا تو اس بات کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابوحنظیفہ کا یہ جواب سن کر انہیں اپنی دعائے خیر سے نوازا۔

(سبل الہدی والرشاد، ج: ۴، ص: ۸۷)

دوسری آزمائش جس سے انہیں دوچار ہونا پڑا وہ اس سے بھی سنگین تر تھی اور اسی غزوے کے دوران انہیں پیش آئی، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

جب میدان جنگ میں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ارشاد فرمایا کہ بنو ہاشم کے جو افراد لشکر کفار کے ساتھ یہاں آئے ہیں وہ اپنی مرضی سے نہیں آئے بلکہ انہیں زبردستی لایا گیا ہے، اگر ان میں سے کوئی تمہارے سامنے آئے تو اسے قتل نہ کرنا، نیز فرمایا: اگر ابوالنختری کسی کے دو بدو ہو تو اسے بھی قتل نہ کیا جائے اور جو شخص عباس بن عبدالمطلب کے مد مقابل آئے تو وہ انہیں بھی قتل نہ کرے کیوں کہ انہیں

بھی جبراً ساتھ لایا گیا ہے۔

ابو حذیفہ جن کا باپ عتبہ، چچا شیبہ، بھائی ولید مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے، انہوں نے جب یہ ارشاد نبوی سنا تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: ہم تو اپنے باپوں، بھائیوں، قریشی رشتہ داروں کو تیغ کر دیں اور عباس کو کچھ نہ کہیں، انہیں چھوڑ دیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ بخدا اگر میرا مقابلہ عباس سے ہوا تو میں اپنی تلوار سے ان کے منہ میں لگام دوں گا۔

ابو حذیفہ کی یہ بات جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنی تو حضور نے حضرت عمر کو فرمایا: اے اباحفص! کیا اللہ کے رسول کے چچا کے چہرے پر تلوار سے ضرب لگائی جائے گی؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے اجازت فرمائیے، میں ابو حذیفہ کی گردن اڑا دوں بخدا وہ منافق ہو گیا ہے۔

حضرت ابو حذیفہ کی زبان سے تند جذبات کی رو میں بہتے ہوئے یہ جملہ نکل تو گیا لیکن عمر بھراس پر پریشان رہے اور اظہار افسوس کرتے رہے۔ کہا کرتے ”میں نے اس دن جو بات کہی تھی، میں اس کے انجام سے اب تک ترساں ولرزوں ہوں۔ اس کے اثر بد سے میری رستگاری کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کا شرف عطا فرما دے تاکہ راہ حق میں میری شہادت میرے اس گناہ کا کفارہ بن جائے،،۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تمنا کو پورا کیا عقیدہ ختم نبوت کے باغی مسلمہ کذاب کے خلاف جنگ کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ (محمد رسول اللہ، ج: ۳، ص: ۴۷۷)

جس شخص کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ چچا اور بھائی کو بیک وقت تیغ کر دیا گیا ہو اس کا رنجیدہ خاطر ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ بشری فطرت کے یہ ایسے شدید تقاضے ہیں جن سے دامن بچانا ناممکن نہیں تو از بس مشکل ضرور ہے۔ ان حالات میں حضرت ابو حذیفہ کی زبان سے ان کلمات کا نکلنا قطعاً محل تعجب نہیں لیکن جو نبی انہیں ہوش آیا تو انہیں اپنی اس غلطی کا اتنا شدید احساس ہوا کہ دن رات پریشان رہتے تھے انہیں ہر وقت کھٹکا لگا

رہتا کہ مباد اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر نازل ہو اور ان کی شیع ایمان ہی بجھادی جائے اگر ایسا سانحہ روپذیر ہوا تو ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی، وہ اکثر سوچتے کہ اس گناہ کبیرہ کا کفارہ ادا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے انہیں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کا موقع مل جائے۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۳، ص: ۳۶۷-۳۷۱)

گویا ابو حذیفہ جنگ کے شدائد اور اہل خانہ کے انجام کو دیکھ کر اتنا بے خود ہو گئے کہ ذہن قوت تمیز کھو بیٹھا اور اس حالت میں وہ کہا جو آپ نے سنا، شاید ان کی اسی کیفیت کے مد نظر انہیں معذور رکھا گیا اور ان سے کوئی مؤاخذہ نہ کیا گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت عباس گرفتار: میدان بدر میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجبوراً موجود تھے جیسا کہ آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد سے عیاں ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو صحابی رسول ابوالیسر سلمیٰ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا آپ بیان فرماتے ہیں: میدان بدر میں میں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا وہ صنم کی طرح کھڑے تھے (کوئی نقل و حرکت نہیں کر رہے تھے) آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، میں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اللہ تعالیٰ تمہیں رشتہ داری کا برابر بدلہ دے، کیا تم ان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنے بھتیجے سے قتال کر رہے ہو؟ تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: کیا معاملہ ہے؟ کیا میرے بھتیجے کو قتل کر دیا گیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ ان کو عزت بخشے والا اور ان کی مدد کرنے والا ہے۔ ابوالیسر کا جواب سن کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: حضور کے سوا ہر غم آسان ہے۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا: اے ابوالیسر! میرے بارے میں کیا ارادہ رکھتے ہو؟ تو میں نے کہا: آپ کو گرفتار کرنے کا، کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو قتل کرنے سے منع کر دیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یہ میرے اوپر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کوئی پہلا احسان نہیں ہے (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو کرم فرماتے ہی رہتے ہیں) حضرت ابوالیسر فرماتے ہیں کہ پھر میں انہیں گرفتار کر کے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی

بارگاہ میں لے آیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: اے ابوالیسر! تم نے عباس کو کیسے گرفتار کیا؟ میں نے عرض کیا: حضور! ان کو گرفتار کرنے میں میری ایک شخص نے مدد فرمائی ہے اور وہ ایسا شخص ہے جس کو نہ میں نے کبھی پہلے دیکھا اور نہ اس واقعے کے بعد دیکھا، اس کا حلیہ اس اس طور پر تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو گرفتار کرنے میں ایک مکرم فرشتے نے تمہاری مدد کی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۸۱، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۱۱)

ایضاح الاشکال میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جس شخص نے گرفتار کیا تھا اس کا نام طارق بن عبید بن مسعود ہے اور ابوالیسر انصاری جن کا نام کعب بن عمرو ہے یہ طارق کے ساتھ تھے۔ (ج: ۱، ص: ۱۱۴)

میں تو مسلمان تھا: جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گرفتار کر کے مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا گیا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: چچا! آپ اپنا اور آپ کے بھتیجے عقیل، نوفل اور آپ کے حلیف عتبہ بن عمر کا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کیجیے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو مسلمان تھا مجھے تو قوم جبراً لے کر آئی ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو بہتر بدلہ عطا فرمائے گا۔ ظاہر میں آپ ان کے ساتھ آئے ہیں تو فیصلہ اسی کے اعتبار سے ہوگا لہذا آپ کو آزادی چاہیے تو فدیہ دینا پڑے گا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۱۲)

پیغمبر تو رکھتا ہے دلوں کی بھی خبر داری: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیس اوقیہ سونا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مال غنیمت کے طور پر وصول کیا تھا اور اب سرکار فرما رہے تھے: چچا! اگر آزادی چاہتے ہو تو فدیہ ادا کرو، اس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جو بیس اوقیہ آپ مجھ سے لے چکے ہیں اسی کو میرا فدیہ بنا دیجیے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنیمت میں عطا فرمایا ہے۔ اس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میرے پاس مال

نہیں ہے، یہ سن کر غیب داں رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: چچا! وہ مال کہاں چلا گیا جو سفر میں نکلنے سے پہلے مکہ میں عالم تنہائی میں میری چچی ام الفضل کو دیکر آئے تھے؟ ساتھ ہی یہ وصیت بھی کر کے آئے تھے اگر عباس اس سفر کی نذر ہو جائے تو اتنا مال فضل کو اور اتنا عبد اللہ کو دے دینا۔

تمہارے لفظ تھے عباس گر مارا بھی جائے گا
تو یہ اتنا اثاثہ ہے تمہارے کام آئے گا
یہ سن کر حضرت عباس پر ریشہ ہوا طاری
کہ پیغمبر تو رکھتا ہے دلوں کی بھی خبرداری

یہ سن کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اس بات کو ہم دونوں میاں بیوی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا یہ تو نہایت راز کی بات تھی لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۱۳)

اس حدیث پاک میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم غیب کا ثبوت ہے اور یہ غیب آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ یہاں ہم نے ایک حوالے پر اکتفا کیا ہے جسے مزید کی جست جو ہو وہ تبیان القرآن ج: ۴، ص: ۷۰۳ کا مطالعہ کرے وہاں اس کثرت کے ساتھ حوالے پیش کیے گئے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چار ہو جائیں گی اور مخالف انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔

عباس کا فدیہ: امام ابو نعیم نے اوائل میں روایت کی ہے کہ ہر قیدی کا فدیہ چالیس اوقیہ سونا تھا پس آپ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اوپر ایک سو اوقیہ سونا مقرر کیا اور عقیل کے اوپر اسی (۸۰) اوقیہ سونا مقرر کیا تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: آپ نے قرابت کی وجہ سے ایسا کیا ہے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ ۖ إِن يَبْعَلْهُ اللَّهُ فِي

قُلُوبَكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّنْكُمْ. (انفال: ۷۰)

اے نبی! آپ ان سے فرما دیجیے جو تمہارے ہاتھوں میں قیدی ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں کسی بھلائی کو ظاہر فرمادیا تو تمہیں اس سے بہتر دے گا جتنا فدیہ تم سے لیا گیا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد میں اس آیت کی وجہ سے کہا کہ: میری خواہش تھی کہ آپ مجھ سے دو گنا جو گنا فدیہ لیتے۔

(فتح الباری، ج: ۵، ص: ۱۷۸، بحوالہ نعمۃ الباری ج: ۷، ص: ۳۱۸)

اسلام کی فتح مندی پر حضرت عباس کی خوشی: جس طرح جنگ بدر کے واقعات اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قدیم الاسلام صحابہ میں شامل ہیں، اسی طرح فتح خیبر کے موقع پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خوشی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اعلان اسلام سے پہلے ہی اسلام لائے تھے اور بعض مصالِح کی بنیاد پر وہ اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر خیبر فتح فرمادیا تو صحابی رسول حضرت حجاج بن علاط نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! مکہ میں میرا مال و منال اور اہل و عیال باقی ہیں اگر آپ اجازت دیں تو اس کو لے کر حاضر ہو جاؤں، ساتھ ہی مجھے اس بات کی اجازت بھی مرحمت فرمائیں کہ میں آپ سے متعلق کچھ بناوٹی باتیں بھی کفار مکہ کے ساتھ کر سکوں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں دونوں اجازتیں عطا فرمادیں۔ حجاج مکہ پہنچے اور اپنا کام شروع کر دیا، سب سے پہلے یہ اپنی اہلیہ کے پاس آئے اور اس سے کہا: تمہارے پاس جو کچھ بھی مال و متاع ہے وہ سب جمع کر کے مجھے دے دو کیوں کہ اس وقت بڑا سنہرا موقع ہے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے اموال جنگ میں غنیمت کے طور پر چھین لیے گئے ہیں، میں ان اموال کو سستے داموں میں

خریدنا چاہتا ہوں۔ پھر حجاج نے اس خبر کو پورے مکہ میں پھیلا دیا۔ اس خبر سے وادی مکہ میں بسنے والے مشرکین کے دلوں کی کلیاں کھل گئیں۔ مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی، شہر مکہ فرح و سرور کے ترانے گانے لگا، ہر طرف خوشیوں کے شادیاں بچنے لگے، بچہ بچہ شراب سرور سے مخمور تھا لیکن مکہ میں بچے ہوئے مسلمان اس خبر کو سن کر ضرور مغموم ہو گئے، ان کے چہرے اداس اور دل مضحل تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یہ خبر ملی ان کے لیے یہ خبر خبر نہ تھی بلکہ ایک ایسی بجلی تھی جس نے ان کے جسم کو شل کر دیا تھا۔ وہ اپنی محفل سے اٹھنے کے قابل نہ بنے تھے گویا کہ ان کے اعضاء کی ساری قوتیں مفقود ہو گئی تھیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بیٹا تھا جو حضور کے مشابہ تھا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو پکڑا اور کچھ اشعار گنگنانے لگے ”یا قثم! یا قثم! یا شبہ ذی الکرم!“ پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک خادم کو حجاج بن علاط کی طرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ تم یہ کیا خبر لے کر آئے ہو؟ حجاج نے جواباً خادم سے کہا: جاؤ ابو الفضل سے میرا سلام کہو اور ان سے کہو میں تم سے ملنے آ رہا ہوں آ کر وہ سناؤں گا کہ تم اس سے خوش ہو جاؤ گے۔ غلام نے آ کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پوری خوش خبری سنائی۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے تھے کہ مارے خوشی کے اچھل پڑے خادم کو بغل گیر کر لیا۔ اب حجاج نے آ کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حقیقت سے آگاہ کیا اور بتایا: عباس! وہ سب ڈراما تھا، سچ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اللہ کے کرم سے خیبر فتح کر لیا ہے، خیبر کا مال حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدموں میں پڑا ہے۔ خیبر کے سردار کی نازنین شہزادی حضور کی زوجیت سے مشرف ہو چکی ہے، میں تو اپنا مال لینے آیا تھا اور جو میں نے کیا ہے اس کی اجازت لے کر آیا تھا بس تین دن تک کسی کو مت بتانا جب میں یہاں سے نکل کر مامون ہو جاؤں تو جسے چاہو بتانا۔ حجاج نے سارا مال و متاع اکٹھا کیا اور اپنی راہ لی پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حجاج کی اہلیہ سے ملے انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا اور قریش کی مجلس میں جا پہنچے۔ قریش نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: عباس تمہیں خیر

حاصل ہو، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: مجھے خیر ہی نصیب ہوئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے خیر کو اس کے رسول کے ہاتھ پر فتح کر دیا ہے، ان کے اموال میں اللہ کے حکم کے مطابق حصے بنادیے گئے ہیں اور خیبر کی شہزادی داخل حرم ہو چکی ہے یہ سچی خبر مجھے حجاج نے دی ہے اور اس خبر کو تین دن تک پوشیدہ رکھنے کی درخواست کی تھی اور وہ صرف اپنا مال لینے یہاں آئے تھے اور جو کچھ تم نے سنا وہ سب بناوٹی باتیں تھیں، یہ خبر بھی ہوا کی طرح مکہ میں پھیل گئی اور حالات بدل گئے۔ خوشی رنج میں اور رنج خوشی میں تبدیل ہو گیا جو ابھی ٹھٹھے مار مار کر ہنس رہے تھے وہ غم زدہ ہو گئے جو غم زدہ تھے وہ مسکرانے لگے۔ مشرکین درد مصیبت سے تڑپ رہے تھے اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے۔ اس روایت کو ابو حاتم نے روایت کیا ہے۔ (ذخائر العقبی، ص: ۳۱۹، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۴۰۹، شرح مشکل الآثار للطحاوی، ج: ۸، ص: ۵۷، مسند عبد الرزاق، حدیث نمبر: ۳۲۱۳، کشف الاستار، ج: ۲، ص: ۳۴۰)

ہجرت: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے سے متعلق آپ علما کا اختلاف پڑھ چکے ہیں، بعض حضرات حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے سے پہلے، بعض حضرات غزوہ بدر سے پہلے، بعض حضرات غزوہ بدر کے بعد، بعض حضرات خیبر فتح ہونے سے پہلے آپ کے اسلام لانے کو ثابت کرتے ہیں، زیادہ تر علمائے کرام بدر سے پہلے یا بدر کے بعد آپ کے ایمان کے قائل ہیں۔ پھر جب آپ نے اپنے ایمان لانے کو لوگوں پر ظاہر فرمادیا تو آپ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے کی اجازت چاہی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو یہ کہتے ہوئے ہجرت کرنے سے روک دیا کہ تمہارا مکہ میں رہنا ہی بہتر ہے۔ ان کو مکہ چھوڑنے کی اجازت اس لیے نہ مل سکی کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں رہ کر مکہ کے مشرکین کی خبریں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک لکھ کر بھیجا کرتے تھے اور مکہ میں بچے کچے مسلمان آپ سے تقویت پاتے تھے۔ اس لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے موقع پر صحابہ کرام کو فرمایا تھا جس کا مقابلہ عباس سے ہو وہ انہیں قتل نہ کرے کیوں کہ انہیں جبراً لایا گیا

ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں ہجرت سے روکتے ہوئے خاتم المہاجرین کا تمنغہ بھی عطا فرمایا۔ آپ نے فرمایا تھا: اے چچا! آپ جہاں ہیں وہیں ٹھہرے رہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر ہجرت کو ختم فرمائے گا جیسے کہ اللہ نے مجھ پر نبوت کو ختم فرمادیا۔ دوسری حدیث میں ہے: اے چچا! جیسے میں آخر النبیین ہوں، آپ آخری المہاجرین ہوں گے۔ اس حکم کے بعد آپ مکہ میں ٹھہرے رہے اور فتح مکہ سے پہلے فتح خیبر کے سال آپ نے ہجرت فرمائی، اور ہجرت آپ پر ختم ہو گئی، آپ فتح مکہ میں حضور کے ساتھ رہے۔

(اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۴، تاریخ دمشق، ج: ۲۶، ص: ۲۹۸)

غزوات میں شرکت: آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فتح مکہ سے قبل ہی ہجرت کرنے کی اجازت ملی تھی۔ آپ نے فتح خیبر کے سال ایک قافلے کے ساتھ ہجرت فرمائی اس قافلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے؛ یہ پورا قافلہ مقام جحفہ میں ٹھہر گیا، جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو آپ کی آمد کی خبر دی گئی تو آپ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو ہریرہ کو خیبر کے مال غنیمت سے کچھ حصہ عطا فرمایا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خیبر کے باغات سے آپ کو دو سو وسق کھجوریں ہر سال عطا فرماتے تھے۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتح مکہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، غزوہ حنین و طائف اور تبوک میں بھی آپ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شریک کار رہے۔

فتح مکہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشرکین کو جنگ سے باز رکھنے کے لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے آگے گزر گئے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا: میرے چچا کو واپس بلاؤ، واپس بلاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش ان کو اس طور پر قتل کر دیں جیسے قبیلہ ثقیف نے عروہ بن مسعود کو قتل کر دیا تھا۔ چند گھڑسوار صحابہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر لائے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے چچا کو دیکھا تو نم آنکھوں سے گلے لگا لیا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: میں تو مسلمانوں کی مدد کے لیے ہی گیا تھا۔ یہ سن کر حضور نے

اپنے چچا کو دعاؤں سے نوازا، بارگاہ مولیٰ میں عرض کی: اے اللہ! عباس اور ان کی اولاد کی مدد فرما۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲۶، ص: ۲۹۹)

غزوہ حنین اور حضرت عباس: غزوہ حنین بھی اسلام کے مشہور ترین غزوات میں سے ایک ہے، اس غزوے کا ذکر قرآن پاک میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا
وَوَضَّاعَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضَ بِمَآرِ حَبَّتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝

حنین کے دن تمہاری مدد کی جب تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے تو وہ کچھ تمہارے کام نہ آئی اور زمین اتنی وسیع ہو کر تم پر تنگ ہو گئی تم پیٹھ دے کر پھر گئے۔ (سورہ توبہ، آیت: ۲۵)

اس غزوے میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نہ صرف ساتھ تھے بلکہ اس جنگ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کے دشمنوں کے خلاف اپنی جواں مردی کے خوب جوہر دکھائے۔ پہلے ہم حنین کا قدرے تعارف پیش کرتے ہیں پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہادری کا ذکر کریں گے۔

شارح بخاری حضرت علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمۃ نعمۃ الباری میں تحریر فرماتے ہیں؛ صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حنین ایک وادی ہے جو طائف کے قریب مکہ مکرمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے، یہاں فتح مکہ سے تھوڑے ہی روز بعد قبیلہ ہوازن وثقیف سے جنگ ہوئی، اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کثیر تقریباً بارہ ہزار یا اس سے زائد تھی اور مشرکین چار ہزار تھے، جب دونوں لشکر بالمقابل ہوئے تو مسلمانوں میں سے کسی شخص نے اپنی کثرت پر نظر کر کے یہ کہا کہ اب ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے یہ کلمہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بہت گراں گزرا کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر توکل فرماتے تھے اور تعداد کی قلت و کثرت پر نظر نہ رکھتے تھے جب جنگ شروع ہوئی اور قتال شدید ہوا تو

مشرکین بھاگے اور مسلمان مال غنیمت لینے میں مصروف ہو گئے تو بھاگے ہوئے لشکر نے اس کو غنیمت سمجھا اور تیروں کی بارش شروع کر دی اور تیر اندازی میں وہ بہت مہارت رکھتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس ہنگامے میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، لشکر بھاگ پڑا اور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ابن عم ابوسفیان بن حارث کے سوا اور کوئی باقی نہ رہا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وقت اپنی سواری کو کفار کی طرف بڑھایا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ وہ بلند آواز سے اپنے اصحاب کو پکاریں، ان کے پکارنے سے وہ لوگ لبیک لبیک کہتے ہوئے پلٹ آئے اور کفار سے جنگ شروع ہو گئی جب لڑائی خوب گرم ہو گئی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک میں سنگ ریزے لے کر کفار کے منہوں پر مارے اور فرمایا: رب محمد کی قسم! (کفار) بھاگ نکلے، سنگ ریزوں کا مارنا تھا کہ کفار بھاگ پڑے اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی غنیمتیں مسلمانوں کو تقسیم فرمادیں، ان آیتوں میں اس واقعے کا بیان ہے:

اور وہ لشکر نازل کیے جو تم نے نہ دیکھے: یعنی فرشتے جنہیں کفار نے ابلق گھوڑوں پر سفید لباس پہنے، عمامہ باندھے دیکھا، یہ فرشتے مسلمانوں کی شوکت بڑھانے کے لیے آئے تھے اس جنگ میں انہوں نے قتال نہیں کیا، قتال صرف بدر میں کیا تھا۔

(نور ائین العرفان، ص: ۲۲۹، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

علامہ عمر بن علی ابن الملقن شافعی متوفی ۸۰۴ھ لکھتے ہیں:

حنین ایک وادی ہے اس کے اور مکہ کے درمیان تین راتوں کے سفر کی مسافت ہے، حنین بن قایہ بن مہلائیل نام کے ایک شخص کی طرف اس وادی کی نسبت ہے۔

(معجم ما سئعم، ج: ۲، ص: ۴۷۲)

اور یہیں غزوہ ہوا زن ہوا تھا جس کا ذکر صحیح البخاری، حدیث: ۲۸۶۴ میں ہے۔

علامہ سیہلی نے کہا ہے کہ یہ غزوہ اوطاس کے نام سے معروف ہے، اوطاس اس جگہ

کا نام ہے جہاں پر بعد میں یہ واقعہ ہوا تھا۔ (الروض الانف، ج: ۴، ص: ۱۳۸)

وہ ہفتہ کا دن تھا اور شوال کی چھ تاریخ تھی اور آٹھ ہجری میں یہ غزوہ ہوا، فرشتوں کی علامت ان کے عمامے تھے جن کے شملے انہوں نے اپنے کندھوں کے درمیان ڈالے ہوئے تھے۔

امام محمد بن سعد نے دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اٹھائیس (۲۸) رمضان کو تیاری کرتے ہوئے نکلے تھے۔ (الطبقات الکبریٰ، ج: ۲، ص: ۱۴۳)

انہوں نے کہا کہ آپ کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی، دس ہزار اہل مدینہ میں سے تھے اور دو ہزار اہل مکہ میں سے تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: آج ہم تعداد میں کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے، پس یہ دس شوال منگل کی رات کو وادی حنین پہنچے جب بنو سلیم اور اہل مکہ پیچھے بھاگے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پکار رہے تھے: اے اللہ کے مددگارو! اے اس کے رسول کے مددگارو! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، تو جو بھاگ گئے تھے وہ لوٹ کر آگئے، اس دن جو صحابہ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے، وہ یہ تھے: حضرت عباس، حضرت علی، حضرت فضل، حضرت ابوسفیان بن حارث، حضرت ربیعہ بن حارث، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو آپ کے اہل بیت اور آپ کے اصحاب میں سے تھے۔ (نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۹۵-۶۹۶)

اب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حنین کی کہانی خود ان کی زبانی سنیں! حضرت علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: کہ غزوہ حنین میں، میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، میں اور حضرت ابوسفیان بن حارث رسول اللہ کے ساتھ رہے، اور آپ سے بالکل الگ نہیں ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس سفید رنگ کے خچر پر سوار تھے جو آپ کو فروہ بن نفاشہ جذامی نے ہدیہ میں دی تھی۔ جب مسلمانوں اور کفار کا مقابلہ ہوا تو مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے خچر کو کفار کی جانب دوڑا رہے تھے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں خچر کی

لگام تھام کر اس کو تیز بھاگنے سے روک رہا تھا اور حضرت ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رکاب پکڑے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عباس! اصحاب سمرہ کو آواز دو، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلند آواز شخص تھے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے بآواز بلند پکارا؛ اصحاب سمرہ کہاں ہیں؟ (سمرہ وہ درخت ہے جس کے نیچے صحابہ نے بیعت رضوان کی تھی، اس کا یہ معنی ہے کہ ان مسلمانوں کو آواز دو جنہوں نے حدیبیہ کے دن بیعت رضوان کی تھی) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: بخدا آواز کا سنتے ہی وہ اس طرح پلٹے جیسے گائے اپنے بچوں کی طرف پلٹتی ہے۔ وہ لہیک! لہیک! کہتے ہوئے دوڑے آئے اور انہوں نے کافروں سے لڑنا شروع کر دیا۔ انہوں نے انصار کو بلایا، وہ کہتے تھے ”اے انصار کی جماعت! اے انصار کی جماعت! پھر بنو خزرج کو بلایا گیا پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا درآنحالیکہ آپ خنجر پر سوار تھے آپ ان کی جنگ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تنور گرم ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چند کنکریاں اٹھائیں اور کفار کے چہروں کی طرف پھینکیں اور فرمایا: رب محمد کی قسم! یہ شکست کھا گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ لڑائی اسی تیزی کے ساتھ جاری تھی کہ آپ نے چند کنکریاں اٹھا کر کفار کے چہروں پر ماریں (اس باب کی آخری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ان کا منہ کالا ہو گیا) بخدا میں نے دیکھا کہ ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ (صحیح المسلم کتاب المغازی، السنن الکبریٰ للنسائی، حدیث نمبر: ۸۶۵۳، تفسیر

عبدالرزاق، رقم الحدیث: ۱۰۶۴، بحوالہ تیان القرآن، ج: ۵، ص: ۱۰۹-۱۱۰)

غزوہ طائف اور حضرت عباس: محاصرہ طائف میں بھی حضرت عباس رضی

اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے، اس غزوے میں بھی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی خداداد شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ آج بھی لوگ سن کر حیران رہ جاتے ہیں اور ان کی جواں مردی کے ترانے گانے لگتے ہیں۔ جس وقت حضور صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کیا تو ایک صحابی رسول کے ساتھ بڑا خطرناک معاملہ پیش آیا، طائف کے قلعہ سے ایک دشمن نکل آیا اور صحابی رسول کو پکڑ کر اٹھالے گیا اس کی کوشش تھی کہ انہیں قلعہ میں لے جائے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ملاحظہ کیا تو فرمایا: جو میرے اس صحابی کو دشمن کے چنگل سے چھڑالائے اس کے لیے جنت ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً اٹھ کر چھڑانے کے لیے چل پڑے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعاؤں سے نوازتے ہوئے فرمایا: چچا جاؤ تمہارے ساتھ جبرئیل و میکائیل بھی ہیں، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ گئے صحابی رسول اور دشمن رسول دونوں کو اٹھا کر لے آئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے لا کر حاضر کر دیا۔

دوسری روایت میں ان صحابی کا نام اور کام دونوں موجود ہے صحابی کا نام حضرت حنظلہ بن ربیع تھا انہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل طائف سے گفتگو کے لیے بھیجا تھا پھر وہ ہوا جو آپ پڑھ چکے ہیں، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر قلعہ سے پتھروں کی بارش بھی کی گئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے پیارے چچا کے لیے دست دعا بلند کر دیے یہاں تک کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس سلامت لوٹ آئے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲۶، ص: ۳۴۰)

حرم کی سقایت و عمارت: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمانہ جاہلیت میں قبیلہ قریش کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ مسجد حرام میں سقایت یعنی پانی پلانے کی خدمت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھی اور عمارت بھی انہیں کے سپرد تھی، عمارت کا معنی مسجد حرام کو گالی گلوچ سے بچانا ہے۔ وہ کسی کو بھی مسجد حرام میں ایسا کرنے نہیں دیتے تھے اہل قریش اس معاملے میں ان کے مددگار تھے۔ (اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۳)

زم زم حضرت عباس کے حوالے: بخاری شریف کے ایک باب، باب سقایت الحاج کی تشریح کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں: السقایت کا معنی ہے: پانی

پلانے کے لیے جو جگہ بنائی جائے (سبیل) قرآن مجید میں ہے: ”أَجْعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ“ (سورہ توبہ: ۱۹) کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے کو بنا لیا ہے۔ ”جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ“ (یوسف: ۷۰) اس نے پانی پینے کا شاہی پیالہ اپنے بھائی کی بوری میں رکھ دیا۔ علامہ ابن اثیر نے کہا ہے کہ حجاج کے پانی پینے کی سبیل وہ تھی جس سے قریش حجاج کو پانی پلاتے تھے، اس کے پانی میں کشمش ملائی جاتی تھی، زمانہ جاہلیت اور اسلام میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے والی اور منتظم تھے، کعبہ کے صحن میں جو حوض بنایا جاتا اس کو ”سقایہ“ اور ”سبیل“ کہتے تھے۔

(النهاية، ج: ۲، ص: ۳۴۲، دارالکتب العلمیہ، بیروت: ۱۴۱۸ھ، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۴، ص: ۸۰)

الفاہی نے عطا سے روایت کی ہے کہ حجاج کے پانی پینے کی جگہ زم زم ہے۔ ارزقی نے کہا ہے کہ عبدمناف مشکوں میں پانی بھر کر مکہ لاتے تھے اور کعبہ کے صحن میں حجاج کے لیے جو حوض بنائے گئے تھے اس میں وہ پانی ڈال دیتے تھے، پھر ان کے بعد ان کے بیٹے ہشام یہ خدمت انجام دینے لگے، پھر ان کے بعد حضرت عبدالمطلب یہ کام کرنے لگے، پھر جب زم زم کا کنواں کھودا گیا تو وہ کشمش خرید کر زم زم کے پانی میں ڈال دیتے تھے اور لوگوں کو پانی پلاتے تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ قصی بن کلاب جب کعبہ کے والی اور منتظم بنے تو کعبہ کی درباری، سبیل، جھنڈا، الوفاہ اور دارالندوہ کو ان کے سپرد کر دیا گیا، پھر ان کے بیٹوں نے اس پر صلح کر لی کہ پانی کی سبیل اور وفاہ (وفود کو ٹھہرانے کا انتظام کرنا) تو عبدمناف کو دے دیا جائے اور باقی امور دوسروں کو دے دیے جائیں، پھر پانی کی سبیل کا انتظام عبدالمطلب کے بعد ان کے بیٹے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دیا گیا اور اس کا انتظام ان ہی کے بھائیوں میں چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ ان ہی کے پاس رہا حتیٰ کہ جب اسلام قائم ہوا تب بھی یہ انتظام ان ہی کے ہاتھ میں تھا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی طریقے کو برقرار رکھا اور وہ آج تک بنو العباس کے ہاتھ میں ہے۔

یہ حضرت علامہ بدرالدین عینی کے زمانے کی بات ہے آج کس کے ہاتھ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ بظاہر تو موٹر کے ذریعے پانی کھینچا جاتا ہے اور عمال حضرات اس کو پائپ لائن یا چھوٹے ڈرموں کے ذریعے حجاج تک پہنچاتے ہیں۔ سعیدی صاحب علامہ ابن بطال کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں: ارباب سیرت کی ایک جماعت نے کہا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حجاج کے پانی پلانے کا منصب عطا فرمانا ان کی تکریم کے لیے تھا، وہ لوگوں کو کھجوروں کی نبیذ پلاتے تھے پس نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو اسلام میں اس منصب پر برقرار رکھا۔ طاؤس نے کہا: سبیل سے نبیذ کو پینا حج کے اتمام سے ہے۔ عطا نے کہا: میں نے اس مشروب کو پایا جو شخص اس کو پیتا تھا مٹھاس کی وجہ سے اس کے ہونٹ چپک جاتے تھے (ایضاً، ص: ۸۱)

حضرت عباس کا حضور کو پانی پلانا: بخاری شریف میں امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پانی کے سبیل پر آئے آپ نے پانی مانگا، تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے فضل! اپنی امی کے پاس جاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ان کے پاس سے پانی لاؤ۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اسی پانی سے پلاؤ، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگ اس پانی میں اپنے ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اسی سے پلاؤ، پھر آپ نے اس سبیل سے پانی پیا پھر آپ زم زم پر آئے، وہاں لوگ کنویں سے پانی کھینچ کر نکال رہے تھے، آپ نے فرمایا: تم یہ عمل کرتے ہو، تم نیک کام کر رہے ہو۔ پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم مغلوب ہو جاؤ گے تو میں (اونٹ سے) اترتا اور کندھے پر رسی رکھ کر پانی کھینچتا۔ یہ فرماتے ہوئے آپ نے کندھے کی طرف اشارہ کیا۔ (صحیح البخاری، کتاب الحج، باب سقایۃ الحاج)

منیٰ کی راتیں مکہ میں: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کو اجازت دی تھی کہ جو راتیں حجاج کرام منیٰ میں گزارتے ہیں، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو مکہ میں گزار لیں۔ اس واقعے کو امام بخاری سے سنیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ وہ حجاج کرام کو پانی پلانے کے لیے منیٰ کی راتیں مکہ میں گزاریں تو آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ (ایضاً)

چچا کی خاطر دلی خواہش کو ترک کیا: علامہ المہلب نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منیٰ کی راتوں میں مکہ میں رہنے کی اجازت دی اور ان پر قربانی واجب نہیں کی کیونکہ حجاج کو پانی پلانا بھی حج کے اعمال میں سے ہے۔ کیا تم نے نہ دیکھا کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زم زم پر آئے اور لوگ پانی پلا رہے تھے تو آپ نے فرمایا: تم عمل کرتے رہو کیونکہ تم صالح عمل کر رہے ہو اور آپ نے فرمایا: اگر تم مغلوب نہ ہو جاتے تو میں بھی پانی پلانے کے لیے اونٹ سے اترتا۔ اس حدیث میں آپ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زم زم سے پانی پلانے کے منصب پر برقرار رکھا ہے کیوں کہ آپ کو خطرہ تھا کہ اگر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زم زم سے پانی پلایا تو بعد میں آنے والے سلاطین پانی پلانے کو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت سمجھ کر اپنالیں گے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اولاد سے یہ منصب چھین لیں گے اس لیے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود زم زم سے پانی نہیں پلایا۔

(شرح ابن بطال، ج: ۴، ص: ۲۷۲، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۴، ص: ۸۱)

تکریم پر تواضع کو اختیار کیا: علامہ بدرالدین عینی نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

علامہ ابن التین نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو زم زم کے پانی سے پیا، یا تو آپ نے کعبہ کے مال خمس میں سے پیا، یا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مال سے پیا جس کو انہوں نے غنی اور فقیر دونوں کے لیے وقف کر دیا تھا، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے اس میں سے اس لیے پیا تاکہ آپ کی امت کے لیے آسانی ہو۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زم زم کا پانی طلب کر کے پیا تاکہ اس بات پر دلیل ہو کہ پانی کا طلب کرنا جائز ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تکریم کے لیے حضرت فضل سے کہا کہ وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو گھر سے پانی لا کر پلائیں لیکن آپ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ کسی مصلحت کی وجہ سے کسی کی تکریم کے عمل کو مسترد کرنا جائز ہے اور یہاں مصلحت یہ تھی کہ کعبے کی سبیل سے پانی پینا لوگوں کے لیے سنت ہو جائے اور اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تواضع کا بھی بیان ہے۔ آپ نے چاہا کہ آپ وہیں سے پانی پیئیں جہاں سے عام لوگ پانی پی رہے ہیں۔ آپ نے اپنے لیے خصوصی اہتمام کو پسند نہیں کیا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پانی میں پاک ہاتھ ڈالنے سے وہ پانی نجس نہیں ہوتا اور اصل پانی میں طہارت ہے۔

(عمدة القاری، کتاب الحج باب سقایۃ الحاج، نعمۃ الباری، ج: ۴، ص: ۸۲)

حضور کے بچپن پر عباس کی شفقت: بخاری شریف میں امام بخاری روایت

کرتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کعبے کی تعمیر کے لیے لوگوں کے ساتھ پتھر اٹھا کر لا رہے تھے اور آپ نے تہبند باندھا ہوا تھا آپ سے آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے میرے بھتیجے! اگر تم اپنے تہبند کو اتار دو اور اس کو اپنے کاندھوں کے اوپر پتھر کے نیچے رکھ دو (تو بہتر ہوگا) حضرت جابر نے کہا: پھر انہوں نے آپ کا تہبند اتار کر آپ کے کاندھوں پر رکھ دیا تو آپ فوراً بے ہوش ہو کر گر گئے، اس کے بعد آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا گیا۔ (کتاب الصلوٰۃ باب کراہیۃ التعری فی الصلوٰۃ)

حدیث میں مذکور باتیں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اور صرف اپنے بھتیجے (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی محبت میں ہی کہیں اور ان کو انجام دیا۔ اس سے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت و شفقت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ اس

زمانے کی بات ہے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اعلان نبوت بھی نہیں فرمایا تھا۔ حدیث پڑھ کر کچھ سوالات ذہن میں ابھر سکتے ہیں یا ابھر چکے ہوں گے۔ اس لیے ہم حدیث کی قدرے شرح علمائے اسلام کے حوالوں سے کیے دیتے ہیں۔ علامہ غلام رسول سعیدی تحریر فرماتے ہیں: علامہ ابوالحسن علی بن خلف ابن بطل مالکی قرطبی متوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں: بعثت سے کافی پہلے کعبے کی تعمیر ہوئی، اس وقت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نابالغ تھے اور آپ کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر اپنی مخلوق کی طرف بھیجا اور آپ کو ان تمام چیزوں کا علم دیا جن کو آپ پہلے نہیں جانتے تھے اور آپ پر قرآن نازل کیا جس نے آپ کو اس پر براہیجنتہ کیا کہ آپ یہ حکم دیں کہ بیت اللہ میں کوئی برہنہ طواف نہیں کرے گا، اور آپ کے اس حکم نے جاہلیت کی ان عادات کو منسوخ کر دیا کہ وہ ایک دوسرے کی شرم گاہوں کو دیکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکیزہ اخلاق اور شریفانہ خصال پر پیدا کیا تھا، کیا تم نے نہ دیکھا کہ جب آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا تہبند اتار تو آپ بے ہوش ہو کر گر گئے اور اس کے بعد کسی نے آپ کو برہنہ نہیں دیکھا۔ (شرح ابن بطل، ج: ۲، ص: ۲۴، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۲۴ھ)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کم عمری میں آپ کو فتنچ کاموں سے محفوظ رکھا اور اخلاق جاہلیت سے آپ کی حفاظت کی، اس پر پہلے کلام گزر چکا ہے کہ آپ اعلان نبوت سے پہلے کفر اور گناہوں سے معصوم تھے، اس حدیث میں یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ کی شرم گاہ لوگوں پر منکشف ہو گئی تھی کیوں کہ تہبند اتارتے ہی آپ زمین پر بے ہوش ہو کر گر گئے تھے اور یہ کسی کی آپ پر نظر پڑنے سے پہلے ہوا، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ایک اور حدیث میں مذکور ہے: آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری تکبریم یہ ہے کہ میں ختنہ کیا ہوا پیدا ہوا اور کوئی شخص میری شرم گاہ پر مطلع نہیں ہوا۔

(تحفۃ المودود فی احکام المولود، ص: ۱۵۹)

بعض روایات میں مذکور ہے کہ ایک فرشتہ نازل ہوا اور اس نے میرا تہبند باندھ دیا۔

(اکمال المعلم بفوائد المسلم، ج: ۲، ص: ۱۹۰-۱۹۱، دار الوفاء ۱۴۱۹ھ)

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تہبند آپ کے کندھے پر رکھا گیا تو آپ زمین پر گر گئے، اس میں دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بچپن میں آپ کی حفاظت کی اور اللہ تعالیٰ نے خود آپ کو ادب سکھایا، کسی اور کو آپ کی تادیب پر مامور نہیں کیا، اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کی نگرانی کرتا رہا حتیٰ کہ افعال جاہلیت کو آپ کے نزدیک مکروہ بنا دیا اور آپ کو ان افعال سے محفوظ رکھا حتیٰ کہ ان میں سے کوئی چیز آپ پر جاری نہیں ہوئی اور یہ سب اللہ تعالیٰ کا آپ پر لطف و کرم تھا اور آپ میں محاسن کو جمع کرنا تھا۔

(المفہم، ج: ۶، ص: ۱۱۸، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۲، ص: ۸۵-۸۶)

حضرت عباس کی تکلیف سے حضور بے قرار: جنگ بدر کا معرکہ سر ہو چکا

تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو نصر معزز عطا فرمائی تھی، کفر کا زور ٹوٹ چکا تھا، غرور خاک میں مل چکا تھا، ابو جہل جیسے کفر کے سرغنہ دائمی ذلت میں قید ہو چکے تھے انہیں مسلمانوں کی دھاردار تلواروں نے ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا، یہ دن بڑی خوشی کا دن تھا۔ رات تو بڑے آرام سے سونے اور پچھلی تکان اتارنے کی تھی لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تکلیف کی وجہ سے سو نہیں پائے، آپ سمجھتے ہوں گے شاید حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم پاک کو کوئی زخم لگا ہوگا اور اس میں درد ہو رہا ہوگا یا جسم میں کوئی دوسری تکلیف رہی ہوگی جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سو نہیں پائے ہوں گے۔ نہیں اور ہرگز نہیں ان میں سے کوئی بھی معاملہ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پیش نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بے قرار تھے، اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بے قراری کو صحابہ کرام نے محسوس کر لیا تھا۔ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا گیا، حضور! سو کیوں نہیں پارہے ہیں؟ تو جواب میں مشفق و مہربان آقا نے فرمایا: ”سعمت انین

العباس فی وثاقہ“ بندھے ہوئے چچا عباس کا کراہنا نہیں سونے دیتا۔ مسلمان اس چیز کو کیسے برداشت کر سکتے تھے جس کے وجود سے حضور کو تکلیف ہو، فوراً ایک صحابی قیدیوں کی طرف بڑھے اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بند ڈھیلے کر دیے۔

اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا ہوا، چچا عباس کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے؟ صحابی رسول نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بند ڈھیلے کر دیے ہیں، عدل و مساوات کے علم بردار نبی معظم کو یہ کیسے گوارہ ہو سکتا تھا کہ چچا کو بندشوں کی صعوبتوں سے نجات مل جائے اور بقیہ قیدی اسی تکلیف میں مبتلا رہیں۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (قیدی قید ہونے میں سب برابر ہیں) لہذا سارے قیدیوں کی بندشیں ڈھیلی کر دی جائیں، حکم پا کر صحابہ کرام نے سارے قیدیوں کے بند ڈھیلے کر دیے۔ (اسد الغابہ، ج: ۳ ص ۱۶۴، رجال حول الرسول، ص: ۳۱۰)

فدیہ معاف کرنے کی ادھوری خواہش: امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار کے کچھ مردوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی، انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ چھوڑ دیں۔ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم! تم فدیہ میں سے ایک درہم بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ (بخاری کتاب المغازی، حدیث نمبر: ۴۰۱۸)

علامہ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں: ابن عائد نے مغازی میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدر کے قیدیوں کو بہت سختی کے ساتھ باندھا تھا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رات کو ان کے کراہنے کی آواز سنی تو آپ کو نیند نہیں آئی، انصار کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا ان کی بندشیں کھولنے میں ہے تو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بندشیں کھول دیں اور آپ کی مزید رضا حاصل کرنے کے لیے کہا کہ ہم ان کا فدیہ بھی چھوڑ دیں تو آپ نے اس کو منظور نہیں کیا۔

(فتح الباری، ج: ۵ ص: ۱۷۸، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷ ص: ۳۱۸)

فدیہ معاف کیوں نہیں کیا؟: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر کے دن قریش کے ساتھ قید کیے گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قریش سے فدیہ لیا تھا تو انصار نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اکرام کی وجہ سے اور آپ کی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرابت کی وجہ سے ان سے فدیہ لینے کو ترک کر دیں، سو آپ نے اس کی اجازت نہیں دی اور مساوات کے اصول کو قائم رکھا جب سب جنگی قیدیوں سے فدیہ لیا جا رہا ہے تو آپ کے چچا عباس سے بھی فدیہ لیا جائے گا اور آپ کے ساتھ نسی قرابت کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی اور یہی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کا وہ زریں پہلو ہے جس کی وجہ سے اسلام بہت جلد لوگوں کے دلوں میں پھیل گیا۔ (نعمۃ الباری، ج: ۵، ص: ۳۰۸)

حضرت عباس، وسیلہ مقبولہ: دور امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات ہے کہ ۱۷ھ میں مسلمانوں پر بڑا ہی سخت وقت آیا، آسمان نے زمین سے نظر سخاوت پھیر لی، بارش نازل نہیں ہوئی، زمین نے ایک مثالی قحط سالی دیکھی، زمین سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بجنے لگی، لوگ پانی کو ترس گئے، رحمت پروردگار کو متوجہ کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں، اپنے اپنے طور پر دعا کرنے میں کسی نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن ابھی تک پانی کا ایک قطرہ بھی نازل نہیں ہوا۔

کلام کا اگلا حصہ امام محب الدین احمد بن عبد اللہ طبری سے سنیے، آپ لکھتے ہیں:

جب زمین بالکل خشک ہو گئی تو حضرت کعب نے امیر المومنین کی بارگاہ میں آکر عرض کیا: جب بنی اسرائیل پر قحط سالی آئی تھی تو وہ انبیاء کے عصبہ رشتہ داروں کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر یہی بات ہے تو ہمارے بیچ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے محترم چچا موجود ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والد کے قائم مقام بھی ہیں اور بنی ہاشم کے سردار بھی ہیں، اس گفتگو کے فوراً بعد امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بارگاہ میں

پہنچے اور لوگوں کی روداد غم کہہ سنائی پھر آپ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے کر منبر پر تشریف لائے اور بارگاہ رب العزت میں عرض گزار ہوئے: اے اللہ! ہم تیرے نبی کے محترم چچا جو ان کے والد کے قائم مقام ہیں کے وسیلے سے تیری بارگاہ میں دعا کر رہے ہیں تو ہم پر بارش نازل فرما اور ہمیں مایوس نہ فرما۔

جب حضرت عمر اپنی دعا سے فارغ ہوئے تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا: اب آپ دعا کیجیے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے، پہلے رب تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالائے اور پھر یوں عرض کرتے ہیں: اے اللہ! تیرے پاس بادل ہیں اور پانی بھی ہے تو بادل بھیج کر پانی نازل فرما دے، اس کے ذریعے اصل و نسل کی حفاظت فرما دے، کھیتیاں بڑھا دے، جانوروں کے تھنوں میں دودھ عطا فرما، اے اللہ! بلائیں گناہوں سے آتی ہیں اور توبہ سے رد ہو جاتی ہیں، قوم نے مجھے تیری بارگاہ میں وسیلہ بنایا ہے تو اس کی لاج رکھ لے اور بارش نازل فرما، اے اللہ! تو ہمارے لیے ہماری دعا قبول فرما لے، اے اللہ! ان بے منہ جانوروں کی وجہ سے بارش نازل فرما دے، اے اللہ! فائدے مند عام تام بارش نازل فرما، اے اللہ! ہم تجھ سے ہی امید رکھتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی طرف راغب ہوتے ہیں، اے اللہ! تیری ہی بارگاہ میں ہر بھوکے، ہر ننگے، ہر خوف والے اور کمزور کی فریاد پیش ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلے اور ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور اسی دم زوردار بارش ہوئی کہ ندی نالے بھر گئے، زمین ہری بھری ہو گئی لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم! یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت عباس کے وسیلے کی برکت ہے اور یہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درجے کی مقبولیت ہے۔ حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ لوگ دعا کر کے اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہ تھے کہ انہیں سیراب کر دیا گیا تھا۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۳۳، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ص: ۵۵۸)

اس سلسلے میں دیگر روایات بھی موجود ہیں اگر روایات کے الفاظ جمع کیے جائیں

تو کلام بہت طویل ہو جائے۔ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح کے اندر کتاب الاستسقاء میں باب سوال الناس الامام کے تحت اس کو مختصراً روایت کیا ہے۔

حریمین کے ساقی کے بوسے: کئی مرتبہ حالات و واقعات جذبہ دروں کو پوشیدگی کی وادیوں سے نکال کر شہود کا لباس عطا کرتے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام کے درمیان موقر و محترم تو تھے ہی لیکن جس وقت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلے و دعا سے بند دروازے کھل گئے تھے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں جھوم کر برسی تھیں، اس وقت لوگوں کے دلوں میں موجود حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت کے دریا میں تموج پیدا ہو گیا، جس کا اظہار لوگوں نے اپنے اس رد عمل سے کیا۔

لوگ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے، کوئی ان سے گلے ملتا تو کوئی ان کے جسم (دست و پا) کو چومتا، لوگ اپنے اس عمل سے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے برکت حاصل کرتے اور انہیں ان الفاظ کے ساتھ مبارک بادیاں پیش کی جا رہی تھیں ”هنيئاً لك ساقى الحرمين!“ اے عباس! حریمین کو سیراب کرنا تمہیں مبارک ہو۔

(رجال حول الرسول، ص: ۳۰۴، اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۶)

شان عباس بزبان حسان: اس مبارک موقع پر شاعر دربار رسالت حضرت حسان بن ثابت نے بڑے ہی وجد آفریں اشعار کہتے ہوئے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف و توصیف فرمائی:

سَأَلَ الْإِمَامُ وَقَدْ تَتَابَعَ جَدُّ بْنُ فَسَقَى الْعَمَامُ بِغُرَّةِ الْعَبَّاسِ

امام وقت کی دعا کے بعد بھی قحط سالی بڑھتی چلی گئی۔ لیکن عباس کی وجاہت سے پانی برس گیا۔

عَمُّ النَّبِيِّ وَصُنُوْا إِلَيْهِ الَّذِي وَرِثَ النَّبِيُّ بِذَلِكَ دُونَ النَّاسِ

(عباس) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا اور والد کی جگہ ہیں۔ انہوں نے حضور سے وہ وراثت پائی ہے جو دوسروں نے نہ پائی۔

أَحْيِ الْإِلَهَ بِهِ الْبِلَادَ فَاصْبَحَتْ مُحْضَرَّةَ الْأَجْنَابِ بَعْدَ الْيَأْسِ

عباس کے صدقے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ملک کو حیات نو بخشی۔ اور ناامیدی کے

بعد ہر طرف شادابی آگئی۔ (اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۶)

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ کے مقررین چاہے وہ انبیائے کرام علیہم السلام ہوں یا اولیائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان سب کو رب تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ بنانا جائز بلکہ مستحب ہے اور آج کے دور میں اہل سنت و جماعت کی یہ شناخت و پہچان ہے۔ اس پورے واقعے سے وسیلے کا پختہ ثبوت ملتا ہے اگرچہ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن قارئین کرام کے لیے بہت فائدے مند ہے لہذا ہم شارح بخاری حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی زبانی قدرے تفصیل پیش کرتے ہیں۔ آپ رقم طراز ہیں:

علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی نے فرمایا کہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صالح اور دین دار لوگوں سے اور اہل بیت سے خدا کی بارگاہ میں سفارش طلب کرنا مستحب ہے۔

زہیر بن بکار نے انساب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس حدیث کو یوں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس دن یہ خطبہ دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باپ کی جگہ جانتے تھے۔ اے لوگو! اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو برتاؤ تھا اس کی پیروی کرو اور انہیں اللہ کی طرف وسیلہ بناؤ۔ (الحديث)

اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں بطریق محمد بن ثنیٰ سند مذکور کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نیز اسماعیلی نے بھی بطریق محمد بن ثنیٰ سند مذکور کے ساتھ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ روایت کیا ہے نیز عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، نیز ابوالقاسم ابن عساکر نے بھی کتاب الاستسقاء میں انہیں سے روایت کیا ہے۔

یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اہل بیت اور بزرگان دین کو خدا کی بارگاہ میں وسیلہ

بنانا مستحب ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن حجر اور علامہ عینی نے تصریح کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل تمام صحابہ کرام کے مجمع میں ہوا اور سب نے اس پر عمل کیا تو توسل کا مستحب ہونا اجماع صحابہ سے ثابت ہو گیا۔

اس پر غیر مقلدین اور توسل کے منکرین یہ کہتے ہیں: اس حدیث میں توسل سے مراد دعا کی درخواست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اقول۔ دوسری روایتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر یہ لوگ صرف بخاری کی روایت پر ایمان رکھتے تو ایسی بے تکی بات نہیں کرتے۔ بخاری کے الفاظ پر ایک نظر ڈالیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”إِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ“ الحدیث۔ حضرت عمر بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کرتے ہیں: اے اللہ! ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کو وسیلہ بناتے تھے اور اب ہم اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ لاتے ہیں ہمیں سیراب فرما۔ یہ عرض اللہ عزوجل کی بارگاہ میں ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں نہیں۔ اس میں صاف صاف تصریح ہے کہ اے اللہ! ہم اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ لاتے ہیں ہم کو سیراب فرما یہ عرض داشت اللہ عزوجل کی بارگاہ میں ہے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلے سے۔ پھر یہ کہنا کہ توسل سے یہاں مراد دعا کی درخواست ہے۔ ابلہ فریبی اور حدیث کی تحریف معنوی نہیں تو کیا ہے؟ دوسرے طرق میں جو دعا کے کلمات مروی ہیں ان میں بھی تقریباً یہی مضمون ہے۔

کبھی ان میں سے کچھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ زندہ کا توسل درست ہے مردے کا شرک۔ اقول: اولاً اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیوی جسمانی حقیقی حیات کے ساتھ زندہ ہیں تو یوں بھی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل درست ہوا اور یہ کہنا کہ اگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل اب بھی جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ہی سے کیوں توسل نہیں کیا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیوں کیا۔ یہ پہلی سے بھی بڑی جہالت ہے اگر کسی کام کے چند طریقے ہوں تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا اس کی دلیل نہیں کہ دوسرے طریقے غلط ہیں خصوصاً جب

اختیار کردہ طریقے میں کوئی خاص فائدہ ہو یہاں بجائے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے توسل میں ایک اہم افادہ مقصود تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل کا استحباب سب کو معلوم تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو وہم ہوتا کہ غیر نبی سے توسل حرام ہے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وسیلہ بنا کر بتا دیا کہ غیر نبی سے توسل اسی طرح مستحب ہے جیسے انبیاء کرام سے ہے۔

ثانیاً علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اور علامہ احمد خطیب قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمر کے خازن مالک داری کہتے ہیں کہ حضرت عمر کے زمانے میں لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو ایک صاحب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مزار اقدس (قبر انور) پر حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا: یا رسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش طلب فرمائیے، لوگ ہلاک ہو گئے، ایک صاحب کے خواب میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: عمر سے جا کر کہہ دو کہ عنقریب بارش آئے گی۔ سیف نے الفتوح میں لکھا ہے کہ یہ صاحب حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ اس حدیث کو علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ احمد خطیب قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں صحیح کہا ہے۔ اسے بیہقی نے دلائل النبوة جلد ہادی عشر میں روایت کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے قرۃ العینین میں الاستیعاب کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

اس حدیث صحیح سے ثابت کہ کبھی کبھی صحابہ کرام مزار اقدس (قبر انور) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر حاضر ہو کر حضور سے بھی استعانت کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ بارگاہ قدس کے خواص کے مزارات پر طلب حاجات کے لیے حاضری صحابہ کرام کی سنت ہے اور یہ تو ثابت ہی ہے کہ بعد وصال صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔ حل مشکلات کے لیے درخواست کرتے اس لیے یہ کہنا کہ بعد وصال حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے توسل حرام یا شرک ہے اس حدیث صحیح کا رد ہے۔

تنبیہ: بعض روایات میں قحط سالی کا سال ۱۷ھ بتایا گیا ہے اور بعض میں ۱۸ھ ذکر ہے، وجہ تطبیق یہ ہے کہ ۱۷ھ کے آخر سے شروع ہوا اور ۱۸ھ تک جاری رہا ہو، اسی لیے کسی نے ۱۷ھ اور کسی نے ۱۸ھ بیان کیا ہے۔

جتنا اٹھا سکو لے لو: جنگ بدر کے موقع پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے فدیہ اور عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کے فدیہ کے طور پر مال خطیر وصول کیا تھا جس سے ان کی مالی حالت پر بڑا فرق پڑا تھا اور وہ مقروض ہو گئے تھے۔ (شرح ابن بطل) اس کا احساس انہیں رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بحرین سے کثیر مال حاضر کیا گیا، مال کا ڈھیر دیکھ کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پھر اپنا مال یاد آ گیا، حضور سے حسن طلب کے ساتھ ملتی ہوئے، حضور نے مرضی کے مطابق لینے کی اجازت عطا فرمائی۔ پوری حدیث امام بخاری سے سنیں:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بحرین کا مال آیا اور یہ سب سے زیادہ مال تھا جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا، رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو مسجد میں پھیلا دو، رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے لیے چلے گئے اور آپ نے اس مال کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، جب آپ نے نماز پڑھ لی تو آپ اس مال کے پاس آ کر بیٹھ گئے، آپ جس شخص کو بھی دیکھتے، اسے مال سے عطا کرتے، اچانک آپ کے پاس حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے اور انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے دیجیے کیوں کہ میں نے اپنا فدیہ بھی دیا تھا اور عقیل کا فدیہ بھی دیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: آپ لے لیں، انہوں نے اپنا کپڑا بچھا دیا اور اس میں مال ڈالا حتیٰ کہ اس کی چوٹی بن گئی (بڑا ڈھیر بن گیا) پھر وہ اس کو اٹھانہ سکے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کسی سے کہیے کہ وہ اس کو اٹھا کر میرے اوپر رکھ دے، آپ نے فرمایا: نہیں! انہوں نے کہا: پھر آپ اس کو اٹھا کر میرے اوپر رکھ دیں، آپ نے فرمایا: نہیں! انہوں نے اس سے مال کم کیا پھر بھی اس کی

چوٹی بن گئی، پس انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کسی سے کہیے یہ مال اٹھا کر میرے اوپر رکھ دے، آپ نے فرمایا: نہیں! انہوں نے کہا: آپ خود اٹھا کر میرے اوپر رکھ دیں، آپ نے فرمایا: نہیں! انہوں نے اس سے کچھ مال کم کیا، پھر اٹھا کر اس کو اپنے کندھے کے اوپر رکھ لیا، پھر چلے گئے اور ان کی حرص پر تعجب کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر ان کا پیچھا کرتی رہی حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور جب تک وہاں ایک درہم بھی باقی تھا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وہاں سے نہیں اٹھے۔

(صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب القسمۃ وتعلیق القنوی المسجید)

طبقات ابن سعد میں ہے: اس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہنسی آگئی یہاں تک کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک دانت ظاہر ہو گئے۔ (ج: ۴، ص: ۱۴)

علامہ غلام رسول سعیدی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

آپ نے ہر ایک سے یہ کہا تھا کہ وہ اتنا مال لے جس کو وہ خود اٹھا کر لے جاسکے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ آپ ان کی قرابت کی وجہ سے ان کی خصوصی رعایت کر دیں گے اور زیادہ مال کسی کو اٹھا کر ان کے کندھے پر رکھنے کے لیے فرمائیں گے یا خود اٹھا کر رکھ دیں گے لیکن نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا انکار کر دیا اور یہ ظاہر فرمایا جس طرح سب کو دیا گیا ہے اسی طرح آپ کو بھی دیا جائے گا۔ اور آپ کی قرابت کی وجہ سے آپ کو رعایت نہیں دی جائے گی یا آپ کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔ آپ نے اپنے عم محترم کی درخواست کو مسترد کر دیا مگر مساوات کے اصول کا جھنڈا بلند کر دیا۔ (نعمۃ الباری، ج: ۲، ص: ۱۷۲)

علامہ ابن بطال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے سے کسی کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ مال ان کے کندھے پر رکھ دے اس میں یہ حکمت بھی ہے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زیادہ مال اکٹھا کرنے سے روکنا چاہتے تھے

کہ وہ اپنی ضروریات سے زیادہ دنیا کا مال نہ لیں اور جتنا مال آسانی سے اٹھا کر لے جاسکتے ہیں اسی پر قناعت کریں اسی لیے آپ نے خود ان کے کندھے پر مال اٹھا کر نہ رکھا تا کہ اس کام میں آپ کی اعانت شامل نہ ہو جو آپ کی مرضی کے خلاف ہے اور جس سے آپ منع فرماتے ہیں۔ (شرح ابن بطل، ج: ۲، ص: ۸۸، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۲، ص: ۱۷۴)

حضرت عباس قرآن میں: مفسرین کے فرمان کے مطابق قرآن پاک کی کئی آیات کا نزول حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ہوا خواہ یہ تعلق انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر۔

علامہ جلال الدین سیوطی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی تفسیر میں نقل فرماتے ہیں:

آیت کریمہ: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا“ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بنی مغیرہ کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی، یہ دونوں زمانہ جاہلیت میں شریک کار تھے جس وقت یہ مسلمان ہوئے تو لوگوں کے اوپر ان کی بڑی بڑی سودی رقمیں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرمائی کہ زمانہ جاہلیت میں جو سود تھا اس کو وصول مت کرو۔ (درمنثور، سورہ بقرہ، آیت نمبر: ۲۷۸)

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جاہلیت کے تمام سود کا لہدم کر دیے گئے ہیں، سب سے پہلے میں جس سود کو ختم کر رہا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ (ذخائر العقبی، ص: ۳۴۱)

عطیہ سے روایت ہے کہ آیت کریمہ: ”لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَكُمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ“ قبیلہ بنی ہاشم کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی، ان میں سے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ (ایضاً)

امام رازی حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں (جن لوگوں نے مسلمانوں سے قتال نہیں کیا) ان سے مراد بنی ہاشم کے کچھ افراد ہیں، ان میں سے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں، جنہیں بدر کی طرف مجبوراً لے جایا گیا تھا۔ (تفسیر رازی، سورہ ممتحنہ، بیت نمبر: ۸)

علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن میں نقل فرماتے ہیں: امام محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ لکھتے ہیں: حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ: ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَن فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَمْوَالِ“ (الانفال: ۷۰) اللہ کی قسم! میرے متعلق نازل ہوئی ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ذکر کیا تھا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میں نے کہا تھا کہ میرے بیس اوقیہ (آٹھ سو درہم) جو مجھ سے لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس کر دیے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا انکار کیا پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان بیس اوقیہ کے بدلے میں بیس غلام عطا کیے، جن میں سے ہر ایک میرے مال کی تجارت کرتا تھا۔ (سیرۃ ابن اسحاق، مطبوعہ: ۱۳۶۸ھ مطبوعہ، معارف اسلامی ایران)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بخدا! یہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی ہے، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور یہ سوال کیا کہ مجھ سے جو بیس اوقیہ لیے گئے ہیں، ان کو فدیہ کی رقم میں کاٹ لیا جائے تو رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا انکار کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان بیس اوقیہ کے بدلے میں بیس غلام عطا کیے جن میں سے ہر ایک میرے مال کی تجارت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں میں اللہ عز وجل سے مغفرت کی امید بھی رکھتا ہوں۔ (المعجم الاوسط، ج: ۹، ص: ۴۹، رقم الحدیث: ۸۱۰۳، م؛ ریاض، المعجم الکبیر، ج: ۱، ص: ۱۳۷، رقم الحدیث: ۱۱۳۹۸، تبیان القرآن، ج: ۴، ص: ۷۰۴-۷۰۵)

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھ سے جو بیس اوقیہ لیے گئے تھے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بیس غلام عطا کیے جن میں سے ہر ایک میرے مال کی تجارت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے زم زم عطا فرمایا اور اگر مجھے زم زم کے بدلے میں تمام اہل مکہ کا مال دیا جاتا تو وہ میں پسند نہ کرتا اور اس کے علاوہ میں اپنے رب سے مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۱۵)

جب مذکورہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: جب تم نے شرط پوری کر دی (تمہارے دل میں خیر پیدا ہوگئی) تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ (تمہیں مال دار بنا دیا) (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۴۱)

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مذکورہ آیت کریمہ میرے بارے میں نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں دو خصلتیں عطا فرمائی ہیں ان کے بدلے پوری دنیا لینا بھی پسند نہیں کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں نے چالیس اوقیہ فدیہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں چالیس غلام عطا فرمائے۔ دوسرے یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے اس مغفرت کی امید ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲۶، ص: ۲۹۳)

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا: کاش! آپ نے مجھ سے اور زیادہ مال فدیہ میں وصول کیا ہوتا۔ (سیدنا محمد رسول اللہ، ج: ۱، ص: ۲۶۳)

مناقب حضرت عباس: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عم محترم تھے، کوئی اجنبی انسان جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دامن رحمت سے لپٹ جائے بایں طور کہ شرف صحابیت سے سرفراز ہو جائے تو اس کی عظمت و رفعت پر قدسیوں کو رشک آنے لگتا ہے، پھر عم محترم کے مناقب کو کما حقہ کون جان سکے، قارئین کے اطمینان قلب کے لیے آپ کے مناقب سے متعلق ہم یہاں چند احادیث پیش کر رہے ہیں:

(۱) عبد المطلب بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ

تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس حالت غضب میں آئے، اس وقت میں بھی آپ کے پاس تھا، آپ نے پوچھا: آپ کو کس نے غضب ناک کیا؟ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! قریش کو کیا ہوا ہے جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو ہنسی خوشی ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو اس طرح نہیں ملتے، اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم غضب میں آگئے اور آپ کا چہرہ انور سرخ ہو گیا، پھر آپ نے ارشاد فرمایا: اس

ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ آپ لوگوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لیے محبت نہ رکھے، پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! جس نے میرے عم محترم کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی کیوں کہ ہر شخص کا چچا اس کے باپ کے مثل ہوتا ہے۔ (سنن ترمذی، رقم: ۳۵۸۰، مسند احمد، ج: ۱، ص: ۲۰۷)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: عباس مجھ سے ہیں اور میں عباس سے ہوں۔ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۳۵۹۰، مسند احمد، ج: ۱، ص: ۳۰۰)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: عباس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا ہیں اور ہر شخص کا چچا اس کے باپ کی مثل ہوتا ہے۔ (سنن ترمذی، ص: ۳۶۱، مسند احمد، ج: ۲، ص: ۳۲۲)

(۴) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: پیر کے دن صبح کو آپ خود اپنی اولاد کو لے کر میرے پاس آئیں تاکہ میں آپ کے لیے ایسی دعا کروں جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اولاد کو نفع پہنچائے، پھر صبح کو ہم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آپ کے پاس گئے تو آپ نے ہم کو ایک چادر اوڑھائی پھر دعا کی: اے اللہ! عباس اور اس کی اولاد کے لیے ظاہری اور باطنی مغفرت فرما اور ان کے کسی گناہ کو نہ چھوڑ، اے اللہ! ان کی اولاد کی حفاظت فرما۔ (سنن ترمذی: ۳۶۲، نہیمة الباری، ج: ۶، ص: ۸۱۰)

حضرت عباس کی مرویات: حافظ صفی الدین احمد بن عبد اللہ الخرزرجی المتونی ۹۲۳ھ لکھتے ہیں:

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پینتیس (احادیث) مروی ہیں جن میں سے ایک حدیث پر امام بخاری اور امام مسلم متفق ہیں اور امام بخاری ایک حدیث

کے ساتھ منفرد ہیں اور امام مسلم تین (۳) حدیث کے ساتھ منفرد ہیں۔

(خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال، ج: ۲، ص: ۴۲، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۸۱۰)

حضرت عباس کی تعظیم حضور فرماتے: ابو عمر نے کہا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی خوب خوب تعظیم فرماتے تھے۔ آپ کہتے تھے یہ میرے چچا ہیں، میرے باپ کی مثل ہیں۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت عروہ سے فرمایا: اے میرے بھانجے! میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعظیم قابل تعجب حد تک فرماتے تھے۔

ابن رشیدین سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعظیم اپنے والد کی طرح فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک لشکر تیار کر رہے تھے کہ حضرت عباس نمودار ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارے نبی کے چچا ہیں، قریش میں سب زیادہ سخی اور رشتہ داری نبھانے والے ہیں، یہ ابوالخلفاء ہیں اور سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عیادت کے لیے آئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو اپنے تخت کے اوپر اپنی جگہ پر بٹھا کر تعظیم فرمائی۔

ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے یہاں حاضر ہوئے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر عم محترم پر پڑی تو آپ کھڑے ہو گئے اور آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا پھر اپنی داہنی جانب بٹھایا، پھر فرمایا: یہ میرے چچا ہیں جو چاہے وہ میرے چچا پر ناز کرے۔ یہ بقیہ اہل بیت میں سب سے بہتر ہیں۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۲۱-۳۲۶)

جنت میں عباس منزل: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کو خلیل منتخب فرمایا، جنت میں میرا اور حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا محل آمنے سامنے ہوگا اور ان دونوں محلات کے بیچ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منزل ہوگی۔ اللہ کے دو خلیوں کے درمیان ایک بندہ مومن ہوگا۔

(ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۳۰، اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۵)

حضرت عباس کو عامل زکوٰۃ نہیں بنایا: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جا کر عرض کرو کہ وہ تمہیں صدقہ وصول کرنے پر مقرر فرمادیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جا کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اپنی عرضی پیش کر دی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چچا! میں آپ کو لوگوں کے گناہوں کا دھوون وصول کرنے پر متعین نہیں کر سکتا۔ محمد بن منکدر سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا: حضور! مجھے بھی کہیں کی امارت عطا فرمائیں آپ نے فرمایا: چچا! اگر تم نے اپنے نفس کو نجات دلا دی تو یہ ان گنت حکومتوں کے حاصل کرنے سے بہتر ہے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۲۴)

حضرت عباس سے حضرت ابوبکر کی محبت: ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محفل میں حاضر تھے۔ حضرت ابوبکر مصطفیٰ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دائیں طرف، حضرت عمر بائیں طرف اور حضرت عثمان سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے، حضرت ابوبکر نے عم نبی کے لیے جگہ چھوڑ دی جہاں خود بیٹھے تھے وہاں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بٹھایا۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۲۱)

دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر کا یہ عمل جس میں انہوں نے حضور کے عم محترم کی تعظیم کی تھی اتنا اچھا لگا کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خوش ہو گئے، یہ خوشی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چہرہ پر نور سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

(تاریخ دمشق، ج: ۲۶، ص: ۳۴۴)

حضرت عباس سے حضرت عمر کی محبت: ایک مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی معاملہ کو لے کر سوال کیا، اور کہا: یہ بتائیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صاحب ایمان چچا آپ کو ملتے تو آپ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا، اس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: امیر المومنین! میں تو آپ کے نبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا چچا ہوں، امیر المومنین نے عرض کیا: بھلا بتائیں تو سہی کہ میرا کون سا عمل محبت میں مشکوک ہو گیا؟ پھر فرمایا: عباس سنو! میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں: مجھے اپنے باپ کے مقابلے میں تمہارے باپ سے زیادہ محبت ہے کیوں کہ مجھے معلوم ہے میرے باپ کے مقابلے میں آپ کے باپ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زیادہ محبت فرماتے ہیں لہذا میں اپنی محبت سے بڑھ کر حضور کی محبت پر عمل کرتا ہوں۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۷)

البدایہ والنہایہ کی ایک اور روایت میں ہے: ایک موقع پر حضرت عمر نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا تھا: میرا باپ خطاب اسلام لاتا تب بھی تمہارا اسلام لانا مجھے اپنے باپ کے اسلام لانے سے زیادہ محبوب ہوتا کیونکہ آپ کا ایمان حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو زیادہ پسند تھا۔ (ج: ۶، ص: ۵۳۸، معارف صحابہ، ج: ۱، ص: ۱۹۵)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں مسلمانوں کا جو دیوان (رجسٹر) تیار ہوا تھا، ان میں سب سے پہلے قبیلہ بنی ہاشم کے نام تھے اور بنی ہاشم میں سب سے پہلے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام لکھا ہوا تھا یہ دیوان حضرت عثمان غنی کے دور خلافت میں بھی جاری رہا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۸)

تعظیم حضرت عباس اور حضرت عثمان: تمام صحابہ کے مانند حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے دور خلافت میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خصوصی تعظیم فرماتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر قاصد بھیج کر بلواتے تو حضرت عثمان رضی

اللہ عنہ آپ کے بلاوے پر حاضر ہو جاتے۔

حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ مجھے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر المؤمنین کی خدمت میں بھیجا کہ میں انہیں بلا کر لاؤں۔ میں ان کے پاس اس وقت حاضر ہوا جب وہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے (میں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیغام سنایا) آپ نے لوگوں کو کھانا کھلایا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہو گئے۔ آکر آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابوالفضل! آپ کا چہرہ روشن رہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے عثمان! آپ کا چہرہ بھی روشن رہے (عذر پیش کرتے ہوئے) حضرت عثمان نے کہا: آپ کے پاس آنے میں مجھے صرف اتنی تاخیر ہوئی ہے جتنی دیر میں لوگوں نے کھانا کھایا ہے۔ پھر دونوں میں کچھ دیر تک کلام جاری رہا۔ (ذخائر العقبیٰ ص: ۳۳۶)

تعظیم حضرت عباس اور حضرت علی: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میرے والد محترم ایک مرتبہ بیمار پڑ گئے، میں اپنے والد کی خدمت میں تھا اور آپ کے پیردبار ہاتھا، اتنے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے، جب مجھے پیردبارتے ہوئے دیکھا تو مجھے وہاں سے ہٹا کر خود اس جگہ بیٹھ گئے جہاں میں بیٹھا تھا اور والد گرامی کے پیردبانے لگے اور فرمایا: اے ابن عباس! میں اپنے چچا کی خدمت کرنے کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور میرے چچا حضرت حمزہ، بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہما کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے چچا عباس کو ہمارے لیے باقی رکھا ہے، کسی بھی شخص کا چچا اس کے والد کے مثل ہوتا ہے پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے دعا کرنے لگے: اے اللہ! ہمارے چچا عباس کو عافیت عطا فرما، ان کے درجات کو بلند فرما اور ان کو اپنی علیین میں جگہ نصیب فرما۔ (ذخائر العقبیٰ ص: ۳۳۷)

حضرت صہیب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پیر چومتے تھے اور عرض کرتے تھے: اے محترم چچا! آپ ہم سے راضی ہو جائیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۹۴)

خلفاء گھوڑے سے اتر جاتے: حضرت ابن شہاب فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت کے اچھے طریقے سے معترف تھے، یہی وجہ تھی کہ ہر معاملے میں وہ عم نبی کو مقدم رکھتے تھے، ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے۔

ابن زناد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عمر و عثمان کی تعظیم کا معاملہ یہ تھا کہ یہ دونوں سوار ہو کر آ رہے ہوں اور راستے میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہو جاتی تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعظیم کے لیے گھوڑے سے اتر پڑتے اور اس وقت تک سوار نہ ہوتے جب تک حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں سے گزر نہ جاتے یہ دونوں صحابہ اس وقت فرمایا کرتے تھے ”یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا ہیں۔“

(ذخائر العقبی، ص: ۳۳۶)

خصوصی اعمال کی ترغیب: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم کو آنے والی دعا تعلیم فرمائی اور فرمایا: اے میرے چچا! اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ سے معافی طلب کیا کرو ”(أَسْأَلُكَ) الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْمَعَاذَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. اے اللہ! میں دنیا و آخرت میں خیر و عافیت اور مغفرت مانگتا ہوں۔ (ذخائر العقبی، ص: ۳۲۸)

امام ابو داؤد اپنی سنن میں نقل فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے چچا جان! کیا میں تمہیں عطا نہ کر دوں؟ کیا تمہیں فائدہ نہ پہنچاؤں؟ کیا تمہیں نہ سکھاؤں؟ کیا تمہیں ایسے دس کام نہ بتاؤں کہ جب تم انہیں کر لو تو اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے پہلے اور پچھلے، پرانے اور نئے، نادانستہ یا دانستہ کیے ہوئے چھوٹے یا بڑے، پوشیدہ یا ظاہر؟ دس کام یہ ہیں کہ تم چار رکعت پڑھو ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ

کے بعد کوئی سورت پڑھو، جب حالت قیام میں تم پہلی رکعت کی قرأت سے فارغ ہو جاؤ تو پندرہ مرتبہ کہو ”سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر“ پھر رکوع میں اسی تسبیح کو دس مرتبہ پڑھو پھر رکوع سے سر اٹھا کر اسے دس مرتبہ پڑھو، پھر سجدہ میں چلے جاؤ اور دس مرتبہ پھر پڑھو پھر سجدہ سے سر اٹھا کر دس مرتبہ پڑھو پھر دوسرے سجدے میں دس مرتبہ پڑھو پھر سجدے سے سر اٹھا کر دس مرتبہ پڑھو اس طرح ہر رکعت میں پچھتر ہوں اور چار رکعتوں میں ایسا ہی کرو اگر تم سے ہو سکے تو روزانہ ایسا ایک مرتبہ کر لیا کرو اگر ایسا نہ کر سکو تو ہفتے میں ایک بار سہی، یہ بھی نہ ہو سکے تو ہر مہینے میں ایک بار سہی، یہ بھی نہ بن پڑے تو سالانہ ایک بار سہی اور یہ بھی نہ کر سکو تو عمر میں ایک بار سہی۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب صلاۃ التسبیح)

مسلمانوں پر شفقت اور کفار کی نظر میں آپ کی حرمت: جس واقعے سے ہم حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مسلمانوں پر شفقت اور کفار قریش کی نظر میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہمیت و حرمت کو ثابت کریں گے اس کا تعلق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام قبول کرنے سے ہے، یہاں ہم اس واقعے کی تمام تفصیلات کو حذف کرتے ہوئے صرف اس حصے کو پیش کر رہے ہیں جس کا تعلق حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی سے ہے:

جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کر چکے تو حضور نے انہیں یہ ہدایت کی کہ وہ مکہ میں کسی سے نہ ملیں گے۔ آگے کا حال آپ پیر کرم شاہ ازہری کی زبانی سنیں آپ رقم طراز ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت کی کہ وہ یہاں (مکہ میں) ابھی اپنے ایمان کو ظاہر نہ کریں اور اپنے قبیلے کے پاس واپس چلے جائیں اور انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ جب ہمارے فتح یاب ہونے کی تمہیں اطلاع ملے تو پھر میرے پاس آجانا۔ آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ میں تو مشرکین کے مجمع میں جا کر اپنے

ایمان لانے کا اعلان کروں گا۔ چنانچہ ایک روز جب قریش کے قبائل حرم شریف میں اپنی اپنی مجلسیں جما کر بیٹھے ہوئے تھے حضرت ابوذر آئے اور پورے زور کے ساتھ اعلان کر دیا۔ اشہدان محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں؛ قریش یہ سن کر بھڑک اٹھے اور مجھ پر ہلہ بول دیا، جو چیز جس کے ہاتھ میں آئی لکڑی، ہڈی، پتھر اس سے مجھے زد و کوب کرنے لگے یہاں تک کہ میں غش کھا کر گر پڑا، اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے، انہوں نے مجھے جھک کر دیکھا تو پہچان لیا اور انہیں جھڑکتے ہوئے کہا: کم بختو! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے جسے مار مار کر تم نے ادھ مار کر دیا ہے تمہیں خبر نہیں کہ تمہارے تجارتی قافلوں کا راستہ ان کے علاقہ سے گزرتا ہے؟ تب ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اٹھ کر زم زم کے کنوئیں کے پاس گیا اس کے پانی سے اپنے جسم پر لگا ہوا خون دھویا، جوں توں کر کے رات گزری۔ صبح ہوئی تو جنون عشق نے مجھے پھر مجبور کیا کہ کفار کے بھرے مجمع میں اپنے محبوب کی رسالت کا پھر اعلان کروں، اس کے جرم عشق میں پیٹا جاؤں اور میرے انگ انگ سے خون کی ندیاں رواں ہوں چنانچہ دوسرے روز قریش حسب دستور جب اپنی محفلیں جما کر بیٹھ گئے تو میں نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نعرہ لگایا ”اشہدان محمد رسول اللہ“ میں نے یہ اعلان کر کے گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دیا۔ یہ سنتے ہی سب ب پھر گئے اور غضبناک ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑے مکوں، گھونسوں، سونٹوں اور پتھروں سے میری خوب مرمت کی، جگہ جگہ سے خون بہنے لگا، غش کھا کر پھر گر پڑا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر میرے لیے نجات کا فرشتہ بن کر آ پہنچے۔ ان کو خوب ڈانٹا اور انہیں بتایا کہ جس شخص پر تم زیادتی کر رہے ہو یہ اس قبیلے کا فرد ہے جس کے علاقہ سے تمہارے تجارتی کارواں گزرتے ہیں، اس طرح مجھے ان سے

چھٹکارا ملا۔ (السيرة النبوية، لابی دحلان، ج: ۱، ص: ۱۹۳، بحوالہ سيرة الرسول، ج: ۲، ص: ۲۴۵-۲۴۶)

حضرت عباس نے امت کو آسانی دلائی: ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے مکہ شریف سے متعلق ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو حرم بنایا ہے لہذا اس کی گھاس نہ کاٹی جائے، درخت نہ کاٹے جائیں، بیٹھے ہوئے شکار کو نہ بھگا یا جائے۔ اس حکم کو سننے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کی، حضور! اذخر گھاس کو کاٹنے کی اجازت دے دی جائے کیوں کہ وہ ہمارے بہت کام آتی ہے، ہم لوگ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں، اہل حرفہ اسے بھٹیوں وغیرہ کے کام میں لاتے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معروضہ سننے کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ”الا الاذخر“ اگر یہ بات ہے تو اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب الاذخر والخصیش فی القبر، صحیح المسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکہ وصدھا، ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۳۸)

آپ غور کریں کہ جس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حرم پاک کے مذکورہ احکام بیان فرمائے اگر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اذخر گھاس کاٹنے کی اجازت اہل مکہ کے لیے نہ لی ہوتی تو قیامت تک کے لیے امت اس بڑی آسانی سے محروم ہو جاتی لیکن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قیامت تک کے لیے امت کو یہ عام رخصت عطا فرمادی، خاص کر اہل مکہ سے حرج کو دفع فرمادیا۔

بخاری و مسلم کی اس حدیث پاک سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دینی امور میں کامل اختیار عطا فرمایا ہے۔ وہ لوگ غور کریں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مختار نہیں مانتے بلکہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں: جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔ (تقویۃ الایمان)

اللہ تعالیٰ ایسے برے مذہب اور ایسے برے لوگوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔

حضرت عباس کی فراست: اہل ایمان کو اللہ تبارک و تعالیٰ ایمان کی برکت سے خاص فراست عطا فرماتا ہے جس سے کئی مرتبہ مستقبل میں ہونے والے واقعات و حادثات کی نقاب کشائی کر دی جاتی ہے، یہ فراست قوت وضعف میں ایمان کے تابع ہے

جس کا ایمان جتنا قوی ہوگا اسی قدر اسے فراست سے حصہ دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرتبے کو بہت بلند فرمایا، صحابی ہونے کے ساتھ عم نبی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، ان کی ایمان کی قوت ہمارے الفاظ سے م اورا ہے، اس لیے وہ معاملہ شناسی اور دور بینی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دلیل کے طور پر بخاری شریف کی آنے والی حدیث ملاحظہ کریں:

جس مرض کے دوران حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اس وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے دولت کدے سے باہر تشریف لائے تو اصحاب رسول نے پوچھا: اے ابوالحسن! حضور کی طبیعت کیسی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: (الحمد للہ) حضور کی طبیعت ٹھیک ہے۔ یہ سن کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: اے علی! خدا کی قسم! تم تین دن کے بعد محکوم ہو جاؤ گے، علی سنو! میرے اندازے کے مطابق حضور اس مرض میں وصال فرمائیں گے کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ بنو مطلب کے چہرے وقت وصال کیسے ہوتے ہیں؟ چلو! حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس امر (خلافت) کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں اگر یہ ہمارے لیے ہوگا تو ہمیں پتہ لگ جائے گا اور اگر ہمارے سوا کسی اور کے لیے ہوگا تب بھی ہمیں پتہ چل جائے گا اور آپ ہمارے لیے وصیت تو فرمائیں گے ہی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر ہم نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھ لیا اور حضور نے منع فرما دیا تو پھر لوگ کبھی بھی ہمیں عطا نہیں کریں گے اس لیے میں اس بارے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

بخاری شریف کی اس حدیث سے رافضیوں کے اس دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے کہ جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت کی تھی یا آپ کو خلیفہ نام زد کیا تھا اگر ایسا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہرگز ہرگز حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نہ فرماتے جو اس حدیث میں مذکور ہے بلکہ

جواب کچھ اور ہی ہوتا جو کسی بھی عاقل پر پوشیدہ نہیں۔ (معارف صحابہ، ج: ۱، ص: ۳۸۰)
حضرت اسماعیل بن محمد فرماتے ہیں کہ میں نے جس کو بھی دیکھا وہ عقل و فراست کے معاملے میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فوقیت دیتا تھا۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۲۵)

بیٹے کو نصیحت: جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ کی غیر معمولی تعظیم فرماتے ہیں، بلا کرا اپنے قرب خاص میں بٹھاتے ہیں، مشورہ فرماتے ہیں تو ایک سنجیدہ اور مربی باپ کا کردار نبھاتے ہوئے آپ نے اپنے شہزادے کو تین باتوں کی نصیحت فرمائی:

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما خود بیان فرماتے ہیں: میرے والد محترم نے فرمایا: تین چیزوں کو خاص طریقے سے محفوظ کرلو۔ تمہاری کسی بھی بات میں امیر المومنین کو جھوٹ کا تجربہ نہیں ہونا چاہیے، ان کا راز کسی کے سامنے ظاہر مت کرنا اور ان کی مجلس میں کسی کی غیبت مت کرنا۔ جب یہ بات حضرت ابن عباس نے امام شعبی کے سامنے بیان کی تو شعبی نے عرض کیا: ان باتوں میں سے ہر بات ہزار باتوں سے بہتر ہے تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: بلکہ ان میں سے ہر بات دس ہزار باتوں سے بہتر ہے۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۳۹)

حضور کی بشارت: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے عم محترم کو غیب کی خبریں دینے والی زبان سے کئی بشارتیں سنائی تھیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسجد تشریف لائے دیکھا کہ عم محترم سر بس جو وہیں حضور کھڑے ہو گئے، جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز پوری کر لی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عم محترم! کیا میں آپ کو بشارت نہ دے دوں؟ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: ضرور یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ سرکار نے فرمایا: اے چچا! آپ کی آل و اولاد میں اصفیا اور خلفا ہوں گے۔

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا: یہ میرے چچا ابوالخلفاء ہیں، ان کی اولاد میں

سفاح، منصور اور مہدی ہوں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا: چچا آخری زمانے میں آپ کی اولاد سے مہدی ہوں گے، ان سے ہدایت پھیلے گی، گمراہی کی آگ بجھ جائے گی، باب ہدایت ہم سے کھلا اور آپ کی ذریت پر اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (ذخائر العقبی، ص: ۲۴۲)

حضرت عباس کا پر نالا اور حضور کی نسبت: صحابہ کرام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسبتوں کا کیسا احترام کیا کرتے تھے یہ بات آنے والی حدیث سے واضح ہوگی۔ آج کل کچھ لوگ نشانیوں کے مٹانے پر کمر بستہ ہیں شاید انہیں اس سے بڑھ کر لطف کسی اور چیز میں میسر نہیں آتا، مملکت سعودیہ عربیہ میں یہ وحشت ناک مناظر ہر طرف دیکھے جاسکتے ہیں لیکن خوش عقیدہ مسلمانوں کے لیے ان کے اسلاف کے اعمال میں اسوۂ حسنہ موجود ہے لہذا وہ اسی پر ہمیشہ سے عمل پیرا ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گے۔ اب آپ آنے والی حدیث پڑھیں اور عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے اہلتے ہوئے آبشار دیکھیں:

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں ایک پر نالا لگا ہوا تھا یہ پر نالا جس جگہ لگا ہوا تھا اسی کے نیچے سے امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرتے تھے۔ ایک دن حضرت امیر المومنین لباس زیب تن کر کے نماز جمعہ کے لیے پر نالے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ پر نالے سے خون ٹپکا اور امیر المومنین کے کپڑے خون آلود ہو گئے، پر نالے سے خون ٹپکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس دن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر دوسرا ذبح ہوئے تھے، امیر المومنین نے حکم دے کر یہ پر نالا وہاں سے اکھڑا دیا، گھر سے دوسرے کپڑے پہن کر مسجد آئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا: (آپ نے جہاں سے پر نالا اکھڑا دیا ہے) یہ وہی جگہ تھی جہاں پر خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دست اقدس سے پر نالا نصب کیا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اب آپ میری پیٹھ پر چڑھ جائیں اور اس پر نالے کو اسی جگہ نصب کریں جہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دست کرم سے رکھا تھا، یہ سن

کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی کیا جو امیر المومنین نے چاہا۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا: اب پر نالا وہیں لگانا ہے جہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لگایا تھا، اس کو آپ لگائیں گے اور آپ کی سیڑھی سوائے میرے اور کوئی نہیں ہوگا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۱۹، مسند احمد بن حنبل، ج: ۲، ص: ۳۹۷، رقم الحدیث: ۱۷۹۰)

اس حدیث پاک کو امام ابن سعد اور امام احمد بن حنبل وغیرہ محدثین اور مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ صحابہ کرام اور پھر ان کے بعد والے ائمہ و علما کا یہی عقیدہ تھا کہ جس چیز کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نسبت ہو جائے وہ ضرور قابل احترام ہے اور یہی اہل سنت و جماعت (آج کے دور میں مسلک اعلیٰ حضرت) کا معمول ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک

حضرت عباس کا گھر حضرت عمر اور مسجد نبوی: امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں محسوس کیا کہ مسجد نبوی کی توسیع ہونی چاہیے کیوں کہ مسجد نمازیوں پر تنگ ہونے لگی ہے، آپ نے آس پاس کے مکانات ان کے مالکوں سے خرید لیے، اب بھی توسیع کے لیے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر اور امہات المومنین کے حجرے درکار تھے لیکن امہات المومنین کے حجروں کو وہاں سے ہٹانے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، اب معاملہ صرف حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کا تھا۔ امیر المومنین نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس معاملے میں بات کی پوری صورت حال سمجھائی اور کہا: آپ اپنا گھر میرے ہاتھوں بیچ دیں، میں مسلمانوں کے بیت المال سے خرید کر مسجد نبوی میں شامل کر دوں گا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا حضرت عمر نے پھر گفتگو کی اور عرض کی: میں تمہارے سامنے تین تجاویز پیش کر رہا ہوں ان میں تمہاری پسند کے اعتبار سے کوئی ایک قبول کر لو۔ پہلی یہ کہ آپ گھر کو میرے ہاتھوں فروخت کر دو۔ دوسری یہ کہ مدینہ شریف میں جہاں چاہو جگہ پسند کر لو تمہیں وہاں مکان بنا کر دے دوں۔ تیسری یہ کہ اپنے گھر کو مسلمانوں پر صدقہ کر دو تاکہ مسجد کی توسیع کی جاسکے

لیکن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر کی تینوں تجاویز کو رد کر دیا اور فرمایا: مجھے تینوں میں سے کچھ بھی قبول نہیں ہے۔ یہ سن کر امیر المومنین نے فرمایا: پھر ہم اور آپ اس معاملے میں کسی کو فیصلہ بنالیں جو اس معاملے میں صحیح فیصلہ کر سکے۔ آخر اتفاق رائے سے حضرت ابی بن کعب کو تسلیم کر لیا گیا۔ دونوں حضرات حضرت ابی بن کعب کے پاس پہنچے، پوری بات انہیں بتائی۔ حضرت ابی بن کعب نے ایک لمبی حدیث سناتے ہوئے فیصلہ سنا دیا یہ فیصلہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں تھا اور امیر المومنین کے خلاف۔ حاصل کلام یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ٹھیک ہے اب میں اس بارے میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ یہ سن کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب یہ بات ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہو چکا اور آپ نے اس کو مان بھی لیا تو اب میں اپنے مکان کو مسلمانوں پر صدقہ کرتا ہوں۔ اے امیر المومنین! آپ کو اجازت ہے کہ میرے گھر کو مسجد کی توسیع میں شامل کر دیجیے (مسجد کی توسیع کر دی گئی) اور بعد میں امیر المومنین نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے بیت المال سے ایک گھر بنا کر دیا جس میں وہ رہتے تھے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۰)

بیٹے کی نظر میں باپ: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے، جلیل القدر صحابی رسول اور عم نبی ہیں۔ اسلام کے تینوں خلفاء کے دور میں انہوں نے مثالی حیات کا نمونہ پیش کیا۔ تقریباً ۳۲ سال اسلام کی خدمت کرتے گزارے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زبان نبوت سے ان کی تعریف و توصیف فرمائی۔ حضور انہیں باپ کا درجہ دیتے، بنفس نفیس ان کا ادب بجالاتے، اسوۂ رسول پر عمل کرتے ہوئے تمام صحابہ تا عمران کی بارگاہ کے مؤدب رہے، اس سب کے بعد انہیں کسی توصیفی سرٹیفکیٹ کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن ان کے ذکر خیر کے طور پر ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بیان کردہ چند جملے قارئین کی خدمت میں نذر ہیں:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہاں یہ شائبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہر بیٹا اپنے باپ کی تعریف کرتا ہے کیوں کہ ہم عام باپ بیٹوں کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ صحابہ کرام کی بات کر رہے ہیں یہ حضرات وہ ہیں باپ تو رہا باپ خود اپنی ذات کے خلاف بھی گواہی دینے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ دعوے اور مطالبہ شہادت کے بغیر اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں چاہے بعد میں انہیں تختہ دار پر ہی کیوں نہ چڑھا دیا جائے لہذا صحابہ کرام کے حق میں ایسی بدگمانی ہرگز روا نہیں رکھی جاسکتی کہ ایک بیٹا اپنے باپ کی غیر واقعی تعریف کر بیٹھے۔ تمام صحابہ عادل ہیں یہ تو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے صحابی ہیں جن کی فقاہت، عدالت اور ثقاہت پر امت کو ناز ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا گیا کہ آپ عباس بن عبدالمطلب کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اس پر حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں ان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رحم فرمائے وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا تھے، اللہ تعالیٰ کے رسول کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور سارے چچاؤں کے سردار تھے، اپنے بلند پایا آباؤ اجداد کے اخلاق کے وارث تھے، ہر مہذب سرداران کی رائے کا پیرو کار تھا۔ اور ہر سرکش ان سے مجتنب تھا اور یہ سب کیوں کر نہ ہوتا سید الکونین افضل المخلوق نے انہیں سنوارا اور نکھارا تھا، اس سے میری مراد وہ ہیں جو صاحب کوثر ہیں، مقام رفیع کے مالک ہیں، نورانی تاج والے، دل جن کا پاک و صاف، زبان تقویٰ شعاع جو جبریل کے خلیل ہیں، محبوب رب العالمین ہیں، حوض کوثر کے مالک اور شفاعت کے والی ہیں نام جن کا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔ (ذخائر العقبی، ص: ۳۳۸)

اس اقتباس میں ابتدائی جملوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنے محترم باپ کا بلند پایا مقام بیان فرمایا اور آخر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت پڑھی ساتھ ہی یہ بھی بتایا میرے باپ جن خوبیوں کے مالک بنے وہ سب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل رب تبارک و تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائیں۔

قمیص کے بدلے قمیص: جب میدان بدر میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قیدی بنایا گیا اور عم نبی کو قمیص پہنانے کی ضرورت پیش آئی تو کسی کی قمیص انہیں فٹ نہیں آئی جو قمیص فٹ آئی وہ قمیص عبداللہ بن ابی بن سلول (منافق) کی تھی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وہی قمیص حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنائی، اسی کا بدلہ دیتے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے کفن کے لیے اپنی قمیص پیش کر دی۔ (اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۶)

آپ کا غلام آزاد فرمانا: خیال رہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زندگی میں ستر غلام آزاد فرمائے تھے۔ (ایضاً)

صحابہ نے حضرت عباس کی تعزیت کی: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاندانی اعتبار سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سگے چچا تھے اور حضور کے عصبات میں سب سے زیادہ قریب تھے۔ علامہ ذہبی نے فرمایا: اگر ہمارے نبی ان لوگوں میں ہوتے جن کا وارث بنایا جاتا ہے تو حضور کی بیٹی اور ان کی ازواج مطہرات کے بعد ان کے سوا اور کوئی وارث نہ بنتا۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۹۹)

رشتے کی قربت کے ساتھ ساتھ الفت و محبت میں بھی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے غایت درجہ قریب تھے اسی لیے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تو صحابہ کرام برائے تعزیت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر پر ہی حاضر ہوئے۔

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شرافت و فضیلت کے لیے اتنا بہت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال پر لوگ ان کے یہاں تعزیت کو حاضر ہوئے۔ (اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۶)

حضرت عباس اور ادب رسالت: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنے ماں باپ، اولاد وغیرہ سے زیادہ محبت نہ کرنے لگے۔ (بخاری)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہر شخص کے لیے عام ہے اور ہر مومن کامل حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ایسی ہی محبت کرتا ہے، دو صحابہ سے لیکر آج تک اہل ایمان نے اس بات کو موقع آنے پر ثابت بھی کر دیا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ حضور کے عم محترم تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود ان کی مثالی تعظیم فرماتے تھے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے آپ کو معاذ اللہ رب العالمین تعظیم نبی سے بری الذمہ سمجھتے ہوں بلکہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی غایت درجہ تعظیم کرتے تھے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں تعظیم نبی کس حد تک گھر کیے ہوئی تھی اس کا اندازہ آپ ان کے آنے والے جملے سے کریں:

حضرت ابن رزین فرماتے ہیں: ”قیل للعباس انت اکبر اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال ہوا کبر منی وولدت قبلہ“ ترجمہ ملاحظہ کرنے سے پہلے اس بات کو ذہن میں حاضر کر لیں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ظاہری عمر سے دو یا تین سال زیادہ تھی۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بڑے ہیں یا آپ؟ تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجھ سے بڑے ہیں، البتہ ولادت میری پہلے ہوئی ہے۔ (حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ایمان افروز جملے کو کثیر مؤرخین نے نقل فرمایا ہے) (مصنف ابن ابی شیبہ، ج: ۸، ص: ۴۸، التاریخ الصغیر للبخاری، ج: ۱، ص: ۷۰، التعلیل والتجریح، ج: ۳، ص: ۱۰۰، المعرفۃ والتاریخ، ج: ۱، ص: ۵۰۴، تاریخ دمشق، ج: ۲۶، ص: ۲۸۰، تہذیب الکمال، ج: ۱۴، ص: ۲۲۷، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۸۰)

حضرت ملا علی قاری شرح مشکوٰۃ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جملے سے متعلق فرماتے ہیں: یہ قول آپ کی فہم کی لطافت اور علم کی متانت کا پتہ دیتا ہے۔ (ج: ۱، ص: ۱۸۹)

دوسری جگہ باب مناقب اہل بیت میں لکھتے ہیں: یہ آپ کی طبع لطیف اور حسن ادب

کی وجہ سے تھا۔ (مرقاۃ، ج: ۱۸، ص: ۳۱)

قارئین! اندازہ کریں کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں بتایا کہ جب بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کسی انسان کا ذکر ہو تو بڑائی کی نسبت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہی کی جائے گی۔ گویا ان کا عقیدہ تھا کہ مقام انسانیت کی تمام تر بڑائیاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ہی حاصل ہیں، مخلوق میں کوئی بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بڑا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ ع

تم سے بس افزوں خدا تم پہ کرو روں درود

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام عشق و محبت کا اندازہ کریں کہ جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گفتار اتنی باادب ہے تو کردار کتنا باادب ہوگا؟

ازواج و اولاد: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد بھی عطا فرمائی۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیوی کا نام لبابۃ الکبریٰ ہے، جو ام الفضل کے نام سے مشہور ہیں، یہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن ہیں، ان کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ یہ ایسی خاتون ہیں جو ام المومنین حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے ایمان لائیں اس رشتے سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہم زلف (ساڑھو) بھی ہوتے ہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ ۹ لڑکوں اور ۳ لڑکیوں کے باپ تھے۔ بعض حضرات نے دس لڑکے شمار کرائے ہیں۔ علامہ طبری نے چوتھی لڑکی کا بھی ذکر کیا ہے۔

ام الفضل کے بطن سے جو لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں ان کے نام اس طور پر ہیں: فضل، عبداللہ، عبید اللہ، قثم، معبد، عبدالرحمن، ام حبیبہ۔

دو بیٹے اور دو بیٹیاں ام ولد کے بطن سے پیدا ہوئیں ان کے نام اس طور پر ہیں: کثیر، تمام، صفیہ، امیمہ۔ جمیلہ بنت جندب کے پیٹ سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حارث تھا۔

علامہ طبری نے امیمہ کی جگہ آمنہ نام لکھا ہے اور لڑکیوں میں ایک نام ام کلثوم زیادہ کیا ہے۔ علامہ عصامی نے امیمہ کی جگہ امینہ لکھا ہے اور دسویں لڑکے کا نام عون بتایا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۶، ذخائر العقبی، ص: ۳۴۴، سمط النجوم العوالی فی انباء الاولائل والتوالی، ج: ۱، ص: ۱۶۴)

وفات: کل نفس ذائقۃ الموت کے دائرے میں آنے سے کون بچ سکتا ہے؟ بلکہ
نفس زکیہ تو بے تاب نگاہوں سے اس دن کا منتظر ہوتا ہے کہ ملائکہ پروردگار اس سے
آکر کہیں ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً“ حضرت
عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لانے کے بعد سے ”رضی اللہ عنہم ورضوعنہ“ کی زندہ تصویر
بن کر دنیا کے سامنے رہے، جب تک زندہ رہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کے دین کی خدمت کرتے رہے اور جب وقت اجل آیا تو پوری شان ایمانی کے
ساتھ دنیا سے رحلت کر کے جوار رحمت پروردگار میں جا بسے۔

آپ کی تاریخ وفات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے ہم چند اقوال بیان کر رہے ہیں:
حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات بروز جمعہ ۱۲/رجب المرجب ۳۲ھ میں
حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی، وفات کے وقت آپ کی عمر
۸۸ سال تھی، جنت البقیع میں مقبرہ بنی ہاشم میں آپ کو دفن کیا گیا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۸)
دوسرا قول بروز جمعہ ۱۲/رجب المرجب ۳۲ھ اور تیسرا قول ۱۲/رمضان المبارک ۳۲ھ
کا ہے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے دو
سال قبل ہوا۔ خلیفہ وقت امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی،
جنت البقیع میں دفن کیا گیا، آخری عمر میں آنکھوں کی بینائی چلی گئی تھی، وفات کے وقت آپ
کی عمر ۸۸ سال تھی۔ (اسد الغابہ، ج: ۳، ص: ۱۶۶)

وفات کے وقت آپ کی عمر ۸۸ یا ۸۹ سال تھی جس میں سے ۳۲ سال آپ کی
زندگی کے اسلام کے سائے میں گزرے۔ (الاستیعاب، ص: ۵۵۹)

علامہ ابن ذہبی نے آپ کی عمر ۸۶ سال لکھی ہے اور ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ جنت
البتیع میں ان کی قبر پر عظیم الشان بلند و بالا قبہ موجود ہے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۱۰۰)

علامہ ذہبی کی وفات ۷۴۸ھ میں ہوئی اس سے یہ ثابت ہوا کہ آج (۱۴۴۲ھ) سے ۶۹۶ سال پہلے وہاں عظیم الشان قبہ موجود تھا جسے اب سعودی حکومت نے مسمار کر دیا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بزرگان دین کی قبروں پر قبہ (گنبد) بنانا مسلمانوں کا پرانا طریقہ رہا ہے۔

تجہیز و تدفین: امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن عباس، عبید اللہ بن عباس اور حضرت شعم رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مل کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازے کو غسل دیا اور آپ کی وصیت کے مطابق یمنی چادر میں آپ کو کفنایا گیا۔ یمنی چادر کی وصیت کرتے وقت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ اسی چادر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کفن دیا گیا تھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۳۰)

جنازے میں ازدحام: حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد

دو اعلان کرنے والوں نے آپ کے وصال کی خبر لوگوں کو دی ان میں سے ایک اعلان کرنے والا امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے تھا۔ اعلان سن کر مدینہ شریف، عوالی مدینہ، قبا اور اطراف کے لوگ جوق در جوق حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری دیدار کرنے اور اپنے نبی کے چچا کو کا نندھا دینے کی غرض سے حاضر ہو رہے تھے۔ حاضر ہونے والوں کی بھیڑ اس قدر بڑھی کہ وہ جگہ لوگوں پر تنگ ہو گئی جہاں جنازے رکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ جنازے کو جنت البقیع کی جانب لے جانا پڑا، لوگ کوشش کر کے بھی جنازے تک نہیں پہنچ پارہے تھے، معاملہ یہاں تک بڑھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فورس کا استعمال کرنا پڑا، فوجیوں نے لوگوں کے ساتھ ہاتھ پائی کر کے انہیں جنازے کے پاس سے ہٹایا۔ صرف بنی ہاشم کو جنازے کے پاس رہنے دیا گیا، وہی لوگ قبر میں اترے اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لحد میں اتارا۔ راوی کا بیان ہے کہ جو چادر آپ کے جنازے پر پڑی ہوئی تھی وہ کھینچ تان سے پھٹ گئی تھی۔ عبدالرحمن بن یزید کے بیان کے مطابق ایسی بھیڑ اس سے پہلے کسی جنازے میں نہیں دیکھی گئی۔

حضرت عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص فرماتی ہیں: میرے باپ اپنے محل سے جنازے

میں حاضری کی غرض سے مدینہ شریف گئے تھے، آپ کا محل مدینہ شریف سے دس میل کے فاصلے پر تھا، جب ایک دن کے بعد گھر واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ کثرت ازدحام کی وجہ سے ہم جنازے کے قریب نہ جاسکے جب کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو کاندھادینامیری خواہشات کا حصہ تھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۳۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۱۰۱)

یہ تھی عم نبی حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تابندہ و درخشندہ حیات جو اہل ایمان کے قلوب کو ہمیشہ جلا بخشی رہے گی۔

ان کے مولیٰ کی ان پرکروں درود
ان کے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام
جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمِيْدًا وَنُصْلًا عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ اٰجْمَعِيْنَ

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوتا ہے تو بندے کو اس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی غلامی میسر آتی ہے اور اس کرم کا کیا کہنا کہ یہ غلامی شرف صحابیت پا کر بندے کی پیشانی کا ایسا درخشندہ تاج بن جائے کہ جس کے نور کے سامنے مہر و ماہ کی روشنی ماند پڑ جائے۔ خوش نصیب ہیں وہ تمام نفوس قدسیہ جنہوں نے اس تاج سے اپنی پیشانیوں کو سجایا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گرد راہ کو سرمہ نظر بنایا۔ ایسے ہی ایک تاج جو رکی بات کرتے ہیں جس کی ابھرتی جوانی سے نظریں ٹٹنے کا نام نہیں لیتیں، طلاق و جدت اور ہنس مکھی پر ہزاروں لطافتیں قربان، حلم و بردباری اور وقار و بلند کرداری، زیور حیات، عجز و انکساری، تقویٰ و عفت شعاری اس کی سرشت میں داخل، بہادر اتنا کہ خوف کے سائے اس سے دور و نفور، فقر نا آشنا سخاوت کا مالک، صدق و امانت میں عالمگیر شہرتوں کا حامل، فصاحت و بلاغت کا ابلتا آبشار، اہل زبان جس کے سامنے مہر بلب، تعجب نہ فرمائیں آپ کے سامنے ایسی ذات ہے جو خلقاً اور خلقاً حضور کے مشابہ ہے جو جنت میں ملائکہ کے ساتھ مصروف پرواز ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جسے ابوالمساکین کہہ کر پکارا، ذوالجناحین جیسا عظیم لقب عطا فرمایا، ان کی ذات تو بڑی بلند ہے صحابہ ان کے بچوں کا ادب کرتے، عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی ان کے بیٹے کو یا ابن ذی الجناحین کہہ کر سلام پیش کرتے، جس نے شاہ حبشہ کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے حق کے پرچم لہرا دیئے، زور بیان، قوت استدلال اور فصاحت کلام سے شاہ حبشہ کے دل میں اسلام کی حقانیت کو راسخ فرما دیا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندانی بلکہ سگے چچا کا

بیٹا، نام جس کا جعفر بن ابی طالب ہے، مسلمان جسے جعفر طیار کہہ کر پکارتے ہیں۔
نام و نسب: جعفر بن ابی طالب (عبد مناف) بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی قرشی ہاشمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا زاد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حقیقی (بڑے) بھائی۔ (اسد الغابہ، ج: ۴، ص: ۵۴۱)

آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۱۲۵)
کنیت و لقب: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک بیٹے کا نام عبد اللہ تھا، اسی کے نام پر آپ کی کنیت ابو عبد اللہ قرار پائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسکینوں سے بہت محبت فرماتے تھے ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، گفت و شنید فرماتے اسی بنیاد پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی کنیت ابو المساکین جو یز فرمائی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۳۱، الاصابہ، ج: ۱، ص: ۲۴۸)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جعفر کو جنت میں ملائکہ کے ساتھ پرواز کرتے دیکھا ہے، اسی وجہ سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے درمیان طیار (پرواز کرنے والا، اڑنے والا) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (ذخائر العقبی، ص: ۳۵۹)

مواخات: بعض مؤرخین کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی مواخات حضرت معاذ بن جبل کے ساتھ قائم فرمائی۔ (الاصابہ، ج: ۱، ص: ۲۴۸)

حلیہ: قبیلہ بنی عبد مناف میں پانچ لوگ ایسے تھے جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے یہاں تک کہ کئی مرتبہ کمزور نظر والے انہیں دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے حالانکہ انہوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ ان پانچ حضرات میں سے کسی ایک کو دیکھا ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ ان پانچ حضرات کو جاننے کے لیے شدت سے منتظر ہوں گے تو آئیے ہم ان پانچ خوش نصیبوں کا آپ سے تعارف کرائے دیتے ہیں:

(۱) ان میں سے ایک حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب تھے جو حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے تھے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرے خوش نصیب شخص کا نام قثم بن عباس بن عبدالمطلب ہے یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد ہیں۔

(۳) تیسری ذات کا نام نامی حضرت سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم ہے یہ حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جد کریم ہوتے ہیں۔

(۴) چوتھے بالنصیب وہ ہیں جسے دنیا نواسہ رسول جگر گوشہ بتول شہزادہ مہلی حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے جانتی ہے، حضرت امام حسن ان تمام حضرات کے درمیان سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔

(۵) پانچواں نام انہیں کا ہے جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں یعنی حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد اور امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کے سگے بھائی ہیں۔ (صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۲۶۶)

حضرت جعفر چچا حضرت عباس کی پرورش میں: ابوطالب اگرچہ قریش میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے، شرافت و قیادت میں کوئی آپ کا ہمسرہ نہ تھا لیکن معاشی نقطہ نظر سے وہ خستہ حالی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر العیال بھی تھے، اس پر مستزاد مکہ کی وہ قحط سالی جس نے اہل مکہ کے نظام زندگی کو تہہ وبالا کر ڈالا تھا، ایسی قحط سالی جس نے کھیتیاں سرسبز ہونے دیں نہ جانوروں کے تھنوں میں دودھ کا ایک قطرہ چھوڑا، اس سوکھے نے قریش کو اس درجہ تنگی میں مبتلا کر دیا کہ وہ مردار کی ہڈیاں کھانے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں سب سے زیادہ خوشحال سمجھے جاتے تھے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیارے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا: چچا! آپ کے بھائی ابوطالب کثیر العیال ہیں اور قحط سالی نے جو لوگوں کی حالت کر ڈالی ہے وہ آپ پر مخفی نہیں ہے، لوگ تنگ دستی اور بھک

مری کا شکار ہیں، چاہتا ہوں کہ میں اور آپ ابوطالب کے پاس چلیں ان کے ایک بیٹے کو میں اور دوسرے کو آپ اپنی کفالت میں رکھ لیں تاکہ ایک حد تک ابوطالب کا بوجھ ہلکا کیا جاسکے۔ منصوبہ بڑا عمدہ، قابل تعریف تھا، اس لیے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توصیفی جملے کہنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکے، تبسم کنناں نظروں سے حضور کو دیکھا اور ارشاد فرمایا: آپ نے خیر کی دعوت دی ہے اور نیکی پر ابھارا ہے، کار خیر میں تاخیر کیسی؟ چلیں بات کر لیتے ہیں، دونوں حضرات ابوطالب کے پاس پہنچے اور ارشاد فرمایا: ہم آپ کا وہ بوجھ کسی حد تک کم کرنا چاہتے ہیں جو اہل وعیال کی پرورش کی صورت میں آپ کے کاندھوں کو بوجھل کیے ہوئے ہے، ابوطالب نے ان کی پیشکش سننے کے بعد کہا: عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو باقی کے بارے میں جو آپ کا فیصلہ ہو مجھے منظور ہے، یہ سننے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کا ہاتھ تھاما اور اپنے مبارک سینے سے چمٹا لیا، حضرت عباس نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لیا اور اپنے عیال میں شامل فرما لیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معیت میں رہے یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حق و ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورش میں رہے، یہاں تک کہ آپ جوان ہو گئے، حضور پر ایمان لائے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔

(سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۲۴۶، ص: ۲۶۷، الکامل فی التاریخ، ج: ۱، ص: ۵۸۲)

حضرت جعفر کا اسلام لانا: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد تھے اس بنا پر انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص قرب حاصل تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلان نبوت فرمایا تو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلد ہی اس کا روانہ نور کا حصہ بن گئے، جس کی قسمت میں عالم کو منور کرنا لکھا تھا، آپ کا شمار صحابہ کرام کی اس جماعت میں ہے جسے سابقین اولین کے مبارک نام سے یاد کیا جاتا ہے، اکثر مؤرخین کے بیان کے مطابق آپ اکتیس مسلمانوں کے بعد بتیسویں مسلمان ہوئے، ایک

قول یہ بھی ہے کہ آپ تیسرے نمبر پر مسلمان ہوئے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۱۲۵)
ابن اسحاق کے بیان کے مطابق آپ پچیس لوگوں کے بعد ایمان لائے۔

(الاصابہ، ج: ۱، ص: ۲۴۸)

بیان کیا جاتا ہے کہ ابوطالب نے ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا، حضرت علی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں اپنی دائیں طرف کھڑا کیا تھا، یہ منظر دیکھ کر ابوطالب نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: جاؤ! اور اپنے چچا زاد کے بائیں بازو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ خیال رہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بھائی امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دس سال بڑے تھے۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۵۴۲)

تاریخ دمشق میں یہ روایت قدرے تفصیل سے درج ہے جسے بیان کرنا فائدے سے خالی نہیں، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کر رہا تھا کہ ابوطالب آگئے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر جب ابوطالب پر پڑی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے چچا! کیا آپ ہمارے ساتھ آ کر نماز ادا نہیں کریں گے؟ ابوطالب نے جواب دیا: اے بھتیجے! میں جانتا ہوں کہ آپ حق پر ہیں لیکن مجھے ایسا سجدہ کرنا پسند نہیں کہ جس میں سرین بلند ہو جائیں، پھر ابوطالب نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بائیں بازو میں آ کر نماز ادا کی، نماز کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تمہیں میرے بازو کی برکت سے اللہ تبارک و تعالیٰ جنت میں دو پر عطا فرمائے گا جن سے تم جنت میں پرواز کرو گے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۱۲۵)

الکامل فی التاریخ کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس موقع پر انہیں اسلام لانے کی دعوت دی لیکن ابوطالب نے یہ کہتے ہوئے ایمان لانے سے انکار

کر دیا کہ میں اپنے دین کو ترک نہیں کر سکتا۔ (ج: ۱، ص: ۵۸۲)

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے چھوٹے بھائی امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب سے کچھ ہی دنوں بعد ایمان لے آئے تھے، یہ ان دنوں کی بات ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقم میں داخل ہو کر اپنی دعوت کا آغاز نہیں کیا تھا۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۳۱، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۵۴۱)

حضرت جعفر کی اہلیہ ایمان لے آئیں: ادھر حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان سے مشرف ہوئے، ادھر آپ کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس بھی اپنے شوہر کی متابعت میں ایمان لے آئیں، آپ کا شمار بھی سابقین اولین میں ہوتا ہے۔

(صور من حياة الصحابة، ص: ۲۶۸، سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۲۵۷، رجال حول الرسول، ص: ۱۹۸)

دور آزمائش: یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قرابت کی برکت تھی کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اہلیہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت کے اول مرحلے میں ہی اسلام کے دامن میں آگئے لیکن آپ پڑھ چکے ہیں یہی وہ دور بھی ہے کہ جس زمانے میں مسلمان ہونا اہل مکہ کی نظر میں سب سے بڑا جرم بلکہ ناقابل معافی اقدام تھا، لہذا اس دور میں ایمان لانے والے دیگر جاں نثاران اسلام کی طرح ہی اہل مکہ نے انہیں بھی اپنے ظلم کی چکی میں پوری طاقت کے ساتھ پیسا لیکن خداداد توفیق سے دونوں میاں بیوی صبر کے راستے پر گامزن رہے، مکہ والوں کی طرف سے آنے والے مظالم کے تیر اور چلنے والے نشتر کو برداشت کرتے رہے کیونکہ انہیں داعی حق نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ جنت کی راہ کانٹوں بھری اور مشقتوں سے بھرپور بلکہ جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے، اس سبق کو یاد کرتے ہوئے نوجوان حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی بیوی ان تمام مصائب و آلام کو جھیلنے رہے، جو اہل مکہ کی طرف سے ان پر مسلط کیے جا رہے تھے لیکن ان تکالیف شاقہ کے برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی مصیبت حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ان کی اہلیہ بلکہ اس راہ کے ہر مسافر کے ساتھ یہ بھی

تھی کہ اہل مکہ انہیں ان کے دین اور دین کے احکامات پر عمل کرنے سے بزور روکے ہوئے تھے، قریش ان کے اور شعائر اسلام کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے، انہوں نے مسلمانوں کو عبادت کی لذتوں سے محروم کر رکھا تھا، قریش مکہ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے پہرے پر پہرے بٹھار رکھے تھے جس سے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ تر ہو گیا تھا۔ (صومن حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۶۸)

ظلم سے بچاؤ کی تدبیر: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں بہت ستایا جانے لگا، دینی امور سے متعلق انہیں آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا، ظاہری طور پر اس ظلم کو روکنے کی کوئی سبیل بھی دکھائی نہیں دیتی تھی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے غلاموں سے ارشاد فرمایا: حبشہ کی سرزمین پر ایک ایسے بادشاہ کی حکومت ہے کہ جس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا ہے لہذا تم لوگ وہیں چلے جاؤ، یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں اس تنگی و تکلیف سے نکال کر کشادگی و آسانی عطا فرمائے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۱۲۱)

ہجرت: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے غلاموں کے لیے جائے پناہ کا انتخاب سرزمین حبشہ کے طور پر فرما چکے تھے اور غلامان با وفا ہجرت کا عزم محکم کر چکے تھے، اسی بیچ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنی زوجہ اور صحابہ کرام کے ایک گروہ کے ساتھ ہجرت کرنے کی اجازت چاہی، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دل حزیں اور جان غمگین کے ساتھ غلاموں کو ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ گو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس گروہ ابرار و اطہار کو اجازت ارزانی فرمائی تھی لیکن یہ اجازت دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر بڑا شاق تھا کیونکہ حضور کے دل کے ٹکڑے حضور سے جدا ہو رہے تھے، اپنے وطن عزیز کو خیر آباد کہہ کر ایک اجنبی سرزمین ارض حبشہ کا رخ کر رہے تھے، یہ گروہ ایک ایسی سرزمین کو چھوڑ رہا تھا جس کے سینے پر ان کے قابل رشک بچپن اور لائق قدر جوانی کے ان گنت نقوش ثبت تھے، یہ اپنوں کو چھوڑ کر

بیگانوں کا رخ کر رہے تھے، گل پوش راہوں کو چھوڑ کر خاردار وادیوں کے راہی بن رہے تھے، وہ بھی بغیر کسی جرم کا ارتکاب کیے ہوئے اگر انہوں نے کچھ کیا تھا تو بس اتنا کہ معبودانِ باطلہ کو چھوڑ دیا تھا اور کہا تھا تو اتنا کہ ہمارا رب صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے، تو ان کے آقا کو ان کی ہجرت سے غم کیوں نہ ہوتا۔ (صور من حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۶۸)

وقت ہجرت رخصت کیا اور دعا سکھائی: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت بخشی بلکہ انہیں رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک حضور ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر کچھ دعائیہ الفاظ سکھا کر انہیں الوداع کہا۔

حضور ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ”اللھم الطف لی فی تیسیر کل عسیر فان تیسیر کل عسیر علیک یسیر واسألک الیسر والبعاۃ فی الدنیا والاخرۃ“ اے اللہ! ہر پریشانی کو آسانی میں تبدیل فرما کر مجھ پر رحم فرما، ہر پریشانی کو آسان کر دینا تیرے لیے آسان ہے، اے اللہ! میں تجھ سے آسودگی، آسانی و فراخی مانگتا ہوں اور دنیا اور آخرت میں معافی کا طلب گار ہوں۔ (معجم الاوسط، حدیث نمبر: ۱۲۵۰)

حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت مل جانے کے بعد مسلمانوں نے ہجرت کا سلسلہ شروع فرمایا، اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جنہوں نے اپنی زوجہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور تقریباً پندرہ افراد کے ساتھ ہجرت فرمائی، یہ ہجرت اعلان نبوت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں کی گئی تھی، مہاجرین حضرات رجب سے لے کر رمضان تک حبشہ میں ٹھہرے رہے پھر انہیں خبر ملی کہ اہل قریش اسلام لائے ہیں لہذا یہ حضرات مکہ المکرمہ واپس آ گئے لیکن خبر باطل اور نری جھوٹی تھی، اس لیے یہ حضرات دوبارہ حبشہ روانہ ہو گئے، اس دوسرے مرحلے میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنی اہلیہ اسماء بنت عمیس اور دیگر صحابہ کرام کے ساتھ ہجرت فرمائی اور کل ملا

کر مہاجرین حبشہ کا عدد ۸۲ افراد تک پہنچ گیا۔ (الکامل فی التاریخ، ج: ۱، ص: ۵۹۸)

حبشہ بہترین پناہ گاہ: ستم رسیدہ، مظلوم چشیدہ، بندگان خدا، غلامان رسول کا یہ مختصر سا قافلہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں حبشہ پہنچ چکا تھا، شاہ حبشہ نجاشی نے ان اجنبی مسلمانوں کو اپنے صالح اور عادل نظام کی بدولت اپنی حفاظت میں لے لیا تھا، نجاشی نے نہ صرف یہ کہ ان مہاجرین کو حبشہ میں رہنے کی اجازت دی تھی بلکہ انہیں مکمل دینی و فکری آزادی بھی عنایت کی تھی، یہ گروہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے مذہبی امور پر عمل پیرا ہونے کے لیے مکمل آزاد تھا، اسلام لانے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب انہیں عدل کی کھلی فضا میں سانس لینا میسر آیا تھا، یہاں آکر انہوں نے امن کا ذائقہ چکھا اور عبادت کی لذت سے شاد کام ہوئے، یہاں کوئی عبادت کے ذائقے کو کرا کر کرنے والا تھا نہ حلاوت ایمانی میں کڑواہٹ گھولنے والا۔ (صور من حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۶۹)

قریش کی مکاری اور حضرت جعفر کی حاضر جوابی: قریش مکہ کے کانوں تک جب یہ خبر پہنچی کہ مسلمان حبشہ میں سکون بھری زندگی بسر کر رہے ہیں، اپنے عقائد و نظریات اور دین پر عمل کرنے کے لیے مکمل آزاد ہیں بلکہ شاہ حبشہ کی رعایات و عنایات بھی انہیں حاصل ہو گئی ہیں تو حیران و پریشان ہو گئے، ان کی یہ پریشانی ان کی سرشت کے عین مطابق تھی کیونکہ انہیں سب سے زیادہ مزہ مسلمانوں کے پریشان ہونے سے ملتا تھا اور یہاں معاملہ بالکل الٹ گیا تھا، وہ فوراً سر جوڑ کر بیٹھے، مشورہ کیا اور اس بات پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا کہ آخر مسلمانوں سے حبشہ میں حاصل راحت و سکون کیسے چھینا جائے، ظلم کی چکی میں دوبارہ پیسنے کا موقع کیسے ہاتھ آئے؟ آخر اس بات پر اہل مکہ متفق ہوئے کہ ان مہاجرین کو مکہ واپس لایا جائے اس کے لیے انہوں نے ایک منصوبہ تیار کیا تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اس منصوبے کو حضرت ام سلمہ کی زبانی سنتے ہیں، ہم قارئین کے سامنے ان کی وہ روایت پیش کر رہے ہیں جسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ہم لوگ حبشہ پہنچے تو ہمیں وہاں بہترین امن میسر آیا، ہم اپنے دین سے متعلق مامون و مطمئن تھے، بغیر کسی دقت و پریشانی کے اپنے معبود حقیقی رب بحر و بر کی عبادت کا مزہ لے رہے تھے، تکلیف تو دور کوئی ناپسندیدہ بات بھی سننے میں نہیں آتی تھی لیکن جب یہ خبر قریش کو پہنچی تو انہوں نے باہمی مشورہ کر کے شاہ حبشہ نجاشی کی طرف اپنے دو قاصد روانہ کیے، دونوں قاصد زبان و بیان، فکر و خیال، مباحثے اور قوت استدلال کے اعتبار سے قریش میں ممتاز خیال کیے جاتے تھے، ایک کا نام عمرو بن عاص تو دوسرے کا عبداللہ بن ربیعہ تھا۔ (بعض حضرات نے دوسرا نام عمارہ بن ولید بیان فرمایا ہے۔ (حلیۃ الاولیاء)

قریش مکہ کا مقصد مہاجر مسلمانوں کو واپس مکہ لانا تھا، اس لیے ان قاصدوں کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ نجاشی اس کے ہم نشینوں اور نصاریٰ کے مذہبی پیشواؤں کے لیے حجاز کے عمدہ تحفوں اور ہدایا کا شاندار انتظام کیا گیا تھا، ایسے تحفے جسے غیر حجازی لوگ قدر، پسند اور لچائی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، ان دونوں کو یہ نصیحت بھی کی گئی تھی کہ شاہ حبشہ کے ملنے سے پہلے یہ لوگ اس کے ہم نشینوں اور تمام پادریوں سے ملاقات کر کے تحائف، نذرانے اور ہدایا پیش کر کے انہیں اس بات کے لیے آمادہ کریں کہ وہ بادشاہ کی بارگاہ میں ان کے مطلوب و مقصود پر ان کی سفارش کریں۔ قریش کے دونوں سفیر حبشہ پہنچے اور ہر پادری کو تلاش کر کے نذرانے و تحائف پیش کیے اور ہر ایک سے یہی عرضی لگائی ہمارے کچھ بے وقوف نوجوان اپنے آبا و اجداد کے آبائی دین سے منحرف ہو کر بادشاہ کے قلمرو میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں، انہوں نے اپنی قوم کے اتحاد کو پامال کیا ہے اور اپنی بد عقلی کی بنیاد پر اپنے ذی شعور، عقلمند، اہل خرد آبا و اجداد سے ہٹ کر ایک نئے دین کو اختیار کر لیا ہے۔ خیال رہے وہ آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، ظاہر ہے ان کی کوتاہ نگاہی مذہبی امور میں ان کے دور میں آبا و اجداد کی برابری نہیں کر سکتیں، ان کے باپ دادا ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ انہیں کیا اعتقاد رکھنا ہے اور کون سے دین کو اختیار کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بادشاہ

سلامت سے ان کے بارے میں گفتگو کریں اور انہیں واپس اپنے ملک لے جانے سے متعلق اپنے معروضات پیش کریں، اسی مقصد کے حصول کے لیے ہماری قوم نے ہمیں یہاں بھیجا ہے، آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ جب ہم بادشاہ کی بارگاہ میں ان سے متعلق گفتگو کریں تو آپ ہماری باتوں کی تائید فرمائیں۔ ان نوجوانوں سے ان کے دین کے معاملے میں کوئی بات سنے بغیر انہیں ہمارے سپرد کر دینے کا مشورہ شاہ حبشہ کے سامنے رکھیں، تمام پادریوں نے دونوں سفیروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ عمرو بن عاص اور ان کے ساتھی کو اس وقت سب سے زیادہ ناپسندیدہ بات یہ تھی کہ شاہ حبشہ دین کے معاملے میں ہم مسلمانوں سے کوئی بات کرے۔ اہل مکہ کے فرستادہ دونوں قاصد جب بادشاہ کے ہم نشینوں اور پادریوں سے متعلق مطمئن ہو چکے تو نجاشی سے ملاقات کا قصد کیا چنانچہ شاہ حبشہ کے دربار میں پہنچے، پوری عزت و تکریم کے ساتھ بادشاہ سے ملاقات کی، نذرانے اور تحائف پیش کیے، بادشاہ نے حجاز کے گراں قدر تحائف کو پسند کی نظر سے دیکھا اور قبول کیا، سلسلہ گفتگو کا آغاز ہوا، قریش کے دونوں سفیروں نے اپنا مقصد بادشاہ کے حضور پیش کیا، سفیروں نے کہا: بادشاہ سلامت! ہمارے چند بد معاش، بے وقوف قسم کے نوجوانوں نے حضور کے دارالسلطنت میں پناہ لے رکھی ہے، انہوں نے ایسے دین کو اختیار کیا ہے نہ اسے آپ پہچانتے ہیں اور نہ ہم جانتے ہیں، یہ نوجوان ہمارے دین کو ترک کر چکے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، ان بے وقوفوں کے معزز ترین، عالی دماغ آبا و اجداد، چچا تاؤ اور کنبے قبیلے والوں نے ہمیں بادشاہ سلامت کی بارگاہ میں بھیجا ہے تاکہ آپ انہیں ان کی طرف واپس لوٹا دیں، اس میں شک نہیں کہ ان کے باپ دادا اور خاندان والے ان سے متعلق بہتر جانتے ہیں اور جس فتنے میں یہ مبتلا ہو گئے ہیں، وہ اس فتنے کو بھی اچھے طریقے سے پہچانتے ہیں، اتنا جتنا یہ بیوقوف نہیں جانتے۔

حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں بادشاہ کے پاس جو پادری موجود تھے ان سب نے

دونوں قاصدوں کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: عالی جاہ! بے شک یہ دونوں صحیح کہہ رہے ہیں کہ ان کی قوم ہی ان کے بارے میں بہتر جانتی ہے اور وہی ان کا فیصلہ کرنے کی زیادہ مستحق ہے، لہذا آپ ان نوجوانوں کو ان دونوں کے سپرد فرمادیں تاکہ یہ لوگ انہیں اپنے ملک لے جا کر قوم سے ملا دیں پھر وہ جو مناسب سمجھیں فیصلہ فرمائیں۔ یہ سن کر بادشاہ شدید غضب ناک ہو گیا، اس نے کہا: نہیں، خدا کی قسم! میں بغیر ان سے بات کیے انہیں ان کے سپرد ہرگز نہیں کروں گا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے سب کو چھوڑ کر میرے ملک کو اختیار کیا، میں حقیقت حال جانے بغیر انہیں کسی کے سپرد کر دوں؟ میں پہلے انہیں بلاؤں گا، جو الزام ان پر لگائے جا رہے ہیں ان کی تحقیق کروں گا، اگر حقیقت یہی ہوگی جو یہ دونوں قریشی کہہ رہے ہیں تو میں ان نوجوانوں کو ان کے حوالے کر دوں گا، بصورت دیگر میں ان کی حفاظت کروں گا جب تک وہ میری پناہ چاہیں گے میں انہیں پناہ فراہم کروں گا۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں: پھر شاہ حبشہ نے اپنی ملاقات کے لیے ہمیں طلب کیا، ہم سب لوگوں نے بادشاہ کے دربار میں پہنچنے سے پہلے مشورہ کیا تو طے پایا کہ عنقریب بادشاہ تم سے تمہارے دین و ایمان کے بارے میں سوال کرے گا لہذا ہمیں اپنے دین و ایمان کے بارے میں علی الاعلان وہی سب کچھ کہنا ہے جو ہمارے علم میں ہے اور جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے، نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو اور ہم سب کی نمائندگی حضرت جعفر بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کریں گے اور وہی بادشاہ سے کلام کریں گے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: پھر ہم لوگ نجاشی کی بارگاہ میں پہنچے، ہم نے وہاں دیکھا کہ بادشاہ نے پہلے سے ہی اپنے پادریوں کو بلا رکھا ہے، بادشاہ کے دائیں اور بائیں انہوں نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال رکھی تھیں، وہ سب کے سب اپنی خاص مذہبی پوشاک میں ملبوس تھے اور سرٹوپوں سے ڈھکے ہوئے تھے، ان کی دینی کتابیں ان کے سامنے رکھی ہوئی تھیں، مجلس میں عمرو بن عاص اور عبد اللہ بن ربیعہ بھی موجود تھے۔ جب ہم داخل ہو چکے اور مجلس جم گئی تو نجاشی نے ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا: وہ کونسا

دین ہے جس کو تم نے اپنا لیا ہے، جس کی وجہ سے تم نے اپنی قوم کے قدیم دین کو چھوڑ دیا ہے، موجودہ ملتوں میں سے نہ تم نے یہودیت کو اختیار کیا ہے اور نہ ہی ہمارے دین کو، آخر تمہارا دین کیا ہے مجھے اس کے بارے میں بتاؤ؟ نجاشی کی گفتگو سن کر حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور آپ نے فرمایا: اے بادشاہ! ہم جاہلیت کی زندگی گزار رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے، مردار کھاتے، بے حیائی کے کام کرتے، رشتے داریاں توڑتے، پڑوسیوں سے برا سلوک کرتے، ہمارا طاقتور کمزور کو ستا رہا تھا، ہمارا یہی حال تھا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب، نسب، سچائی، امانتداری اور پاکدامنی سے ہم بخوبی واقف ہیں، انہوں نے ہمیں خدائے واحد کی توحید پرستی اور عبادت گزاری کی دعوت دی اور یہ کہ ہم ان بتوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہم اور ہمارے باپ دادا کرتے تھے، ہمیں سچ بولنے، رشتہ جوڑنے، امانت ادا کرنے، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے، حرام کاموں سے رکنے اور قتل و خوں ریزی سے باز آنے کا حکم دیا، فحش بات بکنے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک باز عورتوں کو تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ اس نبی مبعوث نے ہمیں وحدہ لا شریک کی بندگی کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرنے کا حکم دیا، انہوں نے ہمیں نماز و زکوٰۃ ادا کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بادشاہ کے سامنے اسلام کے امور کو پیش کرتے ہوئے فرمایا: بادشاہ سلامت! ان تمام باتوں میں ہم نے اپنے نبی کی تصدیق کی ان پر ایمان لائے اور جو احکام وہ اللہ کی طرف سے لے کر آئے اس میں ہم نے ان کی تابعداری کی، ہم نے صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت شروع کر دی، شرک کو یکسر چھوڑ دیا، جس چیز کو انہوں نے حرام کیا ہم نے اس کو حرام جانا، جس کو حلال کیا ہم نے اس کو حلال مانا، بس پھر کیا تھا ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی، ہمیں قسم قسم کے عذابوں میں مبتلا کر دیا تاکہ ہمیں ہمارے دین اور ہمارے خدا کی عبادت سے پھیر کر بتوں کی عبادت پر لگا دیں اور ہم خبیث اور حرام چیزوں کو پہلے ہی کی طرح حلال سمجھنے لگیں۔ اے بادشاہ! جب

ان کے مظالم اور زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں، زمین ہم پر تنگ ہو گئی یہ لوگ ہمارے اور دین کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم آپ کے ملک میں ہجرت کر کے آئے، سب کو چھوڑ کر ہم نے آپ کے سایہ امان کو اختیار کیا، اس امید پر کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں: یہ سن کر نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: کیا تمہارے پاس اس کلام میں سے کچھ موجود ہے جو تمہارے نبی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے؟ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اثبات میں جواب دیا، نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تلاوت کرنے کا حکم دیا تو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورہ مریم کی ابتدا سے چند آیات پڑھ کر سنائیں، یہ قرآن کریم کی اثر آفرینی کا کرشمہ تھا کہ تلاوت سن کر بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، یہاں تک کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی، دربار میں موجود تمام پادری بھی اس قدر روئے کہ ان کے سامنے رکھے ہوئے مذہبی مصاحف ان کے آنسوؤں سے بھیگ گئے، پھر نجاشی نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بے شک یہ کلام اور حضرت عیسیٰ (بعض روایات میں حضرت موسیٰ) کا لایا ہوا کلام ایک ہی چراغ سے نکلی ہوئی روشنیاں ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ عمرو بن العاص اور ان کے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا اور فرمایا: نہیں، خدا کی قسم! میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے سپرد نہیں کروں گا، جاؤ اپنا کام کرو۔

حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں ان کا داؤ فیل ہو چکا تھا دونوں ذلت و خواری کے ساتھ دربار سے باہر نکل گئے، دربار برخاست ہو چکا تھا، دونوں فریق باہر نکل رہے تھے کہ عمرو بن عاص نے ہمیں دھمکاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا: خدا کی قسم! میں کل پھر بادشاہ کے دربار میں حاضری دوں گا، ان لوگوں سے متعلق بادشاہ کو وہ باتیں بتاؤں گا جس سے بادشاہ کا سینہ غیظ و غضب سے بھر جائے گا، اس کے دل میں ان کے لیے سوائے کراہت و نفرت کے اور کچھ نہ ہوگا، پھر میں بادشاہ کو اس کے لیے تیار کروں گا کہ وہ ان کی جڑیں کاٹ دے اور

نام و نشان مٹا دے، اپنے ساتھی کی بات سن کر عبداللہ بن ربیعہ نے کہا: اے عمرو! ایسا مت کرو کچھ بھی سہی آخر یہ ہمارے خاندانی اور رشتہ دار ہیں اگرچہ انہوں نے دین کے معاملے میں ہماری مخالفت کی ہے، عمرو نے جواباً کہا: عبداللہ یہ باتیں چھوڑو اور کل کا انتظار کرو جب کل بھرے دربار میں میری کہی گئی باتوں سے ان کے قدم لرز رہے ہوں گے، خدا کی قسم! میں بادشاہ کو بتاؤں گا یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ بن مریم سے متعلق خدا کا بندہ ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

دوسرے دن عمرو اپنے ساتھی کے ساتھ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور بیان کرنا شروع کیا، اے بادشاہ! یہ لوگ جن کو آپ نے پناہ دے رکھی ہے اور جن کی حفاظت کا بیڑا اٹھا رکھا ہے، یہ لوگ حضرت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں بہت بھاری بات کہتے ہیں، انہیں بلا کر حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کا عقیدہ معلوم کیجئے۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں: جب ہمیں اس بات کا علم ہوا تو ہم پر ناقابل بیان رنج و غم طاری ہو گیا، اتنا غم اس سے پہلے ہم نے کبھی برداشت نہ کیا تھا، ہم نے باہم مشورہ کیا کہ اب ہم لوگ حضرت عیسیٰ سے متعلق سوال کے جواب میں کیا کہیں گے؟ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہوئے ان کی عبادت کرتے ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن نے انہیں خدا کا بندہ فرمایا ہے، بے شک یہی حق اور سچ ہے عیسائیوں کا عقیدہ باطل اور غلط ہے۔ یہ ایک بہت ہی سخت مقام اور پیچیدہ راستہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہم سب لوگ اس بات پر متفق ہوئے کہ ہمیں حضرت عیسیٰ کے بارے میں وہی سب کچھ کہنا ہے جو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے، اللہ کے فرمان سے ہم بال کے برابر بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتے اس کے نتیجے میں چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔ اس بار بھی ہم سب لوگ اس پر متفق تھے کہ سب کی ترجمانی حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمائیں گے، باقی سب لوگ خاموش رہیں۔

ہمیں پھر دربار میں طلب کیا گیا سارے مہاجرین طلبی کے مطابق حاضر ہو گئے،

دربار میں پہنچے تو وہی پہلے والا منظر نظر آیا، جس کا مشاہدہ ہم اس سے پہلے بھی کر چکے تھے، پادری اپنی اپنی جگہ حسب سابق بیٹھے ہوئے تھے، عمرو بن عاص بھی اپنے معاون کے ساتھ دربار میں موجود تھا، ہمیں دیکھتے ہی بادشاہ نے سوال کیا: حضرت عیسیٰ بن مریم سے متعلق تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً فرمایا: ہم ان کے بارے میں وہی مانتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں ہمیں خبر دی ہے، بادشاہ نے کہا: آپ کو ان کے متعلق کیا بتایا گیا ہے؟ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ان سے متعلق ہمارے نبی کا فرمان ہے ”انہ عبد اللہ ورسولہ“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس کی تخلیق کردہ روح اور ایسا کلمہ ہیں جس کا القا اللہ تبارک و تعالیٰ نے کنواری پاک باز مریم کی طرف فرمایا۔

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب سننے کے بعد نجاشی نے پر جوش انداز میں اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور فرمایا: خدا کی قسم! جو تمہارے نبی نے بتایا ہے حضرت عیسیٰ بن مریم ایک بال کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ نجاشی کی یہ بات پاس میں بیٹھے پادریوں کو اتنی بری لگی کہ ان کی ناک بھوں چڑھ گئیں ناک سے ناپسندیدگی کے خراٹے نکلنے لگے، نجاشی نے پادریوں کی یہ حالت دیکھ کر فرمایا: حقیقت یہی ہے اگرچہ تم سب نتھنے پھلاتے رہو۔ پھر بادشاہ نے ہم سے فرمایا: تم لوگ جاؤ اور میرے ملک میں امن و امان کے ساتھ رہو، جو تمہیں برا کہے گا جرمانہ بھرے گا، جو چھیڑ چھاڑ کرے گا سزا پائے گا، نجاشی نے یہ جملے تین مرتبہ فرمائے، پھر کہا: خدا کی قسم! تمہیں سزا دلانے کے لیے مجھے کوئی پہاڑ برابر سونا بھی پیش کرے گا تو میں اسے قبول نہیں کروں گا اور فرمایا: ان دونوں نے جو تحفے دربار میں پیش کیے تھے وہ سب انہیں واپس کر دیے جائیں، مجھے ایسے تحائف کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: یہ سن کر عمرو بن عاص اور عبد اللہ بن ربیعہ شکست خوردہ ذلیل و رسوا ہو کر دربار سے باہر نکل گئے حال یہ تھا کہ ذلت و خواری ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی اور ہمیں الحمد للہ نجاشی کے پاس بہترین ٹھکانہ اور عزت و اکرام

کے ساتھ رہنا میسر آیا تھا۔ (صومن حیاة الصحابة، ص: ۲۷۵، سيرة ابن هشام، ج: ۱، ص: ۳۳۸، السيرة النبوية لابن اسحاق، ج: ۱، ص: ۲۵۰، تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۱۲۳، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۴۹۸)

قارئین کرام! اگر اس طویل تاریخی اقتباس پر غور کریں گے تو دو باتیں کھلے طور پر سامنے آئیں گی ایک تو یہ کہ مسلمانوں نے اس پورے واقعے میں یہ جانتے ہوئے کہ وہ نصاریٰ کے عقیدے کے سراسر خلاف باتیں کرنے جا رہے ہیں، کہیں بھی مکر و فریب یا جھوٹ کی آمیزش نہیں کی بلکہ اتنے سنگین حالات میں بھی انہوں نے سچائی اور حق گوئی کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا، انہیں اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو سچا علم حاصل تھا اس پر آخری دم تک قائم رہے۔ دیگر یہ کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان کی متانت، سلاست، سنجیدگی، حق گوئی، بے باکی اور ان کی حاضر جوابی نے نجاشی کو متاثر کیا اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں پر رحمت و سکینہ نازل کرتے ہوئے انہیں کھلم کھلا فتح نصیب فرمائی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

احسان کا بدلہ احسان: شاہ حبشہ نجاشی نے مسلمانوں کے ساتھ کمال حسن سلوک پیش کیا تھا، جس سے مسلمانوں کے دلوں میں نجاشی کی محبت گھر کر گئی تھی، پھر اچانک ہوا یہ کہ ایک شخص نے نجاشی کے خلاف بغاوت کر دی اور نجاشی پر چڑھائی کر دی، جب مسلمانوں کو اس بات کا پتا چلا تو شدید رنج و غم کا شکار ہو گئے کیونکہ اگر فریق مخالف فتح یاب ہو جاتا تو مسلمان اپنے محسن کے احسان سے محروم ہو جاتے اور پھر یہ دوسرا نہ جانے مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا۔ اس پیش آئند خطرے اور جذبہ احسان شناسی کے تحت مسلمانوں نے نجاشی کے لیے دل کھول کر گر گڑا کر بارگاہ رب العالمین میں دعائیں کیں اور نجاشی کی فتح کے لیے اللہ پاک سے مدد طلب کی، جب نجاشی کا اپنے مخالف سے مقابلہ ہونے والا تھا تو مسلمانوں نے نتیجے کی خبر لانے کا انتظام کیا، باہمی مشورہ ہوا کہ کون جائے گا، موقع واردات

پر جا کر دیکھیے گا اور جنگ کے نتیجے سے مسلمانوں کو خبردار کرے گا؟ سب سے کمسن ہونے کے باوجود یہ ذمہ داری حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبول فرمائی، ایک مشک کے سہارے دریائے نیل کو پار کر کے حضرت زبیر جنگی محاذ پر پہنچے، پورا منظر دیکھا، اللہ تعالیٰ کا کرم مسلمانوں کی دعاؤں کی برکت سے نجاشی کو فتح میسر آئی، حضرت زبیر نے آ کر مسلمانوں کو یہ بشارت جاں فزا سنائی جسے سن کر مارے خوشی کے مسلمانوں کے سینے چوڑے ہو گئے۔ (السيرة النبوية، لابن اسحاق، ج: ۱، ص: ۲۵۰، سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۳۳۸)

حضرت جعفر کے ہاتھ پر نجاشی کا ایمان: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو

صرف یہی شرف حاصل نہیں کہ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت کے ذریعے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو خطرے میں پڑنے سے بچا لیا تھا بلکہ انہیں عزت و وقار اور امن و امان کے ساتھ حبشہ میں رہائش کا موقع بھی میسر آیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے لیے ان کی ایک بڑی خدمت یہ بھی رہی کہ شاہ حبشہ نجاشی ان کے دست حق پرست پر ایمان بھی لے آیا، اس کا انکشاف خود نجاشی نے اپنے اس خط میں کیا تھا جو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بھیجا تھا، اس کی تفصیل علامہ بدر الدین عینی نے امام ابن سعد کے حوالے سے کچھ اس طرح لکھی ہے:

چھ ہجری میں اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شاہ حبشہ نجاشی کی طرف اپنے قاصد حضرت عمرو بن امیہ الضمری کو اپنا خط لے کر روانہ فرمایا، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو اسلام کی دعوت دی تھی، نجاشی کو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ملا اس نے خط کو ہاتھ میں لیا، چوم کر آنکھوں سے لگایا، خط کے احترام میں بادشاہ تخت شاہی سے اتر کر فرش زمین پر آ بیٹھا، حضور کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے بادشاہ نے اسلام کا کلمہ پڑھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جوابی خط ارسال کیا، اس میں تحریر کیا کہ وہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکا ہے۔ (عمدة القاری، کتاب الجنائز باب الرجل ینعی الی اہل المیت بنفسہ، منہج الافکار فی تحقیق مبانی الاخبار فی شرح معانی الآثار للعبی کتاب الجنائز باب التہنئة علی الجنائز کم ہو)

علامہ نووی تحریر فرماتے ہیں: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھی نجاشی کے اسلام لانے کا سبب بنے۔ (تہذیب الاسماء واللغات، ج: ۱، ص: ۱۳۸)

امام ابن سعد تحریر فرماتے ہیں: نجاشی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خط کو اپنی آنکھوں پر رکھا اور ادباً اپنے تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا پھر حق کی شہادت دی (کلمہ شہادت پڑھا) اور کہا: اگر میں استطاعت پاتا تو خدمت اقدس میں ضرور حاضری دیتا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط تحریر کیا جس میں لکھا میں نے حضور کی بات کو قبول کر لیا ہے، میں دل سے آپ کی تصدیق کرتا ہوں اور میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکا ہوں۔ (طبقات، ج: ۱، ص: ۲۲۲)

نجاشی نے حضور کا نکاح ام حبیبہ سے کیا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نجاشی کو ایک خط اور لکھا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان سے کر دے۔ ام حبیبہ اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ آئی تھیں لیکن عبید اللہ بن جحش بدبختی سے حبشہ میں نصرانی ہو کر مر گیا، نجاشی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ام حبیبہ کے پاس اپنی باندی ابرہہ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیغام نکاح لے کر بھیجا کہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح ان کے وکیل کی حیثیت سے تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں لہذا تم اپنا وکیل میرے پاس بھیج دو، ام حبیبہ نے خالد بن سعید کو اپنا وکیل منتخب کر کے نجاشی کے پاس بھیج دیا۔

نجاشی نے حضور کے نکاح کا خطبہ پڑھا: شام کے وقت محفل نکاح کا انعقاد ہوا، نجاشی نے خطبہ نکاح پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنائیاں کی اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دی پھر وکالت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا: بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح ام حبیبہ کے ساتھ کر دوں، لہذا میں نے ام حبیبہ کا نکاح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے مہر کے چار سو دینار بھی میں نے ام

حبیبہ کو ادا کر دیے ہیں۔ دوسری طرف سے خالد نے جوابی خطبہ پڑھتے ہوئے کہا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق میں نے اپنی مؤکلہ ام حبیبہ کا نکاح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کر دیا پھر جو دینار نجاشی نے ام حبیبہ کے مہر کے طور پر دیے تھے خالد نے ام حبیبہ کی طرف سے ان پر قبضہ کر لیا، محفل نکاح میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حبشہ میں موجود تمام مسلمان حاضر تھے۔ اس کے بعد شاہ حبشہ نے اس نکاح کی خوشی میں ان لوگوں کے لیے ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ (الاصابة، ج: ۸، ص: ۸۴، طبقات ابن سعد، ج: ۱، ص: ۲۲۳، المستدرک للحاکم، ج: ۴، ص: ۲۲)

حضور کے خطوط کو نجاشی نے محفوظ کر دیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے خط میں نجاشی کو یہ بھی لکھا تھا کہ جو مسلمان حبشہ میں مقیم ہیں، وہ انہیں مدینہ منورہ روانہ کر دے، لہذا اس حکم پر عمل کرتے ہوئے نجاشی نے مسلمانوں کے لیے سفر کے عمدہ انتظامات کیے اور انہیں دو کشتیوں پر سوار کر کے سوئے مدینہ طیبہ روانہ کیا پھر بادشاہ نے ہاتھی کے دانت کی ایک ڈبی منگائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خط ادب و احترام کے ساتھ محفوظ کر دیے اور سامعین سے فرمایا: اہل حبشہ اس وقت تک بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک یہ دونوں خط ان کے درمیان موجود رہیں گے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۱، ص: ۲۲۳)

حضور نے نجاشی کی نماز جنازہ پڑھی: مذکورہ سطور میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک ہاتھ پر اسلام قبول کیا، اسلام قبول کرنا نجاشی کی بڑی سعادت مندی تھی۔ یہ ایسی سعادت ہے جو ان گنت سعادتوں کو جامع ہے لیکن ان کو بطور خاص ایک سعادت اور میسر آئی کہ جب ان کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی (بظاہر) غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ (حقیقت میں انکا جنازہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے تھا)

بخاری شریف میں ہے جس دن نجاشی کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: آج ایک مرد صالح کا انتقال ہو گیا ہے، کھڑے ہو جاؤ اور اپنے بھائی احمہ کی نماز

جنازہ پڑھو۔ (نجاشی شاہ حبشہ کا لقب تھا اور اس کا اصلی نام اصحمہ تھا)

دوسری حدیث میں ہے جس دن نجاشی کا انتقال ہوا، اسی دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نجاشی کی وفات کی خبر اپنے صحابہ کو دے دی اور فرمایا: اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو۔ ایک اور حدیث پاک میں ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ نجاشی کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے نکلے صف بندی کی گئی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نجاشی کی نماز جنازہ میں چار تکبیر کہیں۔ (صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب التکبیر علی الجنائز، کتاب المناقب باب موت النجاشی)

تقریباً انہیں الفاظ کے ساتھ مسلم شریف میں بھی یہ احادیث موجود ہیں، ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہ سے مروی حدیث میں ہے: جب نجاشی کا انتقال ہوا تو ہم لوگ ذکر کرتے تھے نجاشی کی قبر پر مسلسل نور دکھائی دیتا رہا۔ (سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب فی النوریرہ عند قبر الشہید)

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری مرقات میں فرماتے ہیں ”ہم لوگ آپس میں تذکرہ کرتے تھے کہ حضرت نجاشی کی قبر پر مسلسل نور دکھائی دیتا رہا یعنی ہم میں یہ بات مشہور تھی اور ان لوگوں کی طرف سے بیان کی گئی، جنہوں نے ہم میں سے اس نور کو دیکھا تھا، یہ شہرت متواتر کے قریب تھی“۔ (مرقات، کتاب الفضائل باب الکرامات)

سورہ آل عمران کی آیت کریمہ ”وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ“ اور بے شک کچھ کتابی ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو تمہاری طرف نازل کیا گیا۔ (آیت: ۱۹۹)

اس آیت کریمہ کا شان نزول بیان کرتے ہوئے مفسرین بیان فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ شاہ حبشہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی تھی، ان کا نام اصحمہ تھا، ان کی وفات پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے غلاموں سے فرمایا: چلو اور اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھو جس کی دوسرے ملک میں وفات ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جنت البقیع تشریف لے گئے حبشہ کی سر زمین آپ کی نگاہوں کے سامنے کر دی گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نجاشی کے جنازے کو دیکھ

رہے تھے پھر آپ نے نماز جنازہ پڑھی نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہیں اور ان کے لیے استغفار کیا۔ اس پر بعض منافقین نے اعتراض کیا دیکھو محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک ایسے نصرانی کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں جس کو نہ انہوں نے دیکھا ہے اور نہ ہی وہ ان کے دین پر ہے۔ تب اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

(تفسیر خازن، تفسیر قرطبی، سورہ آل عمران، آیت: ۱۹۹)

امام ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ نجاشی کا نام اصمہ تھا جس کا معنی عربی میں عطیہ ہوتا ہے، نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا جیسا کہ فارس کے بادشاہ کو کسریٰ اور روم کے بادشاہ کو قیصر کہا جاتا ہے۔ امام ابن اسحاق نے اس مقام پر وہ تمام روایتیں ذکر کی ہیں جن کو ابھی آپ پڑھ آئے ہیں۔ (السیرة النبویہ لابن اسحاق، ج: ۱، ص: ۲۵۳)

ایک شبہ کا جواب: مسلم شریف کتاب الجہاد والسیر میں ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسریٰ، قیصر اور نجاشی کو اللہ کی طرف بلانے (دعوت اسلام) کے لیے خط لکھا اور یہ وہ نجاشی نہیں ہے جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھی ہے۔ اس روایت میں اور ہمارے ذکر کردہ دلائل میں بظاہر تعارض دکھائی دیتا ہے، کیونکہ ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ وہی نجاشی ہیں جن کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دعوت حق کا خط بھی لکھا ہے اور ان کی نماز جنازہ بھی پڑھی ہے۔ اس اعتراض کا جواب علامہ عینی نے اپنے ان الفاظ کے ذریعے دیا ہے ”کانہ وہم من بعض الرواة“ صحیح مسلم کا یہ جملہ ”ولیس بالنجاشی الذی صلی علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ یہ وہ نجاشی نہیں جس کی نماز جنازہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پڑھی تھی، بعض راویوں کا وہم ہے۔

دوسرا جواب علامہ عینی نے یہ دیا: یہ روایت اس بات پر محمول ہے کہ جب نجاشی (اول) کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ دوسرا نجاشی بادشاہ بنا اور اس کی طرف حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (دوسرا) خط لکھا، اس دوسرے نجاشی کی نماز جنازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھی۔ (عمدة القاری، کتاب الجنائز باب الرجل، یعنی الی اہل المیت بنفسہ، مخرج الافکار فی تنقیح مبانی

(الانبار فی شرح معانی الآثار کتاب الجنائز)

علامہ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک خط اس نجاشی کو لکھا جس کی نماز جنازہ آپ نے پڑھی اور ایک خط اس نجاشی کو لکھا جو نجاشی اول کے بعد بادشاہ بنا تو یہ دوسرا خط پہلے نجاشی کے بعد میں لکھا گیا۔ نجاشی اول وہ ہے جن کی نماز جنازہ حضور نے پڑھی ہے اور انہیں خط بھی لکھا ہے۔ (مرقاۃ، کتاب الجنائز، باب المشی بالجنائز)

علامہ ابن مقلن نے اپنی شرح میں بھی یہی جوابات نقل فرمائے ہیں۔ (التوضیح لشرح الجامع الصحیح کتاب الجنائز، باب الرجل یتبعی الی اہل المیت) غائبانہ نماز جنازہ: حضرت نجاشی کا انتقال حبشہ میں ہوا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ ان کی نماز جنازہ مدینہ منورہ میں ادا فرمائی، اس سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی، حالانکہ ہمارے مذہب میں غائبانہ نماز جنازہ درست نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی (جیسے بہت ساری چیزیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں دوسروں کو اس کی اجازت نہیں ہوتی ایسے ہی نجاشی کی نماز جنازہ کا معاملہ ہے) علامہ زرقانی فرماتے ہیں: ”ودلائل الخصوصية واضحة“ خصوصیت کے دلائل واضح ہیں اس میں کوئی غیر حضور کا شریک نہیں ہو سکتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نجاشی کا جنازہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظروں کے سامنے کر دیا گیا تھا، تو اب جنازہ غائب نہ رہا بلکہ حاضر رہا، یہ ایسے ہی ہو گیا جیسے کہ امام جنازے کو دیکھ رہا ہو اور مقتدی کی نظر جنازے تک نہ پہنچ رہی ہو، اس طرح کی نماز جنازہ میں کسی کو کوئی کلام نہیں لہذا نجاشی کی نماز جنازہ بھی اسی قبیل سے ہے کہ جنازہ امام الانبیاء کی نظروں کے سامنے رکھا تھا اگرچہ صحابہ کرام کو نظر نہیں آ رہا تھا۔

(شرح الزرقانی علی المؤطا، کتاب الجنائز باب التبع علی الجنائز)

حضرت جعفر کی حبشہ سے روانگی: نجاشی اور اس کی حکومت کے زیر سایہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ پرسکون اور قابل اطمینان دس سال

کا طویل عرصہ گزارا، جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نجاشی کی طرف خط لکھا تو اس میں یہ بات بھی تحریر فرمائی: ”تمہارے پاس جو مسلمان ہجرت کر کے آئے تھے ان سب کو میرے پاس مدینہ طیبہ روانہ کر دو“ ادھر حبشہ میں موجود مسلمانوں کو بھی اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے آئے ہیں، حالات بہتر ہیں اور مسلمان شان و شوکت کے ساتھ جی رہے ہیں تو انہوں نے بھی نجاشی سے اس بات کی درخواست کی کہ وہ انہیں مدینہ پاک بھیجنے کا انتظام فرمادیں۔ نجاشی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کو سمندری راستے سے بھیجنے کا نہ صرف انتظام فرمایا بلکہ ان کے لیے توشہ سفر کا اہتمام بھی کیا۔

(ذخائر العقبی، ص: ۳۴۷، بل الہدی والرشاد، ج: ۱۲، ص: ۳۶۹، صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۷۵)

حضرت جعفر کی مدینہ آمد پر حضور کی خوشی: ہجرت کے ساتویں سال حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ حبشہ سے سفر کر کے مدینہ طیبہ پہنچے، یہ وہ زمانہ تھا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے غلاموں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے خیبر کی فتح نصیب فرمائی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے پلٹ کر مدینہ طیبہ پہنچے ہی تھے کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بارگاہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مدینہ پاک حاضر ہونے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل جذبات فرح و سرور سے لبریز ہو گیا، جس وقت حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، وہ وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے بڑا خوش کن تھا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھتے ہی اپنے سینے سے لگا لیا اور دونوں آنکھوں کے بیچ بوسہ دیا اور پھر جذبات محبت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”ما ادری باہما اشد فرحاً بقدم جعفر او بفتح خیبر“، ”نہیں معلوم کہ مجھے کس چیز کی زیادہ خوشی ہے خیبر کی فتح کی یا جعفر کے آنے کی۔“ (صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۷۶، ذخائر العقبی، ص: ۳۵۴)

حضور کی زیارت پر حضرت جعفر کا انداز: پچھلے اقتباس سے آپ کو اس بات کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے سے کتنا خوش ہوئے تھے۔ قلعہ خیبر کی فتح کوئی معمولی بات تو نہ تھی، حق و باطل کے کسی بھی معرکے میں جب مسلمانوں کو فتح میسر آتی ہے تو قائد کو میسر آنے والی خوشی کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا اگرچہ وہ معرکہ اپنے آپ میں چھوٹا ہی ہو۔ خیبر تو بڑے معرکوں میں سے ایک ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اس فتح سے کتنی خوشی ہوئی ہوگی، اب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ”نہیں معلوم کہ خیبر کے فتح ہونے کی خوشی زیادہ ہے یا جعفر کے آنے کی“ اس سے صاف طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے پائے جانے والے جذبات محبت کا پتہ چلتا ہے۔ غلام کے آنے پر آقا تانا خوش ہے تو اندازہ کیجئے کہ آقا کی قدم بوسی پر غلام کو کتنی خوشی ملی ہوگی، یہ محبت کی باتیں ہیں انہیں الفاظ کی سرحدوں میں محصور نہیں کیا جاسکتا، اس وقت ہمارے سامنے ایک روایت ہے جس سے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خوشی کا پتہ چلتا ہے۔ ”فلما نظر جعفر الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خجل“ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر پڑی تو ایک قدم پر چل کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف بڑھنے لگے، جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی خوشی، تعظیم اور محبت کا یہ انداز دیکھا تو سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں کو چوم لیا۔ (ذخائر العقبیٰ ص: ۵۳)

ہر مسلمان کو حضرت جعفر کے آنے کی خوشی: ایسا نہیں کہ خوشی صرف اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک محدود تھی، حقیقت یہ ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے سے ہر مسلمان خوش تھا، خاص کر غربا، فقرا اور مساکین، کیونکہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غربا پروری اور فقر انوازی میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔ نادار اور مفلوک الحال لوگوں پر ان کے الطاف کریمانہ اور ایثار خسروانہ کو دیکھ کر ہی حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے انہیں ابوالمساکین جیسے معزز خطاب سے ملقب فرمایا تھا۔ (صومن حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۷۶)

حضور نے حضرت جعفر کو خیبر کی غنیمت سے حصہ دیا: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھی غزوہ خیبر میں حاضر نہ تھے کیونکہ وہ اس وقت تک مدینہ شریف نہیں پہنچے تھے، جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خیبر کو فتح کر چکے تب یہ حضرات مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، لیکن یہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کرم کریمانہ تھا کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر کے مال غنیمت سے حصہ عطا فرمایا، نہ صرف حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلکہ حبشہ سے آئے ان کے ساتھیوں کو بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مال غنیمت سے حصہ عطا فرمایا، حبشہ سے آئے لوگوں کو اس موقع پر ”اہل السفینتین“ (دو کشتیوں والے) کہا جاتا تھا کیونکہ نجاشی بادشاہ نے ان کو دو کشتیوں میں سوار کر کے بھیجا تھا۔ ایک کشتی میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء تھے اور دوسری کشتی اشعریین یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ان کے ساتھیوں کی تھی، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ان کے ساتھیوں کے حبشہ پہنچنے کی وجہ یہ رہی کہ یہ حضرات اپنے وطن سے مدینہ شریف جانے کے لیے نکلے، کشتی پر سوار ہوئے، اللہ تعالیٰ کی قدرت، ہوا کا رخ ایسا ہوا کہ ان کی کشتی حبشہ جا پہنچی، پھر یہ لوگ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ وہیں ٹھہرے رہے اور انہیں کے ساتھ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی ایسے شخص کو خیبر کی غنیمت سے حصہ نہیں دیا جو غزوہ خیبر میں موجود نہ تھا لیکن ”قسم لاهل السفینتین“ دونوں کشتی والوں کو حضور نے مال غنیمت سے حصہ عطا فرمایا۔ (اسد الغابہ، ج: ۶، ص: ۳۰۰، مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل جعفر)

حضور نے حضرت جعفر کو گھر دیا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بڑے مہربان تھے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ نئے نئے وارد ہوئے تھے، ان کے پاس پہلے سے کوئی مکان و جائیداد نہ تھی، اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں گھر بنانے کے لیے مسجد نبوی شریف کے پہلو میں جگہ عنایت

فرمائی۔ (المعارف، ج: ۱، ص: ۲۰۵، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۰۹)

حضور نے حضرت جعفر کو اپنے نکاح کا وکیل بنایا: ۷ ہجری میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے ساتھ عمرہ قضا کے لیے مکہ شریف روانہ ہوئے، اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو میمونہ بنت حارث کی طرف اپنے نکاح کا پیغام لے کر روانہ فرمایا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے اپنا وکیل حضور کے عم محترم حضرت عباس بن عبد المطلب کو متعین فرمایا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت میمونہ کا نکاح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا۔

(دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۱۴، تاریخ خمیس ج: ۲، ص: ۶۴)

حضور، حمزہ، عباس، جعفر آپس میں ہم زلف: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے پیارے چچا حضرت حمزہ و حضرت عباس اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپس میں ہم زلف (ساڑو) ہونے کا رشتہ بھی رکھتے ہیں، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت میمونہ بنت حارث اور حضرت عباس کی اہلیہ حضرت ام الفضل بنت حارث آپس میں سگی بہنیں ہوتی ہیں۔ حضرت حمزہ کی اہلیہ حضرت سلمہ بنت عمیس اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس یہ دونوں حضرت میمونہ اور حضرت ام الفضل کی ماں شریک بہنیں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ چاروں خواتین آپس میں بہنیں ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت حمزہ، حضرت عباس اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپس میں ہم زلف (ساڑو) ہوئے۔ (تاریخ انجمیس، ج: ۲، ص: ۶۴، المواہب اللدنیہ، ج: ۱، ص: ۵۰۳)

حضور کا فیصلہ حضرت جعفر کے حق میں: عمرہ قضا کے موقع پر جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکہ شریف سے روانہ ہوئے تو حضرت حمزہ کی صاحب زادی آپ کے پیچھے پیچھے آئیں، وہ پکار رہیں تھیں اے چچا! اے چچا! پس حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو لیا اور حضرت فاطمہ کے ہاتھوں میں ان کا ہاتھ دیتے ہوئے فرمایا: آپ اپنے چچا کی

بیٹی کو لے لیں، حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو لے لیا پھر حضرت حمزہ کی بیٹی کی پرورش کو لے کر حضرت علی، حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اختلاف ہوا۔ حضرت علی نے کہا: اس کو میں رکھوں گا یہ میرے چچا کی بیٹی ہے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اس کو میں رکھوں گا یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے عقد میں ہے۔ حضرت زید نے کہا: اس کو میں رکھوں گا یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ اس کی خالہ (جو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ ہیں) کے حق میں فرما دیا اور فرمایا کہ خالہ ماں کے درجے میں ہوتی ہے۔ پھر حضرت علی سے فرمایا: تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم صورت اور سیرت میں میرے مشابہ ہو اور حضرت زید سے فرمایا: تم ہمارے بھائی اور ہمارے آزاد شدہ غلام ہو۔ (بخاری، کتاب المغازی باب عمرۃ القضا)

فائدہ: حضرت زید نے حضرت حمزہ کی بیٹی کو اپنے بھائی کی بیٹی اس لیے کہا کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی مکی مواخات حضرت زید کے ساتھ قائم فرمائی تھی۔ حضرت حمزہ کی بیٹی جس کا نام عمارہ ہے اس نے آپ کو چچا کہہ کر پکارا حالانکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمارہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ یہ یا تو آپ کی تعظیم کے لیے تھا یا اس لیے کہ حضرت حمزہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی ہیں، اس رشتے سے آپ عمارہ کے چچا ہوئے۔ (اسی رشتے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ سے عمارہ کے متعلق فرمایا تھا: آپ اپنے چچا کی بیٹی کو لے لو)۔

(عمدة القاری، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضا، نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۴۲)

حضرت جعفر حضور کے گرد جھومنے لگے: جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان فیصلہ فرمایا، فیصلہ چونکہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ہوا تھا اس لیے انہیں بے حد خوشی حاصل ہوئی، وہ اتنے خوش ہوئے کہ کھڑے ہو کر حضور کے گرد جھومنے لگے، حضور صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جعفر یہ کیا ہے؟ عرض کیا: حضور! میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ جب شاہ حبشہ نجاشی کسی سے خوش ہوتا تو وہ شخص مارے خوشی کے بادشاہ کے گرد کھڑے ہو کر جھومنے لگتا (وہی میں نے کیا ہے)۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۱)

حضور نے حضرت جعفر کے پاس جبہ بھیجا: شاہ روم نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں ریشم سے کڑھا ہوا ایک جبہ تحفے کے طور پر بھیجا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو پہنا تو حضور کے ہاتھ آستینوں میں اٹکنے لگے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وہ جبہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیج دیا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جبہ پہن کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جبہ تمہیں پہننے کے لیے نہیں دیا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور ارشاد فرمائیے میں اس کا کیا کروں؟ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اسے اپنے بھائی نجاشی کی بارگاہ میں بطور تحفہ بھیج دو۔

(سنن ابی داؤد، کتاب اللباس باب من کر بہ، حدیث نمبر: ۴۰۴)

حضرت جعفر کے جذبات: آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ۷ ہجری میں عمرہ قضا کے لیے اپنے صحابہ کے ساتھ نکلے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی یہ شرف میسر آیا، یہ بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معیت سے فیض یاب ہوئے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمرہ سے فارغ ہو کر اپنے جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ طیبہ واپس تشریف لے آئے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب غزوہ بدر واحد کا تذکرہ ہوتا بدر میں غلامانِ مصطفیٰ کی جاں نثاری، اسلام کی سرخروئی اور کفر و شرک کی ذلت و رسوائی کے چرچے ہوتے، احد کے میدان میں غازیوں کی استقامت، شہدا کی شہادت اور صحابہ کرام کا جان پر کھیل کر حضور کی حفاظت کرنے کے تذکرے غزوات بالخصوص بدر میں شرکت کرنے والوں کے لیے جنت کی بشارت اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت و معیت کے آوازے وغیرہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل کو خدمت کے جذبات

سے ایسا معمور کر دیتے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے، یہ آنسو آخر کیوں نہ نکلتے ان جاں نثاروں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ”مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجُلٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَّنْ قُتِلَ ۖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ ۚ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا“ (سورہ احزاب، آیت: ۲۳) (مسلمانوں میں کچھ وہ ہیں جنہوں نے اپنے اس عہد کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے کیا تھا ان میں سے بعض اپنی منت پوری کر چکے اور بعض راہ دیکھ رہے ہیں اور وہ ذرا بھی نہیں بدلے) جیسے مبارک اعزاز سے سرفراز فرماتے ہوئے صحابہ کرام کی ہمت افزائی فرمائی، اس قسم کے انعامات و اعزازات نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل کو شہادت کے جذبات سے بھر دیا تھا، ان کا ذہن جنت کی پرواز کر رہا تھا اور وہ اس موقع کی تلاش میں تھے کہ انہیں اسلام کے لیے جان پر کھیلنے کا موقع میسر آجائے، اپنی غیر حاضری کی وجہ سے جو خدمت وہ نہ کر سکے اسے انجام دے کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مزید قرب حاصل کریں۔ (رجال حول الرسول، ص: ۲۰۲)

حضرت جعفر کی بہادری اور حق گوئی: جس وقت نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو طلب کیا گیا تا کہ مسلمانان الزامات کا جواب دیں جو ان پر قریش کے دونوں سفیروں کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دربار میں پہنچے، ظاہر ہے کہ یہ ایسا موقع ہے جہاں فیصلہ نجاشی کو کرنا ہے، ایسے موقع پر کوئی بھی عقلمند ایسی بات نہیں کرنا چاہے گا جو فیصل اور حاکم کو نا پسند ہو۔ بلکہ ہوشیاری اس میں ہے کہ حاکم وقت کے دل کو اپنے اقوال و اعمال سے خوش کیا جائے، لیکن دیکھیے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کتنا خطرناک واقعہ پیش آتا ہے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطرات کے دامن میں بھی موت و زندگی سے بے پرواہ ہو کر حق گوئی و بے باکی کی کیسی مثال قائم فرماتے ہیں، پھر اس حق گوئی پر ان کے خالق و مالک نے ان کی کیسی مدد فرمائی وہ آپ پڑھ چکے ہیں، اب وہ پڑھیے جو دربار میں ہوا۔ عمرو بن عاص اور ان کا دوست قریش مکہ کے سفیر ہونے کی حیثیت سے دربار میں حاضر ہو کر مسلمانوں پر الزامات عائد کر چکے

تھے اور نجاشی کے یہاں بدستور حاضر تھے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دربار میں پہنچے لیکن دربار میں داخل ہوتے وقت آپ نے ایسے شاہی آداب کی قطعاً کوئی رعایت نہیں کی جو اسلامی تعلیمات سے منحرف تھے، اس پر لوگوں کو بہت تعجب ہوا لہذا جو لوگ بھی وہاں موجود تھے انہوں نے بیک زبان کہا: ”اسجدوا للملک“ بادشاہ کو سجدہ کرو، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلا کسی تاخیر و تردد کے فرمایا ”لا نسجد الا للہ“ ہم صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اس کے سوا کسی کو نہیں۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۵۲)

یہی وہ بے خوفی اور جواں مردی کے نمونے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر اقبال کو کہنا پڑا:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے
دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی

روایت حدیث: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احادیث کی روایت بہت کم کی ہے، آپ سے روایت کرنے والوں میں حضرت ابن مسعود، عمرو بن عاص، ام سلمہ اور آپ کے بیٹے عبد اللہ کے اسماء شامل ہیں۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۲۰۶، تہذیب التہذیب، ج: ۱، ص: ۳۰۸)

حضرت جعفر کی اہلیہ: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ کا نام اسماء بنت عمیس ہے، ان کی ماں کا نام ہند بنت عوف ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اور حضرت عباس کی زوجہ حضرت ام الفضل لبابہ کی بہن ہیں۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو ان سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکاح کر لیا، پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہو گیا تو حضرت اسماء سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکاح فرمایا۔

(عمدة القاری، کتاب المغازی باب غزوة خیبر، نعمة الباری، ج: ۷، ص: ۶۰۳)

حضرت اسماء کا فیصلہ: اسماء بنت عمیس کے بطن سے محمد نام کے دو بیٹے پیدا ہوئے، ایک کے والد حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے کے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت علی کے ساتھ جب حضرت اسماء کی شادی ہوگئی تو ایک دن حضرت اسماء اور حضرت علی کی موجودگی میں یہ دونوں شہزادے آپس میں مفاخرت کرنے لگے چنانچہ دونوں نے ایک دوسرے سے کہا: ”میں تم سے بہتر ہوں کیونکہ میرا باپ تمہارے باپ سے بہتر ہے“ شہزادوں کی بات سن کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت اسماء سے فرمایا: ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو، حضرت اسماء نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا: میں نے عربوں میں حضرت جعفر سے زیادہ اچھا جوان اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بہتر متوسط العمر نہیں دیکھا، یہ سن کر سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا، تب حضرت اسماء نے کہا: خدا کی قسم! آپ فضیلت میں ان سے کم ہو کر بھی بہترین ہیں، جواب سن کر حضرت علی نے فرمایا: اگر تم اس کے سوا کہتی تو میں تم سے ناراض ہو جاتا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۳۷)

حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت عمر پر ناراض ہوئیں: امام بخاری اپنی صحیح

میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی حدیث نقل فرماتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جس وقت ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی خبر پہنچی اس وقت ہم یمن میں تھے پس ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، میں تھا اور میرے دو بھائی تھے، اور میں سب سے چھوٹا تھا، ان دونوں میں سے ایک حضرت ابو بردہ تھے اور دوسرے حضرت ابو رہم تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہما، یا انہوں نے کہا: ہم چند اصحاب کے ساتھ یا کہا: ترپن یا باون میری قوم کے مرد تھے، ہم کشتی میں سوار ہوئے، پس کشتی نے ہمیں نجاشی کے ملک حبشہ (ایتھوپیا) میں پہنچا دیا، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موافقت ہوئی۔ ہم ان کے ساتھ ٹھہرے حتیٰ کہ ہم ایک ساتھ (مدینہ) آئے۔ ہماری نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس

وقت ملاقات ہوئی جب آپ خیر فتح کر چکے تھے اور اس وقت بعض صحابہ ہم کشتی والوں سے یہ کہتے تھے: ہم تم سے ہجرت کرنے میں سابق ہیں۔ حضرت اسماء بنت عمیس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ان کی زیارت کے لیے گئی تھیں اور یہ ان میں سے تھیں جو ہمارے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر مدینہ پہنچی تھیں اور انہوں نے بھی حضرت نجاشی کی طرف ہجرت کرنے والوں کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حفصہ کے پاس آئے اور حضرت اسماء بھی ان کے پاس تھیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت اسماء کو دیکھا تو پوچھا: یہ کون ہے؟ انہوں نے بتایا یہ حضرت اسماء بنت عمیس ہیں، حضرت عمر نے کہا: یہ سمندر کے راستے سے حبشہ سے آئی ہیں؟ حضرت اسماء نے کہا: جی ہاں، حضرت عمر نے کہا: ہم تم سے ہجرت کرنے میں سابق ہیں، ہم تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقدار ہیں۔

حضرت اسماء غضب ناک ہوئیں، انھوں نے کہا: ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے وہ تمہارے بھوکوں کو کھلاتے تھے اور تم میں سے بے علم لوگوں کو نصیحت کرتے تھے اور ہم ایسے گھر میں تھے یا ایسی دور کی زمین میں تھے، جہاں کے لوگ ہم سے بغض رکھنے والے تھے، ہم حبشہ میں تھے اور ہمارا وہاں جانا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لیے تھا اور اللہ کی قسم! میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی حتیٰ کہ میں آپ کی بات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر نہ کر دوں۔ ہم کو وہاں ایذا دی جاتی تھی اور ہم کو خوف زدہ کیا جاتا تھا اور میں عنقریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کروں گی اور آپ سے سوال کروں گی اور اللہ کی قسم! میں جھوٹ نہیں بولوں گی اور نہ تحریف کروں گی اور نہ آپ کی بات پر کوئی اضافہ کروں گی پس جب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت اسماء نے کہا: اے اللہ کے نبی! بے شک حضرت عمر نے اس طرح اور اس طرح کہا ہے، آپ نے پوچھا: پھر تم نے ان سے کیا کہا؟ حضرت اسماء نے بتایا: میں نے ان سے اس طرح اور اس طرح کہا، آپ نے فرمایا:

وہ تم سے زیادہ میرے حقدار نہیں ہیں، ان کے اور ان کے اصحاب کے لیے ایک ہجرت ہے اور تمہارے لیے اے کشتی والو! دو ہجرتیں ہیں۔ حضرت اسماء نے کہا: پس تحقیق یہ ہے کہ میں نے دیکھا حضرت ابوموسیٰ اور کشتی والے باری باری میرے پاس آتے اور مجھ سے اس حدیث کے متعلق سوال کرتے اور وہ دنیا کی کسی چیز سے اتنے خوش نہیں ہوئے تھے اور نہ ان کے نزدیک دنیا کی کوئی چیز اتنی عظیم تھی جتنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تھی۔ حضرت ابو بردہ نے کہا: حضرت اسماء نے بتایا کہ میں نے دیکھا کہ حضرت ابوموسیٰ بار بار مجھ سے یہ حدیث دہراتے تھے۔ (بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ خیبر)

قارئین کرام! غور فرمائیں! صحابہ کرام نیکی پر کتنے حریص تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب انکو کتنا محبوب تھا، جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت اسماء بنت عمیس سے یہ کہا: ہم تم سے ہجرت کرنے میں سابق ہیں بریں بنا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ تو حضرت اسماء سخت ناراض ہو کر ب پھر پڑیں، خود بھی اس بات پر دلائل قائم فرمائے کہ وہ ان سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستحق نہیں ہیں اور پھر مقدمے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا، بات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے سے پہلے حضرت عمر کو جتا بھی دیا کہ وہ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور بات کریں گی۔ لیکن وہی بات کہیں گی جو حضرت عمر نے کہی ہے، بڑھائیں گی نہ گھٹائیں گی، اس سے ان کے خوف خدا، محبت رسول اور انصاف پسندانہ مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتی والوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے حضرت اسماء اور تمام اہل سفینہ کے لیے دو ہجرتوں کے ثواب کی بشارت عطا فرمائی نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ لوگ تم سے زیادہ میرے حق دار نہیں ہیں، یہ سن کر اہل سفینہ کتنے خوش ہوئے اور بات کو کتنا اہم اور عظیم جانا وہ آپ حدیث پاک میں پڑھ آئے ہیں۔ دنیا و مافیہا کی کوئی چیز ان کی نظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے عظیم نہ رہی، اس فرمان مصطفیٰ کو سننے میں ان کو کتنی لذت محسوس ہوتی تھی کہ وہ باری باری

آکر بار بار حضرت اسماء سے وہ الفاظ سننا چاہتے تھے جو ان کے محبوب نے ان کے بارے میں فرمائے تھے۔ یہ جذبہ مسابقت جماعت صحابہ کے سوا اور کہاں؟

غزوات میں شرکت: غزوات کی ابتداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی سے ہوتی ہے۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۷ھ میں حبشہ سے مدینہ طیبہ واپس آئے اور ۸ھ میں غزوہ موتہ میں آپ شہید ہو گئے۔ اس اعتبار سے آپ کو غزوات میں شرکت کرنے کا زیادہ موقع نڈل سکا۔

جنگ موتہ: بدر واحد وغیرہ غزوات میں شرکت نہ کر پانے کا افسوس اور کسی بھی غزوے میں شرکت کر کے خدمت اسلام کرنے کا شوق، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بے چین کیے ہوئے تھا کہ جلد ہی انہیں جنگ موتہ میں شرکت کرنے اور دل کی حسرت مٹانے کا موقع میسر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہادری و جواں مردی کا تذکرہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ موتہ کی قدرے تفصیل اور موتہ پر لشکر کشی کا سبب بھی بیان کرتے چلیں۔

علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں: علامہ عمر بن علی بن الملقن شافعی متوفی ۸۰۴ھ لکھتے ہیں:

جنگ موتہ کا سبب، موتہ میں جنگ کا حال: موتہ سرزمین البلقاء کی ایک بستی ہے جو سرزمین شام کے قریب واقع ہے، یہ غزوہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں واقع ہوا، اور اس کے بعد رمضان میں مکمل فتح حاصل ہوئی تھی۔ غزوہ موتہ کا سبب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت الحارث بن عمیر الازدی کو اپنا مکتوب دے کر روم کے بادشاہ کی طرف روانہ کیا پس شرحبیل بن عمر الغسانی ان کے درپے ہوا اور ان کو زنجیروں سے باندھ دیا، پھر اسی حالت میں ان کو قتل کر دیا، ان کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی سفیر کو قتل نہیں کیا گیا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بہت ملال ہوا اور آپ نے مسلمانوں کو ان پر حملہ کرنے کے لیے طلب کیا اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کا امیر بنایا اور

آپ نے فرمایا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو پھر جعفر امیر ہوں گے اور اگر وہ شہید ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ امیر ہوں گے، پھر تین ہزار صحابہ تیار ہوئے اور جب وہ مقام جرف میں تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وصیت کی کہ وہ حضرت الحارث بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شہید ہونے کی جگہ پر جائیں اور جو لوگ وہاں پر ہوں ان کو اسلام کی دعوت دیں، اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں فیہا، ورنہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر کے ان سے قتال کریں پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کو رخصت کرنے کے لیے آئے حتیٰ کہ آپ شیعۃ الوداع تک پہنچ گئے، مسلمانوں کے لیے دعا کی اللہ تعالیٰ دشمن کو تم سے دور کر دے اور تم کو صحیح سلامت واپس لائے۔

پھر مسلمانوں کا لشکر روانہ ہوا اور شام کی سرزمین میں معان کے مقام پر ٹھہرا، پھر ان کو یہ خبر پہنچی کہ ہر قل ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ شام کی سرزمین البلقا پر پہنچ گیا جب مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی تو وہ دو راتوں تک معان میں ٹھہرے اور صورتحال پر غور کرتے رہے، مسلمانوں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمن کی تعداد کی خبر بھیجتے ہیں پھر یا تو آپ ہماری مدد کے لیے اور فوج بھیجیں یا آپ جو حکم دیں ہم اس پر عمل کریں، تب حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے صحابہ کو شجاعت کی ترغیب دی اور کہا: اے لوگو! اللہ کی قسم! جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو، یہ وہی شہادت ہی تو ہے جس کی طلب میں تم روانہ ہوئے تھے، ہم لوگوں سے ان کی تعداد، قوت اور کثرت کی وجہ سے نہیں لڑتے ہم صرف اس دین کی سربلندی کے لیے لڑتے ہیں جس دین کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت دی ہے پس تم دشمن سے لڑنے کے لیے روانہ ہو یا تو تم کو دشمن پر غلبہ حاصل ہوگا یا تم کو شہادت حاصل ہوگی، پھر مسلمانوں کے لشکر نے رومیوں سے مقابلہ کیا حتیٰ کہ وہ تینوں شہید ہو گئے جن کی شہادت کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی پھر حضرت خالد بن ولید نے جھنڈا اٹھالیا اور انہوں نے دشمن کو بھگا دیا جیسا کہ امام محمد بن سعد نے ذکر کیا ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ج: ۳، ص: ۴۳۵-۴۳۷، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۴۷)

امام محمد بن سعد نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ رومیوں کو شکست ہوئی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۱۳۰، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۴۷)

جنگ موتہ میں دشمن کی تعداد اور نتیجہ جنگ: کثیر مؤرخین کے بیان کے مطابق جنگ موتہ میں تین ہزار مجاہدین کے مقابلے کے لیے دشمن سپاہی کی تعداد دو لاکھ تھی۔

(تاریخ ابن خلدون، ج: ۲، ص: ۴۵۶، غزوۃ جیش الامراء، البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۶۱، عمدۃ القاری، ج: ۸، ص: ۹۵، کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیۃ یرف فی الحزن)

جہاں تک جنگ میں کامیابی یا ناکامی کی بات ہے، بعض مؤرخین اس طرف گئے ہیں کہ اس جنگ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی، جبکہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ مسلمان کامیاب نہ ہو سکے، تو کچھ حضرات کا قول ہے کہ یہ جنگ بے نتیجہ رہی، نہ مسلمان کامیاب ہوئے اور نہ ہی رومی میدان جیت سکے۔ (سمط النجوم العوالی، ج: ۲، ص: ۲۴۴)

لیکن راقم کو یہ قول صحیح دکھائی دیتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح میسر آئی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بخاری شریف کے ساتھ ساتھ حدیث کی بہت ساری کتابوں میں یہ روایت موجود ہے ”حتی اخذ الرأیۃ سیف من سیوف اللہ حتی فتح اللہ علیہم“ حتی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (حضرت خالد بن ولید) نے جھنڈا پکڑا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمادی۔

ظاہر ہے کہ حدیث (وہ بھی بخاری شریف) کی روایات کا مقابلہ تاریخی روایات نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح بخاری شریف میں ایک روایت یہ بھی موجود ہے کہ حضرت خالد نے فرمایا کہ اس دن میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں، صرف ایک بمی تلوار ہی میرے ہاتھ میں ٹھہر سکی۔

یہ روایت بھی بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے رومیوں کے کشتوں کے پستے لگا دیے تھے۔ تیسری ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ اگر رومی فتح یاب ہو جاتے تو اتنے بڑے جم غفیر کے سامنے سے مسلمانوں کا شاید ہی کوئی مجاہد بچ پاتا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مجاہدین کا یہ کارواں مدینہ طیبہ واپس آیا اور حضور نے دعاؤں سے نوازا۔

علامہ ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس غزوے میں صرف بارہ مجاہدین اسلام شہید ہوئے، جب کہ مشرک رومیوں میں سے خلق کثیر کو تہ تیغ کیا گیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۶۱)

ہمارے ذکر کردہ تمام دلائل یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ رہی یہ بات کہ دولاکھ کے مقابلے میں تین ہزار کیوں کر جیت گئے؟ اس کا جو اب صرف اور صرف اللہ کی قدرت اور اس کی فتح و نصرت ہے۔ مزید اطمینان کے لیے امام بیہقی کی روایت سماعت کریں وہ فرماتے ہیں العطف بن خالد بیان فرماتے ہیں:

جب صبح ہوئی تو خالد نے لشکر کی ترتیب بدل دی، جو صحابہ آگے تھے ان کو پیچھے کر دیا، جو پیچھے تھے ان کو آگے کر دیا، داہنی جانب والوں کو بائیں طرف کر دیا اور بائیں جانب والوں کو دائیں طرف کر دیا۔ رومی یہ دیکھ کر کہنے لگے کہ ان کے پاس مدد آگئی ہے اور یوں وہ مرعوب ہو گئے وہ اتنے زیادہ مارے گئے کہ کسی قوم نے ان کو اتنی بڑی تعداد میں قتل نہیں کیا تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا ہے کہ مسلمانوں نے مشرکین کا بہت سامان بطور مال غنیمت اپنے قبضے میں لیا۔ (التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ج: ۲، ص: ۴۱۱، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۲۸)

ایک روایت اور ملاحظہ ہو امام محمد بن سعد نے روایت کیا ہے ابو عامر نے بیان فرمایا: جب حضرت جعفر، حضرت زید اور ابن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم شہید ہو گئے، پھر مسلمانوں کو اتنی بڑی شکست ہوئی جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی، پھر انصار کے ایک شخص نے جھنڈا پکڑا اور حضرت خالد کو دے دیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ثابت بن اقرع نے جھنڈا اٹھایا اور حضرت خالد کو سونپ دیا، انہوں نے رومیوں پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو اتنی بڑی شکست دی جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی، حتیٰ کہ مسلمانوں نے جہاں چاہا اپنی تلواروں سے وار کیا۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج: ۳، ص: ۴۳۵، دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۲، التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ج: ۲، ص: ۴۱۳، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۵۰)

حضرت جعفر کی تربیت: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے موتہ کے لیے لشکر روانہ فرمایا اور امیر لشکر حضرت زید بن حارثہ کو بنایا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوش جہاد سے اتنا سشار تھے کہ خود بحیثیت امیر، جہاد کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک مجاہد کا ثواب بھی ملے اور لشکر کی قیادت کا ثواب بھی، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملے نے انہیں

سمجھ عطا فرمادی۔ ملاحظہ ہو! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جملہ جو آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تربیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر روانہ کرتے وقت فرمایا: ”زید بن حارثہ تمہارے امیر رہیں گے، اگر زید شہادت پا جائیں تو جعفر تمہارے امیر ہوں گے اور اگر جعفر بھی شہادت پا جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ لشکر کی قیادت کریں گے۔“ یہ سن کر حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اچھل کر کہا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے خیال نہ تھا کہ آپ زید بن حارثہ کو مجھ پر امیر بنائیں گے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”امضوا فانك لا تدري ای ذالك خیر“ جعفر چلے چلو تمہیں نہیں معلوم کیا چیز بہتر ہے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۵۵۱)

سبحان اللہ! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جملے نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سکھا دیا کہ حضور کی نگاہیں جو دیکھ رہی ہیں وہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں دیکھ رہے، اسی لیے یہ جملہ سننے کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش ہو گئے کیونکہ سب کچھ سمجھ آ گیا تھا۔

حضور کے فرمان پر یہودی کا تبصرہ: مذکورہ حدیث کے مطابق جب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ موتہ کے قائدین کا انتخاب فرمایا کہ زید بن حارثہ امیر ہوں گے وہ شہید ہو جائے تو جعفر وغیرہ۔ حضور کے اس کلام کو ایک یہودی سن رہا تھا، اس نے کہا: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں تو جن لوگوں کو امیر متعین کیا گیا ہے یہ سب شہادت پا جائیں گے کیونکہ بنی اسرائیل کے انبیاء جب اس طور پر امیر متعین کرتے جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء کو متعین کیا ہے تو وہ لوگ ضرور ضرور شہادت پا جاتے، اس یہودی نے حضرت زید سے کہا: یاد رکھو! اب تم حضور کی طرف پلٹ کر نہ آ سکو گے۔ (تاریخ النہیس، ج: ۲، ص: ۷۰، ہریۃ موتہ، المغازی للواقدی، ج: ۲، ص: ۷۶، دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۲)

یہودی کا تبصرہ صحیح ثابت ہوا جن لوگوں کو حضور نے لشکر کا امیر منتخب کیا تھا اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان سب کو شہادت نصیب فرمائی۔

جنگ میں حضرت جعفر کی جاں بازی و شہادت: حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے امیر لشکر زید بن حارثہ کو سفید رنگ کا جھنڈا عطا فرمایا اور ثنیۃ الوداع تک لشکر روانہ کرنے کے لیے تشریف لائے، حضور کا عطا کردہ جھنڈا لے کر حضرت زید بن حارثہ اپنے مختصر سے لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں اترے۔ رومیوں کے ساتھ ایک سخت مقابلہ ہوا حضرت زید بن حارثہ آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو کر زمین پر آ گئے، حضرت زید کے شہید ہو جانے کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت تیزی سے اپنے گھوڑے سے نیچے تشریف لائے، جھنڈا سنبھالا اور اپنے اس سفید و سرخ گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالی تاکہ رومی اس گھوڑے کا استعمال مسلمانوں کے خلاف جنگ میں نہ کر سکیں، جوش شہادت سے سرشار ہو کر رجز یہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں جا گھسے، آپ پڑھ رہے تھے: یا حبذا الجنة واقتراہا۔ طيبة باردة شراہا۔ والروم روم قد دنا عذاہا۔ کافرة بعیدۃ انساہا۔ علی اخلاق تہا ضراہا۔

کتنی عمدہ ہے جنت اور اس کا قریب آنا، اس کے مشروبات پاک اور ٹھنڈے ہیں، رومیوں کا عذاب قریب آچکا ہے، یہ ایسے کافر ہیں جن کے نسب بعید ہیں جب میری ان سے مُٹ بھیڑ ہو تو انہیں تنہا کرنا میرے اوپر لازم ہے۔

یہ اشعار پڑھتے صفوف اعداء کو منتشر کرتے ہوئے آپ اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے کہ دشمن کے ایک وار نے آپ کے دائیں بازو کو کاٹ دیا، آپ نے تیزی کے ساتھ جھنڈا اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا، بلاتا خیر آپ پر دوسرا حملہ ہوا جس سے آپ کا بایاں بازو بھی شہید ہو گیا، آپ نے کمال دل داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھنڈے کو اپنے سینے اور کاندھے کے ساتھ سنبھال لیا، پلک جھپکتے ہی تیسرا حملہ ہوا، یہ حملہ سب سے زیادہ سخت تھا، یہاں تک کہ آپ شہید ہو کر زمین پر آ گئے۔ (تاریخ خمیس، ج: ۲، ص: ۷۱، رجال حول الرسول، ص: ۲۷۷، سیرۃ ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۷۸)

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد جھنڈا حضرت عبداللہ بن رواحہ نے تھام لیا اور ان کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید نے جھنڈا سنبھال لیا یہاں تک

کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فتح نصیب فرمادی۔ (الہدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۳۶)

نوے سے زیادہ زخم سینے پر کھائے: امام بخاری روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: جس دن حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تھے وہ ان کے پاس ہی کھڑے ہوئے تھے، میں نے گنتی کی ان کے اوپر نیزوں کے اور دوسری ضربات (تلوار) کے پچاس نشانات تھے، ان میں سے کوئی نشان ان کی پیٹھ پر نہیں تھا۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں بھی جنگ موتہ میں شریک ہونے والے صحابہ میں تھا، ہم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ڈھونڈا تو ہم نے ان کو شہدا میں پایا، ہم نے ان کے جسم میں نوے (۹۰) سے زیادہ نیزوں اور تیروں کے زخم پائے۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ موتہ)

دونوں روایتوں میں زخموں کی تعداد الگ الگ ہے پہلی روایت میں پچاس زخموں کا ذکر ہے، جبکہ دوسری روایت میں نوے سے زیادہ زخموں کا تذکرہ ہے، اس میں بظاہر تضاد دکھائی دیتا ہے۔

اس کا جواب علامہ ابن ملقن سے سنیے آپ تحریر فرماتے ہیں:

ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ پہلی حدیث میں نیزوں کے زخم کا ذکر تھا اور دوسری حدیث میں نیزوں اور تیروں کے زخم کا ذکر ہے۔

(التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ج: ۲، ص: ۴۱۳، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۵۰)

علامہ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ پہلی روایت میں تیروں کے زخم شمار نہیں کیے گئے ہیں، اس لیے تعداد کم ہے اور دوسری روایت میں تیروں کے زخم بھی شمار کر لیے گئے ہیں اس لیے تعداد بڑھ گئی ہے۔

اسلام میں سب سے پہلے حضرت جعفر نے گھوڑے کی کونچیں کاٹیں:

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کمال بہادری دکھاتے ہوئے گھوڑے سے اتر کر پیادہ پا

جہاد شروع کیا اور اپنے گھوڑے کی کونچیں اس لیے کاٹ ڈالیں تاکہ دشمن ان کے گھوڑے کو استعمال نہ کر سکے، اسلام میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی مجاہد نے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دی تھیں، اس سے پہلے کسی مجاہد نے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، ایسے خاص مواقع پر جن فقہاء نے جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے انہوں نے اسی واقعے سے استدلال فرمایا ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۲۱، سیرۃ ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۷۸، دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۳)

شیطان کا حملہ اور حضرت جعفر کی ثابت قدمی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس وقت حضرت زید شہید ہوئے اور علم قیادت حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنبھالا اس وقت شیطان حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا، اس نے زندگی کو ان کی نظروں میں محبوب اور موت کو مکروہ بنانے کی کوشش کی، مزید یہ کہ دنیا کی تمنائیں ان کے دل میں پیدا کرنے کی بیکار سعی کی، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شیطان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایمان کو مومنوں کے دلوں میں مستحکم فرمادیا تو تو مجھے دنیا کا لالچ دینا چاہتا ہے، اتنا کہا اور پھر آپ نے مورچہ سنبھال لیا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۲۸)

قارئین کرام! غور فرمائیں کہ شیطان انسان کو کیسے کیسے موقع پر دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کامیابیوں کی طرف بڑھتے قدموں کو کس طریقے سے ناکامیوں کی طرف کھینچنا چاہتا ہے، حاصل ہوئی سعادت کو کیسے شقاوت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے، اگر تائید ربانی دستگیری نہ فرمائے تو آدمی ہلاک و برباد ہو جائے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کی اور ی فرماتا ہے اور انہیں شیطان کے دام تزویر سے محفوظ رکھتا ہے۔ خود ارشاد فرماتا ہے: ”إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ“ (اے شیطان) بے شک میرے (مخصوص) بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔ (سورۃ بنی اسرائیل، آیت: ۶۵)

بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے خاص بندے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد فرمائی اور شیطان پوری کوشش کرنے کے باوجود بھی انہیں اسلام کی خدمت اور حصول

شہادت و سعادت سے محروم نہ کر سکا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم غیب اور صحابہ کی قوت ایمانی: علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کی شہادت کی پہلے ہی خبر دے دی تھی، اس میں آپ کے علم غیب کا ثبوت ہے اور یہ عطائی علم غیب ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نعمان بن محض یہودی نے بھی آپ کے علم غیب کی تصدیق کی۔ جو لوگ آپ کے علم غیب کے منکر ہیں وہ اس یہودی سے بھی گئے گزرے ہیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام دین کی محبت میں اس قدر مستغرق تھے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے، ان کو یقین تھا کہ وہ موت سے واپس نہیں آئیں گے پھر بھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے موتہ میں جہاد کرنے کے لیے جوش و خروش سے گئے۔ (نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۵۰)

حضور نے مسجد نبوی میں بیٹھ کر جنگ کی خبر دی: ہم اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کی عطا سے غیب جانتے ہیں۔ اس عقیدے کے اثبات کے لیے الحمد للہ! ہمارے پاس قرآن عظیم، احادیث کریمہ، آثار صحابہ اور اقوال اسلاف کرام سے کثیر دلائل موجود ہیں جن کو بیان کرنا ہمارا موضوع نہیں لیکن جنگ موتہ کے تذکرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کی عظیم تجلیاں نظر آتی ہیں اور جنگ موتہ کا تعلق حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے ہے، اس لیے اس کا بیان کرنا ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتا ہے لہذا چند احادیث پیش کی جاتی ہیں، جس سے جنگ موتہ کا حال بھی معلوم ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی وسعت کی جھلک بھی دکھائی دے گی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی خبر آنے سے پہلے ہی اہل مدینہ کو جنگ موتہ کے نتائج اور اس میں واقع بعض صحابہ کرام کی شہادتوں سے خبردار فرمایا جیسا کہ بخاری شریف میں ہے:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی لوگوں کو اس سے پہلے خبر دی کہ آپ کے پاس وہاں سے خبر آئی، آپ نے فرمایا: زید نے جھنڈا پکڑا وہ شہید ہو گئے،

پھر جعفر نے جھنڈا پکڑا پس وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہ نے جھنڈا پکڑا اور وہ بھی شہید ہو گئے (یہ خبر دیتے وقت) حال یہ تھا کہ آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے جھنڈا پکڑا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رومیوں پر (مسلمانوں) کو فتح نصیب فرمائی۔ (بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ موتہ)

اس روایت میں ”قبل ان یأتیہم خبرہم“ (ان کی خبر آنے سے پہلے) یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ کسی نے آ کر خبر نہیں دی تھی اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کا آنکھوں دیکھا پورا حال بیان فرما دیا۔ یقیناً یہی علم غیب ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا ہے۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کیا، آپ منبر پر تشریف لائے اور آپ نے فرمایا: میں تمہیں تمہارے اس لشکر کی خبر دے رہا ہوں، دشمن سے جنگ ہوئی حضرت زید شہید ہو گئے پھر حضور نے فرمایا: ان کے لیے دعائے مغفرت کرو، صحابہ نے ان کے لیے استغفار کیا، پھر جھنڈا حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھام لیا اور دشمن پر سخت حملہ کیا آخر وہ بھی شہید ہو گئے، حضور نے ان کی شہادت کی گواہی دی اور ان کے لیے استغفار کیا، پھر جھنڈا ابن رواحہ نے لے لیا، آخر وہ بھی شہید ہو گئے ان کے لیے بھی سب نے استغفار کیا، پھر جھنڈا خالد بن ولید نے لیا اور خالد نے اپنے آپ کو از خود امیر بنا لیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کو اٹھایا اور عرض کیا: اے اللہ! یہ تیری تلوار ہے اس کی مدد فرما۔ (السنن الکبریٰ للنسائی، حدیث نمبر: ۸۱۹۲ ج: ۷، ص: ۳۴۸، مصنف ابن ابی شیبہ، ج: ۷، ص: ۴۱۲، حدیث: ۳۶۹۶۶، شرح مشکل الآثار، حدیث نمبر: ۵۱۷۰، دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۸ باب ماجاء فی غزوہ موتہ)

حدیث کے آخری جملے انگلیوں سے اشارہ فرمانا اور حضرت خالد کے لیے دعا فرمانا واضح طور پر بتاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو ملاحظہ فرما رہے تھے اسے صحابہ کو بتا رہے تھے اور جودل کے جذبات تھے وہ اشاروں میں بیان فرما رہے تھے اور کامیابی کی دعا اپنے

غلاموں کو دے رہے تھے۔

اگر تم چاہو تو میں تمہیں خبر دوں: حضرت یعلیٰ بن منیہ (بعض کتابوں میں یعلیٰ بن امیہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غزوہ موتہ کی خبر لے کر حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہو تو تم مجھے خبر دو یا پھر میں تمہیں خبر دوں۔ انہوں نے عرض کیا: حضور آپ مجھے خبر دیں، ان کی اس عرض پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غزوہ موتہ کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ حضور سے غزوہ موتہ کا حال سن کر یعلیٰ بن منیہ امیہ نے کہا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، آپ نے غزوہ موتہ کی خبر سے ایک حرف بھی نہیں چھوڑا اور وہاں کی ایک ایک چیز کو بیان فرما دیا، اس کا معاملہ ویسا ہی تھا جیسے آپ نے بیان فرمایا۔ (دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۵، فتح الباری، باب غزوہ موتہ)

زمین موتہ حضور کے سامنے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یعلیٰ بن منیہ سے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ نے زمین کو اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا یہاں تک کہ میں نے ان کے میدان کا رزار کو دیکھ لیا۔ (دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۵، البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۳۰)

فائدہ: البدایہ والنہایہ کے حاشیے میں ہے یعلیٰ بن امیہ اور یعلیٰ بن منیہ دونوں درست ہیں منیہ ان کی والدہ کا نام تھا۔ (ج: ۶، ص: ۴۲۹)

امام واقدی نے عبد اللہ بن ابی بکر سے روایت فرمایا ہے: جب موتہ میں جنگ شروع ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے مدینہ طیبہ سے ملک شام تک سب کچھ آپ کے لیے روشن کر دیا تو آپ میدان کا رزار کو ملاحظہ فرما رہے تھے اور بیان فرما رہے تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۲۷، دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۹)

جنت میں جاتے دیکھا: علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام بیہقی کی چند روایات کو جمع کر کے لکھا ہے۔

امام بیہقی نے روایت فرمایا: جب حضرت خالد نے جھنڈا اٹھایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اب میدان جنگ میں سخت لڑائی ہوگئی۔“

دوسری روایت میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کے متعلق فرمایا: ”وہ جنت میں بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں“ اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق فرمایا: ”وہ شہید ہو کر جنت میں یا قوت کے (پروں کے) ساتھ جہاں چاہیں اڑ رہے ہیں“ پھر فرمایا: عبد اللہ بن رواحہ بھی جنت میں داخل ہو گئے۔ (دلائل النبوة، ج: ۴، ص: ۳۶۳ تا ۳۶۹)

امام ابن ہشام نے ذکر کیا ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے داہنے ہاتھ میں جھنڈا پکڑا تو اس ہاتھ کو کاٹ دیا گیا پھر انہوں نے اپنی بغلوں میں جھنڈا پکڑا اس کے بعد ان کو شہید کر دیا گیا، اس وقت ان کی عمر تینتیس سال (۳۳) تھی۔

(سیرت ابن ہشام، ج: ۳، ص: ۴۳۴، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۲۸)

جنت میں ملائکہ کے ساتھ مصروف پرواز: اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کٹے ہوئے بازوؤں کو ایسا حسن قبول بخشا کہ انہیں ان بازوؤں کے صدقے دو پر عطا فرمائے جن کے ذریعے وہ جنت میں ملائکہ کے ساتھ پرواز کرتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں جاتے آتے ہیں جو چاہتے ہیں کھاتے پیتے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی روایات وارد ہیں جنہیں پڑھ کر ایمان کو جلا ملتی ہے اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بلند مرتبہ اجاگر ہوتا ہے۔

امام ترمذی نے باب مناقب جعفر میں روایت کیا ہے ”رايت جعفرًا يطير في الجنة مع الملائكة“

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جعفر کو جنت میں ملائکہ کے ساتھ مصروف پرواز دیکھا ہے۔

امام بغوی نے اپنی محکم میں روایت فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے جنت میں جعفر کو ملائکہ کے ساتھ دو پروں کے ذریعے پرواز کرتے ہوئے دیکھا“۔ (ذخائر العقبیٰ، ص: ۳۵۷)

حضرت جعفر کے پروں کی کیفیت: علامہ عینی، علامہ سیبلی کے حوالے سے فرماتے ہیں: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دو پر ایسے نہیں ہیں جیسے پرندوں کے پر

ہوتے ہیں کیونکہ آدمی کی صورت تمام صورتوں سے افضل اور اکمل ہیں۔ ان دو پروں سے مراد یہ ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صفت ملکیت اور قوت روحانیہ دی گئی تھی۔ قرآن مجید میں مجازاً بازوؤں کو پروں سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”وَاصْصُمُّ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ“ اور اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا بیٹے۔ (سورہ طہ، آیت: ۲۲)

علامہ عینی کہتے ہیں جب کسی حدیث میں پروں کی کیفیت کا بیان نہیں تو ہم اس پروں والی حدیث پر ایمان لاتے ہیں اور پروں کی حقیقت سے بحث نہیں کرتے۔

(عمدة القاری، ج: ۱، ص: ۳۶۱، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۵۳)

آل جعفر کی تعزیت و غم خواری: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت اثر انداز ہوئی، ان کا فراق حضور پر شاق تھا، یہی وجہ تھی کہ چشمہائے مبارک سے آنسوؤں کے موتی بکھرے اور چہرہ مبارک پر قلق و اضطراب کے آثار ہو پیدا ہوئے، اس مشکل وقت میں آپ نے اہل خانہ کو صبر کی تلقین فرماتے ہوئے آل جعفر کی غم خواری فرمائی اور ان کے خورد و نوش کا انتظام فرمایا۔

امام بخاری ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے ہیں: جب حضرت زید بن حارثہ حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے اور آپ سے غم کا اظہار ہو رہا تھا، آپ فرماتی ہیں کہ میں دروازے کی جھری سے دیکھ رہی تھی، آپ کے پاس ایک مرد آیا اس نے بتایا کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خواتین رو رہی ہیں، آپ نے اس کو حکم دیا کہ ان کو منع کرے، وہ شخص گیا اور اس نے آکر کہا کہ میں نے ان کو منع کیا لیکن عورتوں نے اس کی بات نہیں مانی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پھر وہی حکم دیا، وہ گیا اور اس نے پھر آکر بتایا: اللہ کی قسم! وہ عورتیں ہم پر غالب آگئیں۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ان کے مونہوں میں مٹی ڈال دو، حضرت عائشہ فرماتی ہیں: بس میں نے (دل میں) کہا: اللہ تعالیٰ تیری ناک خاک آلود کرے، اللہ کی قسم! تو وہ

کیوں نہیں کرتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشقت میں کیوں چھوڑا ہے۔ (بخاری، کتاب المغازی باب غزوة موتہ)

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ اسماء بنت عمیس فرماتی ہیں: میں نے چالیس کھالیں پکا کر تیار کیں، آٹا گوندھا اور بچوں کو نہلا دھلا کر تیل لگا کر فارغ ہوئی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا: اسماء! جعفر کے بچوں کو میرے پاس لاؤ میں نے بچوں کو خدمت اقدس میں حاضر کیا، حضور نے سینے سے لگایا اور سونگھا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ کو جعفر کی کوئی خبر ملی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! آج جعفر اور ان کے ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ میں چیخ کراٹھ کھڑی ہوئی اور لوگوں کو اکٹھا کرنے لگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر سے اپنے گھر تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا: جعفر کے بچوں کے لیے کھانا پکاؤ آج وہ جعفر کے غم میں کھانے کا انتظام نہ کر سکیں گے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۴۳)

گھر پر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ہائے بیجا کہہ کر روتی ہوئی آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جعفر جیسوں کے لیے ہی رونے والیوں کو رونا چاہئے۔ (ذخائر العقبیٰ ص: ۳۶۲)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے گھر تین دن کے بعد تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا، پھر فرمایا: میرے بھتیجوں کو لے آؤ، ہم ابھی چھوٹے چھوٹے تھے آپ نے ہمیں پیار کیا اپنے ساتھ چمٹایا اور نائی کو بلا کر سر منڈوا دیے پھر فرمایا: محمد بن جعفر ہمارے چچا ابوطالب سے مشابہت رکھتا ہے، عبداللہ بن جعفر کی جسمانی ساخت اور اخلاق مجھ سے ملتے جلتے ہیں پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اسے بلند کیا اور تین بار دعا فرمائی ”اے اللہ! تو جعفر کے اہل خانہ کو اس کا بہتر قائم مقام عطا فرما، اے اللہ! تو عبداللہ کے ہاتھ میں برکت پیدا فرما پھر ہماری والدہ حضرت اسماء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا تو تنگ دستی سے ڈرتی ہے؟ میں دنیا و آخرت میں ان بچوں کا ولی ہوں۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۴۱۹۲، مسند احمد، ج: ۲، ص: ۳۶۷)

حدیث نمبر: ۱۷۵۰، شرح مشکل الآثار، حدیث نمبر: ۵۱۶۹، الجامع الصحیح للسنن والمسائید، باب مناقب ال بیت)
حضور نے اسماء کا سوگ کم کر دیا: جس عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے اس کے لیے عدت وفات چار مہینے دس دن ہے۔ (اگر وہ حاملہ نہ ہو) چار مہینے دس دن سوگ کے طور پر کاٹنا لازم ہے اور یہ قرآن کریم کا حکم ہے، لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے اس عام حکم سے حضرت اسماء کو مستثنیٰ کر دیا (الگ کر دیا) اور ان کے لیے سوگ صرف تین دن کا متعین فرمایا، جیسا کہ کثیر محدثین نے آنے والی احادیث کو اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے تین دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: ”لا تحدی بعد یومک ھذا“ اے اسماء! تم آج کے دن کے بعد سوگ کے کپڑے مت پہننا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۰۸۳)
 دوسری روایت میں حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اسماء! تم تین دن تک ٹھہری رہو، سوگ مناؤ اور اس کے بعد جو چاہو کرو۔ (شرح معانی الآثار، ج: ۳، ص: ۷۴، حدیث نمبر: ۴۵۴۶، معجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۳۶۹، سنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر: ۱۵۵۲۳)
 اس حدیث پر محدثین کرام نے کچھ تبصرے کیے ہیں اور کئی احتمالات ذکر کیے ہیں، انہیں میں یہ احتمال بھی بیان فرمایا ہے کہ یہ حضرت اسماء کی خصوصیت ہو سکتی ہے جیسا کہ علامہ عینی نے فرمایا: ”واحتمل ان یکون ذلک خصت به العدة من الوفاة خاصة“ یہ بھی احتمال ہے کہ عدت وفات میں ان کی خصوصیت ہو۔

(مخبر الافکار فی تنقیح مبانئ الاخبار فی شرح معانی الآثار، ج: ۱۱، ص: ۱۸۲)

ہم اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو احکام شریعت میں بھی اختیار عطا فرمایا ہے، وہ جس کو چاہیں کسی حکم عام سے خارج فرمادیں جیسا کہ حضرت اسماء بنت عمیس کو حکم عام سے خارج فرما کر ان کے لیے سوگ صرف تین دن کا متعین فرمادیا۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت محدث بریلوی فرماتے ہیں ”یہاں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو اس حکم عام سے مستثنیٰ فرما دیا کہ عورت کو شوہر پر چار مہینے دس دن سوگ واجب ہے۔ (فتاویٰ رضویہ، ج: ۳۰، ص: ۵۲۹، الامن والعلی، ص: ۱۸۰، بحوالہ جامع الاحادیث، ج: ۲، ص: ۲۴۰)

حضرت جعفر کی اولاد پر حضور کی شفقت: جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت فرماتے آپ کے اہل و عیال سے بھی آپ کی محبت ہمیشہ قائم رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد بچوں پر الفت کی خصوصی نگاہ فرماتے تھے اور لوگ بھی حضور کی اس عادت کو پہچانتے تھے، اس لیے حضور کے دل کو خوش کرنے کے لیے حضور کی بارگاہ میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بچوں کو پیش کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو آنے والی روایت

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے عبد اللہ خود روایت فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے تشریف لاتے تو آپ کا استقبال بچوں سے کرایا جاتا، ایک سفر سے جب آپ تشریف لائے تو حضور کی بارگاہ میں (استقبال کے لیے) مجھے پیش کیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سواری پر آگے بٹھالیا پھر حضرت امام حسن یا امام حسین کو لایا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے پیچھے سوار کر لیا، ہم مدینہ شریف میں اس شان سے داخل ہوئے کہ ایک سواری پر تینوں سوار تھے۔

ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان فرماتے ہیں: اے مخاطب، کاش! تم وہ منظر دیکھتے جب میں، قثم بن عباس اور عبید اللہ بن عباس بچپن کے زمانے میں کھیل رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر وہاں سے ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس بچے کو اٹھا کر مجھے دے دو پھر آپ نے مجھے اپنے پیچھے سوار کر لیا پھر اسی طرح فرما کر قثم کو اپنے پیچھے سوار کر لیا پھر آپ نے تین مرتبہ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہر مرتبہ دعا فرمائی ”اللہم اخلف جعفرانی وولدہ“ اے اللہ! جعفر کے بیٹے کو جعفر کا جانشین بنادے۔ (مسند احمد، ج: ۲، ص: ۳۶۱، حدیث نمبر: ۱۷۴۳)

فضائل و مناقب: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری زندگی ہی فضائل و کمالات سے معمور ہے۔ گزشتہ اوراق میں آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل ضَمْنَا ملاحظہ کیے ہیں، اب یہاں خصوصیت کے ساتھ کچھ فضائل تحریر کیے جاتے ہیں:

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عظیم شان سخاوت کے مالک کشادہ دست اور فیاض تھے، غربا و مساکین کی غم خواری کرنے اور ان کو کھانا کھلانے میں ایک خاص لطف محسوس کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی اس ادا کو دیکھتے ہوئے ابوالمسکین جیسے خطاب سے آپ کو ملقب فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہ روایت فرماتے ہیں: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غربا و مساکین سے بہت محبت فرماتے، اپنے پاس بٹھا کر ان سے باتیں کرتے، ان کی باتیں سنتے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ابوالمسکین رکھ دی تھی۔ (ترمذی شریف، حدیث نمبر: ۳۷۶۶)

امام بخاری علیہ الرحمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے:

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ بہت زیادہ احادیث بیان فرماتے ہیں (سنو) میں پیٹ بھرنے کے بعد ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتا تھا حتیٰ کہ میں نمیری روٹی کھاتا تھا نہ دھاری دار لباس پہنتا تھا اور نہ کوئی خادم و کنیز میری خدمت کرتی، میں بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھے رہتا، میں کسی شخص سے کوئی آیت پوچھتا تھا حالانکہ وہ آیت مجھے یاد ہوتی تھی، یہ پوچھنا محض اس لیے تھا تاکہ وہ شخص مجھے اپنے ساتھ لے جا کر کھانا کھلائے، مسکینوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، وہ ہمیں (اصحاب صفہ) کو ساتھ لے جاتے اور جو بھی گھر میں کھانا ہوتا وہ ہمیں کھلا دیتے حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ (شہد کی) خالی کپی (برتن) نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہم اس کو پھاڑ کر جو کچھ اس میں لگا ہوتا چاٹ لیتے۔

(بخاری، کتاب المناقب باب مناقب جعفر)

ترمذی شریف میں کچھ اور تفصیل موجود ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات قرآنیہ پوچھتا تھا حالانکہ میں آیات کے بارے میں جانتا تھا صرف اس لیے تاکہ وہ مجھے کچھ کھلا دیں لیکن جب میں حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھتا تو مجھے جواب نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جاتے، اپنی زوجہ سے کہتے اسماء ہمیں کچھ کھلا دو، جب وہ کچھ کھلا دیتیں تو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سوال کا جواب دیتے۔ (ترمذی شریف، حدیث نمبر: ۳۷۶۶)

یہ جو کچھ بیان کیا گیا کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مساکین کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والے تھے، اس کا مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اچھا سلوک کرنے والے تھے۔ (الفجر الساطع، ج: ۹، ص: ۶۱، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۷۸)۔

سب سے افضل: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی جو تے پہننے والا، کوئی سواری پر سوار ہونے والا، کوئی اونٹ کے کجاوے میں بیٹھنے والا شخص ایسا نہیں جو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ہو۔

(ترمذی شریف، حدیث نمبر: ۳۷۶۴)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: یہ افضلیت جو دو کرم میں ہے ورنہ فضیلت دینیہ میں ابو بکر و عمر وغیرہ ان سے افضل ہیں۔ (الہدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۵۴)

صحابہ حضرت جعفر کی اولاد کا احترام کرتے: آپ کی عظمتوں کے قربان صحابہ آپ کی عظمت کے پیش نظر آپ کی اولاد کا بھی ادب و احترام کیا کرتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی جب آپ کے بیٹے کو سلام کرتے تو کہتے: ”السلام علیک یا ابن ذی الجناحین“ اے دو پروں والے شخص کے بیٹے! تجھے سلام۔

(بخاری کتاب المناقب)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اپنے تایا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کبھی کوئی چیز مانگتا وہ مجھے منع کر دیتے لیکن جب میں عرض کرتا مجھے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے عطا کر دیں تو وہ میری مانگ ضرور پوری

کرتے۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۵۴۴)

بدر و خیبر سے حصہ: یہ بھی آپ کی عظمت و فضیلت ہے کہ اگرچہ آپ جنگ بدر میں شریک نہ تھے مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنگ بدر سے حصہ بھی دیا اور اجر بھی مرحمت فرمایا۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۲۱۶، المستدرک للحاکم، حدیث نمبر: ۴۹۴۵)

آپ خیبر کی جنگ میں بھی شریک نہ تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے خیبر کے باغات سے ہر سال پچاس وسق کھجوریں مقرر فرمائی تھیں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۳۷)

استقبال کیا گلے لگایا آنکھوں کو چوما: جب حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیبر فتح کر چکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے کی خبر دی گئی تو فرمایا: نہیں معلوم مجھے جعفر کے آنے کی زیادہ خوشی ہے یا خیبر کے فتح ہو جانے کی، پھر آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا استقبال کیا، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی ذات کے ساتھ چٹا لیا، گلے لگایا اور آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ۳۲۲۰۶، مسند بزار، ج: ۴، ص: ۱۵۹، حدیث نمبر: ۱۳۲۸)

حضور سے مشابہت: یہ فضیلت کتنی عظیم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: جعفر تم صورت و سیرت میں میرے مشابہ ہو۔

(بخاری، کتاب المغازی باب عمرة القضاء)

حضرت جعفر نے بعد شہادت جبرائیل و میکائیل کے ساتھ حضور کو سلام کیا: علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ملائکہ کے ساتھ مصروف پرواز ہونے اور بعد وصال حضور کی خدمت اقدس میں حاضری دینے سے متعلق چند احادیث بیان کی ہیں، جنہیں ہم ان کی شرح سے نقل کر رہے ہیں۔

امام طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ

حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تمہیں مبارک ہو، تمہارے والد فرشتوں کے ساتھ آسمانوں میں اڑتے ہیں۔ (فتح الباری ج: ۴، ص: ۷۹۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جعفر بن ابی طالب کو فرشتوں کے ساتھ اڑتے ہوئے دیکھا۔

(المستدرک، حدیث نمبر: ۴۹۸۸، سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۷۳۰۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج رات جعفر فرشتوں کی جماعت کے ساتھ میرے پاس سے گزرے ان کے پر خون سے رنگین تھے۔ (فتح الباری، ج: ۴، ص: ۷۹۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں گزشتہ رات خواب میں جنت میں داخل ہوا، میں نے دیکھا جنت میں جعفر فرشتوں کے ساتھ اڑ رہے ہیں۔ (المستدرک، حدیث نمبر: ۴۹۸۶، عمدۃ القاری، ج: ۱۶، ص: ۳۰۴)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت اسماء بنت عمیس بھی آپ کے قریب تھیں، اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا پھر فرمایا: اے اسماء! یہ جعفر بن ابی طالب، حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل کے ساتھ تھے انہوں نے ہم پر سلام پیش کیا تو تم بھی ان کے سلام کا جواب دو اور انہوں نے مجھے خبر دی کہ فلاں فلاں دن ان کا مشرکین سے مقابلہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرنے سے تین چار دن پہلے انہوں نے کہا: میرا مشرکین سے مقابلہ ہوا تو مجھے تیروں، نیزوں اور تلواروں کے زخم لگے پھر میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں جھنڈا پکڑ لیا تو میرا وہ ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر میں نے بائیں ہاتھ سے جھنڈا پکڑ لیا تو وہ ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان دو ہاتھوں کے عوض دو پر عطا فرمائے جن سے میں حضرت جبرائیل اور حضرت میکائیل کے ساتھ اڑتا ہوں اور جنت میں جہاں چاہتا ہوں اترتا ہوں اور جہاں سے چاہتا ہوں جنت کے پھل کھاتا ہوں۔ حضرت اسماء نے کہا:

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہ خیر مبارک ہو جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے لیکن مجھے خطرہ ہے کہ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے تو آپ منبر پر چڑھ کر اس کی خبر دیں پس آپ منبر پر چڑھے اور آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر فرمایا: اے لوگو! بے شک جعفر جبرائیل اور میکائیل کے ساتھ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دو ہاتھوں کے بدلے میں دو پر عطا فرمائے ہیں اور انہوں نے مجھ پر سلام پیش کیا ہے پھر آپ نے لوگوں کو بتایا کہ ان کا کس طرح مشرکین سے مقابلہ ہوا پھر اس دن کے بعد سے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خبر دینے سے معلوم ہوا کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشرکین سے مقابلہ ہوا اور اس وجہ سے ان کا نام جعفر طیار ہو گیا۔ (المستدرک، حدیث نمبر: ۴۹۹۰، المعجم الکبیر، حدیث نمبر: ۱۴۷۱، مجمع الزوائد، ج: ۹، ص: ۲۷۲، الاصابہ، ج: ۱، ص: ۲۳۸، فتح الباری، ج: ۴، ص: ۲۹۹، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۷۸۸)

ازواج و اولاد: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیوی کا تذکرہ کتابوں میں موجود ہے، ان کا نام حضرت اسماء بنت عمیس ہے، حضرت اسماء سے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تین بیٹے پیدا ہوئے، پہلے بیٹے کا نام عبد اللہ ہے، اسی کے نام پر حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ابو عبد اللہ قرار پائی، دوسرے کا نام محمد اور تیسرے بیٹے کا نام عون ہے، یہ تینوں بیٹے قیام حبشہ کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ عبد اللہ حبشہ کے اندر پیدا ہونے والے پہلے مسلمان صاحب زادے تھے، یہ اپنے والد کے ساتھ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، حضور سے احادیث سماعت کیں اور روایت کیں، ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ سواری پر سوار کیا، دست شفقت پھیرا اور دعاؤں سے نوازا، حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی شہزادی حضرت زینب کا نکاح انہیں سے ہوا اور دو بیٹے علی اور عون رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تیسرے شہزادے حضرت عون کا نکاح بھی حضرت علی کی دوسری شہزادی حضرت ام کلثوم سے ہوا، یہ وہی ام کلثوم ہیں جن کا نکاح امیر المومنین حضرت فاروق اعظم سے ہوا تھا، فاروق اعظم کے وصال کے بعد حضرت عون بن جعفر نے ان سے نکاح کیا، ان سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا یہاں تک کہ آپ رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عون کے وصال کے بعد ام کلثوم کے ساتھ حضرت محمد بن جعفر نے نکاح فرمایا، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ (ذخائر العقبہ، ص: ۳۶۷، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر: ۱۳۴۲۳، تاب النکاح باب تسمیۃ ازواج النبی وبناتہ)

وفات: اس پر سب متفق ہیں کہ حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت جنگ موتہ میں ہوئی، جنگ موتہ آٹھ ہجری میں واقع ہوئی، اس اعتبار سے آپ آٹھ ہجری میں شہید ہوئے، البتہ اس بات کو لے کر ضرور مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ بوقت شہادت آپ کی عمر کیا تھی۔

علامہ ابن ہشام کے نزدیک شہادت کے وقت آپ کی عمر ۳۳ سال تھی۔

(سیرت ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۳۷۸)

علامہ ذہبی نے بھی ابن ہشام کی موافقت کی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۲۱۲)

علامہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں آپ کی عمر ۴۱ (اکتالیس) سال تحریر فرمائی۔

(ج: ۱، ص: ۵۴۴)

علامہ ابن کثیر نے ابن اثیر کا قول بیان کرتے ہوئے اکتالیس بیان کرنے کے بعد کچھ تفصیل کی ہے، فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں اگر حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر کا حساب لگایا جائے تو ان کی عمر ۳۹ سال ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور قول پر آٹھ سال کی عمر میں ایمان لائے، مکہ میں تیرہ سال تک اقامت پذیر رہے پھر ہجرت فرمائی، بوقت ہجرت آپ کی عمر اکیس سال تھی، جنگ موتہ آٹھ ہجری میں ہوئی لہذا جنگ موتہ کے وقت حضرت علی کی عمر ۲۹ سال ہوئی اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عمر میں دس سال بڑے تھے لہذا حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر شہادت کے وقت انتالیس سال ہوتی ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۵۴)

علامہ ابن عساکر نے ۳۳ سال کے ساتھ ایک قول ۲۵ سال کا بھی ذکر فرمایا

ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۲، ص: ۱۳۵)

علامہ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھا ہے: حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت جمادی الاولیٰ آٹھ ہجری میں ہوئی، صحیح قول پر آپ کی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی۔

(الاصابہ، ج: ۱، ص: ۲۴۸)

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ۴۱ سال والا قول زیادہ صحیح ہے، لیکن جو تفصیل علامہ ابن کثیر نے بیان فرمائی ہے اس کے مطابق ۳۹ سال والا قول مجھے زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔ واللہ اعلم تمام حمد اللہ کے لیے جس نے اپنے رسول مکرم کو دنیا میں مبعوث فرمایا، درود و سلام ہوں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی آل، آپ کے صحابہ پر، آپ نے امت میں کیسے کیسے مجاہدین تیار فرمائے، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چالیس سال یا اس سے کم عمر میں نہ صرف عرب بلکہ حبشہ تک اپنی دعوت کا دائرہ پھیلا دیا، جن کی تبلیغ کے حلقے میں عام آدمی سے لے کر بادشاہ اور امراء تک داخل ہو گئے، دو دو ہجرتوں کا ثواب اپنے دامن میں جمع کیا، کٹھن سے کٹھن وقت میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرماتے ہوئے انہیں مصیبت میں پڑنے سے بچا لیا، پوری عمر حضور کی آنکھ کا تارا بنے رہے اور آخر میں حق کی بلندی، اعلاء کلمۃ الحق اور خدائی دین کو آفاق کی وسعتوں تک پھیلانے کے لیے نہایت جان بازی کے ساتھ ۹۰ سے زیادہ زخم کھانے کے بعد اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے جنت میں ملائکہ کے ساتھ مصروف پرواز ہو گئے، ان کی زندگی کی سانس سانس، خون کا قطرہ قطرہ، رہتی دنیا تک اسلام کو قوت اور مسلمانوں کو ہمت دیتا رہے گا۔

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود

ان کے اصحاب و عمرت پہ لاکھوں سلام

جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر

اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد والہ و اصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمِيْدًا وَنُصْلًا عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلَىٰ آلِهِ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ لذت حیات کا شامیانہ نعمتوں کے مضبوط دوش پر قائم ہے، کس کس نعمت کا ذکر کیا جائے اور اس کی کیا کیا منفعت بیان کی جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ مکلفہ ان کا ذکر ہو سکتا ہے نہ منفعت کا بیان۔ جہاں تک نعمتوں کے شمار کی بات ہے تو یہ ناممکن ہے، خود خالق نعم فرماتا ہے: ”وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا“، اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ انہیں نعمتوں کے درمیان اولاد کے لیے ماں باپ اور ماں باپ کے لیے اولاد، اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ یہ صرف وجود بھر کی بات نہیں بلکہ ان کی فطرت میں موجود دوطرفہ محبت خالق عالم کی بڑی نشانی ہے۔ اولاد کے لیے ماں باپ خصوصاً لڑکپن کے زمانے میں جائے پناہ اور مرجع کائنات ہوتے ہیں تو ماں باپ کے لیے اولاد قدر دل اور سکون جان و جہان ہیں۔ ایک دوسرے سے بچھڑنے کا تصور ہر ایک کے لیے سوہان روح ہوتا ہے۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کچھ دنوں کے لیے اگر ایک کو دوسرے سے دور رہنا پڑے تو جدائی کے لمحات دونوں پر کتنے شاق ہوتے ہیں؟ بچے ماں باپ سے لپٹ لپٹ کر روتے چلاتے ہیں تو ماں باپ بھی چھپ چھپ کر آنسو بہاتے ہیں، جدائی کے بعد ملاقات کی ساعتیں کس قدر حسین اور قابل دید ہوتی ہیں، کس تیزی کے ساتھ بچہ والدین سے چٹ جاتا ہے اور کس پیار و دلار کے ساتھ والدین بچے کی بلائیں لیتے ہیں، چومتے ہیں، گلے لگاتے ہیں، دل بھر کے نہارتے ہیں، ٹکلی باندھ کر دیکھتے ہیں۔ بچہ ہے کہ ماں کے آنچل اور باپ کے سایہ عاطفت میں وہ سکون پاتا ہے جو ہفت اقلیم میں اسے میسر

نہیں آتا۔ وہ ماں کے آنچل اور باپ کے پیار پر ہر چیز قربان کر سکتا ہے۔ اس پیار، دلار، معیت اور صحبت کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز اس کی نظر میں ہچ اور کمتر قرار پاتی ہے۔ تاریخ اسلام میں ایک ایسے نوخیز کی سیرت بھی محفوظ ہے جو کسی کی محبتوں کا ایسا اسیر ہوا کہ اس نے اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن، کنبہ اور قبیلہ وغیرہ سب کچھ اپنے محبوب پر قربان کر دیا، حب الوطنی کے مقابلے میں غریب الوطنی کو اختیار کیا، آزادی کی بہاروں پر غلامی کی زنجیروں کو ترجیح دی، نوخیز کا یہ فیصلہ ظاہر مینوں کی تنقید کا نشانہ بنا لیکن تاریخ نے نوخیز کے فیصلے کی نہ صرف تائید کی بلکہ سراہا اور خوب سراہا، اب قیامت تک دنیا نوخیز کو، اس کی ہمت کو، جرأت کو، ایثار کو، قربانی کو، عقل کی پختگی کو، پارکھی نگاہ، دور بینی، ژرف نگاہی اور ساری متاع حیات کے عوض جنت کا سودا کر لینے والے فیصلے کو سراہتی رہے گی اور حسن انتخاب کی داد دیتی رہے گی۔

آپ کا تجسس یقیناً آپ کو بے چین کر رہا ہوگا یہ جاننے کے لیے آخر وہ نوخیز کون تھا؟ جس نے صغریٰ میں اتنا عظیم فیصلہ کیا کہ کائنات اس کے فیصلے کی عظمتوں کی اسیر ہوگئی اور وہ مجمع محاسن اور اخلاق کا پیکر کون تھا؟ جس کی مقناطیسی کشش نے نوخیز کو ہر در سے کھینچ کر اپنے در کا دربان بنا لیا تھا۔ تو آئیے اپنے تجسس کو اطمینان کی لگام دیجئے، نوخیز کو ”زید بن حارثہ“ کہا جاتا ہے، اور جس ذات کے لیے حضرت زید بن حارثہ نے ہر ذات کو اور اپنے سارے جذبات کو قربان کیا تھا وہ ذات وہی ہے جس کے لیے ہر عاشق صادق کی یہی آرزو ہے:

کروں تیرے نام پہ جاں فدا

نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا

دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا

کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

یعنی ذات عالم پناہ حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نام و نسب: آپ کا نام زید اور والد کا نام حارثہ ہے۔ پورا نسب نامہ اس طور پر

ہے: ”زید بن حارثہ بن شراحیل بن کعب بن عبد العزیٰ بن امرأ القیس بن عامر بن نعمان بن عامر بن عبدود بن عوف بن کنانہ بن بکر بن عوف بن عزیرہ بن زید اللات بن رفیدہ بن ثور بن کلب بن وبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ۔

یہ وہ نسب نامہ ہے جس کو کلبی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بعض مؤرخین کا بیان کردہ نسب نامہ اس سے قدرے مختلف ہے۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسبی تعلق قبیلہ کلب سے ہے۔ ملک یمن آپ کے آباؤ اجداد کا مسکن تھا۔ (آپ کی والدہ یہیں سے آپ کو لے کر اپنے مائیکے گئی تھیں) (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۵۰، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۲۴۲، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۳۸، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۵۰)

والدہ کا نام: آپ کی والدہ کا نام سعدی بنت ثعلبہ بن عبد عامر بن افلت بن سلسلہ بن بنی معن بن طی ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۳۹)

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ کے نسب نامہ سے ظاہر ہوا کہ آپ قبیلہ طی کی شاخ بنی معن کی صاحبزادی تھیں۔

کنیت: آپ کی کنیت آپ کے بیٹے حضرت اسامہ کے نام پر ابواسامہ مشہور ہوئی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۲)

لقب: آپ حبیب الرسول (محبوب رسول) کے مبارک لقب سے مسلمانوں کے درمیان مشہور ہوئے۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۵۰، صفیۃ الصفہ، ج: ۱، ص: ۷۸)

حلیہ: ایک روایت میں ہے آپ پست قد تھے، رنگ گہرا گندمی اور ناک اندر کودبی ہوئی تھی لیکن دوسری روایت میں ہے کہ آپ کا رنگ خوب گورا تھا۔ ہاں آپ کے بیٹے اسامہ کا رنگ کالا تھا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دس سال چھوٹے تھے، ایک قول ۲۰ سال چھوٹے ہونے کا بھی ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۵۱، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۲، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۵۳، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۲۴۲)

مواخات: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی مواخات اپنے مبارک چچا حضرت

حمزہ بن عبدالمطلب کے ساتھ قائم فرمائی۔ یہ مؤاخات اتنا رنگ لائی اور پروان چڑھی کہ دونوں میں شدید محبت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ احد کے لیے روانہ ہوئے تو (اپنے مال و اسباب سے متعلق) حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے وصیت فرمائی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۸، تذکرہ حضرت حمزہ)

حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آپ کی مؤاخات مکی مؤاخات ہے جو ہجرت سے پہلے وجود میں آئی۔ بعد ہجرت (جسے مدنی مؤاخات بھی کہا جاسکتا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی مؤاخات حضرت اسید بن حضیر کے ساتھ قائم فرمائی۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۲)

حضرت زید نہال میں: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد حارثہ نے

اپنی اہلیہ سعدی اور اپنے بیٹے حضرت زید کو سفر پر روانہ کرنے سے پہلے سفر کی ساری تیاریاں مکمل کر لیں، سواری اور سامان سفر سب کچھ درست کر لیا گیا۔ سعدی حارثہ کی اہلیہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ماں اپنے مائیکے جانا چاہتی ہیں اور اپنے کمسن بیٹے حضرت زید کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتی ہیں، حارثہ نے اس کی اجازت انہیں پہلے ہی دے دی تھی۔ اس لیے سفر کے لیے پیش آئند ضرورتوں کا بھی خوشی خوشی انتظام کر دیا، حضرت زید کے گھر سے ان کی نانی کا گھر کافی دور تھا، اس لیے یہ سفر سعدی حضرت زید کو لے کر تنہا نہیں کر سکتی تھیں بلکہ اس کے لیے ایک قافلے کی ضرورت تھی جس کے ساتھ سعدی با آسانی اپنی منزل پر پہنچ سکیں۔ حارثہ نے سفر کے لیے قافلہ بھی تلاش کر لیا تھا، جب بھی اجازت مانگی جاتی تو حارثہ اپنی اہلیہ اور بیٹے کو اس سفر کی اجازت تو بادل ناخواستہ دے دیا کرتے تھے لیکن بیوی اور بیٹے کی محبت تصوراتی دنیا میں انہیں خود ان کے ساتھ جانے پر مجبور کرتی تھی۔ مگر طول مسافت، احساس ذمہ داری اور عمل کی گراں باری اس تصور کو حقیقت میں تبدیل کرنے سے مانع تھی۔ جب قافلے کی روانگی کا وقت آتا تو حارثہ کے پاس اس کے سوا کوئی اور طریقہ کار نہ ہوتا تھا کہ وہ بھاری دل اور بھگی پلکوں کے بوجھ کے ساتھ اپنی ہمسفر اور لخت

جگر کو قافلے کے ساتھ روانہ کر دیں اور خود ان کی حسین یادوں اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ گھر کی طرف پلٹ آئیں۔ بوجہ امانت کے تلے دے حارثہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ اپنی سسرال خود تو نہیں جا پاتے لیکن اپنے اہل خانہ کو مشتعل جذبات اور نرم آنکھوں کے ساتھ وداع کرتے اور خود ایک جگہ کھڑے رہ کر ان کو تاکتے رہتے، تب تک جب تک کہ قافلہ نگا ہوں سے اوجھل نہیں ہو جاتا۔ اس بار بھی ایسا ہی سب کچھ ہوا، قافلہ چلا گیا آنسو سوکھ گئے خود گھر لوٹ آئے لیکن لگتا ایسا تھا کہ خالی جسم گھر لے آئے ہیں اور دل قافلے کے ساتھ روانہ کر آئے ہیں۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۹۰)

حضرت زید دشمن کی قید میں: سعدی اپنے بیٹے حضرت زید کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھر (مانیکے) قبیلہ بنی معن سلامتی کے ساتھ پہنچ گئیں، جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا اتنا ٹھہریں لیکن ایک دن نوشتہ تقدیر سامنے آیا، سارے ارمانوں کا خون ہو گیا، خوشیاں غموں میں تبدیل ہو گئیں، ہر طرف صف ماتم بچھ گئی، چیخیں بلند ہونے لگیں یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ وہ ڈاکٹر عبدالرحمن پاشا سے سینے وہ لکھتے ہیں:

سعدی اپنے مانیکے میں تھیں کہ قبیلہ قین کے ایک غارت گر گروہ نے بنی معن پر حملہ کر دیا، ڈاکوؤں نے مال لوٹ لیا، جانوروں پر قبضہ کر لیا اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ غارت گر جن کمسنوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ اٹھالے گئے تھے ان میں سعدی اور حارثہ کا کم سن بیٹا زید بھی تھا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر اس وقت تقریباً آٹھ سال رہی ہوگی، اس آٹھ سال کی عمر میں حضرت زید دشمنوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے، بچپن کے آزادانہ لعب و لہو کے بجائے دشمن کی قید میں پہنچ گئے، کمسنی کا معصوم بچپن گزارنے کے بجائے پابند سلاسل ہو گئے۔ (صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۱۷، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۳۹)

حضرت زید بازار عکاظ میں: عرب کا دستور یہ تھا کہ ڈاکو اور غارت گر لوگ نوخیز بچوں کو خیموں وغیرہ سے اٹھالے جاتے، ان کو غلام بناتے اور پھر حسب قیمت انہیں کسی بازار میں فروخت کر دیا کرتے۔ ڈاکوؤں کو ان کی ناجائز محنت کے عوض حرام مال مل جاتا اور

بیچارہ کمسن بچہ کہاں کا مارا کہاں پہنچ جاتا۔ جس کو اس کے ماں باپ نے کس لاڈ و پیار سے پالا تھا، وہ دردِ در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا۔ یہ خرابی بھی عربی معاشرے کی رائج الوقت خرابیوں میں سے ایک بڑی خرابی تھی۔ لیکن صرف اس کی کیا مذمت کی جائے، اس معاشرے کی بڑی بڑی برائیوں کے سامنے یہ تو ادنیٰ درجے کی برائی تھی۔ بہر حال حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ڈاکوؤں کا لقمہ تر بن چکے تھے۔ غلام کو بیچ کر دام کھڑے کر لیے جائیں اس لیے ڈاکو آپ کو بیچنے کی غرض سے بازارِ عکاظ لے آئے۔ بازارِ عکاظ سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قریش کے مشہور سردار حکیم بن حزام نے چار سو درہم میں خرید لیا، حکیم بن حزام نے اس بازار سے تنہا حضرت زید ہی کو نہیں خریدا بلکہ غلاموں کی ایک جماعت کو خریدا تھا۔ (صومن حیاة الصحابة، ص: ۲۱۷، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۳۹۰، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۵۱)

حضرت زید کی خرید و فروخت سے متعلق اور بھی روایات ہیں، ہم نے اس روایت کو بیان کیا ہے جس کو زیادہ تر علمائے کرام نے اپنی کتابوں میں ترجیح کے ساتھ درج فرمایا ہے، تفصیل کے لیے تاریخ دمشق وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: ایک قول یہ ہے کہ ابن حزام نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حباشہ کے بازار سے خریدا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضور نے بطحاء مکہ میں ان کی فروختگی کی ندامت تھی، حضور نے آکر خدیجہ کو بتایا پھر حضور نے حضرت زید کو خدیجہ کے مال سے خرید لیا، حضرت خدیجہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ غلام ہبہ کر دیا، حضور نے حضرت زید کو آزاد کر دیا، یہ اعلان نبوت سے پہلے کی بات ہے۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۳۵۱)

فائدہ: عکاظ و مجنہ اور ذوالحجاز زمانہ جاہلیت میں یہ تینوں مکہ کے بازار تھے ان کی حیثیت عرب کے سب سے بڑے بازاروں کی تھی۔ (الروض المطار فی خبر الاقطار، ص: ۴۱۱)

عکاظ ایک بازار تھا، جسے اہل عرب ماہِ حرام میں منعقد کرتے تھے اس میں خرید و فروخت کے سوا نخر یہ اشعار بھی پیش کیے جاتے تھے۔ (حاشیہ صومن حیاة الصحابة، ص: ۲۱۷)

زید کا شانہ خدیجہ میں: حکیم بن حزام غلاموں کی پوری جماعت کو لے کر اپنے

گھر آ گیا۔ اس کی پھوپھی حضرت خدیجہ کو جب اس بات کی اطلاع ملی کہ ان کا بھتیجہ بازار عکاظ سے اچھے اچھے غلام خرید کر واپس گھر آ چکا ہے تو آپ مرحبا کہنے اس کے گھر تشریف لے گئیں، اپنی پھوپھی کو دیکھ کر حکیم بن حزام نے کہا: اے میری پھوپھی! میں بازار عکاظ سے یہ چند غلام خرید کر لایا ہوں، ان میں سے آپ کو جو غلام پسند آئے اسے میری طرف سے بطور ہدیہ قبول فرمائیں۔ سیدہ خدیجہ نے تمام غلاموں کے اوپر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چہروں کی لکیروں میں پوشیدہ ان کی خوبیوں کو پڑھنے کی کوشش کی اور پھر نظر انتخاب حضرت زید بن حارثہ پر جا کر ٹھہر گئی کیونکہ سیدہ کو نجابت و شرافت کی جو علامات حضرت زید بن حارثہ میں نظر آئیں وہ کسی اور میں موجود نہ تھیں لہذا حضرت زید بن حارثہ کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے گھر تشریف لے آئیں۔ (صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۲۱۸)

زید کا شانہ نبوت میں: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر آئے کچھ ہی زمانہ گزرا تھا کہ حضرت سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سید عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ عقد میں آ گئیں، بخت آور زوجہ نے اپنے عظیم الشان شوہر امام الانبیاء کی بارگاہ ناز میں کچھ تحفہ پیش کرنے کا ارادہ فرمایا تو اپنے گرد و پیش مال و منال، ساز و سامان کا جائزہ لیا تو انہیں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر کوئی اور تحفہ نظر نہیں آیا، لہذا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کو بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قبول فرمایا، پھر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جکڑنے والی غلامی کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آزاد فرما دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت نہیں فرمایا ہے۔

(صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۲۱۸، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۵۳)

غلامی یا سرداری: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنی نہال آنا اور غارت گروں کے ہاتھوں قید ہو کر غلام بن جانا ایک بڑا حادثہ تھا، جس نے مادر زاد آزاد حضرت زید کو غلامی کی بھٹی میں جھونک دیا تھا لیکن اگر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا تجربہ کیا

جائے تو نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ اس حادثے نے بظاہر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غلام بنا دیا تھا لیکن حقیقت میں انہیں غلام نہیں امت کا سید و سردار بنا دیا تھا۔ سچ فرمایا میرے رب نے اور اس کا ہر کلام سچا ہی ہے: ”فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ“ بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ نہ وہ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھتے اور نہ بازار عکاظ میں بکتے، نہ حکیم بن حزام خرید کر اپنی پھوپھی کے حوالے کرتے اور نہ سیدہ خدیجہ انہیں دربار رسالت تک پہنچاتیں۔ یہ سب غلامی ہی کی کرشمہ سازیاں تھیں کہ رحمۃ للعالمین کی آغوش رحمت پناہ میں آئے۔ رحمت تمام نے ظاہری غلامی سے آزاد فرما دیا لیکن حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیشہ کے لیے آپ کے نام کا پٹہ غلامی اپنی گردن میں ڈال لیا۔

حضرت زید غلام کیا بنے قسمت سنور گئی، اس ذات کا در دولت ان کی قیام گاہ بن گیا، جس کی دربانی بھی ہفت اقلیم کے کشور کشائی سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ مقدر کا سکندر رحمت عالمیاں کے سایہ عاطفت اور سرپرستی میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارنے لگا۔ حضور کی کرم نواز صحبتوں سے حصہ پانا اور اخلاق محمدی کی بھینی بھینی خوشبو سے مشام جاں کو معطر بنانا، معمولات زندگی کا لازمہ بن گیا۔ حضور کے لب ہائے جاں بخش کی شیرینی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رگ رگ اور نس نس میں سما گئی، اس کرم گستری نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ماں کی ممتا اور والد کا سارا پیار بھلا دیا۔ یہاں اسے باپ کے پیار سے بڑھ کر پیار اور ماں کے دلار سے ڈھیروں زیادہ لاڈ حاصل تھا۔ والد کی آغوش اور مہر مادری کے مزے اپنی جگہ مگر

جن پہ ماں باپ فدا یاں کرم ان کا دیکھو

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنے والی زندگی کا کردار ہمارے اس دعوے کی مکمل تائید کرے گا۔

ماں باپ کا حال: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ حضور کی آغوش رحمت

میں آکر ماضی کی یادوں کو بھول چکے تھے مگر جس ماں نے اپنے دل کا ٹکڑا گم کر دیا ہو وہ بھی اس کیفیت کے ساتھ کہ نہ زندگی کی خبر نہ موت کا یقین، اس کے سکون و چین کا تصور کیسا؟ آنسو رکتا نہ دل قرار پاتا، نہ اسے کسی کروٹ سکون میسر آتا۔ ماں کی نیچینی کو مزید بڑھانے والی بات یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی زندگی اور موت دونوں سے بے خبر تھی، اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ بیٹا زندہ ہے تو اس کے آنے کی امید اور ڈھونڈنے کی تدبیر کی جاتی اور اگر موت کا پتا چل جاتا تو بے شمار صبر کرنے والوں کی طرح صبر کر لیا جاتا۔ یہ تو ماں کا حال تھا لیکن باپ جو اپنے بیٹے کو رگِ جاں سے بھی زیادہ عزیز تر رکھتا ہے وہ ماں سے غم میں کم کیوں کر ہو سکتا ہے؟ وہ بے چارہ، وقت کا مارا، اپنی بساط بھر بیٹے کی تلاش میں نگر نگر، ڈگر ڈگر، مارا مارا پھرتا رہا۔ ہر آنے جانے والے سے اس کا ایک ہی سوال ہوتا تھا کہ اس نے حضرت زید کو کہیں دیکھا ہے؟ شدتِ غم سے نڈھال ہو جاتا تو خود مرتب کردہ اشعار گنگنا تا بے شک یہ انسانی خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے:

دامن ضبط کو اشکوں سے بھگو لیتا ہوں

درد جب حد سے گزرتا ہے تو رو لیتا ہوں

حارثہ نے اپنے بیٹے کے فراق اور جگر پارے کی محبت میں جو اشعار کہے تھے انہیں سن کر ہر درد مند کا دل شدتِ الم سے پھٹنے لگتا ہے۔ حارثہ کی محبت اور غموں کی شدت ان کے اشعار کی زبان آپ بھی محسوس کیجئے۔

(۱) بکیت علی زید ولم ادر ما فعل احی فیر جی ام اتی دونہ الاجل

میں نے زید پر آنسو بہائے لیکن یہ نہ جان سکا کہ وہ دنیا میں ہے یا دنیا سے چلا گیا۔

(۲) فواللہ ما ادری وانی لسانک اغالک بعدی السہل ام غالک الجبل

خدا کی قسم! مجھے نہیں معلوم اور میں پوچھ رہا ہوں کیا تجھے زمین نکل گئی یا پہاڑ کھا گیا۔

(۳) تذکر نیہ الشمس عند طلوعها وتعرض ذکر اہ اذا غر بہا افل۔

چمکتا سورج تیری یادیں تازہ کرتا ہے اور غروب ہوتے ہوتے تیرا غم پھر ہرا کر جاتا ہے۔

(۴) وان هبت الارواح فھيجن ذكره فيا طول ما حزني عليه ويا وجل
ہواؤں کا چلنا اس کی یادوں میں ہيجان پیدا کر دیتا ہے ہائے میرے غم اور رنج و الم
کی طوالت۔

ہم طوالت سے بچتے ہوئے آگے صرف اشعار کا ترجمہ نقل کر رہے ہیں۔
(۵) قریب ہے کہ میں اونٹ کی طرح چل کر روئے زمین کی خاک چھان ماروں، میں
بادیہ پے مائی سے پوری زندگی نہیں اکتاؤنگا، یہاں تک کہ اونٹ تھک جائے۔
(۶) یا مجھے موت آجائے اور ہر انسان کو فنا ہونا ہی ہے، اگر چہ اسے امیدیں دھوکے میں
ڈالے رکھیں۔

(۷) میں قیس و عمر دونوں کے ساتھ یزید اور جبلة کو اسے ڈھونڈنے کی وصیت کرتا ہوں۔
آخری شعر میں قیس اور عمر سے مراد حضرت زید کے چچا ہیں اور یزید و جبلة حضرت
زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی ہیں۔ یزید ماں شریک بھائی ہے تو جبلة حضرت زید رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کا سگا بڑا بھائی ہے۔ (صور من حياة الصحابة، ص: ۲۱۸، الاستعاب، ج: ۱، ص: ۲۴۳، اسد الغابہ،
ج: ۲، ص: ۳۵۱، الاصابہ، ج: ۳، ص: ۲۵)

ہم وطنوں کی حضرت زید سے ملاقات: حج کا موسم چل رہا تھا، حضرت زید
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم وطن قبیلہ کلب کے کچھ افراد حج کرنے کی غرض سے مکہ آئے ہوئے
تھے، عین اس وقت جب کہ یہ لوگ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھے، ایک چہرہ ان کی
نگاہوں کے سامنے آگیا۔ کلبیوں نے چہرا پہچاننے میں بالکل خطا نہیں کی۔ انہوں نے پہچان
لیا تھا کہ یہ وہی مفقود الخبر لڑکا ہے، جس کے ماں باپ رورو کر ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ نہ ہی
حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے قبیلے کے افراد کو پہچاننے میں کوئی غلطی کی تھی، دونوں
طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ دراز ہوا اور طواف پورا ہو گیا۔ (صور من حياة الصحابة، ص: ۲۱۹)
اس موقع پر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم قوموں نے حضرت زید کو ان کے
ماں باپ کی پوری رودادِ غم، ماں کا بلکنا، باپ کا تڑپنا، بیٹے کے غم میں نوحہ خوانی کرنا سبھی کچھ

بتایا اور سنایا۔ جس کا جواب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آنے والے الفاظ کے ذریعے دیا۔ (رجال حول الرسول، ص: ۱۹۱)

حضرت زید نے کہا: میرے گھر والوں کو میرے یہ اشعار پہنچا دینا، میں جان رہا ہوں کہ وہ میرے فراق میں رو رہے ہیں۔
اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہیں:

- (۱) میرے دل میں میری قوم کی چاہت ہے اگرچہ میں ان سے دور ہوں، میں خانہ کعبہ میں مشعر حرام کے پاس ہی رہتا ہوں۔
- (۲) لہذا تم اس غم سے باز آ جاؤ جس نے تمہیں زخمی کر رکھا ہے اور اونٹوں کی طرح چل کر آبلہ پائی مت کرو۔

(۳) میں الحمد للہ! ایک بہترین خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہوں، جو نسلا بعد نسل معزز و محترم ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۰، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۳۵۱)

والدین کے لیے مژدہ جاں فزا: کلبیوں نے مناسک حج ادا کیے اور مکہ مکرمہ سے اپنے دیار کی جانب واپس ہو گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات کی تفصیلات حضرت زید کے والد حارثہ کو کہہ سنائیں، خاص کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسکن کا پورا پتہ حارثہ کو دے دیا۔

(الاصابہ، ج: ۳، ص: ۲۵، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۳۸، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۳۵۱)

قارئین! سمجھ سکتے ہیں ماں باپ کی خوشی کا عالم، وہ کتنے کیف آگین لحات ہوں گے جس میں حارثہ کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ان کا بیٹا زندہ ہے اور فلاں جگہ سکونت پذیر ہے۔ خوشخبری سنانے والوں اور حارثہ کے درمیان کیا کچھ گفتگو ہوئی اس کی تفصیلات تو ہمیں کسی مآخذ میں دستیاب نہ ہو سکیں، البتہ ایک سوشل سائٹ کے مضمون نگار نے کچھ اس طرح تبصرہ کیا ہے:

ابن شراحیل! خوش ہو جاؤ، ہم تمہارے بیٹے سے مل کر آئے ہیں! ”کہاں ہے میرے دل کا ٹکڑا؟ مجھے پوری بات سناؤ۔“ ابن شراحیل کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس کے ساتھ

شادی مرگ کا معاملہ نہ ہو جائے۔ رشتے داروں نے بتایا: اے ہمارے چچا کے بیٹے! ہم اس برس حج کرنے گئے تھے وہاں ہم نے تیرہ چودہ برس کے ایک لڑکے کو دیکھا، اس کی شکل تمہارے بیٹے سے بہت ملتی جلتی تھی۔ ہمیں وہ تمہارا کھویا ہوا بیٹا ہی معلوم ہوا۔ ہم تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ اے شریف باپ کے بیٹے! تم کس قبیلے سے ہو؟ اس نے بتایا ”بنی کلب قبیلے سے“ ہم نے پوچھا کہ یہاں اکیلے کیوں ہو؟ کہنے لگا: کچھ برس پہلے مجھے ڈاکوؤں نے اٹھالیا تھا پھر مجھے مکہ میں لگنے والے ایک میلے میں بیچ دیا اور اب میں ایک شریف اور اونچے خاندان کا غلام ہوں۔ کیا تم نے اسے اس کے باپ کی حالت نہ بتائی؟ یہ نہ کہا کہ تمہارے غم میں تمہارے باپ نے آنسو بہا بہا کر اپنی آنکھوں کا پانی خشک کر لیا ہے؟ کیوں نہیں عزیز چچا زاد! ہم نے تمہارا اور تمہاری بیوی دونوں کا حال اس تک پہنچایا۔ پھر اس نے کیا کہا؟ باپ نے گلوگیر آواز سے پوچھا۔ اس نے ہمیں عجیب بات کہی۔ کہنے لگا کہ میرے والد کو تسلی دینا اور کہنا کہ حوصلہ رکھے، غم نہ کرے، میں یہاں بہت آرام اور سکون سے ہوں۔ ہائے میری قسمت، پتا نہیں بے چارہ کس حال میں ہوگا؟ میرا دل بہلانے کو کہہ دیا ہوگا کہ اچھا ہوں۔ وہ کچھ لمحے خلا میں گھورتا رہا۔ پھر بولا: ارے دوستو! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ میرا ہی کھویا ہوا بیٹا ہے؟ ہاں، ہاں! اس معاملے میں تو ہمیں ذرہ بھر شبہ نہیں۔ اس نے اپنا اور تمہارا نام بالکل ٹھیک ٹھیک بتایا تھا اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ اسے خیمے سے باہر کھڑے ڈاکوؤں نے اٹھایا تھا۔ شراحیل اپنے بھائی کعب سے کہنے لگا: اے میرے ماں جائے! چلو ابھی اور اسی وقت چلو۔ مجھے تو بیٹے کو دیکھے بغیر پل بھر چین نہیں۔ ہم ابھی مکہ کی طرف چلتے ہیں اور پھر ایک چھوٹا سا قافلہ اسی وقت مکہ روانہ ہو گیا۔ جس قدر جلدی ہو سکتی تھی، یہ قافلہ اتنی ہی جلدی مکہ جا پہنچا۔ بیٹے کے متعلق ابن شراحیل کو یہ بتایا جا چکا تھا کہ اسے عکاظ نامی میلے میں فروخت کیا گیا تھا اور اس کے خریدار کا نام ”حکیم بن حزام“ تھا۔ یہ قافلہ مکہ آ کر سیدھا حکیم کے گھر پہنچا۔ حکیم ایک معزز قبیلے ”بنی سعد“ کا فرد تھا۔ اس نے مہمان نوازی کی روایت کو نبھایا اور ابن شراحیل کو بتایا کہ اسی نے زید نامی لڑکے کو

خریدا تھا، مگر اب وہ اس کی ملکیت نہیں۔ اس نے اسے اپنی پھوپھی کو تحفے میں دے دیا ہے۔ ابن شراحیل فوراً اس کی پھوپھی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ (سوشل ذرائع سے ماخوذ)

حارثہ بامید کرم پاپر کا ب: حارثہ اپنے بھائی کعب کو لے کر تیزی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مکہ پہنچے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت سرائے پر حاضر ہو گئے، حارثہ کو زمانے کے حالات اور اپنے تجربات کی روشنی میں علم یقین کے ساتھ یہ بات معلوم تھی کہ بغیر موٹی رقم خرچ کیے ہوئے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے ٹکڑے کی رہائی ناممکن ہے لہذا وہ اپنے بیٹے کی رہائی کا فدیہ ادا کرنے کے لیے مال کی خاصی مقدار اپنے ساتھ لائے تھے۔ (انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ مال جس ذات کو دینے کے لیے لائے ہیں تمام شاہ و گدا اسی کے در کی خیرات اور صدقہ کھاتے ہیں) دروازے پر دستک دی، دروازہ کھلا اور حارثہ اپنے بھائی کے ساتھ بیت النور میں داخل ہو گئے۔ شہنشاہ کونین سے ملاقات ہوئی تو حارثہ کچھ اس طرح عرض گزار ہوئے: اے ابن عبدالمطلب! اے ابن ہاشم! اے قوم قریش کے سردار کے بیٹے! تم اللہ کے گھر کے پڑوسی ہو، سائل کی مراد کو پورا کرنے والے اور طالب پناہ کو پناہ دینے والے ہو، بھوکے کو کھلانے والے اور مظلوم کی داد دہی کرنے والے ہو، ہم بامید کرم آپ کی بارگاہ میں حاضر آئے ہیں تاکہ اپنے بیٹے کا فدیہ ادا کر کے اسے اپنے ساتھ گھر لے جاسکیں۔ اے کریم ابن کریم! ہم پر کرم فرمائیں، ہمارا بیٹا ہمیں عطا فرمادیں۔ آپ اس کے عوض جو زرفدیہ لینا چاہیں گے وہ ہمیں منظور ہوگا، رحمت عالم نے پوچھا: تمہارا بیٹا کون ہے اور تم کس کا فدیہ ادا کرنے کی بات کر رہے ہو؟ حارثہ نے کہا: آپ کا غلام زید بن حارثہ ہمارا بیٹا ہے، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم زید کی بات کر رہے ہو تو کیا میں تمہاری پیش کردہ تجویز سے زیادہ بہتر تدبیر تمہیں نہ بتا دوں؟ حارثہ نے کہا: فرمائیے وہ تدبیر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اس کو تمہارے پاس بلاتا ہوں پھر اسے میرے پاس رہنے یا تمہارے ساتھ جانے کا اختیار دیتا ہوں، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو تم سے بغیر کوئی روپیہ لیے اسے تمہارے حوالے کر دیا جائے گا اور اگر وہ

میرے پاس رہنا چاہے گا تو خدا کی قسم! میں اس انسان سے بے رغبتی نہیں کر سکتا جو مجھے اختیار کرنا چاہے۔ حضور کی کریمانہ توجیز کو سن کر حضرت زید کے والد اور چچا دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا: آپ نے نہایت ہی عادلانہ بات کہی اور کمال کا انصاف کیا ہے۔

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی: جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیش کردہ توجیز کو حضرت زید کے والد اور چچا نے تمام رضا و رغبت قبول کر لیا اور دونوں حضور کی کرم شعاری کے گرویدہ ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز دی، حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکمل نیاز مندی کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو گئے۔ حضور نے پوچھا: زید! تم ان دونوں حضرات کو پہچانتے ہو؟ عرض کیا: ہاں حضور! میں انہیں اچھے طریقے سے جانتا ہوں، ان میں سے ایک میرے والد حارثہ بن شراحیل ہیں اور دوسرے میرے پیارے چچا کعب ہیں۔ حضور نے فرمایا: زید! اب جب کہ تم نے اپنے والد اور چچا کو پہچان لیا ہے تو بے شک تم مجھے بھی جانتے ہو، میری صحبتوں اور سنگتوں سے بھی واقف ہو اور میرے اس سلوک سے بھی تم بخوبی آشنا ہو، جو میں نے تمہارے ساتھ انجام دیا ہے۔ تمہارے والد اور چچا تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں، وہ تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں، اب میں تمہیں اختیار دیتا ہوں چاہو تو میرے پاس ٹھہرے رہو اور اگر اپنے والد اور چچا کے ساتھ گھر جانا چاہتے ہو تو میری طرف سے تمہیں مکمل اجازت ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغیر کسی توقف اور بلا کسی تردد کے بلا تاخیر کہا: حضور! میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔ میں آپ پر کسی کو ترجیح دے سکتا ہوں نہ آپ کو چھوڑ کر کسی کے بھی ساتھ جاسکتا ہوں۔ آپ میرے ماں باپ اور چچا سب کچھ ہیں۔ والد نے کہا: ہائے زید! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اور کتنا برا فیصلہ کر رہے ہو؟ کیا تم آزادی پر غلامی کو ماں باپ اور اہل خانہ پر ایک اجنبی کو ترجیح دے رہے ہو؟ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوری متانت کے ساتھ اپنے والد کو جواب دیا: جی ہاں! میں یہ فیصلہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ لے رہا ہوں کیوں کہ میں اس ذات میں وہ محاسن و کمالات

دیکھ رہا ہوں جن کے مقابلے میں پوری کائنات میں کسی کو اختیار نہیں کر سکتا۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

(اقبال)

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۰، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۸، الاصابہ، ج: ۳، ص: ۲۵، اسد

الغالبہ، ج: ۲، ص: ۵۱، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۲۳۳، صور من حياة الصحابة، ص: ۲۲۰)

اگرچہ ابھی حضور نے اعلان نبوت نہیں فرمایا تھا لیکن معلم کائنات کے محاسن نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بات کی یقین دہانی کرا دی تھی کہ یہی وہ ذات ہے کہ جس کے قدموں میں پڑا رہنا انسانیت کی معراج ہے۔ اسے چھوڑ کر کسی کو اختیار کرنا نہایت ہی خسارے اور گھٹائے کا سودا ہوگا، ان پر ایک ماں باپ تو کیا ساری کائنات کو قربان کیا جاسکتا ہے، اس در کی در بانی بادشاہی سے کہیں بڑھ کر ہے، اس در کو چھوڑنا نصیبی کی بربادی ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماں باپ اور کنبہ و قبیلے کے مقابلے حضور کو اختیار کر کے پوری انسانیت کو پیغام دیا۔

جو تیرے در سے یار پھرتے ہیں در بدر یوں ہی خوار پھرتے ہیں

اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں مانگتے تاجدار پھرتے ہیں

(اعلیٰ حضرت)

زید بن حارثہ سے زید بن محمد: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی، نیاز مندی، وفا شعار اور اپنے تئیں جذبات محبت کی فراوانی دیکھ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آنکھیں تشکرانہ آنسوؤں سے بھر آئیں۔ وفا شعار کے اس انداز نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بحر محبت میں تموج پیدا کر دیا، بس پھر کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ تھا ما حارثہ اور کعب کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور پھر سب صحن کعبہ میں جا پہنچے۔ کعبہ مقدسہ کے گرد اہل قریش کی محفلیں جمی ہوئی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند

آواز سے فرمایا: اے قوم قریش! گواہ ہو جاؤ آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ میں اس کا وارث ہوں اور یہ میرا وارث ہے۔ اس طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا متبنی (منہ بولا بیٹا) بنا لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد حارثہ اور چچا کعب بہت خوش ہوئے، انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا بیٹا غلام نہیں، عرب کے سب سے باعزت و باوقار شخص کا بیٹا ہے۔ اب انہیں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مستقبل سے متعلق کوئی خطرہ لاحق تھا نہ بدگمانی۔ دونوں نہایت خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ اس حال میں اپنے گھر کی طرف لوٹ گئے کہ ان کے دل مطمئن تھے اور چہرے ہشاش۔ اس دن سے زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہا جانے لگا۔ مسلسل حضرت زید کے والد کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کا استعمال ہوتا رہا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو اعلان نبوت کے ساتھ مبعوث فرمادیا اور اسلام نے عربوں میں رائج متبنی (منہ بولے بیٹے) کے قانون کو ختم فرمادیا۔ (صور من حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۲۰، الاصابہ، ج: ۳، ص: ۲۵، تاریخ دمشق، ج: ۱، ص: ۳۲۸، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۰)

جس پر چاہے فضل فرمائے: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر، ذات مصطفیٰ کے محاسن کا مشاہدہ کر کے، اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر حضور کا انتخاب ضرور کر لیا تھا لیکن شاید یہ فیصلہ کرتے وقت خود حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے کتنا قیمتی سودا کیا ہے اور کس غنیمت پر قبضہ کر لیا ہے؟ انہوں نے جس آقا کا انتخاب کیا تھا وہ صرف انہیں کا نہیں بلکہ تمام اولین و آخرین کا بھی آقا ہے، وہ پوری کائنات کی طرف اللہ کا مقدس رسول ہے، انہیں نہیں معلوم تھا کہ عنقریب زمین پر آسمانی حکومت قائم ہونے والی ہے جس حکومت کے قیام سے زمین کے مشرق و مغرب، اطراف و جوانب سب نیکی اور عادلانہ نظام سے بھر جائیں گے، انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس قائم شدہ حکومت کے شاہی محل کا وہ خود بھی ایک عظیم الشان ستون ہوں گے، ان کے یقین کی دنیا میں ایسا کچھ نہ تھا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہے

عطا فرمائے۔ (صور من حياة الصحابة، ص: ۲۲۱)

دامن اسلام میں: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پورے گھرانے کو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت کو اختیار کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد فرما کر اپنا متبنی بنالیا تھا، اس واقعے کو جو د میں آئے چند ہی سال گزرے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو حق و ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمادیا۔

(صور من حياة الصحابة، ص: ۲۲۱)

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا ایک فرد تھے۔ کاشانہ نور میں جان عالمیاں کے ساتھ ہی بسیرا کرتے تھے، آفتاب نبوت کے ظہور کی شعاعوں سے گھر کے در و دیوار جب جگمگ جگمگ ہوئے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان نورانی کرنوں کا احساس نہ ہوتا؟ جو آفتاب نور عالم سے ظلم و کفر کی تاریکیوں کو کافور فرما کر اسلام کے نور سے منور کرنے والا ہے اس کے مطلع پر انوار میں رہتے ہوئے بھی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل کی ظلمتیں باقی رہ جائیں یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ جس ذات کی راست گوئی، حق بیانی، بلند کرداری، ذرہ نوازی، خوش اخلاقی، شگفتہ روئی، کشادہ دستی اور فراخ دلی سے متاثر ہو کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ماں باپ بلکہ گھر کی پوری کائنات کو چھوڑ دیا تھا وہ بھی بغیر کسی مطالبے کے، وہ اس ذات کے مطالبے پر اسلام کو اختیار کرنے میں کیوں کر پیچھے رہ سکتے تھے؟ چنانچہ اعلان نبوت کے اولین مراحل ہی میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں آ بسے، حضور کی دعوت کو قبول فرما کر ہمیشہ کے لیے اسلام ہی کے ہو رہے۔

اسلام میں آپ کا نمبر: بلا شک و شبہ آپ اس کاروان نور کا حصہ ہیں جو اسلام لانے میں سب پر سابق ہے۔ سابقین اولین کی بھی پہلی جماعت میں آپ کا شمار ہے، حضرت معمر نے تو یہاں تک روایت کیا ہے کہ امام زہری فرماتے ہیں: ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے ایمان لایا ہو۔ اس روایت

کا تقاضہ یہی ہے کہ آپ پہلے مسلمان ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے مسلمان ہیں۔ تفصیل کے لیے تاریخ دمشق وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اولیت کی روایات صرف حضرت زید ہی کے ایمان سے متعلق مروی نہیں بلکہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت مولیٰ علی، حضرت خدیجہ الکبریٰ وغیرہم رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی سب سے پہلے ایمان لانے کی روایات موجود ہیں۔ لہذا اس سلسلے میں محققین علما وائمہ کا قول فیصل وہی ہے جسے ہم معارف صحابہ میں بیان کر چکے ہیں۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے ان تمام روایات کو اس طور پر جمع فرمایا ہے ”آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق ایمان لائے، عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ، آزاد کردہ غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ اور بچوں میں سب سے پہلے حضرت مولیٰ علی ایمان لائے“ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (السیرۃ النبویہ لابن کثیر، ج: ۱، ص: ۷۳، البدایہ والنہایہ، ج: ۲، ص: ۷۳)

امام نووی فرماتے ہیں: بہتر ہے کہ یہ کہا جائے ”آزاد مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق، بچوں میں مولیٰ علی، عورتوں میں حضرت خدیجہ، آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ اور غلاموں میں حضرت بلال سب سے پہلے ایمان لائے“ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (تہذیب الاسماء واللغات، ج: ۱، ص: ۳۴۵)

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لانے میں بہت سارے لوگوں پر اولیت رکھتے ہیں، بلکہ اس راہ کے جو اولین ترین افراد ہیں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام اس فہرست میں شامل ہے۔ بھلا اس اولیت کے اوپر بھی کوئی اولیت ہے؟ بیشک اس جیسے مقابلے میں لوگوں کو مقابلہ کرنا چاہئے۔ (صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۲۲۱)

مصائب و آلام: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ شرف حاصل ہو چکا تھا کہ وہ اعلان نبوت سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے فرد بن چکے تھے اور حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی حضور کے دولت خانہ میں فروکش تھے۔ مجھے اس بات کی صراحت اگرچہ کسی قابل ذکر کتاب میں نظر نہیں آئی لیکن یہ بات بالکل معقول ہے کہ آپ بھی ان تمام مشقتوں میں شامل رہے جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے گھروالوں نے برداشت کیا۔ جیسے شعب ابی طالب میں محصور ہونا، یہ بات یقینی ہے کہ شعب ابی طالب میں کچھ مسلمان ضرور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ محصور تھے، جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے ایک فرد اور حضور کے منہ بولے بیٹے تھے تو وہ بھلا اس محاصرے سے کیوں کر بچ سکتے تھے۔ شعب ابی طالب میں محصور کی زندگی ایک بہت بڑی مصیبت اور صبر آزمایا حادثہ تھا۔

پیر کرم شاہ ازہری لکھتے ہیں:

یہ طویل محاصرہ حضور کے لیے اور حضور کے خاندان کے لیے از حد تکلیف دہ تھا۔ بسا اوقات درختوں کے پتے اور گھاس کھا کر پیٹ بھرا کرتے، بھوک سے ہلکتے ہوئے معصوم بچے اس قدر زور شور سے روتے کہ ان کے رونے کی آواز شعب (گھائی) سے باہر دور دور تک سنائی دیتی۔

علامہ سہیلی لکھتے ہیں: صحیح میں ہے کہ شعب (گھائی) میں محصورین کو بڑی مصیبت اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں وہ درختوں اور بیری کے پتے کھا کر گزارا کرتے تھے، جب وہ قضائے حاجت کرتے تو بکریوں کی میٹھنیوں کی طرح خشک مادہ خارج ہوتا تھا۔ ان محصورین میں سعد بن ابی وقاص بھی تھے۔ آپ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: ”میں ایک دن از حد بھوکا تھا، رات کو اندھیرے میں میرا پاؤں کسی گیلی چیز پر آ گیا، میں نے اسے اٹھا کر منہ میں ڈالا اور اسے نگل گیا، مجھے اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ میں پتہ کرتا کہ وہ کیا چیز ہے؟ اور اب تک مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔“

یونس حضرت سعد سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ ایک رات میں پیشاب کرنے کے لیے باہر نکلا جب میں پیشاب کرنے لگا تو جہاں میرا پیشاب گر رہا تھا وہاں کسی

چیز کی مجھے آواز آئی۔ میں نے اٹھایا تو وہ اونٹ کے خشک چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا، میں نے اسے لیا پھر اسے دھویا پھر اسے جلا کر راکھ کیا پھر اسے کوٹا پھر اسے پانی میں ملایا اور تین دن تک اسے کھاتا رہا۔ (الروض الانف، ج: ۲، ص: ۱۲۷، بحوالہ سیرت الرسول، ج: ۲، ص: ۳۸۷)

خیال رہے یہ محاصرہ تین سال کی طویل مدت تک جاری رہا۔ (سیرت الرسول ج: ۲، ص: ۳۸۷) ظاہر حال یہی ہے کہ وہ تمام تر پریشانیاں جو شعب ابی طالب کے محصورین نے جھیلیں، حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان میں برابر کے شریک رہے۔

طائف میں حضور کے ساتھ: اعلان نبوت کے دسویں سال اب نہ دنیا میں ابو طالب تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے، نہ پیاری شریکہ حیات حضرت خدیجہ تھی، جو حضور کا غم غلط کرتیں، کفار کی سختیاں اور سخت ہو گئیں، جب انتقامی کارروائیاں شدید تر ہو گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی طرف اس توقع پر گئے کہ شاید وہ آپ کو پناہ دیں گے۔ پس آپ طائف کے تین سرداروں کے پاس گئے وہ سب آپس میں بھائی تھے۔ عبد یلیل، حبیب اور مسعود۔ آپ نے اپنے آپ کو ان کی پناہ میں پیش کیا اور آپ کو اپنی قوم سے جو تکلیفیں پہنچی تھیں ان کا ذکر کیا تو ان لوگوں نے بہت بے دردی سے آپ کو مسترد کر دیا۔ (عمدة القاری، ج: ۱۵، ص: ۱۹۵، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۲۴۷)

طائف کے اس سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام وفادار حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی معیت کا موقع نصیب فرمایا۔ یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی سفروں میں سخت ترین سفر تھا۔ اس سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ ساتھ وہی نبھاسکتا تھا جس نے اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جسم و جان بھی حضور پر قربان کرنے کا عزم محکم کر رکھا ہو، اس سفر میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جاں نثاری ہم بعد میں بیان کریں گے پہلے بخاری شریف کی ایک حدیث سے اس سفر کی شدت و مشقت کا اندازہ کیجئے:

حضرت عروہ نے حدیث بیان کی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ نے ان کو حدیث بیان کی، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپ کے اوپر کوئی ایسا دن بھی آیا جو آپ کے نزدیک غزوہ احد کے دن سے بھی زیادہ شدید تھا؟ آپ نے فرمایا: تمہاری قوم سے مجھے جو مصائب پہنچے سو پہنچے اور ان تمام مصائب میں سب سے زیادہ سخت مصیبت وہ تھی جو مجھے عقبہ کے دن پہنچی۔ جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یلیل بن عبد کلال پر پیش کیا، اس نے میرے ارادے کے مطابق میری دعوت کو قبول نہیں کیا، میں وہاں سے بہت مغموم حالت میں چل پڑا پھر جب میں قرن الثعالب پر پہنچا تو میری حالت سنبھلی، پس میں نے سراٹھا کر دیکھا تو مجھ پر ایک بادل نے سایہ کیا ہوا تھا پھر میں نے غور کیا تو اس میں (حضرت) جبرائیل تھے، انہوں نے مجھے آواز دی اور کہا: بے شک اللہ نے آپ کی قوم کی باتیں سن لی ہیں اور انہوں نے جو آپ کو جواب دیا ہے وہ بھی سن لیا ہے اور اللہ نے آپ کی طرف پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تاکہ آپ اس کو ان لوگوں کے متعلق جو چاہیں حکم دے دیں۔ پھر مجھ کو پہاڑوں کے فرشتے نے آواز دی پس اس نے مجھ کو سلام کیا پھر اس نے کہا: اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! اس نے بھی یہی کہا: آپ جو چاہیں اگر آپ چاہیں تو جن دو پہاڑوں کے درمیان یہ لوگ ہیں ان دو پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں (جس سے یہ لوگ ان کے درمیان پس جائیں) تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ مجھے یہ امید ہے کہ اللہ ان لوگوں کی پشتوں سے ایسے لوگوں کو نکالے گا جو صرف اللہ وحدہ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۳۲۳۱)

حدیث میں مذکور واقعہ سفر طائف سے متعلق ہے۔

(عمدة القاری، ج: ۱۵، ص: ۱۹۵ بحوالہ نعمة الباری، ج: ۶، ص: ۲۴۷)

حضرت زید کی جان حضور پر قربان: علامہ پیر کرم شاہ ازہری اس سفر کی

رواد تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

طائف کے ہر قابل ذکر شخص سے حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے ملاقات کی اور انہیں

اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے اور دین اسلام کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ حضور کو یہ توقع تھی کہ اہل مکہ نے ازراہ تعصب اگر اس سچی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے لیکن اہل طائف کا رویہ ایسا معاندانہ نہ ہوگا، وہ اسے قبول کرنے میں تامل سے کام نہیں لیں گے، لیکن یہاں تو سارا آواہی بگڑا ہوا تھا، کسی نے شائستگی سے جواب دینے کی زحمت تک گوارا نہ کی، انتہائی بے مہری اور ڈھٹائی سے اس دعوت کو مسترد کر دیا۔ ان کے غیر متوقع طرز عمل سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاطر عاطر پر جو گزری ہوگی اس کا آپ با آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حضور نے ان سے رخصت ہونے سے پہلے ان کو کہا: ”اذ فعلتم ما فعلتم فاکتھوا علی“ میرے ساتھ جو برتاؤ تم نے کیا وہ تو کیا، اب یہ سارا معاملہ راز رہے اس کو افشا نہ کرنا۔ (السیرۃ النبویہ لابن کثیر، ج: ۲، ص: ۱۵۰)

کیونکہ حضور کو خدشہ تھا کہ اہل مکہ کو اگر معلوم ہو گیا کہ میں طائف گیا ہوں، وہاں کے رؤساء کو قبول اسلام کی دعوت دی ہے اور انہوں نے بڑی سرد مہری سے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ تو اہل مکہ خوشی کے شادیاں بچائیں گے اور اسلام کے خلاف ان کے معاندانہ رویہ میں مزید تیزی اور تلخی پیدا ہو جائے گی، اس لیے حضور نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا لیکن ان میں مروت نام کی کوئی چیز نہ تھی انہوں نے اس واقعے کی خوب تشہیر کی وہ ہر ملنے والے سے اپنے اس متکبرانہ بلکہ احمقانہ جواب کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے اور اس سے بھی زیادہ خست اور زالت کا انہوں نے یوں مظاہرہ کیا کہنے لگے ”یا محمد اخرج من بلدنا“ (کہ ہمارے شہر سے فوراً نکل جاؤ) ہمیں اندیشہ ہے کہ تم ہمارے نوجوانوں کو اپنی باتوں سے بگاڑ دو گے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شہر کے اوباشوں اور نوخیز چھوکروں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا، وہ جلوس کی شکل میں اکٹھے ہو گئے اور حضور کا تعاقب شروع کر دیا، آوازے کستے، پھبتیاں اڑاتے، دشنام طرازی کرتے، اپنے بتوں کے نعرے لگاتے ہوئے حضور کے پیچھے لگ گئے، جس راستے سے سرکارِ دو عالم کو گزرنا تھا، طائف کے شہری دورویہ صفیں بنا کر بیٹھ گئے اور حضور جب ان کے درمیان میں سے گزرے تو انہوں نے

پتھر برسانے شروع کیے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بابرکت قدموں کو اپنے پتھروں کا نشانہ بناتے، چلتے ہوئے جو پاؤں زمین پر رکھتے ٹھک سے پتھر اس پر آگتا، حضور اسے اٹھاتے اور دوسرا پاؤں زمین پر رکھتے تو وہ پاؤں ان کی زد میں آجاتا، یہاں تک کہ ان ظالموں کی سنگ باری سے مبارک قدم زخمی ہو گئے اور خون بہنا شروع ہو گیا۔ ان کی سنگ باری جب شدت اختیار کر لیتی تو حضور درد کی شدت سے بیٹھ جاتے، وہ ظالم آگے بڑھتے حضور کو بازوؤں سے پکڑتے اور کھڑا کر دیتے، پھر پتھر برسانا شروع کر دیتے اور ساتھ ہی قہقہہ لگاتے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیکسی کے اس عالم میں اپنے آقا کو بچانے کے لیے آڑ بن کر کھڑے ہو جاتے، کئی پتھر ان کے سر پر لگے اور زخموں سے خون بہنے لگا، اس طرح طائف کے ان بد بخت شہریوں نے اپنے اس معزز و مکرم مہمان کو اپنے یہاں سے رخصت کیا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف شہر کے باہر پہنچے تو دل ان کے ظالمانہ سلوک سے از حد مغموم تھا، سارا جسم زخموں سے چور چور تھا، پاؤں مبارک سے خون بہ رہا تھا، قریب ہی ایک باغیچہ تھا، رحمت عالم اس میں تشریف لے گئے اور انگور کی ایک بیل کے نیچے بیٹھ گئے۔

عبدمنیب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پہنچ کر دو رکعت نفل ادا کیے پھر بڑے درد و سوز سے اپنے معبود برحق اپنے محبوب حقیقی کی بارگاہ بیکس پناہ میں اپنے قلب حزیں کی حکایت درد و غم پیش کی، ان سنگین ترین لمحات میں زبان رسالت سے نکلے ہوئے ان دعائیہ کلمات میں جو درد و سوز ہے، اپنی بندگی کا جس نرالے انداز میں اظہار ہے اور ان حالات میں بھی جو تمنا لبوں پر دعا بن کر رونما ہو رہی ہے، اس سے عظمت مصطفویٰ کے آفتاب کی تابانیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس محبوب بندے کا اپنے کریم رب سے عبدیت کا جو رشتہ ہے اس کی پختگی کا پتا چلتا ہے، عشق الہی کا جو جذبہ اس قلب مبارک میں موجزن ہے اس سے بقدر فہم آگاہی نصیب ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مناجات اس وقت اپنے کریم و رحیم رب کی بارگاہ میں بدل سوزاں و چشم گریاں و زبان لرزاں پیش کیں اسے بار بار

پڑھیے، اس میں بار بار غور کیجیے شاید اس مقام کی رفعتوں کا آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب کو فائز فرمایا تھا۔

حضور سراپا نور عرض کرتے ہیں: اے اللہ! میں اپنی طاقت کی ناتوانی، اپنی قوت عمل کی کمی، لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کا شکوہ تیری بارگاہ میں کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے تو میرا رب بھی ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے، ایسے بعید کے حوالے جو ترش روئی سے میرے ساتھ پیش آتا ہے۔ کیا کسی دشمن کو تو نے میری قسمت کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر تو مجھ پر ناراض نہ ہو تو مجھے ان تکلیفوں کی ذرا پرواہ نہیں پھر بھی تیری طرف سے عافیت اور سلامتی میرے لیے زیادہ دلکشا ہے، میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے نور کے ساتھ جس سے تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام سنور جاتے ہیں، (پناہ مانگتا ہوں اس سے) کہ تو نازل کرے اپنا غضب مجھ پر اور تو اتارے مجھ پر اپنی ناراضگی، میں تیری رضا طلب کرتا رہوں گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے، تیری ذات کے بغیر نہ میرے پاس کوئی طاقت ہے نہ قوت۔ (سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۲، ص: ۵۷۷، السیرۃ النبویہ لابن کثیر، ج: ۲، ص: ۱۵۰، بحوالہ سیرت الرسول، ج: ۲، ص: ۴۴۴)

ہجرت: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے غلاموں کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ مدینہ طیبہ میں کلثوم بن ہدم کا مکان آپ کی قیام گاہ بنا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت اسید بن حضیر کے ساتھ آپ کی مدنی مؤاخات قائم فرمائی، آپ ہجرت کرنے میں کافی مقدم ہیں۔

علامہ ابن خلدون کے بیان کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام کی جس جماعت کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی اس سے قبل صرف چند صحابہ کرام نے ہی ہجرت فرمائی۔ حضرت عمر کے ہجرت فرمانے کے بعد حضرت طلحہ نے ہجرت فرمائی، حضرت طلحہ کے بعد سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے ہجرت فرمائی اور حضرت سید الشہداء کے

ساتھ ہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت فرمائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہجرت فرمانے سے پہلے ہی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ روانہ فرما دیا تھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۲، تاریخ ابن خلدون، ج: ۲، ص: ۴۲۰)

غزوات میں شرکت: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ماہر فوجی اور بہادر جنگ جو تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں جو نامور تیر انداز تھے، ان میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدر، احد، خندق، حدیبیہ اور خیبر تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوہ مریسج میں آپ اس لیے شرکت نہ کر سکے کہ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ طیبہ میں اپنی جانشینی اور نائب ہونے کا شرف عطا فرمایا تھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۳، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۵۸)

فوجی مہمات میں حضرت زید کی سرداری: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ماہر جنگ جو تھے۔ فوج کشی کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن مہمات میں خود شرکت نہ فرماتے اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مہم میں شریک ہوتے تو اس مہم کی امارت کا سہرا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر باندھا جاتا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی لشکر کو روانہ فرماتے اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس لشکر میں شریک ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کو لشکر کا امیر منتخب فرماتے۔ اسی حسن انتخاب کا نتیجہ تھا کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چھوٹی بڑی ۹ فوجی مہمات (سرایا) میں بطور امیر لشکر شرکت کی سعادت نصیب ہوئی، چنانچہ حضرت سلمہ بن اکوع فرماتے ہیں: میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ۹ غزوات میں شریک رہا، ان تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر لشکر بنایا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۳)

حضرت زید کے غزوات کی تفصیل: امام ابن سعد نے غزوہ موتہ کے

علاوہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ۷ سرایا کی تفصیل کو کچھ اس طور پر بیان فرمائی ہے:

(۱) **سریہ قرہ:** بحیثیت امیر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سب سے پہلی فوجی مہم سریہ قرہ تھی، یہ معرکہ ہجرت کے اٹھائیس ماہ بعد جمادی الاخریٰ میں پیش آیا۔ قرہ، ربذہ اور غمرہ کے درمیان ارض نجد کا ایک علاقہ ہے۔ یہ مہم قریش کے ایک قافلے کے مقابل تھی، اس قافلے میں صفوان بن امیہ، حویطب بن عبد العزیٰ، اور عبد اللہ بن ابی ربیعہ جیسے لوگ شامل تھے۔ سونے چاندی پر مشتمل کثیر مال بھی اس قافلے کے ساتھ موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سواروں پر امیر بنا کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس قافلے کی طرف روانہ فرمایا، حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ قافلے سے برسر پیکار ہوئے، قافلے کے چیدہ چیدہ لوگ تو نکل بھاگنے میں کامیاب رہے تاہم حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غنیمت کے طور پر مال کثیر ہاتھ آیا تھا اور وہ قریش کے ایک سردار فرات بن حیان کو قیدی بنا کر بارگاہ رسالت میں لے آئے، ابن حیان سے کہا گیا: ایمان لے آؤ اور نجات پاؤ، چنانچہ اس نے اسلام قبول کر کے اپنی جان کو محفوظ کر لیا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۳۳)

(۲) **سریہ عیمص:** جماد الاولیٰ ۶ھ میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقام عیمص کی طرف ایک سو ستر مجاہدین کے ساتھ بھیجا گیا۔ یہ مقابلہ بھی قریش کے ایک قافلے کے ساتھ تھا جو ملک شام سے واپسی کر رہا تھا، اس میں بھی کثیر مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا اور قافلے کے لوگوں کو قیدی بھی بنایا گیا، گرفتار ہونے والوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بن ربیع بھی تھے، جنہوں نے اپنی اہلیہ حضور کی شہزادی حضرت زینب سے امان حاصل کر لی، جب صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز ادا کرائی تو حضرت زینب نے اعلان فرمایا: اے لوگو! میں نے ابوالعاص کو امان دے دی ہے۔ حضور نے فرمایا: اے زینب! جس کو تم نے امان دے دی ہے اسے ہم نے بھی امان بخش دی ہے، لہذا جو ان سے لیا گیا تھا وہ واپس کر دیا گیا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۸۳)

ابوالعاص کا ایمان: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص ابھی تک داخل

اسلام نہیں ہوئے تھے۔ یہ حضرت زینب کے شوہر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی حضرت امامہ کے والد تھے۔ یہی وہ امامہ ہیں جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حالت نماز میں گود میں اٹھا لیا کرتے تھے۔ ابوالعاص جنگ بدر میں مشرکین کی طرف سے شامل ہوئے تھے، مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، ان کی رہائی کے لیے بطور فدیہ وہ بار بار گاہ رسالت میں پیش کیا گیا جو حضرت زینب کی والدہ حضرت خدیجہ نے اپنی بیٹی کو تحفے میں دیا تھا۔ اسے دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اشک بار ہو گئے تھے اور پھر مسلمانوں کی عرض پر حضور نے انہیں رہا کیا اور ہار بھی واپس کر دیا۔ اس وقت ابوالعاص سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ لیا تھا کہ وہ حضرت زینب کو مدینہ طیبہ روانہ فرما دیں گے۔ حضرت زینب ابھی تک اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے ہجرت نہیں کر سکیں تھیں۔ رحمت عالمیاں سے کیا ہوا وعدہ ابوالعاص نے پورا کیا اور حضرت زینب کو مدینہ طیبہ حضور کی خدمت میں بھیج دیا۔ (جس کی تفصیل ہم ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے) ابوالعاص صلح حدیبیہ سے پانچ ماہ قبل ایمان لے آئے، جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو پھر ان کے ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۳۲)

(۳) سر یہ طرف: جماد الاخریٰ ۶ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقام طرف کی جانب روانہ فرمایا ”طرف“ مدینہ طیبہ سے ۳۶ میل دور مقام مراض کے پاس پانی کا ایک چشمہ ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس چشمے کی طرف مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ بھیجا گیا تھا، وہاں کے باشندے مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر فرار ہو گئے، مسلمانوں کو مال غنیمت کے طور پر اونٹ اور بکریاں حاصل ہوئیں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۸۴)

(۴) سر یہ حسمی: یہ معرکہ بھی جماد الاخریٰ ۶ھ میں پیش آیا۔ اس معرکہ کو سر کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پانچ سو مجاہدین کے ساتھ مقام حسمی کی جانب روانہ فرمایا۔ معرکہ پیش آنے کی وجہ یہ رہی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

قاصد دحیہ کلبی حضور کے پیغام کو قیصر روم تک پہنچا کر واپس آ رہے تھے کہ مقام حسی کے قریب ہنید بن عارض اور اس کے بیٹے عارض بن ہنید نے قبیلہ جذام کے ساتھ مل کر حضرت دحیہ کلبی کو لوٹ لیا اور ایک پرانے کپڑے کے سوا ان کے پاس کچھ نہ چھوڑا، جب یہ بات قبیلہ بنی ضبیہ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے ہنید اور اس کے بیٹے پر حملہ کر کے حضرت دحیہ کلبی کا تمام سامان واپس کر دیا۔ بنی ضبیہ رفاعہ بن زید کے رشتہ دار اور ہم قبیلہ تھے۔ رفاعہ بن زید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اپنی قوم کی جانب لے کر آئے تھے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام کی دعوت پیش کی تھی۔ ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول فرما لیا تھا، (اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں کہ زید بن رفاعہ اور ان کے ساتھی مذکورہ غزوے سے پہلے ہی ایمان لے آئے تھے یا اس غزوے کے بعد ایمان لائے)

بہر حال حضرت دحیہ کلبی نے بارگاہ رسالت میں پہنچ کر آپ بیتی سنائی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رد عمل کے طور پر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر کو روانہ فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا سفر اس طور پر کیا کہ رات کو سفر کرتے اور دن میں چھپ رہتے، یہاں تک کہ ایک دن صبح ان غارت گروں پر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر نے حملہ کر دیا، کچھ قتل کیا بعض کو قیدی بنایا، ہنید اور اس کے بیٹے کو بھی تہ تیغ کیا گیا، مال غنیمت کے طور پر ایک ہزار اونٹ، پانچ ہزار بکریاں حاصل ہوئیں، ایک سو عورتیں اور بچے مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بنائے گئے۔ اس وقت زید بن رفاعہ جذامی اپنی قوم کے بعض افراد کے ساتھ جن میں ابو یزید بن عمرو بھی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں وہ خط لے کر پہنچے جو حضور نے ان کے لیے اور ان کی قوم کے لیے لکھا تھا اور اس کے نتیجے میں زید بن رفاعہ ایمان لے آئے تھے، جا کر حضور کو وہ خط دکھایا اور عرض گزار ہوئے: حضور! حلال کو ہمارے اوپر حرام نہ فرمائیں اور حرام کو حلال نہ فرمائیں۔ حضور نے فرمایا: مقتولین کا کیا کیا جائے؟ اس پر ابو یزید نے عرض کیا: حضور! مقتولین کو جانے دیجئے جو ہمارے زندہ افراد ہیں انہیں رہا فرما دیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو یزید نے سچ

کہا۔ آنے والوں نے عرض کیا: حضور! ہمارے ساتھ نشانی کے طور پر کسی صحابی کو روانہ فرما دیں تاکہ ہمارے بال بچے اور مال کو رہائی حاصل ہو جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی! تم ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: (مجھے کوئی نشانی عطا فرمادیں ورنہ) زید میری اطاعت نہیں کریں گے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور نشانی عطا فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے، مقام فحلتین پر پہنچ کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ آپ کے پاس ان لوگوں کا ساز و سامان، مال و منال اور قیدی ہیں وہ سب ان کو واپس کر دو۔ یسن کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: حضور کے اس فرمان پر علامت کیا ہے؟ تب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار دکھائی۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور کی تلوار کو پہچان لیا اور پھر تمام مال غنیمت ان لوگوں کو واپس کر دیا گیا۔ (سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۶، ص: ۸۹، طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۸۵)

(۵) اسی سال ماہ رجب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنا کر وادی قرئی کی طرف روانہ فرمایا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۸۵)

(۶) سریرۃ ام قرفہ: رمضان ۶ ہجری میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ام قرفہ کی طرف بھیجا گیا۔ (ام قرفہ ایک عورت کا نام ہے) ام قرفہ کا مسکن مدینہ طیبہ سے سات رات کی دوری پر وادی قرئی کے قریب تھا، معرکہ پیش آنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک تجارتی قافلہ لے کر ملک شام جا رہے تھے۔ اس قافلے میں صحابہ کرام کا خاصی مقدار میں سامان تجارت موجود تھا۔ جب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے قافلے کے ساتھ وادی قرئی کے پاس پہنچے تو بنو بدر کی شاخ قبیلہ فزارہ کے ایک غارت گر گروہ نے قافلے پر حملہ کر دیا، اہل قافلے کو مارا پیٹا اور سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ حضرت

زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ چھپتے چھپاتے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت میں ایک لشکر اس قبیلے کی بیخ کنی کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن میں چھپے رہتے اور رات کو چلتے، اس طور پر ایک دن صبح کے وقت ان غارت گروں پر جا ٹوٹے۔ ام قرفہ، اس کی بیٹی اور اس کے سوا کچھ لوگوں کو قیدی بنایا گیا۔ بعد میں ام قرفہ کو کفر کردار تک پہنچاتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ بعض دوسرے لوگوں کو بھی قتل کیا گیا۔ اس معرکہ سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس آئے تھے، حضور کے دولت کدے میں داخل ہونے کی اجازت چاہی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شوق جذبات میں صرف ستر عورت کیے، کم کپڑوں میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس دروازے پر آگئے، انہیں بغل گیر کیا اور چوم لیا پھر معرکہ کی کیفیت معلوم کی تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور کو فتح یابی کی پر مسرت نوید سنائی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۸۶)

(۷) سریہ بنو سلیم: ربیع الآخر سن ۶ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنو سلیم کی سرزنش کے لیے روانہ فرمایا۔ بنو سلیم مقام جموح میں سکونت پذیر تھے۔ مسلمانوں نے ایک عورت سے جس کا نام حلیمہ مزنہ تھا، پوچھنا چھ کی تو اس نے بنی سلیم کے تمام ٹھکانوں کا پتہ مسلمانوں کو بتا دیا۔ مسلمانوں کو یہاں بڑی تعداد میں اونٹ بکری اور قیدی حاصل ہوئے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۸۳)

زید بن محمد سے زید بن حارثہ: اعلان نبوت سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس وقت عربوں میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیتا تھا، تو لوگ اس کو اسی کی طرف منسوب کرتے تھے (جس نے اس کو اپنا بیٹا بنایا ہو) اور وہ اس شخص کی میراث کا وارث ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آیت کریمہ: ”أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ“ (الاحزاب، آیت: ۵) ”منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے“ نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ہم ان کو صرف زید بن محمد کہہ کر بلاتے تھے حتیٰ کہ قرآن کی آیت نازل ہوئی: ”أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ“

(بخاری شریف، حدیث نمبر: ۷۸۲، نعمۃ الباری، ج: ۸، ص: ۷۸، تبیان القرآن، ج: ۹، ص: ۷۶، ۷۷)

اوپر ذکر کردہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زید بن محمد کہا جانے لگا لیکن جب سورہ احزاب کی مذکورہ آیت نازل ہوگئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ بیٹے کو اس کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کر کے پکاریں تو پھر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حسب سابق زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

حضرت زید حضور کے محبوب نظر: کائنات کی ہر شے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتی ہے اسے اپنی محبت پر ناز ہے۔ آخر اسے یہ ناز کیوں نہ ہو جبکہ اس نے اس ذات سے پیما نہ وفا باندھ رکھا ہے جس سے خالق عالم محبت فرماتا ہے۔ لیکن اس نصیب کو کیا نام دیجیے گا جس کی قسمت میں رحمت عالم کا محبوب ہونا لکھا ہو۔ بیشک حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے خوش بخت ہیں جنہیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت کرتے ہیں اس کا قدرے اندازہ ان کے اس کارنامے سے کیجیے، جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنے والد، والدہ، چچا، گھر بار بلکہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس غیرت والے آقا نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی محبت فرمائی کہ تاریخ ہمیشہ اس محبت کو سلام کرتی رہے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے گھر کا ایک فرد بنالیا، اپنے بچوں میں حضرت

زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شامل فرمالیا، جب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر نہ ہوتے بلکہ کسی سفر یا کسی خاص مہم پر گئے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا اشتیاق بچپن کرتا، جب پلٹ کر آتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے آنے سے خوش ہوتے اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی ملاقات فرماتے کہ ایسی ملاقات کسی اور کا مقدر نہیں ہوتی۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے دیکھے ہوئے ایک واقعے کی منظر کشی کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشی کو بیان فرماتی ہیں، جو خوشی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات سے حاصل ہوئی تھی۔ فرماتی ہیں: زید بن حارثہ کسی سفر سے مدینہ طیبہ واپس آئے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دروازے پر دستک دی، جب حضور کو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آنے کی خبر ملی تو حضور فوراً دروازے کی طرف بڑھ چلے، اس وقت حضور کا جسم صرف ناف سے لے کر گھٹنوں تک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، باقی جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ حضور نے اسی حالت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گلے لگا لیا اور چوما۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: خدا کی قسم! میں نے اتنے کم کپڑوں کے ساتھ حضور کو اس سے پہلے نہ اس کے بعد کسی سے ملاقات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (صور من حیاة الصحابہ، ص: ۲۲۲، سنن الترمذی، حدیث: ۲۷۳۲، شرح معانی الآثار، ۶۹۰۵، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۵، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۲۲۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشفقانہ محبت صحابہ کرام کے درمیان خوب معروف تھی، اسی لیے صحابہ کرام حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ”حب الرسول“ کے مبارک لقب سے یاد فرماتے اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ کو ”حب الرسول وابن حب الرسول“ (حضور کے محبوب اور محبوب کے بیٹے) کہہ کر پکارتے تھے۔ (صور من حیاة الصحابہ، ص: ۲۲۲، رجال حول الرسول، ص: ۱۹۲)

حضور اور صحابہ کی محبت حضرت زید کی نسل سے: اللہ تعالیٰ جب کسی کو بزرگی اور عظمت عطا فرماتا ہے تو اس کا فائدہ اس عظیم ہستی کی آل و اولاد کو بھی میسر آتا ہے۔ رب تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے محبوب کی بارگاہ میں قرب خاص عطا فرمایا تھا اور محبوب کے دل میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت ڈال دی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے صحابہ میں سب سے زیادہ محبت فرماتے اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وجہ سے حضور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ سے بھی بہت محبت فرماتے، یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام بھی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل سے بڑی شدید محبت فرماتے تھے۔ ملاحظہ ہوں ہمارے دعوے سے متعلق چند دلائل:

زمانہ رسالت میں ایک معاملہ پیش آیا کہ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کرنے کی مرتکب ہو گئی، جس کو لے کر اہل قریش بڑے پریشان ہوئے اور وہ اس معاملے میں کسی کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عورت کی سفارش کرانا چاہتے تھے، تاکہ عورت سزا سے بچ جائے۔ ان لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ کس شخص کو حضور کی بارگاہ میں بھیجا جائے، حضور کی بارگاہ میں اس سلسلے میں کون بات کر سکتا ہے؟ اب ام المومنین حضرت عائشہ سے سنیے کہ وہ کون شخص تھا؟ جس پر اہل قریش کی نظر انتخاب جا کر رک گئی تھی اور انہوں نے اس ذات کو حضور سے بات کرنے کے لیے راضی کیا۔ آپ فرماتی ہیں:

قریش کو مخزومی عورت کے معاملے نے بہت پریشان کر رکھا تھا، پھر انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کی جرأت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سوا کون کر سکتا ہے، جو رسول اللہ کے لاڈلے ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت اسامہ نے اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی (چونکہ معاملہ حدود اللہ سے متعلق تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضور اس سلسلے میں کسی کی بات کو قبول کر لیتے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل میں جب کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو وہ اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور حال انسان چوری کرتا تو وہ اس کا

ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ اگر (بالفرض) فاطمہ (بھی) چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (بخاری کتاب فضائل الصحابہ باب ذکر اسامہ)

ہماری ذکر کردہ حدیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ بات لوگوں میں مشہور تھی کہ حضرت اسامہ حضور کے لاڈلے، چہیتے اور اتنے محبوب ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بھی معاملے میں سفارش کر سکتے ہیں۔

حضور کی ایک زانوں پر حسن دوسرے پر اسامہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ سے کتنی محبت فرماتے تھے؟ اس کا اندازہ آنے والی احادیث سے کیجیے۔ امام بخاری روایت فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسن کو اور حضرت اسامہ کو لیتے اور دعا کرتے ”اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت فرما“۔ (بخاری باب ذکر اسامہ، حدیث: ۳۷۳۵)

دوسری روایت ہے حضرت اسامہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک ران پر مجھے بٹھاتے اور دوسری ران پر حضرت امام حسن کو بٹھاتے پھر دونوں کو ملاتے اور دعا کرتے ”اے اللہ! میں ان دونوں پر شفقت کرتا ہوں تو ان پر رحمت نازل فرما“

(بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ)

امام ترمذی حدیث روایت فرماتے ہیں ”ام المؤمنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ کی ناک کی رطوبت (رینٹ) صاف کرنا چاہتے تھے کہ میں نے عرض کیا: حضور! آپ رہنے دیں یہ کام میں کیسے دیتی ہوں۔ اس پر حضور نے فرمایا: عائشہ اس سے محبت رکھو کیونکہ اسے میں محبوب رکھتا ہوں۔ (ترمذی، حدیث: ۳۸۱۸، باب المناقب اسامہ)

بیٹے سے زیادہ وظیفہ اسامہ کا: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے صحابہ کی محبت کی بہترین مثال آنے والا واقعہ ہے:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ کا وظیفہ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کے وظیفے سے زیادہ مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمر کے

صاحبزادے عبداللہ نے امیر المومنین کی بارگاہ میں عرض کیا: والد بزرگوار! آپ نے میرا وظیفہ حضرت اسامہ بن زید سے کس لیے کم مقرر فرمایا ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا ”میں نے اسامہ بن زید کا وظیفہ تم سے زیادہ اس لیے مقرر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مقابلے اسامہ سے زیادہ محبت کرتے تھے اور حضور کی نظر میں اسامہ کے باپ زید، تمہارے باپ عمر سے زیادہ محبوب تھے۔“

(تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۷، نعمة الباری ج: ۶، ص: ۸۴۲)

پوتے کو دیکھ کر گردن جھکالی: صحابہ کرام کے عشق رسول پر ہم سو جان سے قربان۔ حضور کی نسبتوں کا کیسا احترام فرماتے تھے؟ حضرت عبداللہ بن عمر کے آنے والے طرز عمل سے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بھینی بھینی خوشبو بھی میسر آئے گی اور ایک جلیل القدر صحابی کی زندگی میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے کا کیا مقام تھا؟ وہ بھی بخوبی سمجھا جاسکے گا۔ امام بخاری حضرت عبداللہ بن دینار سے روایت فرماتے ہیں: حضرت ابن عمر نے ایک دن ایک شخص کو مسجد میں دیکھا کہ وہ اپنا کپڑا ایک کونے میں پھیلا رہا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: دیکھو یہ کون شخص ہے؟ کاش! یہ میرے نزدیک ہوتا (تو میں اس کو نصیحت کرتا اور سمجھاتا) ایک شخص نے کہا: اے ابو عبد الرحمن (حضرت ابن عمر کی کنیت) کیا آپ اس کو نہیں پہچانتے؟ یہ محمد بن اسامہ ہیں۔ تب حضرت ابن عمر نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین کریدنے لگے، پھر کہا: اگر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ لیتے تو اس پر شفقت فرماتے۔ (بخاری کتاب فضائل الصحابہ باب ذکر اسامہ)

علامہ سعیدی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں حضرت ابن عمر نے کہا: اگر رسول اللہ دیکھ لیتے تو شفقت فرماتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو علم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ سے ان کے والد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ان کی اولاد سے محبت کرتے تھے۔

(نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۸۴۳)

حضرت زید کی پوتی اور عمر بن عبد العزیز: دور تابعین کی ایک مثال ملاحظہ

فرمائیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کس انداز میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی حضرت فاطمہ بنت اسامہ کی تعظیم فرمائی۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں: فاطمہ بنت اسامہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس تشریف لائیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور جس جگہ خود بیٹھے ہوئے تھے وہاں حضرت فاطمہ کو بٹھایا اور خود ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی نے اپنی جو بھی ضرورت امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز کے سامنے پیش کی، امیر المؤمنین نے اسے پورا فرما دیا، ان کی ایک حاجت بھی ایسی نہ رہی جسے پورا نہ فرمایا ہو۔

(تہذیب الاسماء واللغات، ج: ۱، ص: ۱۱۵، الشفا بعریف حقوق المصطفیٰ، ج: ۲، ص: ۱۱۱)

حضور اپنے ہتھیار حضرت زید کو عطا فرماتے: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی معرکے میں بنفہ نفس تشریف نہ لے جاتے تو اپنے ہتھیار آپ کسی اور صحابی کو عطا نہیں فرماتے تھے بلکہ حضور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ ہاں صحابہ کرام میں دو نام ایسے ہیں جن کو یہ شرف حاصل ہے، کہ اگر حضور غزوے میں تشریف نہ لے جاتے تو انہیں اپنے ہتھیار عطا فرماتے تھے۔ ان میں سے ایک امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ہیں اور دوسرے خوش نصیب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۰)

کمال قرب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا کمال قرب عطا فرمایا تھا، بایں وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مختلف انداز میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نوازشات کی بارشیں فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی جبکہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں دو شخصوں نے ہدیہ پیش کیا، ایک تحفہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قبول فرما لیا اور دوسرا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرما دیا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۰)

فضائل: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے محبوب نظر صحابی اور آزاد کردہ

تھے۔ صحابہ کرام ان کو حب الرسول اور ان کے بیٹے اسامہ کو ابن حب الرسول کہہ کر پکارتے۔ صحابہ کرام میں یہ شرافت و کرامت صرف حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصے میں آئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کا نام ذکر فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بڑی فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ ایک زمانے تک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوتے رہے، جب تک آیت کریمہ ”ادْعُوهُمْ لِأَسْمَائِهِمْ“ نازل نہ ہوئی، اس وقت تک ان کو زید بن محمد کہہ کر ہی پکارا جاتا رہا۔ آیت کریمہ کے نزول کے بعد انہیں دوبارہ زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ جیسے کہ اول امر میں انہیں زید بن حارثہ ہی کہا جاتا تھا، چوں کہ ابن محمد کی نسبت قرآن کریم کے حکم کے ذریعے ان کے نام سے ہٹا دی گئی۔ یہ نسبت اپنے آپ میں بڑی عظیم الشان تھی، اس کی تلافی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام صراحت کے ساتھ قرآن کریم میں ذکر فرمادیا، تاکہ ایک عظیم شرف ہاتھ سے جانے کے بعد دوسرا عظیم شرف ان کے ہاتھ آجائے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل میں مستقل باب قائم فرمایا ہے۔ ہم اس باب سے کچھ فضائل ذکر کر رہے ہیں:

حضرت زید امیر بنانے کے لائق ہیں: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے من جملہ فضائل سے یہ بات بھی ہے کہ آپ کی بعض خوبیوں کی شہادت زبان رسالت نے عطا فرمائی، چنانچہ امام بخاری حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی، اس کا امیر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے اسامہ کو بنایا۔ ان کے امیر بنائے جانے پر بعض لوگوں کو اعتراض ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تم اسامہ کے امیر بنائے جانے پر اعتراض کر رہے ہو تو اس سے پہلے تمہیں اس کے باپ زید کو امیر بنائے جانے پر بھی اعتراض تھا۔ خدا کی قسم! وہ (زید) امیر بنائے جانے کے لائق تھے اور وہ لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھے اور زید کے بعد اب مجھے اسامہ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

حضرت زید میرے بھائی ہیں: امام بخاری حضرت براء بن عازب سے روایت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انت اخونا ومولانا“ زید تم میرے بھائی اور میرے آزاد کردہ ہو۔ (بخاری کتاب المناقب باب مناقب زید)

دونوں احادیث سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام کا بارگاہ رسول میں اندازہ کیا جاسکتا ہے، حضور کی نظر وہ نظر جس سے عالم کی کوئی شے چھپی ہوئی نہیں۔ اس نظر میں وہ امیر بنائے جانے کے لائق تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کو بہت زیادہ محبوب تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کو ”احب الناس الی“ فرمایا، (میری نظر میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہے) حضرت زید کے بیٹے اسامہ بھی حضور کی نظر میں ویسے ہی محبوب تھے جیسے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کو محبوب تھے۔ اس میں بھی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ازراہ شفقت اپنا بھائی قرار دیا، اس جملے نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت میں مزید چار چاند لگا دیے ہیں۔

حضرت زید اللہ اور اس کے رسول کے انعام یافتہ ہیں:

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں قرآن کریم میں آیت کریمہ نازل ہوئی: ”وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتُ عَلَيْهِ“ اور اے محبوب! یاد کرو جب تم فرماتے تھے اس سے جسے اللہ نے نعمت دی اور تم نے اسے نعمت دی۔ (الاحزاب، آیت: ۳۶)

خليفة اعلیٰ حضرت صدر الافاضل فرماتے ہیں: اسلام کی (نعمت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی) جو بڑی جلیل نعمت ہے (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے) آزاد فرما کر (انعام فرمایا) مراد اس سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں کہ حضور نے انہیں آزاد کیا اور ان کی پرورش فرمائی۔ علامہ نعیم الدین مراد آبادی نے اس جگہ تحریر فرمایا ہے: بعض تفاسیر میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غلام کہا گیا ہے، مگر یہ خالی از تسامح نہیں کیونکہ وہ حر تھے، گرفتاری سے بالخصوص قبل بعثت شرعاً کوئی شخص مرقوق یعنی مملوک نہیں ہو جاتا اور وہ

زمانہ فترت کا تھا اور اہل فترت کو حربی نہیں کہا جاتا۔ (خزان العرفان، الاحزاب آیت: ۳۶-۳۷) حضور کا انعام دینا غنی فرمانا اور تقسیم فرمانا: جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا اس سے مراد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام کیا کہ اسلام لانے کی توفیق دی اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دل میں ڈالا کہ آپ ان کی اچھی تربیت کریں اور ان کو آزاد کر دیں اور ان کو اپنا قرب عطا کریں اور ان کو اپنا بیٹا بنالیں اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اس پر انعام کیا، اس سے مراد آپ کا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزاد کرنا ہے اور ان پر اس قدر شفقت فرمائی اور اس قدر حسن سلوک کیا کہ جب ان کے والد اور چچا ان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تو انہوں نے اپنے والد اور چچا کے ساتھ جانے پر آپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بھی منعم فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی منعم فرمایا ہے۔ اس طرح ایک اور آیت میں فرمایا: ”وَمَا تَقْضُوا إِلَّا أَنْ أَعْنَهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ“ اور ان (منفقوں) کو صرف یہ ناگوار ہوا کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ (التوبہ، آیت: ۷۴)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو غنی کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ اور حدیث صحیح میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وَأَنَا قَاسِمُ وَاللّٰهُ يَعْطِي“ اور میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرمانے والا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عطا سے انعام فرماتے ہیں اور غنی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز عطا فرماتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز کو تقسیم فرماتے ہیں۔ اس کائنات میں جس شخص کو جو نعمت بھی ملی ہے وہ آپ کے واسطے سے آپ کی تقسیم سے ملی ہے۔

(تبیان القرآن، ج: ۹، ص: ۴۵۶)

قرآن میں نام زید کی خصوصیت: علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے کسی صحابی کا نام ذکر فرمایا نہ کسی اور نبی کے کسی صحابی کا۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۵۳) علامہ ذہبی نے لکھا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا کسی صحابی کا نام ذکر نہیں فرمایا۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۲۲۰)

فرشتے حضرت زید کا نام لیتے ہیں: تفسیر صراط الجنان میں صاوی کے حوالے سے لکھا ہے: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ تمام صحابہ کرام میں صرف ان کا نام صراحت کے ساتھ قرآن کریم میں مذکور ہے، دنیا و آخرت میں قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے انسان اور فرشتے آیت میں ان کا نام پڑھتے رہیں گے۔

(صاوی، الاحزاب آیت: ۳۷، بحوالہ صراط الجنان)

حضرت زید کا نام قرآن میں کیوں ذکر ہوا: علامہ عبدالرحمن ثعالبی نے اپنی تفسیرال جواہر الحسان میں علامہ سہیلی کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے: جب آیت کریمہ ”أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ“ (لوگوں کو ان کے باپ کی طرف منسوب کر کے پکارو) نازل ہوئی، تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پروردگار کے حکم پر عمل کرتے ہوئے لوگوں سے کہا: میں زید بن حارثہ ہوں (اس سے پہلے آپ کو زید بن محمد کہا جاتا تھا، اب ان کے نام کے آگے سے ابن محمد ہونے کی نسبت جاتی رہی جس سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یقیناً وحشت و تکلیف ہوئی ہوگی)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وحشت کو اس طور پر دور فرمایا کہ ان کا نام قرآن کریم میں ذکر فرما کر ان کی ذات کو عظیم شرف عطا فرما دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فَلَمَّا قُضِيَ زَيْدٌ مِّنْهَا وَظَرًا“ جب زید نے اپنی حاجت پوری کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے نام کو عظمت کے ساتھ قرآن کریم میں ذکر فرما کر اس کے نام کو قرآن بنا دیا کہ اب مسجد کی محرابوں میں اس کے نام کی تلاوت کی جائے گی تو بیشک اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات کو غایت درجہ کی بلندی عطا فرمادی۔ لہذا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام قرآن کریم میں ذکر کرنا ان کی وحشت کو دور کرتے ہوئے انہیں ڈھارس بندھانا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہونے کا جو فخر ان سے جاتا رہا اس کا بدلہ دینا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

شرف کو سمجھنے کے لیے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پڑھیے۔ (یہ واقعہ بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے سامنے سورہ ”لَعَدَّ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا“ پڑھوں، تو حضرت ابی بن کعب عرض گزار ہوئے: کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟ حضور نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابی بن کعب خوشی سے رونے لگے، جب ذات باری کا کسی کے نام کو ذکر کرنا اتنا بڑا شرف ہے کہ انسان مارے خوشی کے رونے لگے تو ذرا غور کیجیے اس ذات کی شرافت و عظمت پر کہ جس کے نام کو اللہ تعالیٰ نے قرآن بنا دیا ہو، اب ہمیشہ ہمیش اس نام کی تلاوت ہوتی رہے گی، اہل دنیا جب تک دنیا میں ہیں اس کی تلاوت کرتے رہیں گے اور اہل جنت، جنت میں تلاوت کرتے رہیں گے۔

قرآن میں حضرت زید کے لیے جنت کی بشارت: علامہ عبدالرحمن مزید لکھتے ہیں: پھر آیت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کمال کرم کرتے ہوئے فرمایا گیا ”وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ“ اور جب آپ اس سے فرماتے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، اللہ تعالیٰ کے انعام فرمانے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایمان کی دولت عطا فرمائی، لہذا اللہ تعالیٰ کا انعام یافتہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جنتی ہیں۔ آیت کریمہ میں یہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دوسری فضیلت ہے اور یہ وہ فضیلت ہے جو انسانی آرزوؤں کا منتہی ہے۔ (ال جواہر الحسان فی تفسیر القرآن، الاحزاب: ۵، انارۃ الدجی فی مغازی خیر الوری، ج: ۱، ص: ۵۷۳، باب مناقب زید)

جو کچھ علامہ ثعلبی نے تفصیلاً بیان فرمایا ہے اس کو علامہ صاوی نے بھی اپنے تفسیری حاشیہ صاوی علی الجلالین میں اجمالاً بیان فرمایا ہے۔ (صاوی علی الجلالین، الاحزاب، آیت: ۳۷)

حضور کی محبت کے بارے میں حضرت علی و جعفر کا سوال: حضرت

اسامہ بن زید فرماتے ہیں: حضرت جعفر، حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایک موقع پر اکٹھا تھے کہ حضرت جعفر نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مقابلے میں مجھ سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا: حضور مجھ سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: حضور کو سب سے زیادہ محبت مجھ سے ہے۔ پھر سب نے کہا: چلو چل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے ہیں۔ حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت کاشانہ اقدس میں حاضر بارگاہ تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی، حضور نے فرمایا: دیکھو کون ہے؟ میں نے دیکھ کر جواب دیا: حضرت جعفر، حضرت علی اور حضرت زید باریابی کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ سب کو اجازت مل گئی اور یہ حضرات اندر داخل ہو گئے۔ سوال کیا: حضور! آپ سب سے زیادہ کس سے محبت کرتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے۔ ان حضرات نے عرض کیا: ہم مردوں سے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا: اے جعفر! تمہارا معاملہ یہ ہے؟ کہ تم جسم و جسمانیات اور عادت و اطوار میں میرے مشابہ ہو، تم مجھ سے ہو اور نسباً بھی تمہارا تعلق مجھ سے ہے اور اے علی! تم میرے داماد ہو، میرا نسب تم سے جاری ہوگا اور اے زید! تمہارا معاملہ یہ ہے کہ تم میرے آزاد کردہ ہو، تمہارا سارا معاملہ مجھ سے ہے، میری طرف ہے اور تم مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۲)

اس حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تینوں صحابہ کی دل جوئی فرمائی اور اپنی ذات سے ان کا تعلق، قرب اور ہر ایک کی خصوصیات بیان فرمائیں لیکن شدت محبت کی صراحت حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ فرمائی، یہ وہ فضیلت ہے جو انہیں تمام صحابہ میں ممتاز بناتی ہے۔

حضور کے اہل بیت کو مکہ سے لانے کی ذمہ داری: حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرما چکے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے اہل و عیال مکہ ہی میں موجود تھے۔ اب حضور صلی اللہ

علیہ وسلم انہیں اپنے پاس بلانا چاہتے تھے، اس عظیم کام کی ذمہ داری جن حضرات کو سونپی گئی ان میں ایک نام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی ہے۔ قارئین غور کر سکتے ہیں کہ یہ کتنی عظیم اور نازک ذمہ داری تھی۔ ظاہر ہے کہ اس امر عظیم کے لیے انہیں عظیم شخصیات کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جن کی دیانت، امانت، شجاعت اور ذہانت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل یقین اور اعتماد تھا۔ واہ رے نصیبہ زید کہ حضور نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس مہم پر بھیج کر آپ کی قابل قدر خوبیوں پر مہر لگا دی۔ اب آپ علامہ ابن سعد کا نقل کردہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

ام المومنین فرماتی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو حضور اپنی شہزادیوں کو اور ہم ازواج کو مکہ مکرمہ ہی میں چھوڑ گئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پاک میں سکونت اختیار فرمائی تو ہمیں مکہ مکرمہ سے مدینہ پاک لانے کے لیے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا۔ حضور نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضرت ابورافع کو بھی روانہ فرمایا تھا۔ حضور نے ان حضرات کو دو اونٹ اور پانچ سو دراہم لے کر بھیجا تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ درہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر دیے تھے۔ مال دینے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں حضرات واپسی میں ضرورت کے مطابق سواریاں خرید سکیں۔ حضرت ابوبکر نے عبد اللہ بن اریقظ کو بھی دو یا تین اونٹ دے کر ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر نے ایک خط اپنے بیٹے عبد اللہ کے نام لکھا تھا، جس میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبد اللہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اہل خانہ کو لے کر مدینہ طیبہ حاضر ہو جائیں۔ حضرت ابوبکر کے اہل خانہ میں میری والدہ ام رومان، میں خود اور میری بہن جو حضرت زبیر کی زوجہ تھیں یہ سب لوگ شامل تھے۔ حضور اور حضرت ابوبکر کے فرستادہ تمام افراد ساتھ میں روانہ ہوئے، مقام قدید پر پہنچ کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مزید تین اونٹ خریدے پھر سب لوگ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ حضرت طلحہ بن عبید اللہ کو بھی لے لیا، جو آل ابی بکر کے ساتھ ہجرت کا ارادہ رکھتے

تھے۔ حضرت زید اور حضرت ابورافع نے حضرت فاطمہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم (ام المؤمنین) کی خدمت کی ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی، حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زوجہ ام ایمن اور اپنے بیٹے حضرت اسامہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ میرے بھائی عبداللہ کے ساتھ والدہ ام رومان اور ہم دونوں بہنیں روانہ ہوئیں۔ چنانچہ ہم مدینہ طیبہ پہنچ گئے، مدینہ طیبہ میں حضرت ابوبکر کے اہل و عیال حضرت ابوبکر کے ساتھ اقامت پذیر ہوئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسجد نبوی اور اس کے گرد حجرات کی تعمیر کا کام چل رہا تھا۔ لہذا حضور کے اہل بیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد شریف کے حجروں میں مقیم ہوئے، میں کچھ دن تک اپنے والد محترم کے ساتھ رہی، پھر والد محترم نے میری رخصتی کی درخواست حضور کی بارگاہ میں پیش کی۔ حضور ابھی تک مہر کی عدم ادائیگی کی وجہ سے رخصتی روکے ہوئے تھے۔ میرے والد نے مہر ادا کرنے کے لیے چاندی بارگاہ رسالت میں پیش کی، حضور نے وہ چاندی بطور مہر میرے پاس بھجوا دی اور میں بھی رخصت ہو کر اپنے اسی حجرے میں چلی گئی جس میں مسلسل رہتی رہی اور اسی حجرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۱۰، ص: ۶۳، امتاع الاسماء، ج: ۱، ص: ۶۹،

عمدة القاری، ج: ۷، ص: ۳۳، نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، ج: ۱، ص: ۸۱، تاریخ طبری، ج: ۱۱، ص: ۶۰۱)

حضور کی بارگاہ میں حضرت زید کا سیاسی قد و تدبیر: آپ غزوات کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متعدد معرکوں میں امیر بنا کر بھیجا۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق جس معرکے میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا جاتا تھا تو انہیں امیر بنا کر بھیجا جاتا۔ جنگ موتہ کے موقع پر جبکہ حضرت جعفر بھی لشکر میں شامل تھے، آپ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کو امیر منتخب فرمایا۔ حضرت جعفر عرض گزار ہوئے: حضور! مجھے یہ امید نہ تھی کہ آپ مجھ پر زید کو امیر بنائیں گے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جعفر چلے چلو تم نہیں جانتے کہ کس چیز میں بہتری ہے؟

اس کو ہم بالتفصیل حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعے میں بحوالہ ذکر کر چکے

ہیں۔ اب آنے والا بیان ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ کیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں زید کا سیاسی مقام کیا تھا اور وہ تدبر کی کس منزل پر فائز تھے؟ حضرت ام المومنین فرماتی ہیں: اگر حضور کے وصال کے وقت حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ باحیات ہوتے تو حضور ضرور ضرور حضرت زید ہی کو اپنا خلیفہ مقرر فرما دیتے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۶، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۳، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۵۳۳)

بڑے زید ہیں پیدائش میری پہلے: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی جو عمر میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑے تھے لیکن اپنے چھوٹے بھائی حضرت زید کا بڑا احترام کرتے، اگر حضرت جبلہ سے کوئی پوچھتا: آپ بڑے ہیں یا حضرت زید؟ تو بڑا ادبیانہ جواب دیتے ہوئے فرماتے: بڑے تو زید ہی ہیں البتہ میری پیدائش ان سے پہلے ہوئی ہے۔ حضرت جبلہ کو بھی بارگاہ رسالت میں حاضری کا موقع میسر آیا لیکن جبلہ حاضری دے کر واپس ہو گئے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح کا شانہ رسالت کی چوکھٹ پر پڑے نہ رہے بلکہ حاضری کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ جبلہ وطن واپسی سے متعلق اپنے فیصلے کو خطا سمجھتے تھے اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے بارگاہ رسالت کی حاضری کو لازم پکڑ لیا تھا ان کے فیصلے کو جبلہ خوب سراہتے تھے۔ خود بیان فرماتے ہیں:

میرے بھائی کا فیصلہ میرے فیصلے سے بہتر تھا: میں نے حضور کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے بھائی زید کو میرے ساتھ وطن بھیج دیجیے۔ حضور نے فرمایا: زید اپنے فیصلے کے لیے آزاد ہیں، اگر وہ جانا چاہیں تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: قسم خدا کی! میں ہرگز نہ جاؤں گا۔ یا رسول اللہ! میں آپ کو چھوڑ کر کبھی بھی کسی کے ساتھ نہیں جاسکتا۔ جبلہ کہتے ہیں: میرے بھائی زید کی رائے میری رائے سے بہتر تھی۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۲۲۳، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۵۳۶)

تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منہ کیا دیکھیں
کون نظروں پہ چڑھے دیکھ کے تلو تیرا

تیرے ٹکڑوں سے پلے غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال
جھڑ کیاں کھائیں کہاں چھوڑ کے صدقہ تیرا
(اعلیٰ حضرت)

حضرت زید کے والد اور بھائی صحابی تھے: علامہ ابن حجر عسقلانی نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد بزرگوار حضرت حارثہ اور بڑے بھائی حضرت جبکہ ذکر صحابہ کرام میں فرمایا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے بھائی حضرت جبکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت پر علامہ ابن حجر نے کسی قسم کا کوئی اعتراض ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ حضرت جبکہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث بھی ثابت فرمائی ہے۔ البتہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد حارثہ کے اسلام کو ثابت کرنے والی روایت کو علامہ ابن مندہ کے حوالے سے غریب قرار دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (الاصابہ، ج: ۱، ص: ۲۳۳-۳۱۱)

حضرت زید کا انفاق فی سبیل اللہ: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے سخی طبیعت اور راہ خدا میں خرچ کرنے والا دل عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنے کا جذبہ ان کی نس نس اور رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ آیت کریمہ ”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ“ (تم اس وقت تک ہر گز بھلائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رب کی بارگاہ میں عرض کیا: اے میرے پروردگار! تو خوب بہتر جانتا ہے، میرے مال میں کوئی بھی شے مجھے اس گھوڑے سے زیادہ پسند نہیں ہے۔ یہ عرض کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں گھوڑا صدقہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، گھوڑا اتنا پیارا تھا کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے سے محبت کرتے تھے اور گھوڑا بھی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کرتا تھا۔ گھوڑے کا نام ”سبل“ تھا، لیکن یہ محبت اللہ کی راہ میں صدقہ کرنے سے آڑے نہیں آئی، گھوڑا لے جا کر منڈی میں کھڑا کر دیا اور حضور سے فروخت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے تاکہ گھوڑا بیچ کر

اس کی قیمت غرابو مساکین پر صدقہ کر سکیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑا بیچنے کی اجازت مرحمت نہ فرمائی۔

گھوڑا بیٹے کا ہوا صدقہ باپ کا: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: حضور! اس کو صدقہ فرمادیں۔ حضور نے گھوڑا لیا اور ان کے بیٹے حضرت اسامہ کو عطا فرمادیا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ! میں نے تو اسے صدقہ کرنے کی نیت کی ہے۔ (نہ کہ اپنے بیٹے کو دینے کی) اس پر حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: زید! (فکر نہ کرو) تمہارا صدقہ قبول کر لیا گیا ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۷، الاستذکار، ج: ۸، ص: ۶۰۰، شرح بخاری لابن بطل، ج: ۳، ص: ۴۸۳)

نماز کی برکت اور دعا کی قبولیت: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں خاص مقبولیت رکھتے تھے۔ بارگاہ رسالت میں مقبولیت کے کئی واقعات ہم ماقبل میں تحریر کر چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ جو رسول کی بارگاہ میں مقبول ہو جاتا ہے وہ خدا کی بارگاہ میں بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی بارگاہ کا قرب خاص عطا فرمایا تھا۔ آنے والے واقعے سے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مقبولیت کا پتہ چلے گا، نیز معلوم ہوگا کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیسے مستجاب الدعوات تھے۔

سعد فرماتے ہیں: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص سے سواری کا جانور کرائے پر لیا، سواری چلانے کی ذمہ داری مالک کی تھی، سواری والا طائف کا رہنے والا تھا۔ سواری کے مالک نے سواری کرائے پر دیتے وقت یہ شرط لگا دی تھی کہ مالک جہاں چاہے گا وہاں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سواری سے اترنا پڑے گا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شرط کو منظور کر لیا، سواری والے نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک ویرانے میں لے جا کر اتار دیا، یہ ایسا ویرانہ تھا کہ یہاں دیکھنے پر بہت سارے قتل کیے ہوئے لاشے یا ان کے ڈھانچے نظر آتے تھے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ سب اسی منافق

مالک کی کارستانیاں تھیں، اس نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی قتل کرنے کی تیاری کر لی۔ منافق حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ اس شخص نے کہا: تمہیں نماز پڑھنا ہے تو پڑھ لو، میری طرف سے اجازت ہے لیکن تم سے پہلے یہ سامنے پڑے لاشے بھی نماز پڑھ چکے ہیں، مگر ان کی نماز ان کو قتل ہونے سے نہ بچا سکی۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نماز پڑھ چکا تو وہ شخص مجھے قتل کرنے کے ارادے سے میرے پاس آیا، میں نے اپنے رب کو پکارا ”یا ارحم الراحمین“ پس ایک آواز آئی۔ اس کو قتل مت کرو۔ آواز سن کر وہ شخص ڈر گیا اور صاحب آواز کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ لہذا وہ شخص میرے پاس لوٹ آیا، میں نے پھر ”یا ارحم الراحمین“ پکارا، اسی طرح تین مرتبہ معاملہ پیش آیا۔ اب میں نے دیکھا کہ ایک گھڑ سوار نیزہ لیے ہوئے میرے سامنے کھڑا ہے اور اس کے سر پر آگ کا ایک شعلہ ہے، آنے والے نے نیزہ سواری کے مالک کی پیٹھ میں پیوست کر دیا، چنانچہ یہ شخص مردہ ہو کر تڑپنے لگا، پھر آنے والے نے کہا: جب تم نے پہلی مرتبہ ”یا ارحم الراحمین“ پکارا تھا، اس وقت میں ساتویں آسمان پر تھا اور جب تم نے دوسری مرتبہ پکارا تو میں آسمان دنیا پر تھا اور جب تم نے تیسری مرتبہ پکارا تو میں تمہارے پاس پہنچ گیا۔ (الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۲۴۲، الروض الانف، ج: ۶، ص: ۱۳۳، السیرۃ الخلیفہ، ج: ۳، ص: ۲۳۸، تاریخ الخلفاء، ج: ۱، ص: ۴۵۷، شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، ج: ۲، ص: ۴۹۱)

علامہ زرقانی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا فرستادہ تین مرتبہ ”یا ارحم الراحمین“ کہنے کے بعد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچا، اس طرح ظالم کو مہلت دی گئی کہ وہ صرف آواز کے ذریعے ہی ظلم کرنے سے باز آجائے اور قتل ہونے سے بچ جائے لیکن جب وہ آواز سے نہ مانا، اس نے اپنی حرکت کو تین مرتبہ تک مکرر کر دیا، اب اس کی سرکشی پورے طور پر ثابت ہو چکی تھی لہذا وہ مستحق قتل ہو گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا فرستادہ تیسری پکار تک ساتویں آسمان پر ٹھہرا نہیں رہا، حالانکہ وہ چاہتا تو ساتویں آسمان سے بھی تیسری پکار کے بعد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچ جاتا، اس میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت کا اہتمام ہے کہ پکارنے والا اللہ کی بارگاہ میں اتنا مکرم ہے کہ اس کی پکار فوراً مقبول کر لی گئی اور عالم اسباب میں ہلچل مچ گئی ہے۔

آنے والے کا اپنے بارے میں آنے کی کیفیات کی تفصیل بتانا، اس سے اس بات پر آگہی دینا ہے کہ جو ان مبارک الفاظ کے ساتھ بارگاہ رب العالمین میں استغاثہ کرتا ہے تو اس کی مدد کس طور پر کی جاتی ہے۔ لہذا بندوں کو اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اور اپنے رب سے ”یا ارحم الراحمین“ کہہ کر فریاد کرنا چاہیے۔ (شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ ج: ۲، ص: ۴۹۱)

حضور کی ملاقات حضرت زید کی حور سے: اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر جنتی کے لیے جنت میں ایسی حوریں تیار کر رکھیں ہیں جن کے حسن و جمال کا کما حقہ بیان انسانی طاقت سے م اور ی ہے۔ ان حوروں کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے اور احادیث طیبہ میں بھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ادنیٰ درجے کے جنتی کے لیے اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی۔ (ترمذی، حدیث: ۲۵۶۲، شرح سنن للبخاری، حدیث: ۴۳۸۱، صحیح ابن

حبان، حدیث: ۷۴۰۱، مسند احمد، حدیث: ۱۱۷۲۳)

یہ حال ادنیٰ جنتی کا ہے، پھر اعلیٰ جنتی کا حال کیا ہوگا؟ یہ تو اللہ تعالیٰ جانے اور اس کے دیے ہوئے علم سے اللہ تعالیٰ کے محبوب جانیں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان و عظمت یہ ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصے میں آنے والی ایک جنتی دوشیزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی گئی جو بڑی ہی حسین و جمیل تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جب میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے ایک بہت حسین دوشیزہ کو دیکھا، میں نے اس سے پوچھا: تجھے کس کے لیے بنایا گیا ہے؟ تو اس نے عرض کیا: میں زید بن حارثہ کے لیے ہوں۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۷۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پاک سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

نمایاں شان معلوم ہوتی ہے۔

شرف اہل بیت: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں شامل ہونا کتنا عظیم شرف ہے اس کو آنے والی حدیث پاک میں ملاحظہ فرمائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے جعفر کے درجے کو زید کے درجے سے بلند پایا، میں نے کہا: میرا یہ گمان نہ تھا کہ زید کا درجہ جعفر کے درجے سے کم ہوگا۔ فوراً بارگاہ رسالت میں حضرت جبرائیل حاضر آئے اور عرض کیا: واقعی زید اپنی فضیلت میں جعفر سے کم نہیں لیکن جعفر کے درجے کو آپ کی قرابت کی وجہ سے بلند کر دیا گیا ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۹، المستدرک للحاکم، حدیث: ۴۹۳۸، الخصائص الکبریٰ، ج: ۱، ص: ۴۳۸، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۳۵)

ازواج و اولاد: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے الگ الگ اوقات میں پانچ شادیاں کیں۔ بعض ہجرت سے قبل اور بعض بعد میں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا۔ آپ کے یہاں دو بیٹے ایک اسامہ بن زید دوسرے زید بن زید اور ایک بیٹی رقیہ پیدا ہوئی۔ زید اور رقیہ کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا، اسامہ کو اللہ تعالیٰ نے شرف صحابیت بخشا اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد ایک زمانے تک زندہ رکھا۔

اب آپ تفصیل ملاحظہ فرمائیں!

پہلی زوجہ: آپ کی پہلی زوجہ کا نام ”حضرت ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا“ ہے۔ حضرت ام ایمن جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ تھیں، جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کرنے کی سعادت حاصل ہے۔

قارئین غور فرمائیں! حضرت ام ایمن ان عورتوں میں شامل ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش فرمائی۔ پرورش کی خدمت انجام دینا تبھی ممکن ہے کہ حضور کے بچپن کے زمانے میں حضرت ام ایمن خاصی باشعور رہی ہوں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظاہری عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سال چھوٹے تھے بلکہ بعض روایات کے

اعتبار سے بیس سال چھوٹے تھے۔ اب آپ اندازہ فرمائیں کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر ام ایمن کی عمر سے کتنی کم رہی ہوگی۔ مذکورہ تفصیل سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ جب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ام ایمن بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو چکیں تھیں، چونکہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ایمن کو بہت محبوب رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا ہے: ”جو ام ایمن سے نکاح کرے گا وہ جنت پائے گا“ لہذا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کی خوشی اور جنت کی بشارت حاصل کرنے کے لیے ایک معمر خاتون سے نکاح کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۳)

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح ام ایمن کے ساتھ کر دیا۔ ام ایمن کے بطن سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے اسامہ پیدا ہوئے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۳)

حضور ام ایمن کی ملاقات کو تشریف لے جاتے: ام ایمن جن کا نام برکہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ اور خادمہ تھیں۔ یہ حضور کے والد محترم حضرت عبد اللہ کی کنیز تھیں جو حضور کو وراثت میں ملی تھیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد فرما دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، چنانچہ حضور ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ کبھی حضور ان کو ماں کہہ کر خطاب فرماتے اور فرماتے ”یہ میری دوسری ماں ہیں“ حضور کے بعد حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان سے ملاقات کرنے جایا کرتے، حضرت ام ایمن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خاص مقبولیت رکھتی تھیں۔ ایک سفر کے دوران انہیں شدت کی پیاس لگ گئی کہ جان پر بن آئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی خاص مدد فرمائی گئی اور سفید رسی سے بندھا ایک ڈول آسمان سے لٹک آیا، اسے پی کر حضرت ام ایمن نے اپنی پیاس بجھائی۔ اس جام نے ام ایمن کو ایسا سیراب

کر دیا کہ پھر بھی پیاس نے غلبہ نہ کیا۔ گرمی کے دنوں میں روزہ رکھ کر پیاس لگانے کی کوشش کرتیں تھیں لیکن پھر بھی پیاس محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن حضور نے فرمایا: جسے یہ پسند ہو کہ وہ جنتی عورت سے شادی کرے تو وہ ام ایمن سے شادی کر لے۔ یہ سن کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ام ایمن سے شادی کر لی۔ یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے ایک برتن میں رکھے حضور کے پیشاب کو پانی سمجھ کر پی لیا۔ جب حضور نے فرمایا: برتن میں جو پیشاب ہے اسے پھینک دینا تو انہوں نے عرض کیا: حضور! میں تو اسے پانی سمجھ کر پی چکی ہوں۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنستے ہوئے فرمایا: اے ام ایمن! آج کے بعد تمہارے پیٹ میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ایک روایت میں ہے حضور نے فرمایا: آگ سے تمہارا پیٹ محفوظ رہے گا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۴، ص: ۳۰۳، طبقات ابن سعد، ج: ۱۰، ص: ۲۱۳، کشف المشكل، ج: ۲، ص: ۲۲۴، المستدرک للحاکم، حدیث: ۶۹۱۲، التلخیص الحیبر، ج: ۱، ص: ۱۷۱)

اسامہ بن زید: اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں اور حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر میں برکت عطا فرمائی، آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت تک باحیات رہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی تحریر فرماتے ہیں: حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت اسامہ بن زید بن شراحیل بن عبد العزیٰ ان کا پورا نام ہے۔ ان کو محبوب ابن الحبوب کہا جاتا تھا، کیونکہ یہ دونوں باپ بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھے۔ ان کی کنیت ابو محمد اور ابو زید ہے، ان کی والدہ حضرت ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پالنے والی تھیں۔ امام ابن سعد نے کہا ہے کہ حضرت اسامہ زمانہ اسلام میں پیدا ہوئے اور جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شام پر حملہ کرنے والے عظیم لشکر کا امیر بنایا، لشکر کے روانہ ہونے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے اس لشکر کو روانہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی بہت تعظیم اور تکریم کرتے تھے اور اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے زیادہ ان کو وظیفہ عطا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت اسامہ فتنوں سے الگ رہے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے اواخر میں فوت ہوئے۔ حافظ ابن عبد البر نے کہا ہے: وہ پینتالیس ہجری میں فوت ہوئے تھے۔ (نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۸۴۲)

دوسری زوجہ: آپ کی دوسری بیوی کا نام ”حضرت زینب بنت جحش“ ہے۔ زینب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن ہوتی ہیں، جو بعد میں حضور کے نکاح میں آکر ام المؤمنین کے منصب پر فائز ہوئیں۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ دونوں شادیاں مکہ مکرمہ میں ہوئیں۔ ابھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابورافع کو مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ اپنے اہل بیت کو لینے کے لیے روانہ کیا تھا، مکہ پہنچ کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور کے اہل بیت کو لیا اور اپنی زوجہ ام ایمن، بیٹے اسامہ کو لیا۔ پھر سب کو ایک ساتھ لے کر حضور کی بارگاہ میں مدینہ طیبہ حاضر ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ام ایمن کے ساتھ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح مکہ مکرمہ میں ہو چکا تھا۔

رہی یہ بات کہ حضرت زینب کا نکاح بھی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ہوا تھا، اس کے لیے آنے والا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ غلام رسول سعیدی سورہ احزاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

سورہ احزاب بالاتفاق مدنی ہے البتہ حسب ذیل آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی: ”وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا“ (آیت: ۳۶) جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر دیں تو اس کام کے متعلق کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہ آیت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضرت

زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کے متعلق نازل ہوئی۔ یہ نکاح مکہ مکرمہ میں ہوا تھا، اس لیے یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور سورۃ الاحزاب کی باقی آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔ (تبیان القرآن، ج: ۹، ص: ۳۵۰)

حضور نے حضرت زید کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن سے کرادیا: حضور
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مکمل سرپرستی فرماتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک موقع پر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب سے کرانا چاہا، لہذا آپ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیغام نکاح حضرت زینب اور ان کے اہل خانہ کے پاس بھیجا، حضرت زینب اور ان کے بھائی کو یہ رشتہ پسند نہ تھا اس لیے انہوں نے اس پیغام کو منظور نہ کیا۔ حضرت زینب اور ان کے بھائی کے انکار پر آیت کریمہ نازل ہوئی، جس کے ذریعے حضرت زینب اور ان کے بھائی کی تربیت کی گئی، چنانچہ پیغام منظور ہوا اور نکاح کر دیا گیا۔

حضرت زید کے پیغام نکاح پر آیت کا نزول: مفسر قرآن صدر الافاضل
خلیفہ اعلیٰ حضرت، حضرت علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی تحریر فرماتے ہیں: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کیا تھا، وہ حضور ہی کی خدمت میں رہتے تھے، حضور نے زینب کے لیے ان کا پیغام دیا، اس کو زینب اور ان کے بھائی نے منظور نہیں کیا۔ اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی: ”وَمَا كَانَ لِهِمْ مِنْ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلًّا مُبِينًا“ جب اللہ و رسول کچھ حکم فرمادیں تو کسی مسلمان مرد عورت کو اپنے معاملے کا کچھ اختیار باقی نہیں رہتا اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا وہ بے شک صریح گمراہی بہکا۔ (الاحزاب، آیت: ۳۶)

حضرت زینب اور ان کے بھائی اس حکم کو سن کر راضی ہو گئے اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا اور حضور نے انکا

مہر دس دینار، ساٹھ درہم، ایک جوڑا کپڑا، پچاس مد کھانا، تیس صاع کھجوریں دیں۔ (تفسیر خزائن العرفان، سورہ احزاب، آیت: ۳۶)

اس مضمون کو علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے ان کو نکاح کا پیغام دیا تھا اور فرمایا: میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارا زید بن حارثہ سے نکاح کر دوں کیوں کہ میں نے ان کو تمہارے لیے پسند کر لیا ہے۔ حضرت زینب بنت جحش نے اس کا انکار کیا اور کہا: یا رسول اللہ! لیکن میں اپنے لیے زید کو ناپسند کرتی ہوں۔ میں اپنی قوم کی بے نکاح عورت ہوں اور آپ کی پھوپھی کی بیٹی ہوں، سو میں اس نکاح کے لیے تیار نہیں ہوں۔ دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: میں خاندانی شرافت کے لحاظ سے زید سے افضل ہوں اور ان کے بھائی عبد اللہ نے بھی ان کی موافقت کی، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ دونوں اس نکاح پر راضی ہو گئے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کر دیا اور ان کے مہر میں دس دینار، ساٹھ درہم، ایک دوپٹہ، ایک قمیص، ایک چادر، ایک لحاف، ۲۵ کلوگرام طعام اور ایک سو بیس کلوگرام کھجوریں مقرر فرمائیں۔ (جامع البیان، ج: ۲۲، ص: ۱۷، الکشف و البیان، ج: ۸، ص: ۴۷، روح المعانی، ج: ۲۲، ص: ۳۴، احکام القرآن، ج: ۳، ص: ۵۷۴، بحوالہ تبیان القرآن، ج: ۹، ص: ۴۵۲)

زینب کی طلاق اور ام المؤمنین بننے کی تفصیلات: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا مزاج کی تیز تھیں اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلے میں اپنے نسب اور اپنے خاندان کو برتر

خیال کرتی تھیں۔ حضرت زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر ان کی شکایت کرتے تھے کہ ان کی زبان بہت سخت ہے اس لیے میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرماتے تھے: تم اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں رہنے دو اور اللہ سے ڈرو اور ان کی زبان کی تیزی اور تندگی کی وجہ سے ان کو طلاق مت دو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے مطلع فرمادیا تھا کہ بالآخر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت زینب کو طلاق دے دیں گے اور ان کی عدت گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت زینب کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دے گا۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ خوف اور خدشہ تھا کہ پھر کفار اور منافقین آپ پر یہ اعتراض کریں گے کہ پہلے آپ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا بیٹا بنایا پھر اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، حالانکہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ ان اعتراضات کے خدشہ کی وجہ سے آپ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرماتے تھے کہ تم زینب کو طلاق مت دو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور آپ اپنے دل میں اس بات کو چھپا رہے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ کو لوگوں کے طعنوں کا اندیشہ تھا اور اللہ آپ کے خوف کا زیادہ مستحق ہے۔ (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے کسی آیت کو چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپا لیتے) (صحیح البخاری، حدیث: ۴۸۸۵، صحیح المسلم، حدیث: ۱۷۷۷)

اس کے بعد فرمایا: (قرآن میں) جب زید نے (اس کو طلاق دے کر) اپنی غرض پوری کر لی اور طلاق دینے کے بعد زید کے دل میں ان کی طرف سے کوئی میلان اور رغبت نہ رہی اور نہ ان کے فراق سے ان کے دل میں کوئی وحشت اور گھبراہٹ ہوئی، اس کے بعد فرمایا: تو ہم نے (عدت کے بعد) آپ کا اس سے نکاح کر دیا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: جب حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عدت پوری ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم زینب کے پاس جاؤ اور ان سے میرا ذکر کرو۔ حضرت زید رضی اللہ

تعالیٰ عنہ ان کے پاس گئے، اس وقت وہ آٹا گوندھ رہی تھیں، وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے ان کو دیکھا تو میرے دل میں ان کی بہت عظمت اور ہیبت طاری ہو گئی اور میں ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی تاب نہیں لا رہا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر کیا تھا، میں ان کی طرف پیٹھ کر کے اپنی ایڑیوں کے اوپر کھڑا ہو گیا، میں نے کہا: اے زینب! تمہیں خوشخبری، مبارک ہو۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے، وہ تمہارا ذکر فرما رہے تھے۔ حضرت زینب نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔ پھر وہ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ چلی گئیں اور اسی وقت قرآن نازل ہو گیا۔ (یعنی یہ آیت: ”زَوِّجْنٰكَهَا“) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر اجازت کے ان کے پاس داخل ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولیمہ میں ہمیں روٹیاں اور گوشت کھلایا۔ (سنن نسائی، حدیث: ۳۲۵۱، مسند احمد، ج: ۳، ص: ۱۹۵، الطبقات الکبریٰ، ج: ۸، ص: ۱۰۴، المستدرک، ج: ۴، ص: ۲۳، اسد الغابہ، ج: ۷، ص: ۱۲۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سلسلے میں پردے کے حکم کی آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ولیمہ میں روٹیاں اور گوشت کھلایا اور حضرت زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواج کے سامنے فخر کرتی تھیں اور فرماتی تھیں: اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح آسمانوں میں کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے وہ دیگر ازواج سے فرماتی تھیں: ”تمہارا نکاح تمہارے گھر والوں نے کیا ہے اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے“۔ (صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۲۰، صحیح المسلم، حدیث: ۱۴۲۸، سنن ترمذی، حدیث: ۳۲۱۸، مسند احمد، حدیث: ۱۲۶۹۸)

علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں: اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے یہ چیز ہے کہ آپ کو یہ اجازت دی گئی کہ آپ بغیر مہر کے نکاح کر لیں تاکہ

آپ کی ازواج مطہرات خلوص سے آپ کا قصد کریں نہ کہ مہر کے عوض اور آپ سے تخفیف ہو اور ولی کی اجازت کے بغیر بھی آپ کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ اسی طرح سے آپ اپنے نکاح میں گواہوں کے حاضر ہونے سے بھی مستثنیٰ ہیں، اسی وجہ سے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا دیگر ازواج مطہرات سے فخر سے یہ کہتی تھیں کہ تمہارا نکاح تمہارے گھروالوں نے کیا ہے اور میرا نکاح اللہ عزوجل نے کیا ہے۔ (زاد المسیر، ج: ۶، ص: ۳۹۱)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تو اللہ تعالیٰ ان کے نکاح کا خود ولی ہو گیا اور اس لیے فرمایا: ہم نے آپ سے ان کا نکاح کر دیا۔

امام جعفر بن محمد نے اپنے آباء سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی کہ اس نے آپ کا نکاح حضرت زینب سے کر دیا تو آپ بغیر اجازت کے حضرت زینب کے پاس داخل ہو گئے، کسی عقد نکاح کی تجدید کی گئی نہ کوئی مہر مقرر کیا گیا اور نہ ان شرائط میں سے کوئی چیز تھی جو ہمارے نکاحوں میں ہوتی ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خصوصیات میں سے ہے جن میں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی وجہ سے حضرت زینب دیگر ازواج سے بطور فخر یہ کہتی تھیں کہ تمہارا نکاح تمہارے گھروالوں نے کیا ہے اور میرا نکاح آسمانوں پر اللہ عزوجل نے کیا ہے۔

علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ اور علامہ آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔ (روح البیان، ج: ۷، ص: ۲۱۵، روح المعانی، ج: ۲۲، ص: ۳۷)

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مختصر سوانح: حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

ذوالقعدہ پانچ ہجری میں غزوہ بنو قریظہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا تھا، نکاح کے وقت ان کی عمر پینتیس سال تھی۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان خواتین میں سے تھیں جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت کی

تھی، وہ بہت نیکی کرنے والی اور بکثرت صدقہ اور خیرات کرنے والی تھیں۔ ان کا پہلا نام برہ تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام تبدیل کر کے زینب رکھ دیا۔ ان کی کنیت ام الحکم تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: میں نے ان سے زیادہ نیکوکارہ، صادقہ، اللہ سے ڈرنے والی، صلہ رحم کرنے والی، خیرات کرنے والی اور امانت دار خاتون نہیں دیکھی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب منافقوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے میرے متعلق پوچھا اور ازواج مطہرات میں یہی میری ٹکڑی تھیں، ان کے تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتی ہوں۔ (صحیح البخاری، حدیث: ۴۱۴۱، صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۷۰، سنن ابی داؤد، حدیث: ۲۱۳۸، سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۹۷۰)

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ”تم میں سب سے پہلے مجھ سے وہ ملے گی جس کے ہاتھ سب سے زیادہ لمبے ہوں گے“ سو ہم ناپتے تھے کہ ہم میں سے کس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں تو حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کے ہاتھ سب سے لمبے تھے کیونکہ وہ بہت صدقہ اور خیرات کرتی تھیں۔ (آپ کی مراد لمبے ہاتھوں سے زیادہ سخاوت کرنا تھی اور ازواج نے اس سے یہ سمجھا کہ اس سے مراد جسمانی لمبائی ہے) (صحیح مسلم، رقم حدیث: ۲۴۵۲)

امام واقدی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت زینب ۲۰ ہجری کو فوت ہوئیں اور حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور ان کو بقیع میں دفن کیا گیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۳، ص: ۳۰۹)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ اور ایک روایت کے مطابق ان کی عمر تریپن سال تھی۔ (الاصابہ، ج: ۸، ص: ۱۵۵، بحوالہ تبیان القرآن، ج: ۹، ص: ۴۵۸۳۴۵۶)

تیسری زوجہ: آپ کی تیسری بیوی کا نام ”ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط“ ہے۔ جب ام کلثوم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ حاضر ہوئیں تو انہیں زبیر بن عوام، عبد الرحمن بن عوف، عمرو بن عاص اور زید بن حارثہ جیسے جلیل القدر صحابہ نے پیغام نکاح دیا، ام کلثوم نے اپنے ماں شریک بھائی حضرت عثمان بن عفان سے مشورہ کیا، حضرت عثمان نے ان سے فرمایا: تم اس بارے میں حضور سے دریافت کرو، جیسا حضور فرمائیں، اس پر عمل کرو۔ یہ حضور کی بارگاہ میں حاضر آئیں، حضور نے انہیں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیغام قبول کرتے ہوئے ان سے نکاح کر لیا۔ ان سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بیٹا زید بن زید اور ایک بیٹی رقیہ پیدا ہوئی، یہ دونوں بچے بچپن ہی میں انتقال فرما گئے، پھر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں بھی طلاق دے دی۔

چوتھی زوجہ: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چوتھی بیوی کا نام ”درہ بنت ابی لہب“ ہے۔ کچھ دن بعد آپ نے درہ کو بھی طلاق دے دی۔ پھر آپ نے پانچویں شادی فرمائی۔

پانچویں زوجہ: آپ کی پانچویں بیوی کا نام ہند بنت العوام ہے جو حضرت زبیر بن عوام کی بہن ہیں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۶۳، الاصابہ، ج: ۳، ص: ۵۳)

بدر کی فتح کی بشارت اور حضرت زید: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں جو جنگ بدر میں حضور کی معیت میں حاضر تھے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جنگ بدر کی ایک اور تاریخ وابستہ ہے، وہ یہ کہ جب جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح میں نصیب فرمائی تو اس فتح کی خوشخبری سنانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غازیان اسلام سے پہلے مدینہ طیبہ روانہ فرمایا۔

جب اس کی تفصیل ہم علامہ صالحی سے معلوم کرتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کو جنگ بدر کی خوشخبری سنانے کے لیے دو حضرات کو دیگر غازیان

اسلام سے پہلے روانہ فرمایا، ان میں ایک حضرت زید بن حارثہ اور دوسرے حضرت عبداللہ بن رواحہ تھے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ کے ان باشندوں کو فتح کی بشارت سنانا تھی جو نچلے حصے میں رہتے تھے، جبکہ بالائی حصے والوں کو بشارت دینے کی ذمہ داری حضرت عبداللہ بن رواحہ کو سونپی گئی تھی۔ یہ دونوں لوگ بروز اتوار دن چڑھے مدینہ منورہ پہنچے اور اپنے اپنے علاقے میں بشارت دینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ دونوں حضرات خوشی خوشی اہل مدینہ سے کہتے تھے: اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی پر خوشیاں مناؤ اور مشرکین کے قتل ہونے اور قید کیے جانے پر خوش ہو جاؤ، ربیعہ اور حجاج کے بیٹے مارے جا چکے ہیں، ابو جہل اور امیہ بن خلف وغیرہ سرداران قریش میدان بدر میں تہ تیغ ہوئے پڑے ہیں، حضرت عبداللہ بن رواحہ انصار کے گھر جا کر بشارت سناتے تھے، ان کے ساتھ بچوں کی بھیڑ چل رہی تھی، بچے زور زور سے کفار مکہ کے اتر حال کو بیان کر رہے تھے۔ اس دن حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اوٹنی قصواء یا عضباء پر سوار کر کے بھیجا تھا۔ جب مقام مصلیٰ پر پہنچ کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باواز بلند لوگوں کو بشارت سنائی اور عتبہ، شیبہ، ابو جہل اور ابوالخثری جیسے سرداروں کی ہلاکت کی خبر دی تو بعض لوگوں نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سچا نہ جانا بلکہ انہوں نے گمان کیا کہ زید شکست خوردہ میدان جنگ سے جان بچا کر مدینہ پہنچے ہیں۔ اسامہ فرماتے ہیں کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس دن بشارت لے کر مدینہ طیبہ تشریف لائے جب لوگ حضور کی شہزادی حضرت رقیہ کو دفن کر کے فارغ ہوئے تھے۔

ایک منافق نے حضرت ابولبابہ سے کہا: مسلمان میدان جنگ سے ایسے بھاگے ہیں کہ اب وہ کبھی جمع نہ ہو سکیں گے اور بڑے بڑے صحابہ قتل کیے جا چکے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ (معاذ اللہ) یہ دیکھوان کی اوٹنی ہے جسے زید لے کر بھاگ آیا ہے، زید اتنا دہشت زدہ ہے کہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ کیا کہہ رہا ہے، بے چارہ جیسے تیسے کسی طرح جان بچا کر بھاگ آیا ہے۔ معاذ اللہ

حضرت ابولبابہ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ عنقریب تیرا جھوٹا ہونا ظاہر فرما دے گا، اسی طرح کی کچھ باتیں یہود نے بھی مسلمانوں سے کہیں۔ حضرت اسامہ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: آپ جو بشارت سنارہے ہیں، کیا وہ واقعی سچی بشارت ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میرے بیٹے، خدا کی قسم! یہ بالکل سچی بشارت ہے۔ اسامہ کہتے ہیں: اب مجھے یقین ہو گیا اور میں نے اس منافق سے کہا: تم رسول اللہ کے بدگو ہو، ہم تمہیں عنقریب حضور کی بارگاہ میں پیش کریں گے پھر وہ تمہاری گردن اتار دیں گے، اس نے کہا: اسامہ! میں نے جیسا لوگوں کو کہتے ہوئے سنا وہ تمہیں بتا دیا۔ (میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے) پھر لوگوں نے اس بشارت کی تصدیق اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لی جب مسلمان کفار قیدیوں کو دبوچے ہوئے مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔ (سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۴، ص: ۵۸، البدایہ والنہایہ، ج: ۳، ص: ۷۱)

جنگ موتہ اور حضرت زید: موتہ سرزمین البلقاء کی ایک بستی ہے جو سرزمین شام کے قریب واقع ہے۔ یہ غزوہ جماد الاولیٰ آٹھ ہجری میں ہوا تھا، اور اس کے بعد رمضان میں مکمل فتح حاصل ہوئی تھی۔ (جنگ موتہ کا تفصیلی بیان حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت میں گزر چکا ہے اس لیے ہم یہاں اختصار کے ساتھ صرف انہی واقعات کو پیش کریں گے جو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت کے ساتھ وابستہ ہیں، تفصیل کے لیے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت کا مطالعہ کریں)

موتہ میں حضرت زید امیر لشکر: غزوہ موتہ کا سبب یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت الحارث بن عمیر الازدی کو اپنا مکتوب دے کر روم کے بادشاہ کی طرف روانہ کیا۔ پس شرحبیل بن عمر الغسانی نے حضور کے قاصد کو زنجیروں میں باندھ کر قتل کر دیا، ان کے سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی سفیر کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث کا بدلہ لینے کے لیے مسلمانوں کو طلب کیا اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس لشکر کا امیر بنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: اگر زید شہید ہو جائیں تو

جعفر امیر ہوں گے اور اگر وہ شہید ہو جائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کے لشکر کو یہ وصیت کر کے روانہ فرمایا کہ وہ حارث بن عمیر کے شہید ہونے والی جگہ پر پہنچیں، وہاں جو لوگ موجود ہوں انہیں اسلام کی دعوت پیش کریں اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں فبہ اور نہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر کے ان سے قتال کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کو وداع کرنے کے لیے ثنیۃ الوداع تک تشریف لائے اور دعاؤں کے ساتھ لشکر کو روانہ فرمایا۔

(التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ج: ۲۱، ص: ۴۱۷-۴۱۸، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۷، ص: ۶۷۷ مختصراً)

امام بخاری نے روایت فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: حضور نے غزوہ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر زید شہید ہو جائیں تو پھر جعفر امیر ہوں گے اور اگر جعفر شہید ہو جائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے۔ (بخاری، حدیث: ۴۲۶۱)

جنگ موتہ میں دشمن کی تعداد: کثیر مؤرخین کے بیان کے مطابق جنگ موتہ میں تین ہزار مجاہدین کے مقابل دشمن کے دو لاکھ سپاہی موجود تھے۔ (تاریخ ابن خلدون، ج: ۲، ص: ۴۵۶، البدایہ والنہایہ، ج: ۶، ص: ۴۶۱، عمدۃ القاری، ج: ۸، ص: ۹۵)

جنگ موتہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس سلسلے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے، ہماری نظر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یہ قول زیادہ رائج ہے دلائل حضرت جعفر کے تذکرے میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت زید کا جہاد اور حضور کا بیان: جنگ موتہ میں جب مسلمانوں کا مقابلہ رومی مشرکین سے ہوا، ملک شام کی سرحدوں کے قریب مقابلہ جاری ہے اور مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کے منبر سے حضور کا بیان جاری ہے، ادھر جوہر ہاتھ حضور ادھر اس کو بیان فرما رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ اور شام کے درمیان جتنے حجاب تھے وہ سب اٹھا دیے، حضور پچشم خود مجاہدین اسلام کو مصروف جہاد دیکھ رہے تھے اور مدینے والوں کو ہر پل کی تازہ خبر عطا فرما رہے

تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب جھنڈا زید بن حارثہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔

جنگ موتہ کے میدان میں شیطان کو حضرت زید کی لاکار: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: اس دوران زید کے پاس شیطان آگیا، شیطان نے زید کی نظر میں زندگی کو محبوب بنانے اور موت کو ناپسند کرنے کی کوشش کی اور دنیا کی محبت زید کے دل میں بسانے کے لیے کوشاں رہا۔ زید نے شیطان کو (منہ توڑ) جواب دیا اور فرمایا: تو اب ہماری نظر میں دنیا کو محبوب بنانے کے لیے سرگرداں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو مومنوں کے دلوں میں راسخ فرما دیا ہے۔ (اب تیرا مومنوں پر کوئی داؤں چلنے والا نہیں ہے)

شہادت، استغفار اور حضرت زید کا دوڑتے ہوئے جنت میں داخل ہونا:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان کو جواب دے کر زید آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے (إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ) (زید کی شہادت کے بعد حضور نے خود بھی زید کے لیے دعائے خیر فرمائی اور اپنے صحابہ سے بھی فرمایا: اپنے بھائی زید کے لیے استغفار کرو۔ ساتھ ہی حضور نے فرمایا: بے شک زید دوڑتے ہوئے جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۸)

حضور کے آخری جملے سے پتہ چلا کہ حضور کی نظر صرف ملک شام کی سرحدوں کو ہی نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ نگاہ مصطفیٰ جنت کا بھی احاطہ کیے ہوئے تھی۔ نگاہ مصطفیٰ کا کیا کہنا؟ امام اہلسنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

سر عرش پر ہے تری گزر دل فرش پر ہے تری نظر

ملکوت و ملک میں کوئی شے نہیں وہ جو تجھ پہ عیاں نہیں

حضور کے آخری جملے سے یہ بھی پتہ چلا کہ استغفار جنتیوں کے لیے بھی کی جاتی ہے (کیونکہ اس سے مراتب و درجات ترقی پاتے ہیں) ورنہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو جنت میں پہلے ہی دوڑتے ہوئے داخل ہو چکے ہیں کیونکہ حضور کے فرمان: ”استغفر والہ وقد دخل الجنة وهو يسعي“ کا مطلب ہے تم لوگ زید کے لیے استغفار کرو، اس حال

میں کہ زید دوڑتے ہوئے جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔

تاریخ شہادت اور عمر: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت بالاتفاق جنگ موتہ میں ہوئی اور جنگ موتہ جمادی الاولیٰ آٹھ ہجری میں لڑی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی شہادت جمادی الاولیٰ آٹھ ہجری میں ہوئی، بوقت شہادت آپ کی عمر شریف ۵۵ سال تھی۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۳۶۸، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۵۳، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۴)

حضرت زید کی شہادت پر حضور کا غم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شدید محبت فرماتے تھے بلکہ یہ بات متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ لہذا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فراق حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا شاق تھا، شہادت کے کئی دن بعد تک جب کسی وجہ سے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد تازہ ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چشمان کرم اشک بار ہو جاتیں۔ حضرت اسامہ بن زید فرماتے ہیں: ”میں اپنے والد کی شہادت کے بعد جب حضور کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو مجھے دیکھ کر حضور کی آنکھیں بہہ نکلیں“ دوسرے دن پھر بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: تمہیں (بے باپ کے) دیکھ کر جو قلق میں نے کل محسوس کیا تھا وہ آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔ پھر حضرت اسامہ کئی دن تک بارگاہ رسالت میں حاضر نہ ہوئے۔ کئی دن کے بعد حاضر خدمت ہوئے اور جیسے ہی حضور کے چہرے پر نظر پڑی آنکھیں برس پڑیں، تب حضور نے فرمایا: اسامہ جب تک تم نہیں آئے تھے تب تک نہیں آئے لیکن آج تم نے ہمارے غم کو پھر تازہ کر دیا ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۷۰)

یہ محبوب کا محبوب کے لیے اشتیاق ہے: حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی بارگاہ رسالت میں روتی ہوئی داخل ہوئیں، حضور نے بھی انہیں دیکھ کر گریہ فرمایا، یہاں تک کہ سسکیاں بندھ گئیں۔ حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا: حضور! یہ کیا ہے؟ تو حضور نے فرمایا: یہ جذبات محبت کی فراوانی کا ایک منظر ہے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۴، تاریخ دمشق، ج: ۱۹، ص: ۷۱)

یہ تھی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نورانی سیرت جسے کتابِ محبت کا نام دیا جانا ہی زیادہ موزوں ہے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آسمانِ محبت کا وہ درخشندہ آفتاب ہے جس کی ضیا پاشِ کرنوں کی چمک قیامت تک اہلِ محبت کے سینوں کو منور کرتی رہے گی، جن کی وفا شعاری، شوقِ جہاد، ذوقِ عبادت اور اندازِ شہادت تاریخ کے روئے روشن پر نقشِ کالجبر بن کر ثبت ہو چکا ہے، اسے لیلِ ونہار کی آمد و رفت دھندلا کر سکے گی نہ امتدادِ زمان کی رفتار مٹا سکے گی۔

محبتِ رسول کے کارنامے نے انہیں شہرتِ دوام بخشی، تو تنزیلِ الرحمن یعنی قرآن کریم کی آیتِ کریمہ نے ان کے نام کو بقائے ابدی عطا فرمادی۔ ان کی سیرت کا یہ پہلو ہر عام و خاص کے لیے درسِ عبرت ہے کہ رضائے رب کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ محبتِ رسول ہے۔

وہ اپنے ہو گئے تو رحمت پروردگار اپنی

حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹرِ اقبال نے کہا:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے صدقے ہم گناہ گاروں کو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں کی طرح محبتِ رسول سے ہمارے سینوں کو مزین فرما کر ہمیں بھی اپنا قربِ خاص عطا فرمائے۔

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود

ان کے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام

جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر

اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمِيدُهُ وَتُصَلِّيُّ وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مکہ میں مبعوث فرمایا، بے شمار فضائل و خصائص عطا فرمائے، انہیں خصائص میں سے ایک آپ کی جاذبیت بھی ہے، اس جاذبیت نے نہ جانے کتنوں کو کہاں کہاں سے کھینچ لیا۔ ان کی ذاتیں بدلیں، عادتیں بدلیں، خصلتیں بدلیں، خواہشات اور چاہتیں بدلیں، وہ دیکھیے ایک نوجوان جو حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس اور عمدہ پوشاک بھی ہے۔ خوشبو کا ایسا دلدادہ کہ بغیر خوشبو کے اس کی زندگی کا تصور مشکل ہے، چلتا ہے تو راہوں کو مہکا دیتا ہے بلکہ اپنی گزرگاہوں کو اپنی موجودگی پر دلیل بنا جاتا ہے، ناز و نعم کا پروردہ، ماں باپ کی آنکھ کا تارہ، گفتار کی مٹھاس، لطافت کلام اور ذوق سلیم سے آراستہ ہے، ایک دن ہادی عالم کی آغوش رحمت میں آگیا، اسلام لے آیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بہت بھایا، قرآن سکھایا، نازل شدہ دین کا عالم بنایا، یثرب کو مدینہ بنانے کا وقت قریب آگیا ہے، یہاں دین پھیلا نا ہے، یہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نمائندے اور اسلام کے مبلغ کی سخت ضرورت ہے اور یہ ضرورت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش ہو چکی ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر انتخاب اٹھی اور اس نوجوان کے چہرے پر جاتھی۔ یہ نوجوان ہجرت سے پہلے مدینہ میں فروکش ہوا، ایک سال بعد مسلمانوں کا ایک ج تھا لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، خدمت دین سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خوش کر دیا، جنگ بدر و احد میں اسلام کا علمبردار رہا، احد میں شہادت پائی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مبارک لاش کے قریب آئے، آیت کریمہ: **يَوْمَ الْمُؤْمِنِينَ رَجُلٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ** (سورہ احزاب: ۲۳)

تلاوت فرمائی۔ پھر نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں نے تم کو مکہ میں دیکھا تھا، تم سے زیا
دہ حسین اور خوش پوشاک کوئی جوان نہ تھا اور آج دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بال الجھے ہوئے
ہیں اور جسم پر صرف ایک چادر ہے، اللہ کا رسول گواہی دیتا ہے کہ تم لوگ قیامت کے دن اللہ
کے حضور گواہ بنو گے۔ جانتے ہیں یہ نوجوان کون ہے اس کو تاریخ اسلام، اسلام کے عظیم مبلغ
اور سپوت کے طور پر جانتی ہے اس کا مبارک نام مصعب بن عمیر ہے۔

نام و نسب: آپ کا نام مصعب بن عمیر ہے، پورا نسب نامہ اس طور پر ہے
مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد دار بن قصی بن کلاب بن مرہ قرشی عبد ری۔
ماں کا نام خناس بنت مالک بن المضر بن وہب بن عمرو بن حنظل بن عبد بن معص بن
عامر بن لوی ہے۔

کنیت و لقب: اکثر مؤرخین نے آپ کی کنیت ابو عبد اللہ بیان فرمائی ہے لیکن
امام ابن سعد نے طبقات میں آپ کی کنیت ابو محمد تحریر فرمائی ہے۔

(اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۵، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۷)

بعض مؤرخین نے دونوں (ابو عبد اللہ، ابو محمد) کنیتیں تحریر فرمائی ہیں، آپ کا لقب
مصعب الخیر تھا۔ (سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۱۲)

پیدائش: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش کو متعین طور
پر بتانا بہت دشوار ہے تاہم ایک موٹے اندازے کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت
مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش ۵۸۵ء کے آس پاس ہوئی وہ اس طور پر کہ حضرت
مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت جنگ احد میں ہوئی اور جنگ احد تین ہجری
۶۲۵ء میں لڑی گئی اور شہادت کے وقت حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر
شریف چالیس سال تھی اس سے ثابت ہوا کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی
پیدائش حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے تقریباً چودہ سال بعد ۵۸۵ء
میں ہوئی۔ (سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۱۱)

قبل اسلام: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نعمت میں پیدا ہوئے، ناز میں پلے اور شامیانہ دولت کے تلے پروان چڑھے، مکہ میں بہت کم نوجوان ہوں گے جو اس شان سے بڑھے پلے ہوں، حسن و جمال میں بھی قدرت نے انہیں یکتائے روزگار بنایا تھا۔ اس قدرتی حسن پر لباس کی نزاکت نے انہیں مزید حسین بنا دیا تھا۔ حسن اور لباس کی پھبن پر عطریات کا استعمال ان کے لیے وجہ شہرت بنا ہوا تھا۔ عرب کے اس غربت زدہ ماحول میں بھی وہ حضرمی جوتا، یمنی پوشاک اور عمیر کا عطر استعمال کرتے تھے اور یہ سب اس وجہ سے ممکن تھا کہ ان کے والدین کے پاس دولت کی کثرت بھی تھی اور جذبات محبت کی فراوانی بھی، وہ اپنے لاڈلے پر دولت کو پانی کی طرح بہانے میں خوشی محسوس کرتے تھے، اس نام پر وہ قطعاً کن جوس واقع نہیں ہوئے تھے، وہ اپنے لخت جگر کو بہتر سے بہتر کھلاتے اور اچھے سے اچھا پہناتے خاص کر ان کی والدہ ان سے شدید محبت کرتی تھی، کوئی رات ایسی نہ ہوتی جس میں وہ حیس (کھجور، گھی اور ستو سے تیار کیا گیا مخصوص کھانا) کا پیالہ ان کے سرہانے نہ رکھتی ہو۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بھی بیدار ہوتے اس سے جتنا کھانا چاہتے کھا لیتے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں قبل اسلام اور بعد اسلام دونوں حالتوں میں دیکھا تھا، کبھی کبھی رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی سابقہ حالت کو یاد کر کے فرمایا کرتے تھے: ”میں نے مکہ مکرمہ میں مصعب بن عمیر سے زیادہ خوبصورت، پروردہ نعمت اور جامہ زیب کسی اور جوان کو نہیں دیکھا“۔ (اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۶، المستدرک علی الصحیحین، ج: ۳، ص: ۲۲۱، الروض الالنف، ج: ۲، ص: ۲۵۱، سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۲۰، رجال حول الرسول، ص: ۲۳)

اسلام میں داخلہ: والدین کے سایہ عاطفت اور نعمتوں کے جوم کے درمیان حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کاروان زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں اور خوش گوار یوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر جمیل ان کے سامنے ہوا، یہ تذکرہ اسی محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تھا جسے مکہ والے ابتداء

صادق و امین کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آج بات ہو رہی ہے کہ وہ اپنے بارے میں کہنے لگے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مجھے بشیر و نذیر اور وحدہ لا شریک کی عبادت کا داعی بنا کر بھیجا ہے۔ اب یہ ذکر ایک مرتبہ یا ایک دن کی بات نہیں رہ گیا ہے بلکہ مکہ پر سورج اپنی نئی شعاعوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے یا مکہ سے اپنی رو پہلی کرنوں کو سمیٹ لیتا ہے تو یہ تبدیلی صرف اور صرف سورج کے مزاج و انداز میں آسمان دنیا پر واقع ہوتی ہے۔ رہے مکہ میں کیے جانے والے تذکرے تو ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، وہاں تو داعی اسلام ہی کے تذکرے بانداز سابق جاری و ساری تھے۔ یہ آوازیں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کانوں سے زیادہ ہی ٹکراتی تھیں اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان آوازوں کو ان سنا بھی نہیں کرتے تھے بلکہ پوری توجہ سے ایسی خبروں کو سماعت کرتے، ان کے سامنے تذکرہ زیادہ ہونے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لڑکپن کے زمانے میں ہی زینت مجالس بن چکے تھے، کم عمری کے باوجود حسن ظاہری اور عقل کی پختگی نے انہیں مقبول انام بنادیا تھا، ہر مجلس اور محفل اس بات کی خواہاں رہتی کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے حاضرین اس کی رونق بڑھائیں۔

ایک دن حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ملتی ہے کہ محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے جاں نثار مومنین کے ساتھ کوہ صفا کے نزدیک دار ارقم بن ابی ارقم میں منتقل ہو گئے ہیں تاکہ قریش کے ظلم و ستم اور ایذا رسانی سے کسی حد تک حفاظت ہو سکے کیوں کہ دار ارقم کفار کی آنکھوں سے ایک حد تک چھپا ہوا اور ان کی مجلسوں سے دور تھا، اس وقت مسلمانوں کی تعداد چالیس ہو چکی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دار ارقم میں اپنی قوم سے چھپ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت فرماتے، ایمان لائے نو آموزوں کو قرآن سکھاتے، آیات بینات پڑھ کر سناتے، ان کے نفوس کا تزکیہ فرماتے اور علم و حکمت سے اپنے صحابہ کی تربیت فرماتے۔ دار ارقم میں مسلمان جمع ہو کر اپنے اعمال اور عبادات بجالاتے اور جو کچھ احکام نازل ہوئے رہتے ان کو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سیکھ بھی لیتے اور ظلم و ستم

کے خوگروں سے محفوظ بھی رہتے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی اپنے قبیلے کے افراد کے درمیان گزر رہی تھی، ان کا قبیلہ بھی کوئی دودھ کا دھلا تو نہ تھا، عرب کی اندھی جہالت نے انہیں بھی بتوں کی پوجا، شراب خوری، جوا بازی اور رقص و سرور کی محفلوں کا دیوانہ بنا دیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اخلاق کی باخنگی، کردار کی پس ماندگی، نفوس کی بدتری و سماجی معاشی زبوں حالی میں بھی وہ کسی سے کم نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظاہری صفائی اور حسن صورت بخشا تھا اسی طرح ان کی طبیعت میں بھی پاکیزگی و نفاست کا مادہ ودیعت فرما دیا تھا، اسی خداداد طاقت و لطافت کے ذریعے وہ جلد ہی ان باطل رسومات، فرسودہ خیالات اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین حق کے درمیان تمیز کر پانے پر قادر ہوئے، انہوں نے سمجھ لیا کہ معاشرے میں موجودہ الحادی افکار عقل و فطرت کے قطعاً مخالف ہیں جبکہ اسلامی تعلیمات عقل سلیم اور فطرت انسانیہ کے عین موافق و مطابق ہیں۔

قدرت باری نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہنمائی فرمائی، حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی داعی کی دعوت کے بغیر ہی دار ارقم میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملنے جا پہنچے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے معمول کے مطابق اصحاب کی تعلیم و تربیت میں مشغول تھے، آفتاب رسالت سے نکلنے والی کرنیں اہل محفل کے جسم و جان، قلب و نظر کو یکساں منور کر رہی تھیں، مہبط وحی کے قلب نوری سے نکل کر لب و زبان کے راستے بہنے والی آیات قرآن و حکمت و بیان کا آبشار سامنے بیٹھنے والے غلاموں کو تمام آلودگیوں سے مصفیٰ و مزکی کر رہا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ دیکھا اور سنا تو آنکھیں خیرہ ہو گئیں، دل میں جذبات کا تلاطم موجیں مارنے لگا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک بڑے پیار سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر پھیرا، ہاتھ کا سینے سے مس ہونا تھا، تردد و یقین کے درمیان کا نپتا ہوا دل

ہمیشہ کے لیے سکون پا گیا اور دوسرے ہی لمحے میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہر ایمان کے بلند پایہ ملین بن چکے تھے، کلمہ پڑھ کر اسلام کے کبھی نہ ختم ہونے والے سایہ رحمت میں آچکے تھے۔ اس کم سنی میں بھی وہ ایمان و یقین و عزم مصمم کی ایسی دولت لازوال کے مالک بن گئے تھے جو زمانے کا رخ بدلنے کے لیے کافی تھی۔

(رجال حول الرسول، ص: ۲۴، سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۲۳)

علامہ ابن سعد لکھتے ہیں کہ جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت و دعوت کی خبر پہنچی تو آپ دار ارقم میں داخل ہوئے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصدیق کر کے ایمان لے آئے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۸)

پوشیدہ ملاقات: جس وقت حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے، یہ وقت کفار و مشرکین کی جانب سے بڑا ہی ظلم و زیادتی سے بھرا ہوا تھا، لہذا مصلحتاً صحابہ کو اپنے ایمان کو مخفی رکھنے کی اجازت تھی۔ ایمان کا ظاہر ہو جانا گویا ظلم کی چکی میں پس جانا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دیگر صحابہ کی طرح اپنے ایمان کو چھپائے رکھا کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ اب وہ ایسے دین کو قبول کر چکے ہیں جو ان کی قوم اور آبا و اجداد کے دین کے مخالف ہے، اگر ان کا راز کھلتا ہے تو انہیں بھی ان ساری دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑے گا جس سے دیگر صحابہ کرام گزر رہے ہیں اور وہ سب کچھ سہنا پڑے گا جو سابقین صحابہ برداشت کر رہے ہیں، لہذا کفار و مشرکین کی نظروں سے بچتے بچاتے، چھپتے چھپاتے، محبوب پروردگار پر نذرانہ دل لٹانے دار ارقم میں دن میں داخل ہوتے، صحابہ کرام کے ساتھ مل کر وحدہ لا شریک کی عبادت کرتے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے علم حاصل کرتے، نبوت کے چشمہ صافی سے فیضیاب ہوتے۔ اس ابتدائی دور اور پوشیدہ ملاقاتوں میں بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فیضان نبوی سے خوب مالا مال ہوئے، یہاں تک کہ وہ اپنے بہت سے ساتھیوں پر میدان علم میں سبقت لے گئے، اسی وجہ سے ضرورت پڑنے پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں مدینۃ المنورہ میں صحابہ کرام کی تعلیم

و تربیت پر مقرر فرما دیا، جس کا ذکر ان شاء اللہ آئندہ سطور میں آئے گا۔

(سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۲۴)

ماں کا خوف: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ خناس بنت مالک غیر معمولی طاقتور شخصیت کی مالک تھی، اس سے خوف ناک حد تک حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں ڈر بیٹھا ہوا تھا، ایک طرف پورے مکہ والوں کی مخالفت کا معاملہ ہوتا اور دوسری طرف ان کی ماں کی مخالفت کا، تو پورے مکہ کی مخالفت حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے اس سے آسان تھی کہ وہ اپنی ماں سے مخالفت مول لیں۔ یہی وہ اسباب تھے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایمان کو چھپائے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوشیدہ ملاقات کے سلسلے کو غنیمت جانا تھا۔ (رجال حول الرسول، ص: ۲۴)

راز راز نہ رہا: وہ ایک حکیمانہ تدبیر تھی جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختیار کی تھی کہ اسلام پر عمل بھی ہوتا رہے اور کفار مکہ کے مظالم سے امان بھی حاصل رہے لیکن مکہ میں یہ کب تک چل سکتا تھا کیوں کہ مکہ کا مزاج یہ بن چکا تھا کہ اس میں کوئی راز راز نہ رہے۔ ہر پوشیدہ معاملہ کو منصفہ شہود پر لایا جائے، خاص کر پیغمبر اسلام اور ان کے متبعین کے پیچھے تو اہل مکہ اپنا منصفی بلکہ مذہبی فریضہ سمجھ کر لگے ہوئے تھے، دار ارقم تک پہنچنے والی ہر راہ پر نگاہوں کے پہرے تھے اور اس راہ کے پہرے داروں میں ہر دن اضافہ ہو رہا تھا، پہرہ دینے کی کیفیت میں ہر گزرنے والی آن کے ساتھ شدت آتی جا رہی تھی۔ اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ راہوں پر منقوش ہونے والے نشان قدم سے راہی کی منزل کو متعین کیا جانے لگا تھا۔

جب معاملہ کی سنگینی اس حد تک بڑھ جائے تو پھر زمانے کی نگاہوں سے چھپ پانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بھی یہی ہوا، ایک دن چھپتے چھپاتے دیدار حبیب کے لیے دار ارقم میں داخل ہو رہے تھے کہ عثمان بن طلحہ

کی پردہ سوز منتظر نگاہوں نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھ لیا، اطمینان کامل ہونے کے لیے تھوڑا اور انتظار کیا، دوسری بار عثمان نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نماز جیسی نماز پڑھتے دیکھ لیا، اب کسی شک کی گنجائش نہ بچی تھی بلکہ یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ مصعب بن عمیر نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

(رجال حول الرسول، ص: ۲۵)

ماں کی حالت: عثمان نے وقت برباد کیے بغیر ہوا کی تیزی کی طرح حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر پہنچ کر اہل خانہ، خاص کر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ کو اس خبر سے مطلع کیا، ماں نے جب یہ خبر سنی بال کھولے ہوئے گھر سے باہر آ گئی اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے قسم کھائی کہ میں اس وقت تک نہ دوپٹہ اوڑھو گی، نہ سائے میں بیٹھوں گی، نہ تیل لگاؤں گی، نہ کھانا کھاؤں گی، نہ پانی پیوں گی جب تک کہ تو اس نئے دین کو ترک نہ کر دے۔

حضرت مصعب کی آزمائش: یہ سن کر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی، ابوعزیز بن عمیر نے کہا: اے میری ماں! مصعب کو میرے حوالے کر دو، ابھی یہ نرم و نازک نوجوان ہے، جب میں اسے بھوک کا مزہ چکھاؤں گا تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا اور نئے دین کو چھوڑ کر اپنے قدیم دین میں واپس آ جائے گا۔ ابوعزیز بن عمیر نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے قبضے میں لے کر گھر میں بند کر دیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دنیوی تمام تر سہولیات چھین لی گئیں تھیں، شہزادہ نعمت سے خوان نعمت سمیٹ لیا گیا تھا، پر تکلف زندگی سراپا عذاب بن گئی تھی، اب نہ وہ مخملی پوشاکیں تھیں، نہ بھڑکتی خوشبو، نہ زلف عنبری کی مہک تھی، نہ سرگیں آنکھوں کی چمک، نہ وہ ناز و انداز تھے، نہ ٹھاٹ باٹ، اب مسلسل عذاب تھے، مصیبتیں تھیں، گھر والوں کی ملامتیں تھیں اور قوم کے طعنے، یہ سب کچھ اسلام قبول کرنے کی سزا تھی۔ وہی ماں جسے اپنے بیٹے کے پیار کے سوا کوئی کام نہ تھا، سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے بیٹے کے خاطر داری ہی اس کا

بہترین مشغلہ تھا، جس کا سینہ بیٹے کی محبت کا خزینہ تھا، اب بالکل بدل گئی تھی۔ وہ نرم و نازک ماں اپنے بیٹے کے جسم نازنین کے لیے عذاب کی کدال بن گئی تھی۔ وہ بیٹے کو طرح طرح کے عذاب دینے میں ذرہ برابر تردد نہیں کرتی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محروم نعمت کرنے میں تھوڑا سا توقف نہیں کرتی، وہ خود تو جو کر سکتی تھی کرتی تھی، ساتھ ہی قوم کے بہیمانہ سلوک پر بھی مکمل مددگار تھی۔ وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑی ہو جاتی اور طویل وقت تک کھڑی رہتی یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی، اس کے بیٹے موت سے بچانے کے لیے وقتی تدابیر کر کے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آزمائش و ابتلاء کے سخت دور سے گزرتے رہے۔ جسمانی، روحانی، نفسانی اور دماغی سختیاں جھیلتے جھیلتے حالت دگر ہو گئی تھی، رنگ بدل گیا تھا، جسم کمزور ہو گیا، گوشت پوست کی ہیئت تبدیل ہو گئی تھی۔ (سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۲۵، الروض الانف، ج: ۲، ص: ۲۵۱)

حبشہ کی طرف ہجرت: جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام پر کیے جانے والے ظلم و ستم کے سلسلہ لا متناہی کو ملاحظہ فرمایا اور پھر یہ کہ مکہ میں اب کوئی بھی اس ظلم کے خلاف زبان کھولنے کو تیار نہیں ہے۔ ابوطالب جیسی با وزن اور مسلمانوں کی حامی شخصیت دنیا سے جا چکی ہے تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی اور فرمایا: حبشہ کی سرزمین پر ایسے بادشاہ کی حکومت ہے کہ اس کے سامنے کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا لہذا تم لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی اور کشادگی کے دروازے کھول دے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے اجازت مل جانے کے بعد بعض صحابہ کرام نے فتنے کے خوف سے بچنے کے لیے ہجرت کو اختیار فرمایا اور دوسرے بعض اپنے اسلام کو مخفی رکھتے ہوئے مکہ میں ٹھہرے رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی وقت مہاجرین کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی، اس سفر میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ان

کے بھائی منصور بن عمیر بھی تھے۔

اس سفر کی تفصیل حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ نے اس طور پر بیان کی ہے، فرماتی ہیں: جب ہجرت کرنے والے مسلمان پابرجا ہوئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: مصعب بن عمیر بھی تم لوگوں کے ساتھ ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن ان کی والدہ نے ان کو قید کر رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان سن کر مسلمان ٹھہر گئے اور ان کے انتظار میں رات کو اپنے دروازوں کو کھولے رکھا، رات کے وقت جب مکہ میں سناٹا پسر گیا اور ان کی ماں ان سے غافل ہو گئی تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے پاس آ گئے، پورا دن یہیں گزارا اور رات کو چپکے سے نکل کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سارے مہاجرین کا جمع ہونا طے پایا تھا، پھر سب لوگوں نے وہاں سے پیدل سفر کیا۔ لیلیٰ فرماتی ہیں: میں اپنے اونٹ پر سوار تھی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نازک اندام، نرم خرام انسان تھے، ان کے پاؤں دوسرے صحابہ کی طرح مضبوط نہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ ننگے پیر پیدل چلنے کی وجہ سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نازک قدموں سے خون بہ رہا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حالت جب صحابی رسول عامر بن ربیعہ نے دیکھی تو اپنے جوتے اتار کر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنا دیے۔ میں نے حضرت عامر کو دیکھا کہ وہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بے پناہ شفقتیں فرماتے تھے جیسے ایک والد اپنے بیٹے پر شفقت کرتا ہے (خیال رہے کہ حضرت عامر بن ربیعہ لیلیٰ بنت ابی حثمہ کے شوہر ہیں) پھر ہم کشتی کے ذریعے مقام مور پر پہنچے اور وہاں سے حبشہ پہنچ گئے۔ اس سفر میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس نہ کوئی درہم تھا اور نہ دینار، جب کہ ہمارے پاس پندرہ دینار موجود تھے۔ (الآحاد والثانی لابن ابی عاصم، ج: ۶، ص: ۲۳۷، سیرۃ الصحابی الجلیل، ص: ۲۹)

حضرت مصعب کی حبشہ سے واپسی: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ پہنچ گئے، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہاں

ٹھہرے رہے پھر کچھ مسلمان حبشہ سے پلٹ کر مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو یہ بھی پلٹنے والوں کے ساتھ واپس آ گئے، جیسا کہ حضرت عامر بن ربیعہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس دن سے ایمان لائے اس دن سے لے کر ان کی شہادت کے دن تک میری دوستی اور صحبت ان کے ساتھ قائم رہی، انہوں نے ہمارے ساتھ حبشہ کی طرف دو ہجرتیں کیں، میں نے ان سے زیادہ اچھے اخلاق کا انسان نہیں دیکھا اور نہ ہی ان سے کم اختلاف کرنے والا انسان دیکھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۹)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب حبشہ سے مکہ مکرمہ واپس آ گئے تو حالت اس قدر بدل گئی تھی کہ دیکھنے والوں کو ان کی حالت پر ترس آنے لگا تھا، پتھر دل ماں نے بھی جب اپنے نور نظر کی یہ حالت دیکھی تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ملامت کرنے سے باز آ گئی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۸)

حضرت مصعب بن عمیر کی حالت: ہجرت کے پہلے کی زندگی ہو یا ہجرت کے بعد حبشہ کی زندگی ہو یا پھر واپسی کے بعد کی زندگی ہو، ہر دور میں ہ جو مفکار اور مصائب کی یلغار نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چکنا چور کر کے رکھ دیا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حالت کس قدر بدل گئی تھی اور وہ کیا سے کیا ہو گئے تھے؟ اس کا اندازہ آنے والی حدیث سے کریں:

امام ترمذی حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں: حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد شریف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر بارگاہ ہو گئے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے جسم پر پیوند لگا ہوا کھال کا ایک کمبل تھا، جس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیکھا ان کے ماضی و حال کا موازنہ کرتے ہوئے سر کا ر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آنکھیں بھر آئیں، پھر سر کا ر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: وہ زمانہ کیسا ہوگا؟ جب تم صبح و شام جوڑے تبدیل کرو گے، طرح طرح کے

کھانے تمہارے سامنے پیش کیے جائیں گے (جنہیں تم کھاؤ گے) اور تم اپنے گھروں میں اس طور پر پردہ لگاؤ گے جیسے کہ خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ زمانہ ہمارے لیے بہتر ہوگا کیوں کہ ہم فکر معاش سے آزاد ہو کر عبادت میں لگے رہیں گے۔ اس پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: (بلکہ) تم آج اس زمانہ کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہو۔

(سنن الترمذی، کتاب ابواب صفۃ القلیۃ والرقائق والورع، حدیث نمبر: ۲۴۷۶)

دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے درمیان میں تشریف فرما تھے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے پاس حاضر ہوئے، حالت یہ تھی کہ ایک چادر کا ٹکڑا اوڑھے ہوئے جس میں تہ بتہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ صحابہ کرام نے جب یہ حالت دیکھی تو دلوں میں ترحم کے جذبات پیدا ہوئے لیکن مالی حالت کچھ کرنے کے لائق نہ تھی تو احساس ندامت سے گردنیں جھکا لیں، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر سلام کیا، رحمت عالمیاں نے جواب دیتے ہوئے دعاؤں سے نوازا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف کی، پھر فرمایا: الحمد للہ! اب تو پوری دنیا کو بدل جانا چاہیے، میں نے اس نوجوان کو اس حال میں دیکھا ہے کہ پورے مکہ میں کوئی جوان اس سے زیادہ پروردہ نعمت نہ تھا اور نہ کسی کے والدین اپنی اولاد کے اتنے نکھرے برداشت کرتے تھے جتنا ناز اس جوان کے والدین اٹھاتے تھے لیکن خیر کی طرف سبقت کرنے اور اللہ و رسول سے محبت کرنے میں آج اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۹)

حضرت سعد ابن ابی وقاص سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نعمت کے پروردہ، بہت ہی نازک اندام تھے، مکہ میں مسلمانوں نے سختیوں کا سامنا کیا تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ معاملہ بڑا گراں اور دشوار گزار تھا، ان کی کھال پھٹ کر اس طرح متفرق ہو گئی تھی کہ جیسے سانپ کی کھال ٹکڑے ٹکڑے دکھائی دیتی ہے، ان کے لیے راستہ چلنا مشکل تھا، کبھی کبھی ہم ان کو اپنے کاندھوں

پر سوار کر کے چلتے تھے۔ (سیر سلف الصالحین، ص: ۳۰۶، اسد الغابہ ج: ۵، ص: ۱۷۶، سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۲۷)

ان احادیث کریمہ سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آزمائش، تکلیف، صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کی جاں نثاری مصیبت کے وقت مسلم بھائی کے لیے ایثار و قربانی کے جذبات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

حضور سے اہل مدینہ کی طلب: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہ تھی کہ ہر سال ایام حج میں مختلف قبائل کے پاس جا کر ان کو اسلام کی دعوت دیا کرتے تھے۔ ۱۰ نبوی جب آپ اسی غرض سے اس عقبہ کے پاس پہنچے تو یہاں انصار کے قبیلہ خزرج کے چند اشخاص موجود ملے جو مکہ معظمہ اس غرض سے آئے تھے کہ قریش سے امداد باہمی کا معاہدہ کر کے ان کے حلیف بن جائیں۔ انہیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی، ان لوگوں نے مدینہ کے یہود سے نبی آخر الزماں کی آمد آمد کی خبر سن رکھی تھی، اسلام کی دعوت سن کر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہا کہ یہ وہی نبی ہیں، کہیں یہود ایمان لانے میں تم پر سبقت نہ کر جائیں اور کہا: ہم جس کے لیے آئے ہیں اس سے یہ بہتر ہے۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ حضرات تھے: ابوالہیشم بن تہبان، اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک بن حارث، جنگ احد میں شہید ہوئے۔ قطبہ بن عامر جنگ یمامہ میں شہید ہوئے، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ مدینہ طیبہ واپس گئے اور آئندہ سال پھر آنے کا وعدہ کر گئے، مدینہ پہنچ کر اسلام کی تبلیغ کی۔ جس سے متعدد سعادت مندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حسب وعدہ دوسرے سال بارہ حضرات مدینہ سے آئے ان میں حضرت عبادہ بن صامت بھی تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔

حضرت مصعب بن عمیر کی مدینہ روانگی: ان لوگوں نے درخواست کی کہ مدینہ کے نو مسلموں کو دین سکھانے اور تبلیغ کے لیے کوئی صاحب ہمارے ساتھ کر دیے

جائیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سیدنا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ کر دیا۔ (نزہۃ القاری، ج: ۱، ص: ۲۶۸)

قارئین! غور فرمائیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے موجودہ وقت کی سب سے بڑی مہم پر بھیجنے کے لیے جس ذات کا انتخاب کیا وہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ انہیں اسلام کا سفیر بنا کر مدینۃ المنورہ بھیجا جا رہا ہے، وہاں جا کر ایمان لا چکے افراد کو دین سکھانا ہے، انہیں علم و حکمت کے پرامن حصار میں آباد کرنا ہے اور مدینۃ منورہ کے غیر مسلموں کو دائرۃ ایمان میں لانے کی کوشش کرنا ہے اور یہ کہ مدینۃ منورہ کو دار ہجرت کے طور پر تیار کرنا ہے۔ یاد رہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ تجربہ کار، عمر میں بڑے، جاہ و عزت میں مقدم اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نسبتاً بھی زیادہ قریب ہیں، اس سب کے باوجود رحمت عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کارِ عظیم کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کا انتخاب فرمایا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وقت کے خطرناک ترین مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا، پیچیدہ سے پیچیدہ قضایا کو حل بھی کرنا پڑے گا، یہ شہر پاک جو عنقریب دارالہجرت بن کر مرجع خلأق بنے گا۔ دینی دعوت اور مبلغین کی جولان گاہ اور غازیان ملت و فاتحین اسلام کی قیام گاہ بنے گا۔ ان اعلیٰ اغراض کے پیش نظر اس کی تہذیب و تمدن کو معیاری بنانا بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقاصد میں شامل ہے۔ اس سب کے باوجود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس عظیم مہم کے لیے منتخب فرمانا، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کردار کی برتری، عقل کی پختگی، دعوت و تبلیغ کی سنجیدگی اور عزائم کی بلندی کی اعلیٰ دلیل ہے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۲۷)

مدینۃ منورہ میں سب سے پہلے کون؟: عیون الاثر کے مصنف ابن سید الناس تحریر فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینۃ منورہ کے مسلمانوں کی تعلیم کے

لیے اور جو اسلام نہیں لائے انہیں دعوت دین پہنچانے کے لیے دو مبلغین کو روانہ فرمایا، ان میں ایک ابن ام مکتوم ہیں اور دوسرے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

(عیون الاثر، ج: ۱، ص: ۲۶۵)

بخاری شریف کی ایک حدیث سے بھی ان دونوں صحابہ کی اولیت کا پتا چلتا ہے۔ حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن ام مکتوم تشریف لائے، پھر عمار بن یاسر اور حضرت بلال تشریف لائے۔ (صحیح البخاری، کتاب المناقب باب مقدم النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم المدینہ)

لیکن علامہ عینی نے ابن ابی شیبہ کی روایت بیان فرما کر تحقیق فرمائی کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے مدینہ المنورہ پہنچے، ان کے بعد حضرت ابن ام مکتوم مدینہ المنورہ تشریف لائے۔ (عمدة القاری، باب مقدم النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم المدینہ) اسد الغابہ میں درج روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ المنورہ تشریف لائے، اس کے بعد حضرت عمرو بن ام مکتوم تشریف لائے۔

(اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۶)

اس تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ مدینہ منورہ میں سب سے پہلے قیام پذیر ہونے والے مہاجر صحابی کا نام مصعب بن عمیر ہے اور یہ کہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ منورہ پہنچنے میں مطلقاً اولیت حاصل ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مدینہ منورہ میں جو اسلام کی بہاریں آئیں، وہاں اسلام پھلا پھولا ان سب کا سہرا سجانے کے لیے جبین مصعب سب سے زیادہ سزاوار اور لائق تر ہے۔

حضرت مصعب کی قیام گاہ: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فلاح و نجات اور اسلامی ترقی کی دعائیں دے کر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ المکرمہ سے مدینہ المنورہ روانہ فرمایا، حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی محسن انسانیت و معلم کائنات کا حکم پا کر بغیر کسی تردد کے غلامانہ شان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے

درمیان کی راہ طے کر کے مدینہ شریف پہنچے، یہاں پہنچ کر سب سے پہلے آپ حضرت اسعد بن زرارہ کے مہمان بنے اور یہیں رہ کر آپ نے وہ ذمہ داریاں نبھائیں، جس کے لیے سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو مکہ سے روانہ فرمایا تھا، یہاں رہ کر آپ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتے، قرآن پاک سکھاتے اور انہیں دینی مسائل سمجھاتے، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس خدمت پر پورے تن من کے ساتھ لگ گئے تھے، انہیں اس کے سوا کوئی کام نہ تھا اس لیے مدینہ شریف میں وہ مقری (معلم) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ (اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۶، سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۳۱)

اہل مدینہ کے امام: مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بڑی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ انصار مدینہ کو باجماعت نماز ادا کراتے تھے اور ان کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے کیوں کہ انصار کا تعلق اوس و خزرج عرب کے دو مشہور قبائل سے ہے اور یہ دونوں قبیلے ایک زمانے تک آپس میں دست بگریباں رہے، اس لیے ان دونوں قبیلوں کے افراد ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ امامت کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ مناسب کوئی اور انسان نہ تھا لہذا آپ مدینہ منورہ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ امامت کے فرائض بھی انجام دیتے۔

مدینہ منورہ کا پہلا جمعہ: اس دوران حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک مکتوب بھیجا، جس میں آپ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ شریف کے مسلمانوں کو جمعہ قائم کرنے کی اجازت دیں، یہ درخواست حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبول فرمائی۔ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ دوپہر کے وقت جمعہ قائم کریں، دو رکعت نماز پڑھیں اور اس میں قوم کو خطبہ بھی دیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اجازت مل جانے کے بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے اہل مدینہ کو دار سعد بن خثیمہ میں جمعہ کی پہلی نماز ادا کرائی اور اس دن خوشی کے طور پر مسلمانوں نے ایک بکری ذبح کی تھی کیوں کہ یہ اسلام کا پہلا جمعہ تھا۔ (اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۶، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۰، سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۳۱)

بعض روایات میں اسعد بن زرارہ کا نام: ابھی آپ پڑھ آئے کہ مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا جمعہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھایا لیکن بعض روایات میں ابو امامہ حضرت اسعد بن زرارہ کا نام درج ہے کہ پہلا جمعہ انہوں نے ادا کرایا۔ لہذا ذہن میں خلجان پیدا ہونا ایک فطری امر ہے، ہم اس خلجان کو ان شاء اللہ دور کریں گے لیکن پہلے آپ یہ روایت بھی پڑھ لیں جس میں حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ کا نام ہے کہ انہوں نے پہلا جمعہ پڑھایا۔

علامہ پیر کرم شام ازہری لکھتے ہیں:

اس پر سب متفق ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسعد بن زرارہ کے پاس رہائش اختیار کی، یثرب میں حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر کیا جاتا تھا۔ یہی سب کے امام تھے، سارے لوگ ان کی اقتداء میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے کیوں کہ اوس و خزرج میں باہمی عداوت تھی، وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کسی کو اعتراض نہ تھا۔ سب نے بالاتفاق ان کو اپنی نماز کا امام مقرر کیا۔

دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف لکھا کہ وہ مدینہ میں نماز جمعہ قائم کریں۔ عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کتب الی مصعب بن عمیر یأمرہ باقامة الجمعة۔ (سیرۃ ابن کثیر ج: ۲، ص: ۱۸۰)

بڑھاپے میں کعب بن مالک کی بینائی جاتی رہی تھی ان کے فرزند عبد الرحمن ان کا ہاتھ پکڑ کر مسجد میں لے جایا کرتے تھے، کعب بن مالک جب بھی جمعہ کی اذان سنتے تو ابی

امامہ اسعد بن زرارہ کے لیے دعا فرماتے۔ عبد الرحمن کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ہمت کر کے اپنے والد سے اس دعا کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: ابوامامہ وہ شخص ہے جس نے مدینہ طیبہ کے حرہ بنی بیاضہ میں ہرم النبیہ کے مقام پر نماز جمعہ کی ابتدا کی۔ میں نے پوچھا: اس وقت آپ لوگوں کی تعداد کتنی تھی؟ انہوں نے فرمایا: ہم چالیس آدمی تھے۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۵۸۷، سیرت ابن کثیر، ج: ۲، ص: ۱۸۱)

خلجان کا حل: بعض روایات میں جو حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ کا نام ہے کہ انہوں نے جمعہ قائم کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت اسعد نے جمعہ قائم کرنے کا حکم دیا تھا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز جمعہ ادا کرائی تھی۔ یعنی حضرت اسعد بن زرارہ حکم دینے والے تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام جمعہ تھے۔

قال الحافظ ویجمع بین روایۃ الطبرانی لہذہ وروایۃ اسعد بن زرارۃ الی عند المؤلف بأن اسعد کان امرأ وکان مصعب اماماً، (عون المعبود، شرح ابی داؤد، باب الجمعۃ فی القری، ج: ۳، ص: ۲۸۳)

یہی بات علامہ سمہودی کے بیان سے بھی ظاہر ہے، فرماتے ہیں: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کا پہلا جمعہ حضرت اسعد بن زرارہ کی مدد سے پڑھایا۔ (وفاء الوفاء، ج: ۱، ص: ۵۸۲)

امام بیہقی نے فرمایا: حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد سے جمعہ پڑھایا تھا اس لیے راوی نے جمعہ پڑھانے کی نسبت حضرت اسعد بن زرارہ کی طرف کر دی۔ (دلائل النبوة، ج: ۲، ص: ۴۴۱)

دعوت کی کامیابی کا راز: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اسعد بن زرارہ کے یہاں قیام پزیر ہو کر سستی یا کابلی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ جسم و جان کی تمام تر قوتیں تبلیغ اسلام پر صرف فرمائیں۔ اہل مدینہ کو اسلام کے بنیادی عقائد سے روشناس کرایا، مسلسل کوششیں اور پر خلوص عزائم جلد ہی ثمر بار ہوئے، چنانچہ قلیل سے وقت میں حضرت

مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی مدد اور اسی کی توفیق سے ممکن ہو سکا تھا۔ اگر کامیابی کے ظاہری اسباب پر غور کیا جائے تو یہ تیز تر کامیابی آنے والے اسباب کی وجہ سے حاصل ہو سکتی تھی۔ سب سے بنیادی سبب تو یہ تھا کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے میں مصطفیٰ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سکھایا ہوا دامن علم موجود تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دلائل قوت سے بھرپور تھے اور استدلال کا طریقہ مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی دل نشیں تھا۔ تیسرے یہ کہ اپنی دعوت میں سکینہ و وقار کو لازم پکڑے ہوئے تھے، جلد بازی اور غضب مزاجی کو انہوں نے قریب بھی نہیں آنے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگوں کے مقام و مزاج کو اپنی دعوت میں فراموش نہیں کرتے تھے، مزید یہ کہ قرآنی آیات کی تلاوت اور ان کے ذریعے استدلال کرنے کی وجہ سے ان کے کلام میں غیر معمولی اثر پیدا ہو گیا تھا، ان کا کلام لوگوں کے دلوں میں جلد ہی سرایت کر جاتا تھا۔ (سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر ص: ۳۴)

مدینہ میں تبلیغی سرگرمیاں: اب ہم پیر کرم شاہ ازہری کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں، جس سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت کے کئی گوشے اجاگر ہوں گے۔ ساتھ ہی مدینہ طیبہ میں اسلام کے فروغ کا پتہ چلے گا۔ آپ رقم طراز ہیں: علامہ ابن کثیر ابن اسحاق کے حوالے سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں ایک واقعہ درج کرتے ہیں، جو درج ذیل ہے:

ایک روز اسعد بن زرارہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمراہ لے کر عبدالاشہل اور بنی ظفر کے علاقے میں آئے، سعد بن معاذ اسعد کی خالہ کا لڑکا تھا اور اسعد اور حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنی ظفر کے ایک باغیچے میں چلے گئے، وہاں ایک کنواں تھا جس کا نام بیر مرق تھا، اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے، ارد گرد کے علاقے میں جو مسلمان آباد تھے انہیں ان کی آمد کا پتہ چلا وہ بھی وہاں پہنچ گئے، ان دنوں سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر بنی عبدالاشہل اپنی اپنی قوم کے سردار تھے اور دونوں ابھی تک مشرک و بت پرست تھے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ اسعد اور مصعب دونوں بنی ظفر کے باغیچے میں آئے ہوئے ہیں تو سعد نے اسید سے کہا: تیرا باپ مرے، تم ان دونوں کے پاس جاؤ جو ہمارے علاقے میں آئے ہوئے ہیں تاکہ ہمارے ضعیف العقیدہ لوگوں کو وہ بیوقوف بنائیں، تم جاؤ ان کی سرزنش کرو اور انہیں کہو کہ وہ آئندہ اس علاقے میں آنے سے پرہیز کریں۔ اگر مجھے اپنے خالہ زاد بھائی اسعد کا خیال نہ ہوتا تو میں خود چلا جاتا اور تمہیں یہ زحمت نہ دیتا۔

اسید بن حضیر دامن اسلام میں: سعد کے کہنے پر اسید اٹھا اور اپنا نیزہ سنبھالا اور بنی ظفر کے باغیچے کی طرف چل پڑا، جہاں اسلام کے دونوں مبلغ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اسعد نے اسید کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہا: وہ سامنے اپنی قوم کا سردار تمہارے پاس آ رہا ہے۔ اسے یوں تبلیغ کرو کہ وہ اللہ کے دین کی تصدیق کرنے لگے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: اگر وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا تو میں ضرور اس سے گفتگو کروں گا، اتنے میں اسید وہاں پہنچ گیا اور منہ بسور کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کہنے لگا کہ تم ہمارے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے یہاں کیوں آئے ہو؟ اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو فوراً میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ذرا بیٹھیے! ہماری بات تو سنیے، اگر پسند آگئی تو قبول کر لینا اور اگر ہماری بات پسند نہ آئی تو ہم خاموش ہو جائیں گے اور آپ کو ایسی بات نہیں سنائیں گے جس کا سننا آپ پسند نہیں کرتے۔ اسید نے کہا کہ تم نے انصاف کی بات کی ہے پھر اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور ان دونوں کی باتیں سننے کے لیے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گفتگو شروع کی اور اسلام کے بنیادی عقائد کے بارے میں بتایا اور پھر قرآن کی چند آیات تلاوت کیں، اس سے پیشتر کہ اسید اپنی زبان سے کچھ کہے، ہم نے اس کے چہرے پر ایمان کا نور دیکھ لیا، آخر وہ بولا: کتنی اچھی باتیں آپ نے سنائی ہیں، اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم میں سے کوئی شخص اس دین میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے کیا کرنا پڑتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسے شخص

کو چاہیے پہلے غسل کرے اور اپنے آپ کو پاک کرے پھر پاک لباس زیب تن کرے پھر کلمہ شہادت پڑھے اور آخر میں کہا: دو رکعت نفل نماز ادا کرے۔ یہ باتیں سن کر اسید اٹھا، پہلے جا کر غسل کیا پھر پاک کپڑے پہنے، کلمہ شہادت پڑھا پھر دو رکعت نماز ادا کی۔ اس نے ان دونوں سے کہا کہ میرے پیچھے ایک شخص ہے اگر وہ تمہاری تابعداری اختیار کر لے تو اس کی قوم کا ہر فرد آپ کے دین کو قبول کر لے گا۔ میں اس کو ابھی تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اس نے اپنا نیزہ پکڑا اور جہاں سعد بن معاذ کو وہ چھوڑ کر گیا تھا ادھر جانے کا ارادہ کیا۔ سعد بھی مع اپنی قوم کے اس کے لیے چشم براہ تھا جب اس نے دور سے اسید کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھا تو کہنے لگا: ”احلف بالله لقد جاءكم اسيد بغير الوجه الذي ذهب به من عندكم“ یعنی میں اللہ کی قسم! کھا کر کہتا ہوں کہ اسید کا چہرہ بدلا ہوا ہے، جو چہرہ وہ لے کر گیا تھا اب وہ اس چہرہ کے ساتھ واپس نہیں آ رہا ہے۔ (سبل الہدی، ج: ۳، ص: ۲۷۳)

جب اسید وہاں پہنچا تو سعد نے پوچھا: سناؤ کیا کر آئے ہو؟ اسید نے کہا کہ میں نے ان دونوں صاحبوں سے گفتگو کی ہے، مجھے تو ان کی گفتگو میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ جب میں نے ان کو مزید تبلیغ کرنے سے منع کیا تو انہوں نے کہا: ”نفعل ما احببت“ ہم وہ کام کریں گے جو تمہیں پسند ہو۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ بنو حارثہ اسعد بن زرارہ کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، اپنے گھروں سے وہ باہر نکل آئے تھے کیوں کہ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ تیری خالہ کا بیٹا ہے، اس طرح اسعد کو قتل کر کے درحقیقت وہ تجھے ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں۔

سعد بن معاذ دامن اسلام میں: یہ سنتے ہی سعد غضب ناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، مبادا بنو حارثہ اسعد کو قتل کر دیں اس نے اپنا نیزہ پکڑا اور جانے سے پہلے کہنے لگا کہ اے اسید! تو نے وقت ضائع کیا ہے اور کوئی مفید کام نہیں کیا۔ سعد تیزی سے ادھر چل پڑا جہاں حضرت مصعب اور اسعد بن زرارہ بیٹھے تھے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دونوں بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ بھانپ گیا کہ اسید نے اسے محض اس لیے ادھر بھیجا ہے کہ

وہ ان کی گفتگو سن سکے۔ سعد وہاں پہنچا تو اس نے اسعد کو بڑے غصہ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا: بخدا! اے ابوامامہ! اگر تیرے اور میرے درمیان یہ رشتہ داری نہ ہوتی تو تو کبھی یہ جسارت نہیں کر سکتا کہ تم ہمارے علاقے میں ایسا کام کرنے کے لیے آتے جو ہمیں از حد ناپسند ہے۔ اسعد نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہا کہ بخدا! ہمارے پاس اپنی ساری قوم کا سردار آگیا ہے۔ اگر اس نے تیری تابعداری قبول کر لی تو پھر اس کی قوم کا ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سعد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”او تقعد وتسمع وان رضیت امرار غبت فیہ قبلتہ وان کرہتہ عزلنا عنک ماتکرہ“ کیا آپ بیٹھ نہیں جاتے؟ کیا آپ میری بات سن نہیں لیتے؟ اگر آپ کو میری بات پسند آجائے تو اسے قبول کر لیجیے گا اگر آپ کو پسند نہ آئے تو ہم ایسے کام سے دست بردار ہو جائیں گے جو آپ کو ناپسند ہے۔ یہ سیدھی سی بات سن کر سعد نے کہا: ”انصفت“ تو نے بڑے انصاف کی بات کی ہے، پھر اس نے اپنا نیزہ زمین پر گاڑ دیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کریم کی چند آیتیں تلاوت کیں۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ انہوں نے سورۃ الزخرف کی ابتدائی چند آیتیں اسے پڑھ کر سنائیں۔ یہ آیتیں سنتے ہی اس کی کایا پلٹ گئی اور اس کے چہرے پر اسلام کی چمک دکھائی دینے لگی، اس سے پیشتر کہ وہ خود بات کرتا، ہم کو خود ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا۔ پھر اس نے پوچھا کہ جب تم لوگ اسلام قبول کرنے لگتے ہو اور اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: پہلے غسل کرنا ہوگا تا کہ تمہارا جسم پاک ہو جائے پھر تمہیں پاک لباس زیب تن کرنا ہوگا پھر تمہیں کلمہ شہادت پڑھنا ہوگا پھر تمہیں دو رکعت نفل ادا کرنے ہوں گے۔ یہ سن کر وہ اٹھا، اس نے غسل کیا، پاک لباس زیب تن کیا، کلمہ شہادت پڑھا، دو رکعت نفل نماز ادا کی پھر اپنا نیزہ پکڑا اور اپنی قوم کی مجلس کی طرف چل پڑا۔ اسید بھی اس وقت اس کے ہمراہ تھا، جب اس کی قوم نے انہیں آتے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ ہم اللہ کی قسم! کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ سعد اس چہرے کو

لے کر واپس نہیں آ رہا ہے جس کو لے کر وہ یہاں سے گیا تھا، جب وہ ان کے پاس پہنچا تو کھڑے کھڑے اس نے اپنی قوم سے دریافت کیا:

یابنی عبد الاشہل کیف تعلمون امری فیکم

اے عبد اشہل کے خاندان والو! میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

قالوا سیدنا و افضلنا رایا وایمننا نقیبة

انہوں نے کہا: آپ ہمارے سردار ہیں، ہم سب سے آپ کی رائے افضل ہے اور

تمہاری ذات بڑی بابرکت ہے۔

پورا قبیلہ دامن اسلام میں: سعد نے کہا کہ تمہارے مردوں اور تمہاری عورتوں

کے ساتھ گفتگو کرنا مجھ پر حرام ہے، جب تک تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لے آؤ۔

شام تک بنی عبد الاشہل میں کوئی ایسا مرد اور عورت باقی نہ رہی تھی جس نے اسلام

قبول نہ کر لیا ہو۔ حضرت سعد اور حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں یہاں سے اٹھ کر

اسعد بن زرارہ کے مکان پر آ گئے اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے میں مشغول

ہو گئے۔ ان کی کوششوں کے باعث سارے مدینہ میں انصار کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں

کسی مرد یا کسی عورت نے کلمہ شہادت نہ پڑھ لیا ہو۔ اس نعمت سے چند وہ خاندان محروم

رہے جو ابوقیس بن الاسلت کے عقیدت مند تھے۔ یہ ان کا قومی شاعر اور قائد تھا، اس کی

ہر بات وہ سنتے بھی تھے اور بجا بھی لاتے تھے۔ یہ لوگ اس کی وجہ سے کفر پر اڑے رہے،

یہاں تک کہ خندق کا معرکہ پیش آیا، اس وقت ان کی آنکھوں سے تعصب کا حجاب دور ہوا

اور اندھی تقلید کی پٹی کھلی اور انہیں اسلام قبول کرنا نصیب ہوا۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۵۹۱)

قیام گاہ منتقل: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انصار کے قلوب کو

حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر قیام پذیر رہتے ہوئے ہی فتح کر لیا تھا لیکن جب بنی نجار

نے اسعد بن زرارہ پر زیادہ سختی کی تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی قیام

گاہ تبدیل کر لی، پھر آپ نے سعد بن معاذ کے گھر قیام فرمایا اور وہاں سے اپنی تبلیغی سرگرمیاں

جاری رکھیں۔ (وفاء الوفا، ج: ۱، ص: ۵۸۵)

اہل مدینہ کو جاں نثار بنادیا: گزشتہ سال یثرب کے بارہ آدمی بارگاہ رسالت میں حاضری کا شرف پا کر اور بیعت کی سعادت حاصل کر کے اپنے وطن واپس لوٹے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ہمراہ روانہ کیا تاکہ وہاں کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں اور جو لوگ اسلام قبول کر لیں انہیں قرآن کریم پڑھائیں، ان میں اسلام کا صحیح فہم اور ادراک پیدا کریں۔ یہ بارہ افراد جب یثرب پہنچے تو بڑے مخلص اور پر جوش مبلغین کی طرح انہوں نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موجودگی اور سرپرستی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ ان کی تبلیغ کا انداز اتنا اثر انگیز اور دل نشیں تھا کہ یثرب کے دو بڑے سردار اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ حلقہ بگوش اسلام بن گئے، قلیل عرصہ میں یثرب کی کایا پلٹ گئی۔ اب اس شہر میں کوئی محلہ، کوئی گلی اور کوئی علاقہ ایسا نہ رہا جہاں اسلام نے کسی مرد یا کسی عورت کے دل میں عرفان الہی کا چراغ روشن نہ کر دیا ہو۔ اس ایک سال کے عرصے میں سینکڑوں افراد نے جن میں قبائل کے رؤسا بھی تھے، اس دین حق کو قبول کر لیا، ہر گھر میں ہر محفل میں ہمہ وقت محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر خیر، یہاں کی پر نور فضاؤں میں گونجتا رہتا۔ یہاں کے شہریوں کو بھی ان مصائب و آلام کا علم ہو گیا جن سے ان کا ہادی و مرشد دو چار تھا۔ انہوں نے ظلم و ستم کی وہ لرزہ خیز داستانیں بھی سن لی تھیں جن سے مکہ میں ان کے دینی بھائیوں کو واسطہ پڑتا تھا۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ اپنے محبوب آقا کو یہاں بلائیں گے، اہل مکہ نے ان کی راہ میں جو کانٹے بچھائے ہیں انہیں وہ اپنی آنکھوں کی پلکوں سے چن لیں گے اور ان کے بجائے اپنے راہبر کے قدموں کے نیچے محبت و عقیدت کے پھولوں کی تازہ پیتیاں بچھائیں گے۔

وہ زندہ ہوں اور ان کے دینی بھائیوں پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جا رہے ہوں، یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے متفقہ فیصلہ کیا، ہمارا جو وفد موسم حج میں

مکہ جائے گا وہ حضور کی خدمت میں پر زور التماس کرے گا کہ حضور ان کی بستی کو اپنے قدم سے مہینت لزوم سے ضرور سرفراز فرمائیں۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۵۹۲، ۵۹۳)

حضرت مصعب بارگاہِ حضور میں: چنانچہ جب حج کا موسم قریب آ گیا تو حاجیوں کا ایک قافلہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں مکہ مکرمہ روانہ ہوا، اس میں ستر انصار تھے جو مسلمان ہو چکے تھے، ان کے علاوہ کئی مشرک بھی قافلے میں شامل تھے۔ مسلمانوں کی اس جماعت نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات کی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے نتائج کی رپورٹ پیش کی اور جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان کے نام گنوائے، تبلیغی میدان میں ان کی شاندار کامیابیوں کے بارے میں سن کر حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انتہائی مسرت ہوئی۔ (ایضاً: ۵۹۴)

ماں نہیں حضور اول ہیں: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سال مکمل مدینہ طیبہ میں ٹھہرے رہے، فروغ اسلام کے لیے ان کی کوششیں مشکور ہوئیں، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی روداد محنت و مشقت سنانے کے لیے جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ مکرمہ میں قدم رکھا تو ان کا رخ رخ حبیب کی طرف تھا، اگرچہ مکہ میں ان کا گھر بار، ساز و سامان، دوست و یار، عزیز و رشتہ دار، بھائی بہن اور ماں سب کچھ تھے لیکن حضور سے پہلے کسی اور کی طرف رخ کرنا دستور محبت کے خلاف تھا، جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک قطعاً جائز نہ تھا اور یہی ایمان کا مقتضی بھی تھا کیوں کہ

محمد ہے متاع عالم ایجا د سے پیا را

پدر، مادر، برادر، مال، جان، اولاد سے پیا را

اس کسوٹی پر اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے وہ مکمل کھرے اترے اور مکہ میں سب سے پہلے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دلیلیز پر حاضر ہوئے۔ جب یہ خبر حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ماں کو موصول ہوئی تو اس نے بڑے افسوس کے ساتھ حضرت مصعب رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کو پیغام بھیجا: ”تو کتنا نافرمان لڑکا ہے جس شہر میں تیری ماں موجود ہے، تو ماں سے ملے بغیر کسی اور سے ملاقات کو رو جانتا ہے“ یہ پیغام حقیقت میں بڑا خطرناک تھا کیوں کہ اس میں جذباتِ محبت کو مہیز دی گئی تھی ایک ماں کی طرف سے ایسا پیغام جس میں محبت کا بہتا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو، لڑکے کو اس کے مشن سے غافل کر کے بآسانی اپنے ساتھ بہا سکتا تھا لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تلوے کی خاک جن آنکھوں کا سرمہ بن جائے پھر ان آنکھوں میں کوئی اور کیسے سما سکتا ہے۔

تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منہ کیا دیکھیں
کون نظروں پہ چڑھے دیکھ کے تلوا تیرا
(اعلیٰ حضرت)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار اس عاشق زار نے اپنی ماں کو ایسا جواب دیا جو ماں نے خواب و خیال میں بھی نہ سوچا ہوگا، آپ نے فرمایا: ”وما کنت لابد أباحد قبل رسول الله“ جس شہر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم موجود ہوں، وہاں میں حضور سے پہلے کسی اور سے ہرگز ملاقات نہیں کر سکتا۔

محمد کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے

ماں کے غلط ارادے پر مصعب کا جواب: آخر کار جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مل کر فارغ ہوئے تو اپنی ماں کے پاس پہنچے، ملاقات ہوئی۔ ماں نے چہرہ دیکھ کر کہا: مجھے لگتا ہے کہ تم اب بھی اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوری متانت کے ساتھ جواب دیا: (الحمد للہ) میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین پر قائم ہوں، جس کا نام دین اسلام ہے، جس دین سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول راضی ہے۔ ماں نے کہا کہ تم نے میرے ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کیا جو احسانات میں نے تم پر حبشہ اور یثرب کی مصیبتوں کے

بعد کیے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں تمہاری ہی ایذا رسانیوں کی بنیاد پر اپنے دین کو بچانے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگتا رہا اور مصیبتیں جھیلتا رہا ہوں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ پھر یہ محسوس کیا کہ ماں کا ارادہ دوبارہ قید کر لینے کا ہے تو آپ نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا: ماں! اگر تم نے مجھے قید کرنے کی کوشش کی تو سمجھ لو جو انسان بھی مجھے پکڑنے کے ارادے سے آگے بڑھے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بیٹے کا اٹل فیصلہ سن کر ماں اپنے ارادے سے باز آگئی، روتے ہوئے کہا: مصعب! جاؤ اپنا کام کرو۔

ماں کو دعوت اسلام اور ماں کا انکار: جن آنکھوں سے کبھی متا برستی تھی، ان سے آنسو ٹپکتے دیکھ کر حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے آپ کو روک نہ سکے۔ ایک مومن بیٹا اپنی کافرہ ماں کے لیے جو کر سکتا تھا، حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے وہ سب کر دکھایا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ماں! میری نصیحت قبول کرلو۔ میری نصیحت میں شفقت کے سوا اور کچھ نہیں، میری بات مان جاؤ اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ۔ ماں نے کہا: میں تمہارے دین میں داخل ہو کر نہ اپنی رائے کو سوا کروں گی اور نہ ہی اپنی عقل کو کمزور کروں گی، ہاں میں تم کو تمہارے دین کے ساتھ چھوڑ رہی ہوں، میں اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہوں گی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۱، سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۳۹)

ایمان کی مضبوطی اور کفر کی سختی: آپ ماں اور بیٹے کے الوداعی الفاظ پڑھ آئے ہیں۔ ماں اپنے نور نظر کو کتنے سخت الفاظ کے ساتھ وداع کر رہی ہے اور بیٹا ماں کے جواب میں ”وبالوالدین احساناً“ کی کتنی عمدہ عملی ترجمانی کر رہا ہے، ماں کتنی مصر ہے اپنے کفر پر ڈٹے رہنے کے لیے تو بیٹے کی طرف سے کیا ہی عظیم اصرار ہے ایمان پر جسے رہنے کے لیے۔ بیٹے کے دل میں اپنی ماں کے ہدایت یافتہ ہونے کی کس درجہ حرص موجود ہے، اس خطرناک موقع پر بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کتنی دل نشین تبلیغ فرمائی

ہے لیکن صحیح تو یہی ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ خود فرماتا ہے: ”إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ“ یہاں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بھی ثابت کیا کہ بیٹے کا اپنے ماں باپ کو اسلام کی دعوت دینا ان کے ساتھ سب سے بڑی نیکی ہے اور بیٹے کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری بھی ہے اور یہ کہ والدین کی محبت یا ان کے دباؤ میں آکر اپنے سچے دین کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ذرہ برابر اس سے روگردانی کی جائے گی۔ (رجال حول الرسول، ص: ۲۶، سيرة الصحابي الجليل مصعب بن عمير، ص: ۳۹)

حضرت مصعب کی ہجرت: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذی الحجہ میں مکہ آئے تھے، آنے کے بعد پورے ذی الحجہ مکہ میں ٹھہرے۔ محرم و صفر میں بھی یہیں رہے اور ربیع الاول شریف کا چاند دیکھ کر مدینہ شریف کی طرف ہجرت کی۔ لہذا حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہجرت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مدینہ شریف میں تشریف فرما ہونے سے بارہ رات قبل ہوئی۔ (المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، ج: ۳، ص: ۱۹۴)

مواخات: نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے درمیان محبت کی ڈور مضبوط کرنے کے لیے دو صحابہ کے درمیان رشتہ اخوت قائم فرماتے، ایک مہاجر کو لیا جاتا اور ایک انصاری کو اور دونوں کو بھائی قرار دے دیا جاتا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضرت ابویوب انصاری کا رشتہ مواخات قائم فرمایا۔ یہ ابویوب انصاری وہی ہیں جنہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا میزبان بننے کا شرف حاصل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کی مواخات ذکوان بن عبد قیس کے ساتھ قائم کی گئی لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۱، انساب الاشراف، ج: ۳، ص: ۲۷۲، جوامع السيرة، ج: ۱، ص: ۹۶، جوامع الکلم، ج: ۱، ص: ۶۰، مشاہیر الصحابہ، ج: ۱، ص: ۷۰)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مواخات حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قائم کی گئی۔ یہ آپ کی مکی مواخات کا تذکرہ ہے کیوں کہ مواخات کے باب میں تحقیق یہ ہے کہ مدنی مواخات سے پہلے حضور صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبل ہجرت مہاجرین کے مابین مؤاخات قائم فرمائی تھی، لہذا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مؤاخات حضرت سعد کے ساتھ مکئی مؤاخات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

غزوات میں شرکت: قارئین جانتے ہیں کہ غزوات کا سلسلہ ہجرت مدینہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حیات میں دو غزوات پیش آئے، جن میں سے ایک کو بدر اور دوسرے کو احد کہا جاتا ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں غزوات میں شریک رہے۔ بدر سے غازی کی حیثیت سے مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور جنگ احد میں شہید راہ وفا ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ (عام کتب تاریخ)

ایک اونٹ پر تین سوار: اسلام و کفر کے درمیان سب سے پہلا فیصلہ کن غزوہ بدر کے نام سے پیش آیا۔ اس غزوے میں ظاہری اسباب حرب کی قلت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم خاص سے مسلمانوں کو فتح مبین نصیب فرمائی اور مجاہدین اسلام کو ان کی جاں نثاری کا نعم البدل عطا فرمایا۔ غزوے میں شرکت کرنے کے لیے مسلمانوں نے سفر شروع کیا، سفر کیا تھا؟ بذات خود غربت و افلاس کا واضح نشان تھا۔ ایک ایک اونٹ پر دو، دو تین، تین اور چار، چار صحابہ کرام باری باری سوار ہو کر مسافت طے کر رہے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے اونٹ پر بھی تین لوگ باری باری سوار ہوتے تھے، ایک تو خود حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، دوسرے سوہیط بن حرمہ اور تیسرے حضرت مسعود بن ریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ (الغازی للواقفی، ج: ۱، ص: ۲۴)

بدر میں علم بردار: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر میں صرف موجود بھر نہیں تھے بلکہ ایک عظیم مجاہد کی حیثیت سے شریک تھے۔ ان کی حیثیت کی عظمت ان کی زبان نے بیان نہیں فرمائی بلکہ جو ذمہ داری حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں سونپی تھی وہ ان کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔ بدر کے دن حضور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے انہیں اسلام کا جنگی علم عطا فرمایا تھا، اس علم کو سرنگوں ہونے سے بچانے کی ذمہ داری حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپی گئی تھی۔

علامہ واقدی لکھتے ہیں:

جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسلمانوں کی صفیں درست کرا چکے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں میں سونپ دیا پھر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس جھنڈے کو لے کر اس جگہ تک پیش قدمی کی جہاں تک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چاہتے تھے۔

(المغازی، ج: ۱، ص: ۵۶، سیرۃ الصحابی الجلیل، ص: ۴۱، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۱)

یاد رہے کہ جنگ کے دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین جھنڈے استعمال فرمائے تھے۔ ایک جھنڈا مہاجرین کا تھا، جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا، ایک قبیلہ خزرج کا جھنڈا تھا جس کو اٹھانے کی ذمہ داری حباب بن منذر کی تھی، تیسرا جھنڈا قبیلہ اوس کا تھا جس کی ذمہ داری سعد بن معاذ نے سنبھال رکھی تھی۔ اس دن کفار قریش بھی تین جھنڈے لیے ہوئے تھے جس میں سے ایک جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سگے کافر بھائی ابوعزیز کے پاس تھا۔ (المغازی، ج: ۱، ص: ۵۸)

مشرك سے تعلقات منقطع: جب معرکہ بدر اپنے اختتام کو پہنچا، مسلمان فتح

یاب ہوئے، کفر کو سخت رسوائی اور بڑی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، ستر کفار مقتول ہوئے تھے اور اتنے ہی قید کیے گئے تھے، باقی جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ جنگ بدر کے قیدیوں میں ایک قیدی نصر بن حارث بھی تھا جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قریبی رشتہ دار تھا، نصر بن حارث کو حضرت مقداد نے گرفتار کیا تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقام بدر سے چل کر مقام اشل پہنچے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام قیدیوں کو ملاحظہ فرمایا، چنانچہ جب آپ کی نظر نصر بن حارث پر پڑی تو آپ کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے، نصر بن حارث نے اپنے پاس کھڑے ہوئے انسان سے کہا: مجھے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے ایسی نظر سے دیکھا ہے جس میں مجھے میری موت دکھائی دے رہی تھی۔ اس انسان نے جواب دیا: تمہارا یہ کہنا صرف تمہارے دل کا ڈر ہے اس کے سوا کچھ نہیں، دہشت زدہ نضر نے اس وقت حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رابطہ کیا اور ان سے سفارش کی بھیک مانگی، نضر نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا: آپ یہاں کے موجودین میں میرے سب سے قریبی رشتہ دار ہیں، مہربانی کر کے اپنے آقا کی بارگاہ میں میری سفارش کر دیں کہ میرے ساتھ میرے ساتھیوں جیسا سلوک کیا جائے (مجھ پر کوئی الگ سے حکم نافذ نہ کیا جائے) اے مصعب! اگر آپ نے میری سفارش نہ کی تو حضور مجھے قتل کرنے کا حکم فرما دیں گے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کافر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا: تم وہی نضر تو ہو جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بارے میں واہیات باتیں کیا کرتے تھے اور اللہ کے رسول کی بارگاہ میں کیسی کیسی گستاخیاں کیا کرتے تھے۔ نضر نے کہا: مصعب میں صرف تم سے اتنی سفارش چاہتا ہوں کہ مجھے بھی میرے جملہ ساتھیوں میں سے ایک سمجھا جائے (مجھ پر الگ سے کوئی سختی نہ کی جائے) اگر ان کو قتل کیا جائے تو ان کے ساتھ مجھے بھی قتل کیا جائے اور انہیں احسان کی بھیک دی جائے تو مجھے بھی اس سے محروم نہ کیا جائے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم وہی ہو جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ پر ظلم و ستم کیا کرتے تھے، یہ سن کر نضر نے کہا: اے مصعب! اگر تمہیں قریش نے قید کر لیا ہوتا تو میرے زندہ رہتے ہوئے وہ تمہیں قتل نہیں کر سکتے تھے (اور تم میرے ساتھ یہ گفتگو کر رہے ہو) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم مجھے قتل ہونے سے بچا لیتے لیکن میرا معاملہ تمہاری طرح نہیں، تم مشرک ہو اور میں مسلمان۔ اسلام نے زمانہ جاہلیت کے تمام معابدات کو ختم کر دیا ہے، مسلمانوں کی قرابت صرف مسلمانوں سے ہو سکتی ہے اور کسی سے نہیں۔ یہ کہتے ہوئے آپ نے اس کی درخواست کو رد فرما دیا اور معاملہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ (الغازی، ج: ۱، ص: ۶، سیرۃ الصحابی الجلیل، ص: ۴۲)

سگے کافر بھائی پر سختی: جنگ بدر میں مسلمانوں نے ایک اور مشرک کو قید کیا تھا، یہ قیدی بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قریبی تھا بلکہ اس کی قرابت نصر بن حارث کی قرابت سے زیادہ اہم و اتم تھی، اس کا نام ابوعزیز تھا، وہی ابوعزیز جو کفار کے ایک جنگی جھنڈے کا علمبردار تھا، ابوعزیز حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے کوئی عام انسان نہ تھا بلکہ ان کا سگا بھائی تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے سگے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اس خونی رشتہ کو کس انداز میں نبھایا؟ اس کو پیر کرم شاہ ازہری سے سنیے، آپ لکھتے ہیں:

دوسرے روز جب ستر جنگی قیدی بارگاہ رسالت میں حاضر کیے گئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے پہلے ان کے قیام و طعام کے انتظام کی طرف توجہ مبذول فرمائی، حضور نے انہیں اپنے صحابہ کرام کے درمیان حسب حیثیت تقسیم کر دیا اور ہر ایک کو تاکید فرمائی کہ وہ اپنے حصے کے قیدیوں کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھیں۔ ابوعزیز حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سگا بھائی تھا، وہ خود بتاتا ہے کہ بدر کے روز کعب نامی ایک انصاری میرے بازو باندھ رہا تھا کہ میرے سگے بھائی مصعب بن عمیر میرے پاس سے گزرے، انہوں نے میری سفارش کرنے کے بجائے اس انصاری کو کہا کہ اس کے دونوں بازوؤں کو خوب کس کر باندھو، اس کی ماں بڑی دولت مند ہے وہ تمہیں گراں قدر فدیہ ادا کرے اس کو چھڑائے گی، میں مدینہ پہنچا تو مجھے ایک انصاری کے حوالے کر دیا گیا، صبح و شام جب اس انصاری کے اہل خانہ کھانا کھاتے تو حضور کی وصیت کے پیش نظر وہ مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجوروں کے چند دانوں پر اکتفا کرتے، جب ان میں سے کسی کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا آ جاتا تو وہ اسے پھونک کر اس کی گرد صاف کر کے مجھے پیش کر دیتے، مجھے بڑی شرم محسوس ہوتی، میں وہ ٹکڑا انہیں دینے پر اصرار کرتا لیکن وہ اس ٹکڑے کو ہرگز نہ لیتے اور بضد ہوتے کہ میں ہی اسے کھاؤں۔ ابوعزیز کفار کے لیے ایک اہم شخص تھا۔ نصر بن حارث کے قتل کے بعد مشرکین مکہ کے لشکر کا یہی علمبردار تھا۔ جب

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابویسر انصاری کو کہا کہ اسے خوب کس کر باندھو، ابو عزیز نے اپنے بھائی کی بات سن کر اسے کہا: میرے بھائی میرے لیے تم اسے یوں وصیت کر رہے ہو، تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میرا بھائی یہ ہے، تم میرے بھائی نہیں ہو۔ سب سے گراں قیمت فدیہ ابو عزیز کی والدہ سے طلب کیا گیا، اسے کہا گیا کہ اپنے بیٹے کو آزاد کرنا چاہتی ہو تو چار ہزار درہم ادا کرو۔ اس نے یہ فدیہ ادا کیا اور اپنے بیٹے کو آزاد کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ابو عزیز (ایک قول کی بنیاد پر) مشرف باسلام ہو گیا۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۳، ص: ۳۸۳، المغازی، ج: ۱، ص: ۱۲۰، البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۱۹۱)

ابو عزیز مومن یا کافر: ابو عزیز بعض حضرات (ابن عساکر) کے نزدیک حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سگا بھائی ہے اور بعض (ابن کثیر) کے نزدیک باپ شریک بھائی ہے۔ یہ ایمان لایا یا نہیں، اس میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے، خلیفہ بن خیاط نے ابو عزیز (جس کا نام زرارہ ہے) کو صحابہ میں شمار کرایا ہے۔ ابن کلبی اور زبیر نے کہا: ابو عزیز احد کے دن حالت کفر میں قتل کیا گیا۔ ابو نعیم نے ابن مندہ کے حوالے سے کہا: میں اس کے اسلام کو نہیں جانتا۔ ابن اسحاق نے احد میں قتل ہونے والے کافروں کے نام جو شمار کرائے ہیں، اس میں ابو عزیز کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن اتنا طے ہے کہ ابو عزیز احد میں مشرکین کی طرف سے شریک تھا اور مشرکین کا علمبردار تھا۔ (سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، ص: ۱۵)

علامہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ ابو عزیز کو شرف صحابیت بھی حاصل تھا اور شرف سماعت بھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (اسد الغابہ تذکرہ ابو عزیز بن عمیر)

حضرت مصعب کا خاندان میدان احد میں: جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو نصرت عظیمہ سے سرفراز فرمایا تھا اور کفار قریش کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، ساتھ ہی کئی صنادید قریش بھی میدان بدر کی خوراک بنے تھے، یہ سب کچھ کفار بد اطوار کیسے برداشت کر لیتے؟ مکہ پہنچتے ہی انہوں نے انتقامی جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی، تقریباً ایک سال تک جنگی تیاریوں میں مصروف رہنے کے بعد شوال ۳ھ میں کفار ایک بڑی

جنگ کے ارادے سے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے بڑے لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں آئے تھے۔ وہ جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے کچھ عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے، جو مشرکہ عورتیں میدان احد میں آئی تھیں ان میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کافرہ والدہ خناس بنت مالک بھی تھی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سگا بھائی ابو عزیز بھی شرکائے جنگ میں موجود تھا، یہ وہی ابو عزیز ہے جو جنگ بدر میں قید ہوا تھا اور ان کی والدہ نے موٹی رقم ادا کر کے اس کو آزاد کرایا تھا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے اصحاب سے مشورہ فرما کر احد کی طرف نکلے، آپ کے ساتھ آپ کے جاں نثار صحابہ تھے اور بعض صحابیات عورتیں بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ ان عورتوں میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ حضرت حمنہ بنت جحش بھی تھیں۔ حضرت حمنہ پیاسوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کو مرہم لگانے پر مامور تھیں۔

(سیرۃ الصحابی الجلیل، ص: ۴۳، المغازی، ج: ۱، ص: ۲۵۰)

حضرت مصعب میدان احد میں اسلام کے علم بردار: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میدان احد میں پہنچے، صحابہ کرام کی جنگی صفوں کو مرتب کیا، پورے اہتمام کے ساتھ صفوں کا جائزہ لیا، کوئی بھی صحابی صف کے آگے یا پیچھے ہوتے تو حضور ان کو صحیح جگہ پر کھڑا کر دیتے۔ مومنین پورے اخلاص کے ساتھ اپنے آقا کی معیت میں سرفروشی کے لیے صف بستہ کھڑے ہیں۔ اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے چہروں پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ اس مرد میدان کے مبارک نام کا اعلان کیا جائے جس کے ہاتھوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنا جنگی علم عطا فرمائیں گے۔ حضور نے فرمایا: مشرکین کا علمبردار کون ہے؟ جواب ملا: بنو عبددار کفر کے علمبردار ہیں۔ حضور نے فرمایا: ہم بھی اسی قبیلے کے ہاتھوں اسلام کا علم عطا فرمائیں یہی لائق تر ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ندا فرمائی: ”این مصعب بن عمیر“ مصعب بن عمیر کدھر ہیں؟ ادب کے پیرائے میں ڈھلی ایک آواز ابھری لبیک یا رسول اللہ! جاں نثار حاضر ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلامی

علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں کو سونپ دیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ علم کو لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو گئے۔

(المغازی، ج: ۱، ص: ۲۲۱)

علم اسلام کی حفاظت اور شوق جہاد: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عظیم اسلامی علم کو تھامے ہوئے میدان احد میں مرد میدان کی حیثیت سے حاضر ہیں، جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے، اللہ تعالیٰ کی مدد سے مجاہدین اسلام نے اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے کفار کو بھاگنے پر مجبور کر دیا، میدان مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا لیکن تیر انداز دستے کی خطائے اجتہادی سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ پیچھے سے ہونے والے ناگہانی حملے نے مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی، صحابہ کرام منتشر ہو گئے۔ اس افراتفری کے عالم میں بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ داد شجاعت دیتے رہے، علم اسلام کی حفاظت کرتے رہے اور ساتھ ہی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدافعت میں جان چھڑکتے رہے، جب تک آپ کے جسم میں جان رہی آپ نے اسلام کے علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔

شہادت: انہیں سخت لمحات میں قریش کا ایک ماہر جنگ جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے لگا ہوا تھا، وہ آپ کو شہید کرنا چاہتا تھا لیکن مصعب سمجھ کر نہیں بلکہ وہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گمان کر رہا تھا۔ قریشی جنگ جو جس کا نام ابن قمنہ تھا حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ آور ہوا اس نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے داہنے ہاتھ کو نشانہ بنایا اور اس کو کاٹ دیا، اس وقت حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان پر قرآن پاک کے یہ الفاظ جاری تھے: ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ“ (آل عمران ۱۴۴) ہاتھ کٹتے ہی آپ نے علم بائیں ہاتھ میں تھام لیا اب اس مشرک نے آپ کے بائیں ہاتھ کو نشانہ بنایا اور اسے بھی کاٹ دیا، آپ ابھی بھی بدستور مذکورہ آیت کی تلاوت کر رہے تھے، آپ نے کمال بہادری و ہوشیاری دکھاتے ہوئے دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کا حلقہ بنا کر علم کو سنبھال لیا، جب

مشرک نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو تیسرا حملہ تلوار سے نہیں بلکہ نیزے سے کیا، نیزہ پوری قوت سے مارا گیا تھا جس سے بڑا کاری زخم لگا، یہی زخم آپ کے لیے پیغام اجل ثابت ہوا اور آپ زمین پر آگئے، روح قفص عنصری سے پرواز کر گئی، علم ہاتھ سے چھوٹ گیا اور آپ جام شہادت سے سیراب ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۲، سیرۃ الصحابی الجلیل، ص: ۴۵)

حضور سمجھ کر قتل کیا: ابن قمنہ لیشی نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پے در پے وار کیے تھے، اس کے پیچھے ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مصعب نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سمجھ رہا تھا، اسی لیے جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو یہ خبیث النفس، بد بخت مشرک بھاگ کر اہل قریش کے پاس پہنچا اور انہیں خبر دی کہ میں نے محمد کو قتل کر دیا ہے، اس کے بعد کفار نے شور مچا دیا کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قتل کر دیے گئے ہیں۔ (معاذ اللہ)

(البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۳۶۷، سیرۃ الصحابی الجلیل، ص: ۴۵، اکامل فی التاریخ، ج: ۲، ص: ۵۰)

حضرت مصعب کی جان حضور پر قربان: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت حضور کی حفاظت کرتے ہوئے ہوئی، اس کی تفصیل اس طور پر ہے کہ مکہ میں ابی بن خلف نے قسم کھائی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قتل کرے گا، جب یہ بات حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معلوم ہوئی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: بیل انا اقتله ان شاء اللہ، وہ مجھے نہیں ان شاء اللہ میں اسے قتل کروں گا۔ جنگ احد میں ابی بن خلف زرہ پوش ہو کر میدان میں اس نعرے کے ساتھ اتر ا ”مان جوت ان نجا محمد“ اگر محمد بچ گئے تو میرے لیے نجات نہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر حملہ کر دیا، وہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتا تھا (العیاذ باللہ تعالیٰ) ان ہلاکت خیز لمحات میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کی حفاظت کے لیے آگے بڑھے اور جان کی بازی لگا دی، جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری توجہ حضور کی حفاظت پر لگی ہوئی تھی ابن قمنہ نے آپ کو شہید کر دیا، جب حضرت مصعب رضی

اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابی بن خلف کی ہنسی پر اپنے نیزے سے وار کیا ابی بن خلف کی ہنسی زرہ سے چھپ نہ سکی تھی، نیزے کی خراش ابی کو لگی، ابی گھوڑے سے نیچے گرا، نیزہ اتنا ہلکا لگا تھا کہ اس کے جسم سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا تھا لیکن وہ زمین پر گر کر نیل کی طرح دھاڑیں مار رہا تھا، اس کے ساتھیوں نے آکر اسے اٹھاتے ہوئے کہا کہ اتنا کیوں چیخ رہے ہو؟ ڈرنے کی بات نہیں یہ تو صرف کھرونج لگی ہے ساتھیوں کی بات سن کر ابی نے کہا: تمہیں یہ معلوم نہیں کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ فرما چکے ہیں کہ میں ابی کو قتل کروں گا۔ اے میرے دوستو! سنو یہ خراش جو مجھے لگی ہے اگر یہی خراش اس وادی میں موجود تمام لوگوں کو لگ جاتی تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچتا، سب کے سب موت کے گھاٹ اتر جاتے۔ یہ ابی کے آخری الفاظ تھے اس کے بعد وہ مر کر جہنم رسید ہو گیا۔

(البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۴۰۳)

اس روایت کی وجہ سے بعض حضرات نے ابی بن خلف کو ہی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل قرار دیا ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۳۶۷)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جذبہ جاں نثاری کو سلام، حضور پر جان قربان کرنے کا یہ جذبہ تاریخ صحابہ کے سوا کہاں ملے گا؟ اور جہاں ملے گا تو وہ صحابہ کرام کی اتباع میں ملے گا، ان کی تربتوں سے آج بھی یہ آوازیں گونج رہی ہیں۔

کروں تیرے نام پہ جاں فدا
نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا
کروں کیا کروں جہاں نہیں

(اعلیٰ حضرت)

قارئین کرام! حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مار پر غور کیجیے، ایک ہلکی سی خراش کا عالم یہ ہے کہ ابی بن خلف نیل کی طرح دھاڑیں مار مار کر تڑپ تڑپ کر جہنم رسید ہوا، کہیں کاری

زخم حضور کے ذریعے لگا ہوتا تو کیا ہوتا؟

غضب سے ان کے خدا بچائے جلال باری عتاب میں ہے
حضرت مصعب کے بعد علم کس کے ہاتھ میں: جب حضرت مصعب بن
 عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو علم کس نے سنبھالا؟ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔
 ایک روایت یہ ہے کہ علم سنبھالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 کی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا اور اسی فرشتے نے علم اسلام کو سنبھال لے رکھا، اس کی تائید
 اس بات سے ہوتی ہے کہ دن کے آخری وقت پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
 ارشاد فرمایا: مصعب! آگے آؤ، تو شکل بشر میں نازل شدہ فرشتے نے عرض کیا: ”لست
 بمصعب“ میں مصعب نہیں ہوں! سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہچان لیا کہ یہ مصعب
 نہیں بلکہ ملک مقرب ہے، اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 کی عزت افزائی فرمائی ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمین پر
 گر گئے تو بنو عبد دار کے دو شخص علم سنبھالنے کے لیے جھپٹے، ایک کا نام سویط بن سعد تھا،
 دوسرے ابوالروم بن عمیر (حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی) تھے۔
 حضرت ابوالروم بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے علم کو سنبھال لیا، یہ علم اس وقت تک انہیں کے
 ہاتھوں میں رہا جب تک مسلمان مدینہ میں داخل نہیں ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۲)
 دوسری روایت میں ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے
 بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلامی علم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا
 فرمادیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۳۶۷)

عرب کے چاند حضرت مصعب بن عمیر کے سرہانے آئے ہیں: جنگ
 اختتام کو پہنچی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میدان جنگ کا جائزہ لیا، ان اصحاب پر
 نظر فرمائی جنہوں نے اس میدان میں اپنی جانوں کے بدلے جنت خرید لی تھی۔ حضور چلتے

چلتے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نعش پر آ کر ٹھہر گئے، دیکھا کہ غلام وفادار اپنے چہرے کے بل خون میں لت پت راہ خدا میں شہید ہوا پڑا ہے۔ حالت دیکھ کر زبان پاک پر آیت کریمہ جاری ہو گئی 'مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رَجُلٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ' ترجمہ: مومنین میں کچھ وہ ہیں جنہوں نے رب سے کیے گئے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر شہدا کی شہادت پر مہر تصدیق لگائی، فرمایا: اللہ کا رسول گواہی دیتا ہے کہ تم سب کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مرتبہ شہادت حاصل ہے، یہ کہہ کر آپ مومنین سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: آؤ! ان شہدائے راہ خدا کی زیارت کر لو، ان کو سلام کر لو۔

عاشق کا منہ چھپانا: شہادت کے بعد زمین پر منہ کے بل پڑے رہنے سے ایسا لگتا ہے کہ عاشق صادق نے قصداً حضور سے منہ کو اس لیے چھپالیا تھا کہ حضور ان کو دیکھ کر غمگین نہ ہو جائیں، عاشق کبھی بھی اپنے محبوب کو غمگین نہیں کرنا چاہتا یا شاید اس لیے کہ وہ حضور پر جان قربان کر کے حضور سے شرمناک تھے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ (رجال حول الرسول، ص: ۳۰)

شہدا، سلام کا جواب دیتے ہیں: آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان کو الوداعی سلام کر لو۔ اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، قیامت تک جو مسلمان بھی سلام کرے گا یہ سلام کرنے والوں کا جواب دیتے رہیں گے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۳، اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۷)

شہدائے احد کے تصرفات سے متعلق مزید معلومات کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تذکرہ پڑھیں:

تم سے حسین کوئی نہ تھا: نعش مبارک اور انداز شہادت دیکھ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بچپن یاد آ گیا، فرمایا: میں نے تم کو مکہ میں دیکھا تھا، تم سے خوش پوش و جامہ زیب کوئی نہ تھا، بالوں کے بناؤ و سنگار سے تم حسن میں یکتائے روزگار تھے لیکن آج راہ خدا میں تمہارے بال بکھرے ہوئے ہیں اور تمہارے

جسم پر ایک چادر کے سوا کچھ نہیں بچا ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۳)

دُنیا سے کچھ حاصل نہیں کیا: کتنے غم گین اور پرالم ہیں حضور کے وہ الفاظ جو سرکار ابد قرار نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمائے، بوقت شہادت حضور کی زبان پر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بچپن کا تذکرہ اس بات کی سچی گواہی دیتا ہے کہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری زندگی حضور کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، ایسا کیوں کر نہ ہوتا، حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ عز و جل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا کے حصول اور خدمت دین کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ زندگی بھر اسلام کی تبلیغ فرمائی، زبان و بیان، کردار و عمل اور افکار و خیالات سے تبلیغ کرتے کرتے آج شہید راہِ محبت خون کے آخری قطرے سے احد کی سرزمین پر پیغامِ جاں بازی و جاں نثاری کی آخری تحریر لکھ کر جنت کی نیند سو گیا ہے۔ سابقین اولین صحابہ کرام کو حدیثِ پاک کی رو سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے میں وہ لوگ ہیں جو سخت ترین دور میں اسلام لائے، کفار کے ظلم و ستم جھیلے، تنگ دست رہے، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، کبھی بھی راحت عیش سے بغل گیر نہ ہوئے پھر بھی ہر لمحہ صابر و شاکر رہے، اعلاء کلمۃ الحق کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور اسی حال میں دنیا چھوڑ چلے۔ دوسرے گروہ میں وہ حضرات ہیں جو پریشانیاں جھیلنے اور مصیبتوں پر صبر کرنے میں گروہ اول سے کسی طور پر کم نہیں، ہاں بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں فارغ البالی عطا فرمائی اور یہ لوگ تنگ دستی کے قید خانے سے نکل کر فراخ دستی اور رزق کی کشادگی کی آزاد فضا میں آباد ہو گئے چنانچہ حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

ہم نے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی اور یہ ہجرت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تھی، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہمارا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہو گیا۔ ہم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا سے جا چکے اور انہوں نے اپنے اجر سے کچھ حاصل نہیں کیا، جنہوں نے کچھ حاصل نہیں کیا ان میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور

ہم میں سے بعض ایسے ہیں جن کا پھل پک گیا وہ اسے چن چن کر کھاتے ہیں۔

(بخاری، کتاب الحجۃ باب اذا لم یجد کفنا)

اس حدیث پاک سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دنیا کے عیش و آرام سے بغیر کچھ حاصل کیے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔

بکھیر و تکفین: اسلام کے سفیر اول اور شہید راہ محبت پر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعزیتی کلمات کہے، کلمات کی اثر انگیزی ماضی کی یاد دہانی، اسلام کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی اور سامنے پڑی نعش کی خواری دیکھ کر صحابہ کرام آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۳۰)

لیکن شہیدوں کو حتی الامکان بے گور و کفن تو چھوڑا نہیں جاسکتا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ کرام نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کفن و دفن کی تیاری کی، کفن کے لیے صرف ایک چادر تھی وہ بھی اتنی کشادہ نہ تھی کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پورے جسم کو ڈھانک سکے مگر مجبوری یہ ہے کہ کوئی دوسری چادر دستیاب نہیں کہ اس کو ملا کر پورے جسم کا ستر کیا جاسکے، حالات کی تنگی اور مسلمانوں کی مفلسی کی سچی تصویر دیکھنی ہو تو بخاری شریف کی یہ حدیث پڑھیے!

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ احد میں شہید ہوئے (کفن کے لیے) ایک چادر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر ہم لوگ (صحابہ کرام) ان کے سر کو ڈھانکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا (یہ بے سرو سامانی دیکھ کر) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس چادر سے مصعب کے سر کو ڈھانک دو اور پیروں کو چھپانے کے لیے اذخر گھاس ڈال دو۔ (بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ احد)

نماز جنازہ: شہدائے احد کی نماز جنازہ کی کیفیت آپ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تذکرے میں پڑھ آئے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی گئی پھر ایک ایک شہید کو لایا جاتا اور حضرت حمزہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے برابر میں رکھ کر نماز جنازہ پڑھی جاتی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰)

تذقین: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے قبر کھودی گئی اور نماز جنازہ کے بعد قبر میں دفن کر دیا گیا۔ آخری آرام گاہ میں اتارنے کے لیے ان کے بھائی ابوالروم بن عمیر ان کی قبر میں اترے، عامر بن ربیعہ اور سویط بن سعد ان کے ساتھ رہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۱۶)

تاریخ شہادت: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کے ۳۲ مہینے بعد جنگ احد میں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر چالیس سال یا کچھ زیادہ تھی۔ (ایضاً)

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت جنگ احد میں ہوئی، البتہ جنگ احد کی تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے اس سلسلے میں چند اقوال ہیں: ۳ھ، سات شوال، گیارہ شوال، پندرہ شوال۔ لہذا انہیں میں سے کوئی ایک حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تاریخ شہادت ہے۔ (امتاع الاسماع، ج: ۱، ص: ۱۱۳)

نزول قرآن: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل پر اللہ تعالیٰ کی کتاب ناطق ہے، سورہ نازعات میں ”وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ“ جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی ٹھکانا ہے۔

بعض مفسرین کے بیان کے مطابق یہ دونوں آیتیں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں نازل ہوئیں۔ مفسر شہیر حضرت علامہ قرطبی فرماتے ہیں: دونوں آیتیں (مذکورہ آیتیں اور اس سے پہلے والی آیتیں) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بھائی عامر بن عمیر کے حق میں نازل ہوئیں۔ (یہاں پر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی کا نام عامر ذکر کیا گیا ہے جب کہ اکثر مؤرخین نے بھائی کا نام عامر کی جگہ زرارہ لکھا ہے۔)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ”فَأَمَّا مَنْ ظَلَمَ“

جس نے سرکشی کی، اس سے مراد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھائی ہے جسے بدر کے دن قید کیا گیا، حضرات انصار کرام نے اسے پکڑا، اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ جواب دیا: میں مصعب بن عمیر کا بھائی ہوں، یہ سن کر انصار نے اس کی بندشیں نہیں کھینچیں اور اچھے طریقے سے اپنے پاس ٹھہرائے رکھا، صبح کو حضرات انصار نے پورا قصہ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اپنا بھائی ماننے سے انکار کر دیا، فرمایا: وہ میرا بھائی نہیں (کافر میرا بھائی نہیں ہو سکتا) تم اپنے قیدی کو مضبوطی کے ساتھ کس کے باندھو، اس لیے کہ بطلی والوں میں سب سے زیادہ مال و زیور اس کی ماں کے پاس ہی ہے۔

اور ”وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ“ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا، اس سے مراد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگ احد میں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تنہا حفاظت فرمائی، جب صحابہ کرام منتشر ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں بہت سارے تیر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بدن میں پیوست ہو گئے تھے جس سے آپ شہید ہوئے، جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو خون میں لت پت دیکھا تو فرمایا: مصعب کو میں نے دو قیمتی چادروں میں دیکھا تھا جس کی قیمت کا لوگ اندازہ نہیں کر سکتے تھے اور ان کے جوتے کے تسمہ میں سونے کی کاریگری ہوتی تھی۔ (تفسیر قرطبی، سورۃ النازعات، آیت: ۳۷-۳۸، التکت والعین ایضاً)

فضائل: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو اہل اسلام نے ہمیشہ بھاری بھر کم القاب سے یاد کیا اور یاد کرتے رہیں گے، انہیں مصعب خیر، قاری، مقری، سفیر اول اور نمائندہ رسول کے مبارک القاب سے پکارا جاتا ہے، سابقین اولین میں نمایاں مقام کے حامل ہیں، اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ دین میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ مدینہ طیبہ کی طرف حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تبلیغ اسلام اور تعلیم دین کے لیے بھیجا ان کی علمی پختگی، اخلاق کی بلندی، مزاج کی سنجیدگی اور قرأت قرآن کی عمدگی کا منہ بولتا ثبوت ہے، مدینہ طیبہ کی سرزمین کو دار ہجرت کے طور

پر ہموار کرنا ان کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا: اگر کسی کی وجہ سے ایک انسان ہدایت پا جائے تو یہ اس کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں میں اسلام قبول کرنے والے تاریخ اسلام میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں جن کا شمار دشوار ہے۔

امام ابن سعد وغیرہ کے بیان کے مطابق انصار مدینہ میں اگر چند کو چھوڑ دیا جائے تو باقی سب کے سب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لائے، اہل مدینہ کے امام اول ہونے کا شرف انہیں کو حاصل ہے، مدینہ طیبہ میں جمعہ کے بانی بھی یہی ہیں۔ انہیں تمام فضائل و مناقب کو دیکھ کر علامہ ابن اثیر نے فرمایا: ”و کفی بذالك فخر و اثرافی الاسلام“ اسلام میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ کارنامے رہتی دنیا تک فخر کے لیے کافی ہیں۔ (اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۱۷۶)

مختصر یہ کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فضائل و مناقب کا وہ درخشندہ آفتاب ہے کہ جس کی ضیا پاشیوں سے قیامت تک کے مسلمان فیضیاب ہوتے رہیں گے لیکن جب جب اس آفتاب عظمت نشان کی حقیقت و کنہ کا ادراک کرنا چاہیں گے تو اس کی درخشندگی کے سامنے ادراک کرنے والوں کی نظریں چندھیا کر رہ جائیں گی اور وہ کما حقہ ان کی عظمت کا پتہ نہ لگا سکیں گے۔

اصحاب رسول کی نظر میں: یوں تو تعلیم نبوی سے سارے مسلمانوں کے سینوں میں اپنے ہر بھائی کے لیے اخوت اسلامی کے چشمے ابلتے تھے، بغض و حسد اور کینہ و عداوت تقریباً ناپید ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود اصحاب رسول کی نظر میں بعض صحابہ کرام کا مقام بہت ہی نمایاں تھا، انہیں میں سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں، صحابہ آپ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے، آپ کی اسلامی خدمات اور دینی قربانیوں کو بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھتے، ساتھ ہی یہ حضرات آپ کی سیرت سے بے حد متاثر تھے۔ ملاحظہ ہوں! چند نمونے:

حضرت عامر بن ربیعہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ کسی کو خلیق نہیں پایا اور نہ ان سے زیادہ کم اختلاف کرنے والا انسان دیکھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مثل کسی کو نہ دیکھا، گویا کہ وہ جنتی اشخاص میں سے ایک تھے۔

(مشاہیر الصحابہ، ج: ۱، ص: ۷۲)

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ایک بار کھانا پیش کیا گیا آپ کھانے کو دیکھ کر رونے لگے پھر فرمایا: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا اور وہ مجھ سے بہتر تھے، انہیں ایک چادر میں کفن دیا گیا وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اگر ہم ان کے پاؤں ڈھکتے تھے تو سر کھل جاتا اور اگر سر ڈھکتے تو پاؤں کھل جاتے۔ (بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ احد)

صحابہ کرام کے تاثرات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صحابہ کرام کی نظر میں ایک خاص مقام حاصل تھا، جو انہیں خوف خدا، زہد و تقویٰ، خدمت دین اور محبت رسول کے اعتبار سے دیگر صحابہ سے ممتاز کرتا ہے۔

ازواج و اولاد: حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حمہ بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ نکاح کیا، حضرت حمہ بنت جحش ام المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن ہیں۔

(الکشف فی معرفۃ من لا یروای فی الکتاب السنۃ، ج: ۲، ص: ۲۷۲، تہذیب التہذیب، ج: ۷، ص: ۱۶)

حضرت حمہ کے بطن سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیٹی پیدا ہوئی جن کا نام زینب تھا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۱۰۸)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی حضرت حمہ شیر دل عورت تھیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جنگ احد میں مریضوں کی تیمارداری کرتی تھیں اور انہیں پانی پلاتی تھیں۔ جنگ احد کے خاتمہ کے بعد جب ان سے جنگ کے شہداء کی تفصیل بیان کی گئی

تو صبر و غم کی ملی جلی کیفیت کا مجسمہ بنی رہیں۔ حضرت ابن اسحاق روایت فرماتے ہیں کہ جب حضرت حمزہ کو ان کے بھائی عبد اللہ بن جحش کی شہادت کی خبر دی گئی تو ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھا اور دعائے مغفرت کی پھر ان کے ماموں حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی شہادت کی خبر سنائی تو پھر آپ نے ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھ کر دعائے مغفرت کی پھر آپ کے شوہر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی خبر دی گئی تو آپ بلبل کر چیخ پڑیں، یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورت کی زندگی میں شوہر کی اہمیت اور مقام بہت بلند ہے کیوں کہ حمزہ اپنے بھائی اور ماموں کی خبر شہادت سن کر ثابت رہیں اور شوہر کی شہادت کی خبر سن کر ٹپ اٹھیں۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۴۲۸)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت حمزہ سے حضرت طلحہ تیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکاح فرمایا۔ (الکشف من لہ روایۃ فی الکتاب السنۃ، ج: ۲، ص: ۲۷۲)

یہ تھی عظیم المرتبت صحابی رسول حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درخشندہ سیرت طیبہ جس کی سطر سطر جانی، مالی، روحانی اور جسمانی قربانی کی گواہی دے رہی ہے، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دی اور اسلام کی راہ میں ہر وہ شے داؤں پر لگا دی جس کے وہ مالک تھے اور یہ سب چشمہ نبوت کی فیضیابی کا اثر تھا۔ ہزاروں سلام ہوں نبی آخری الزماں پر جنہوں نے ایسے ایسے ہیرے تراشے اور ہزاروں سلام ہوں صحابہ کرام پر بالخصوص حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جنہوں نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع میں اپنی جان کا سودا کر دیا۔

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود

ان کے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام

جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر

اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ اقدار اور مکارم اخلاق کے ساتھ مبعوث فرمایا، حضور کی بعثت کائنات کے انقلاب کی ضامن تھی، ظلمات کو نور، شرک کو ایمان، کفر کو ایقان، بدی کو نیکی، جہل کو علم، غضب کو حلم، عداوت کو محبت، نفرت کو الفت اور تکبر کو عجز و انکسار کے پیرائے میں ڈھلنا مقدر ہو چکا تھا، اونچ نیچ اور چھو چھوت کے وہ جراثیم جنہوں نے عالم کو مہلک امراض میں مبتلا کر رکھا تھا، ان سے اجسام و اذہان کی پاکی کا وقت بہت قریب آچکا تھا، اب عزت و تکریم کو محض حسب و نسب کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکے گا بلکہ ”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ“ کا غلغلہ بلند ہونے والا ہے، اب فقط ظاہری حسن و جمال ہی دامن دل کشید کرنے کے لیے کافی نہ ہوگا بلکہ کسی نگاہ کا مرکز توجہ بننے کے لیے پہلے حسن سیرت کے جاذب نظر خزینے درکار ہوں گے۔ انقلاب ایسا انقلاب غلام جنہیں عزت و وقار کی ہوا بھی نہ لگی وہ معظم بن جائیں گے، ایسے معظم کہ شرفاء ان کی معیت کو اپنے لیے وجہ افتخار سمجھیں گے، امرائے وقت انہیں اپنا سید اور آقا کہہ کر پکاریں گے، ہاں، ہاں! یہ خیال نہیں حقیقت ہے، بیان نہیں اصلیت ہے، افسانہ نہیں واقعہ ہے۔

وہ دیکھیے مکہ کا ایک غلام جسے اس کے آقانے مار مار کر ادھمرا کر دیا ہے، ایک شریف الخصال باوقار شخص اس کا سودا کر رہا ہے اور کئی گنے داموں پر اس کو خرید لیتا ہے، سودا کتنا عظیم ہے کہ کائنات کا سلطان خریدار سے کہتا ہے: اس سودے میں مجھے بھی اپنا شریک بنالو، خریدار نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کر دیا، اس آزادی پر اسلام کا دوسرا خلیفہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے: ہمارے ایک آقانے دوسرے آقا کو آزاد کیا ہے، کل کا غلام آج کا آزاد،

اب رب کے محبوب کی غلامی میں آچکا ہے، آقا کو غلام کا حسن معنوی خوب پسند آیا، وہ نظر انتخاب میں سما گیا، اب فیض بار جو دونوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اسلام کا نقیب اول یعنی مؤذنین کا سرخیل بنا دیا گیا، اسلام کا پہلا مؤذن بننا نصیب ہوا، فتح مکہ کے وقت شہنشاہ کونین کا ہم رکاب رہا، شاہ بطحا کے ساتھ دخول کعبہ سے سرفراز ہوا اور جب کعبہ کے چھت سے توحید و رسالت کا نعرہ بلند کرنے کا وقت آیا تو باوجود یکہ عرب کے سر آورده افراد صحن کعبہ میں موجود تھے، حکم اذان اسی غلام کا نصیب بنا پھر وہ آقا کی غلامی میں ترقی کرتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ نبوت کے کانوں نے اس کے قدموں کی آہٹ کو جنت میں سماعت کر لیا اور میدان محشر میں لاہوتی ترانہ گنگنانے کا موقع بھی اسی کے سپرد کر دیا۔ اللہ اللہ کیسا انقلاب کل لوگ جسے کوڑے لگاتے نہیں تھکتے تھے، آج اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے نہیں تھکتے، یقیناً آپ جان چکے ہیں کہ ہم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر جمیل کر رہے ہیں۔

نام و نسب: آپ کا نام بلال والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ ہے۔

آپ کی کنیت کے سلسلے میں مؤرخین نے کئی اقوال نقل فرمائے ہیں: (۱) ابو عبد اللہ (۲)

ابو عبد الکریم (۳) ابو عبد الرحمن (۴) ابو عمرو۔ (استیعاب، ج: ۱، ص: ۸۱، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۵)

جمال بلال کے مصنف نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حوالے سے آپ کی کنیت

ابو خازن بھی نقل فرمائی ہے۔ (جمال بلال، ص: ۸۰)

اعزازات و القابات: جمال بلال کے مصنف نے کئی معتبر حوالوں سے آپ

کے متعدد القاب بیان فرمائے ہیں: رجل من اهل الجنة، سابق الحبشة، الصادق، اندی صوتاً۔ یہ تمام القاب آپ کو بارگاہ رسالت سے میسر آئے، سیدنا ابو بکر صدیق کی طرف سے آپ کو خازن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاروق اعظم کی جانب سے سیدنا، حسنة من حسنات ابی بکر کے اعزازی القاب نصیب ہوئے۔

اسلاف امت کی طرف سے بھی آپ کو بہت سے اعزازی القاب سے نوازا گیا،

ان میں سے چند یہ ہیں: مؤذن الرسول، متجدد، عبد الکریم، سید المؤمنین، صاحب الغزہ،

طاہر القلب وغیرہ۔ (جمال بلال، ص: ۷۹)

پیدائش: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش کب ہوئی یہ بات صاف طور پر کتب سیر و تاریخ میں مذکور نہیں، ہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش کے حساب سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش کا سنہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے وہ اس طور پر کہ کتب تاریخ میں یہ روایت کثرت کے ساتھ درج ہے ”کان بلال طرب ابی بکر“ حضرت بلال، حضرت ابوبکر کے ہم عمر تھے اور حضرت ابوبکر واقعہ فیل سے تین سال بعد پیدا ہوئے، اس اعتبار سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش واقعہ فیل کے تقریباً تین سال بعد ہوئی۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۷۵، معرفۃ الصحابۃ لابن نعیم ج: ۱، ص: ۳۷۳، تہذیب التہذیب باب من اسمہ بلال، ج: ۱، ص: ۵۰۳، تہذیب الکمال، ج: ۴، ص: ۲۹۰)

جائے پیدائش: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش کہاں ہوئی؟ اس سلسلے میں کتابوں میں سراً، مکہ، حجاز اور حبشہ کے نام درج ہیں جس میں سراً کو اکثر مؤرخین نے مضبوطی کے ساتھ بیان فرمایا ہے پھر علاقہ سراً کہاں واقع ہے؟ اس کو لے کر علامہ ابن عساکر نے مصر اور شام کی نشان دہی فرمائی لیکن تاریخ دمشق کے محشی نے مصر والے قول کو رد کر دیا۔ محقق علی الاطلاق علامہ عبدالحق محدث دہلوی نے سراً سے مراد وہ علاقہ لیا جو مکہ اور یمن کے درمیان ہے۔ اس بحث کو علامہ محمد علی رضا القادری نے کافی تفصیل سے لکھا ہے لہذا قارئین کے اطمینان کے لیے ہم اس بحث کو نقل کر رہے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں:

جائے ولادت میں اختلاف: حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے ولادت کے سلسلے میں کوئی بھی قول صراحت سے منقول نہیں چنانچہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آپ حبشہ میں پیدا ہوئے ہیں یا مکہ میں یا پھر کسی اور جگہ۔ لیکن تاریخ ابن عساکر، عمدۃ القاری، معرفۃ الصحابہ، الاستیعاب، مجمع الزوائد، المعجم الكبير للطبرانی، الزرقانی علی المواہب، المستدرک، الاصابہ، اسد الغابۃ، مدارج النبوة، تہذیب التہذیب، سیر اعلام النبلاء و تاریخ الاسلام للذہبی میں محمد بن

سعد، ابو عبد اللہ بن مندہ، احمد بن عبد اللہ بن عبد الرحیم، احمد بن محمد بن حسین الکلاباذی، یحییٰ بن بکیر، محمد بن عمر، محمد بن اسحاق المدائنی اور ابو نعیم وغیرہم کے اقوال بکثرت منقول ہیں کہ ”کان بلال بن رباح مولیٰ ابی بکر الصدیق من مولدی السراة“ اور اسد الغابہ میں ابن اثیر، السیرۃ الحلبیہ میں امام حلبی، الاستیعاب میں ابن عبد البر اور الاصابہ میں ابن حجر یہ بھی کہتے ہیں کہ ”قیل: من مولدی مکة“۔ اسی طرح امام ذہبی ”السیر“ اور ”التاریخ“ میں یہ بھی کہتے ہیں ”یقال انه حبشی وقیل من مولدی الحجاز“ چنانچہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے ولادت کے سلسلے میں چار قسم کے اقوال ہمارے سامنے ہیں: (۱) سراة (۲) مکہ (۳) حجاز (عرب کا ایک معروف صوبہ جس میں مکہ و مدینہ و نواح شامل ہیں اور جس کا محل وقوع سراة اور نجد (یعنی موجودہ الریاض) کے درمیانی علاقے پر محیط ہے) (۴) حبشہ۔

ان میں سب سے مضبوط و مشہور اور رائج قول ”سراة“ کا ہے، یعنی حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سراة میں پیدا ہوئے کیونکہ مکہ حجاز یا حبشہ میں ولادت پر مذکورہ بالا اقوال کمزور ہیں جنہیں ”قیل“ اور ”یقال“ سے بیان کیا جاتا ہے، جن کا قائل معلوم نہیں چنانچہ اس پر ان کمزور اقوال کے علاوہ کوئی ٹھوس دلیل بصورت روایت بھی نہیں۔ لہذا ”سراة“ والے قول کو ترجیح ہوگی جسے اصحاب سیر نے بھی اپناتے ہوئے ترجیحاً نقل کیا ہے پھر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”سراة“ سے کیا مراد ہے؟ تو اس حوالے سے مزید کچھ کہنے سے پہلے میں ابن عساکر کے دو نقل کردہ قول پیش کرتا چلوں چنانچہ ایک قول یوں ہے ”من مولدی السراة من اهل مصر“ (یعنی حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سراة اہل مصر کے مولدین میں سے تھے) اور دوسرا قول یوں نقل کرتے ہیں کہ ”کان من مولدی السراة یعنی بالشام“ (آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سراة یعنی شامی سراة کے مولدین میں سے تھے) ان دونوں قولوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصر کے علاقے ”سراة“ میں پیدا ہوئے یا پھر ملک شام کے علاقے ”سراة“ میں۔

رفع ابہام: لیکن حق یہ ہے کہ سراة (سین کے زبر کے ساتھ) یوں تو پہاڑوں وغیرہ پر مشتمل ہر بلند مقام یا وسیع وعریض میدان کو کہا جاتا ہے، اس لحاظ سے ”سراة“ نامی علاقے عرب میں صرف دو ہی نہیں تھے بلکہ ابن منظور، مرتضیٰ زبیدی اور ابن سیدہ جیسے ماہرین لغت کے مطابق عرب میں سراة الطائف، سراة ثقیف، سراة فہم، سراة عدوان، سراة الازد، سراة الحرة، سراة بجیلہ، سراة زہران، سراة عذر، سراة حجر، سراة بنی قرن، سراة بنی شہانہ، سراة المعافر، سراة الکراع، سراة بنی سیف، سراة ختلان، سراة الحان، سراة المصانع، سراة قدم، سراة ہتوم اور سراة العرفہ، نیز ”سراة“ نامی علاقہ کوفہ کے نزدیک بھی موجود تھا جسے سراة الکوفہ کہا جاتا تھا، ان کے علاوہ آذربائیجان کے ایک علاقے کا نام بھی سراة ہی ہے لیکن یاد رہے کہ ان تمام علاقوں کو سراة کہہ کر بہت ہی کم پکارا جاتا تھا لیکن جب بھی ان پر لفظ سراة کا اطلاق کیا جاتا تو ساتھ ہی مقید کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، حتیٰ کہ اگر مصر یا شام کے سراة کا بھی ذکر ہوتا تو انہیں بھی مقید بالاضافت ہی کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، جیسا کہ سابق میں مثال گزر چکی چنانچہ یہی بات قابل غور ہے کہ ہمارے مذکور الصدر اقوال میں سے زیادہ تر اقوال مطلقاً سراة کے ہیں جن میں مصر یا شام یا عرب کے کسی بھی دوسرے علاقے کی قید نہیں، لہذا لفظ سراة کو بغیر کسی قید کے مطلق رکھنے سے ذہن بغیر کسی تکلف کے خود بخود ہی اس طرف چلا جاتا ہے کہ یہاں سراة سے ایک ایسا علاقہ مراد لیا گیا ہے جو عوام میں مصر اور شام اور عرب کے دوسرے سراوات سے بھی زیادہ مشہور و معروف تھا جسے مقید کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی بس یہی ہمارا موقف ہے۔

حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت جس سراة کے علاقے میں ہوئی وہ نہ تو مصر کا علاقہ تھا اور نہ ہی شام کا بلکہ وہ علاقہ اس وقت کا سب سے زیادہ مشہور و معروف سراة تھا جو یمن میں واقع ہے، چنانچہ اسی کی تائید کرتے ہوئے علامہ ابن منظور لسان العرب، ج: ۸، ص: ۳۵۵ میں لکھتے ہیں کہ وسراة الیمن معروفۃ یعنی یمن کا سراة زیادہ مشہور و معروف ہے تو یمن کا سراة اپنی شہرت کی وجہ سے اول الذکر اقوال میں مطلق رکھا گیا، ورنہ

اسے مقید کر کے ذکر کیا جاتا لہذا اسی کی تائید و توثیق میں سراۃ الیمن کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں علامہ ابن ناصر الدین دمشقی، جامع الآثار ج: ۵، ص: ۲۸۰۹ میں لکھتے ہیں کہ ”کان من مولدی السراۃ فیما بین الیمن والطائف“ (یعنی حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سراۃ کے مولدین میں سے ہیں اور سراۃ وہ علاقہ ہے جو یمن اور طائف کے درمیان آباد ہے) نیز اسی قول کو شیخ محقق علامہ عبدالحق نے مدارج النبوة، ج: ۲، ص: ۵۸۲ میں بیان فرمایا ہے ”وی دراصل از مولدین سراۃ است بفتح سین مہملہ و تخفیف را موضع است میان مکہ و یمن، یعنی حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ دراصل سراۃ کے مولدین میں سے تھے، سراۃ سین مہملہ کی فتح اور را کی تخفیف کے ساتھ ہے اور یہ جگہ مکہ اور یمن کے درمیان آباد ہے اور چوں کہ یمن کا علاقہ سمندر کے واسطے سے حکومت حبشہ کے زیر تسلط تھا اور یہ علاقہ عرب اور حبشہ کے درمیان راہ داری کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، اسی لیے یمن میں عربی، حبشی اور کئی طرح کی قومیں اور قبیلے آباد تھے اور سراۃ الیمن مکہ کے جنوب مغرب کی جانب یمن اور عرب کی سرحد پر سمندر کے تقریباً کنارے پر آباد تھا جس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو حبشہ یمن اور مکہ سے تعلق جوڑنے میں دقت نہیں تھی اور ان علاقوں میں آمد و رفت رکھنا بھی آسان تھا۔ نیز سراۃ یمن اور عرب کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا تھا، بعض اسے یمن اور بعض عرب کا حصہ سمجھتے تھے البتہ کچھ بھی ہو یہاں مذکورہ سراۃ سے مراد ہر حال میں یمن اور عرب کی سرحد پر واقع علاقہ سراۃ ہی مراد لیا جاتا ہے اور یہی رائج ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی سراۃ میں پیدا ہوئے تھے۔ (جمال بلال، ص: ۱۱۲)

مسکن: نصوص و اشارے بتاتے ہیں کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ”سراۃ الیمن“ میں پیدا ہوئے جو آپ کے والد کا مسکن تھا، بچپن اور لڑکپن یہاں گزارنے کے بعد کسی (نامعلوم) وجہ سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی والدہ صاحبہ کے وطن یعنی حبشہ چلے گئے جہاں کئی سال پر محیط اپنی جوانی کا ایک بڑا حصہ گزارا پھر شاید وہیں غلام

بنالیے گئے یا شاید وہاں سے جب کئی سالوں کے بعد یمن واپس آئے تو کسی (نامعلوم) وجہ سے حبشہ سے آئے ہوئے پورے کنبے کو زبردستی غلام بنالیا گیا اور اس بات کی تائید ”الکامل فی التاريخ لابن الاثير ج: ۱، ص: ۵۸۸، ۵۸۹“ سے بھی ہوتی ہے، جس میں یوں کہا گیا ہے کہ ”بلال بن رباح الحبشي مولی ابی بکر الصديق وكان ابوه من سبى الحبشة وامه حمامة سببية ايضا وهو من مولدى السراة“ یعنی حضرت سیدنا بلال بن رباح حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں، نیز آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ حضرت حمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں ہی حبشہ سے آنے والے زبردستی بنائے گئے غلاموں میں سے تھے اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ”سراة“ کے مولدین میں سے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ غلامی کی حالت میں مکہ آئے اور پورے خاندان کو عرب کے مختلف قبیلوں نے خرید لیا، چنانچہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قبیلہ بنو تیم کے ایک سردار عبداللہ بن جدعان نے خریدا جو بہت مالدار اور سخی تھا۔ عمدة القاری، فتح الباری اور السيرة المحمديہ کے مطابق اسی کی غلامی میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ (جمال بلال، ص: ۱۱۳)

قبیلہ اور والدین: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس قبیلے میں پیدا ہوئے؟ اس بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہم اس سلسلے میں علامہ محمد علی رضا قادری کی تحقیق کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں، تفصیل کے لیے اصل کتاب جمال بلال کی طرف رجوع کریں۔

بعض لوگوں نے آپ کو قبیلہ بنی تیم کا فرد بتایا ہے اس قبیلے سے آپ کا تعلق صرف ولا کی حد تک قائم ہے کیونکہ یہ قبیلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو آزاد فرمایا، لہذا ولا کا تعلق اس قبیلے کے ساتھ قائم تھا۔ بعض حضرات نے قبیلہ بنو جحج میں آپ کا شمار کیا ہے، یہ قبیلہ امیہ بن خلف کا تھا لہذا اس قبیلے سے آپ کا تعلق غلامی کی حد تک درست ہے، جن حضرات نے آپ کو قبیلہ بنی جحج سے شمار کرایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ ابن عساکر وغیرہ نے آپ کے تعارف میں ”کان

مولد امن مولدی بنی جمح“ الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کی پیدائش بنی جمح میں ہوئی، کیوں کہ مولد کا استعمال کئی معنوں میں ہوتا ہے۔ (۱) ولادت (۲) نسبت (۳) وہ شخص جس کے ماں باپ خالص عربی نہ ہوں بلکہ وہ عربوں میں رہ کر ان کے طور طریقے اختیار کر لے (۴) وہ شخص جس کا باپ عربی ہو لیکن ماں عجمی ہو۔ علامہ محمد علی رضا اپنا نظریہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

میرے نزدیک حق یہی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبیلہ نہ ہی بنی جمح تھا اور نہ ہی بنو تیم، بلکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسبی تعلق یمن کے کسی خاندان سے تھا لیکن یہ تعلق کس خاندان اور قبیلے سے تھا؟ افسوس کہ اس قبیلے کا حال تو دور نام تک معلوم نہیں۔

(جمال بلال، ص: ۱۱۹)

والدین: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والدین کے سلسلے میں بھی ہم علامہ محمد علی رضا کی تحقیق کا قول فیصل ذکر کر رہے ہیں، حق تحقیق ملاحظہ کرنے کے لیے جمال بلال کا مطالعہ کریں۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کا نام رباح ہے باقی حالات سے تاریخ خاموش ہے۔ رباح پیدائشی غلام نہیں تھے بلکہ انہیں بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ زبردستی غلام بنایا گیا تھا، یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نسلاً حبشی تھے۔ (علامہ محمد علی رضا کے نزدیک رائج ترین موقف یہی ہے کہ وہ حبشی النسل نہیں تھے بلکہ یمنی تھے) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ حبشی النسل تھیں، جن کا نام حمامہ تھا، جن کو شرف صحابیت حاصل ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ماں کی وجہ سے بلال بن حمامہ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کی والدہ دونوں ایک ساتھ دامن اسلام سے وابستہ ہوئے لہذا آپ بھی سابقین اولین والی جماعت میں شامل ہیں، دونوں ماں بیٹے قبیلہ بنو جمح کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دونوں کو غلامی کی بندشوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد کرادیا۔

(جمال بلال، ص: ۱۱۷-۱۳۴ ملخصاً)

(نوٹ: علامہ محمد علی رضا کی یہ تحقیق بے سرو پیر کی باتیں نہیں بلکہ دلائل سے مزین ہے، طوالت کے خوف سے ہم نے دلائل کو ذکر نہیں کیا ہے)

حلیہ: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رنگ گہرا گندمی تھا، رخسار اندر کو دبے ہوئے تھے اور بدن دبلا اور لمبا تھا، جسم پر بال زیادہ مقدار میں تھے کچھ کالے اور کچھ سفید تھے جنہیں آپ رنگین نہیں فرماتے تھے۔ (تہذیب الکمال، ج: ۴، ص: ۲۹۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۹، تاریخ اسلام، ج: ۳، ص: ۲۰۵، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۸، انساب الاشراف، ج: ۱، ص: ۸۳) آپ کی آواز بلند اور لہجہ صاف تھا۔ (فتح الباری، ج: ۲، ص: ۳۹۷)

ناک اور ہونٹ موٹے تھے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۴، ص: ۳۳۶)

علامہ محمد علی رضا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مذکورہ بالا کتب کی روایات کے الفاظ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رنگ کے گندمی ہونے پر گواہ ہیں، مگر افسوس! کہ ہر خاص و عام کی زبانوں اور ذہنوں پر یہی بات سوار ہو چکی ہے کہ سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا رنگ کالا سیاہ تھا۔ رنگ کا کالا ہونا بے شک کوئی عیب نہیں لیکن کسی کا کالا ہونا کوئی فضیلت کی بات بھی نہیں، تاریخ گواہ ہے کہ کالے رنگ سے متصف بہت سے لوگ ہوئے لیکن افسوس کہ حیرت انگیز حد تک سیاہی کی نسبت جس طرح حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے ہی خاص کر دی گئی ہے اس کی مثال نہیں، معلوم نہیں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو کالا کہنے میں کیا لطف و ثواب مضمر و مستتر ہے۔

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد و مستفاض ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ کالا محبوب بھی خوب رنگ دکھائی پڑتا ہے لیکن کیا کمال تعجب ہے کہ ایک طرف مؤذن رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور عشق کے بے نظیر دعوے اور دوسری جانب ان کے دیگر عظیم فضائل کو چھوڑ کر محض سیاہ رنگ کا پرچار۔ معلوم نہیں کس زبان میں اتنی تاثیر تھی کہ ہر خاص و عام اپنے اپنے انداز میں کالی رنگت کے افسانے میں اسی کی پیروی کرتا چلا جا رہا ہے۔ (جمال بلال، ص: ۲۶۰)

بھائی بہن: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نسبی اعتبار سے ایک بھائی اور ایک بہن تھی، بھائی کا نام خالد جبکہ بہن کا نام غفیرہ تھا۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۸)

مواخات: حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی مواخات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کے ساتھ قائم فرمائی؟ اس سلسلے میں بھی مؤرخین کے چند اقوال ہیں۔

(۱) مواخات حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب کے درمیان قائم فرمائی تھی۔

(۲) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو رویحہ کے درمیان قائم فرمائی تھی۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۴)

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو رویحہ میں اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام جانے لگے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: بلال! تمہارا وظیفہ کون وصول کرے گا؟ تو آپ نے جواب دیا امیر المومنین! میرا وظیفہ ابو رویحہ حاصل کریں گے، میں انہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ ان کے اور میرے درمیان اخوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۴)

(۳) حضرت ابو عبیدہ بن جراح کے ساتھ قائم کی گئی۔ (الاصابہ، ج: ۱، ص: ۱۷۱)

(۴) مسند الفردوس میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! بلال میرا بھائی ہے اور میں اس کا بھائی ہوں اور بلال تمہارا بھائی اور آزاد کردہ ہے اور کسی بھی قوم کا آزاد کردہ انہیں میں شمار ہوتا ہے۔ (ج: ۲، ص: ۴۵)

اسلام لانا: ابتداءً حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ عبد اللہ بن جدعان کے غلام تھے، عبد اللہ بن جدعان سخت گیر کا فر تھا جیسے ہی عبد اللہ بن جدعان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے تمام غلاموں کو اسلام لے آنے کے خوف سے مکہ سے باہر بھیج دیا، یاد رہے کہ عبد اللہ بن جدعان کے پاس سو غلام تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ عبد اللہ بن جدعان کی بکریاں چراتے تھے اس لیے آپ مکہ ہی میں ٹھہرے رہے۔

وضین بن عطا کہتے ہیں کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک غار میں تنہا مصروف عبادت تھے کہ اس دوران وہاں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر ہوا، آپ وہاں بکری چرا رہے تھے چنانچہ ایک دن اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر انور غار سے باہر نکالا اور فرمایا: اے چرواہے! کیا تھوڑا دودھ ملے گا؟ تو حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے صرف ایک بکری کا اختیار ہے اگر آپ چاہیں تو میں وہ آج آپ کو پیش کر دیتا ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لے آؤ چنانچہ وہ لے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لکڑی کا بڑا پیالہ منگوایا پھر بکری کو باندھ کر اس کا دودھ دوہا تو پیالہ بھر گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرمایا یہاں تک کہ سیر ہو گئے پھر دوہا اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پلایا پھر دوہا اور پیالہ بھر کے سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پلایا، یہاں تک کہ وہ بھی سیر ہو گئے پھر جب اس بکری کو چھوڑا تو اس کا دودھ پہلے کی طرح پھر سے بھرا ہوا ہو گیا پھر فرمایا: اے غلام! کیا تم اسلام لاؤ گے؟ چنانچہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئے اور اسلام قبول کیا، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا اسلام چھپانا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنی بکریاں لے کر چلے گئے، رات گزاری چونکہ ان کے دودھ کئی گنا بڑھ چکے تھے تو حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے ان کے مالکان نے پوچھا: معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بکریاں بڑی اچھی جگہ پر چرائی ہیں چنانچہ اب یہ تمہاری ہی ذمہ داری میں ہیں پھر حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ مزید تین دن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دودھ پلاتے رہے اور اسلام کے بارے میں سیکھتے رہے۔

جب چوتھا دن ہوا تو ابو جہل کا گزر عبد اللہ بن جدعان کے گھر کے قریب سے ہوا تو وہ بولا: میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری بکریاں یوں ہی پڑی رہتی ہیں لیکن ان کا دودھ کثیر ہوتا ہے تو گھر والے بولے کہ تین دن سے ایسا ہی ہو رہا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو وہ بولا: تمہارا غلام کعبہ کے رب کی قسم وہ ابن ابی کبشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

رہنے کی جگہ کو جانتا ہے لہذا اسے وہاں بکریاں چرانے سے منع کرو تو انہوں نے منع کر دیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف لائے اور چپکے سے مروہ کے قریبی مکان میں جلوہ افروز ہو گئے اور حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اپنے اسلام پر قائم رہے، چنانچہ ایک دن حضرت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اس وقت قریش خانہ کعبہ کی دوسری جانب آپ کی آمد سے بے خبر موجود تھے پھر آپ نے جھانک کر دیکھا تو کوئی بھی آپ کو نہیں دیکھ رہا تھا، آپ بتوں کے پاس آئے اور ان پر تھوکنے لگے نیز فرمانے لگے: تمہیں پوجنے والا ناکام و نامراد ہو گیا، قریش کو پتہ چل گیا انہوں نے آپ کو پکارا لیکن آپ بھاگ کر اپنے آقا عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں داخل ہو کر چھپ گئے، مشرکین وہاں پہنچے اور عبد اللہ بن جدعان کو پکارنے لگے وہ نکل آیا تو انھوں نے اس سے کہا: کیا تم نے دین بدل دیا؟ وہ بولا: مجھ جیسے شخص کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو حالانکہ میں نے لات و عزی کے نام پر ۱۰۰ اونٹنیاں قربان کی ہیں، تو وہ بولے تیرے حبشی غلام نے ایسا کیا ہے، یہ سن کر اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو پکارا لوگ بھی تلاش کرنے لگے، جب مل گئے تو آپ رضی اللہ عنہ کو اس کے پاس لے آئے، وہ آپ رضی اللہ عنہ کو نہیں پہچانتا تھا تو اس نے اپنے نگران کو بلایا پھر بولا: یہ کون ہے کیا میں نے تمہیں حکم نہ دیا تھا کہ مؤلداً میں سے کوئی بھی اس کام پر باقی نہ رہے ورنہ میں تمہیں نکال دوں گا تو وہ نگران بولا: یہی غلام آقا کی بکریاں چراتا ہے اور بکریوں کی دیکھ بھال اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تو عبد اللہ بن جدعان ابو جہل اور امیہ سے بولا: اب یہ تمہارا ہوا اس کے ساتھ جو چاہو کرو تو وہ دونوں آپ رضی اللہ عنہ کو لے کر پتھر لی زمین کی جانب نکلے، آپ رضی اللہ عنہ کو انہوں نے وہاں کی تپتی ہوئی زمین پر لٹایا پھر انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر چکی رکھ دی اور کہنے لگے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرو تو آپ رضی اللہ عنہ فرماتے: نہیں! اور آپ رضی اللہ عنہ اللہ کی وحدانیت کا نعرہ لگانے لگے، اسی دوران ابو جہل اور امیہ پر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا، فرمایا: تم اس حبشی غلام سے کیا چاہتے ہو؟ اللہ کی قسم! تم اس سے کسی کے قصاص کا

مطالبہ تو نہیں کر رہے، پھر اسے بلا وجہ کیوں مار رہے ہو؟ تو امیہ بن خلف اپنے ساتھیوں سے بولا کیا میں تمہیں ابو بکر سے ایسا کھیل کھیل کر نہ دکھاؤں، جیسا کسی نے بھی نہ کھیلا ہو پھر ہنسنے لگا اور بولا: اے ابو بکر! وہ تیرے دین پر ہے اسے ہم سے خرید لو۔ فرمایا: ٹھیک ہے، بولا: مجھے اپنا غلام فسطاس دے دو، فسطاس سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، پیشے سے لو ہار تھا اور وہ آپ کو آدھا دینار بطور خراج دیا کرتا تھا تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: اگر میں سودا کروں تو کیا تم بھی کرو گے؟ بولا: ہاں، فرمایا: تو میں نے اسے تمہاری ملکیت میں دیا، وہ ہنسنے لگا اور بولا: نہیں، اللہ کی قسم! جب تک تم اس کی بیٹی اور بیوی بھی ساتھ میں نہ دو گے، فرمایا: اگر میں سودا کروں تو کیا تم بھی کرو گے؟ بولا: ہاں، فرمایا: تو یہ سب کچھ بھی تمہارا ہوا، وہ پھر ہنسنے لگا اور بولا: نہیں، اللہ کی قسم! جب تک تم اس سودے پر دو سودینار مزید نہیں بڑھا لیتے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو ایسا شخص ہے جسے جھوٹ بولتے بھی شرم نہیں آتی، وہ بولا: لات وعزى کی قسم! اگر تم مجھے یہ دے دو تو میں اس بار سودا ضرور کر دوں گا چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ پیسہ بھی تیرا ہوا، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے لیا۔

(جمال بلال، ص: ۱۸۲، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۳۶، السيرة الحلیہ، ج: ۱، ص: ۷۹)

آپ کب اسلام لائے: جس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں کلمہ توحید بلند کیا اور مکہ دین سماوی کے نور سے جگمگا اٹھا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابقین اولین کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے۔ آپ اس وقت اسلام لائے جب زمین پر معدودے چند افراد ہی کلمہ توحید و رسالت کی چاشنی سے فیض یاب ہوئے تھے، ان میں سرفہرست حضرت ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم، حضرت عمار بن یاسر ان کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما، صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے بے سہارا ساتھیوں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے اسلام لانے کی پاداش میں جو مصائب برداشت کیے وہ کسی اور نے نہیں کیے۔ مستضعفین کی اس جماعت نے ابتلاء و آزمائش کی جوراہیں طے کیں، اس کا عشرِ عشر بھی کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا، حضرت ابوبکر صدیق ہوں یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما یا دیگر وہ حضرات جو مکہ مکرمہ میں اپنا مضبوط خاندانی وجود رکھتے تھے، ان کی قوم، خاندان اور قبیلہ کسی نہ کسی مرحلے میں ان کی حمایت کرتا تھا، مصائب کی چکی میں پیسے جانے سے ایک حد تک ان کی حفاظت کرتا تھا، لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے غلام اور باندیوں کا کون سہارا تھا جو انہیں کچھ مدد فراہم کرتا۔ بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ کمزور بے سہارا لوگوں کی یہ جماعت تھی اور سردارانِ مکہ کے مظالم۔ کفار مکہ ان کو سزا دے کر دو مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے ایک تو یہ کہ یہ غلام و باندیاں دین اسلام سے الٹے پیر واپس آکر ان کے باطل مذہب میں شامل ہو جائیں، دوسرا مقصد یہ کہ ان کو دی جانے والی سزائیں دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بن جائیں اور مکہ میں بسنے والا کوئی بھی انسان ایسی غلطی نہ کر سکے جو انہوں نے کی ہے، جس کا خمیازہ یہ جماعت بھگت رہی ہے۔

اس بات پر تمام علما متفق ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کی اس جماعت میں شامل ہیں جسے سابقین اولین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، البتہ یہ متعین کرنا بہت مشکل ہے کہ آپ کس نمبر پر ایمان لائے۔ تاریخ دمشق کی روایت میں ہے کہ جن حضرات نے سب سے پہلے اپنے اسلام کو ظاہر کیا وہ سات افراد تھے، اس روایت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام مذکور ہے۔ (ج: ۲۳، ص: ۲۲۱)

بعض روایات میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام چھٹے نمبر پر درج ہے، اس کے علاوہ اور بھی روایات ہیں جس سے آپ کا نمبر دوسرا معلوم ہوتا ہے لیکن نظرِ تحقیق میں آپ کے اسلام لانے کا نمبر متعین کرنا بہت دشوار کن معاملہ ہے کیونکہ ان روایات میں

حضرت خدیجہ کا نام ہے نہ حضرت علی کا حالانکہ یہ دونوں اولین ترین مسلمانوں میں شامل ہیں، اس قسم کی روایات کو محققین علما نے جس انداز میں جمع کیا ہے وہی مذہب و مسلک سب سے بہتر ہے۔

ابن صلاح نے کہا: سب سے بہتر ہے کہ یہ کہا جائے آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق، نو عمروں میں سب سے پہلے حضرت علی، عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہ، آزاد کردہ غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہ، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں میں سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے۔ (شرح الزرقانی، ج: ۱، ص: ۴۵۵، تاریخ الخمیس، ج: ۱، ص: ۲۸۶، السیرۃ النبویہ علی ضوء القرآن و السنۃ، ج: ۱، ص: ۲۸۵، نہایۃ الایجاز فی سیرۃ ساکن الحجاز، ج: ۱، ص: ۱۰۴)

ظلم کا سلسلہ لامتناہی: آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات اور آپ کے تصرفات کا دیدار کر لینے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے آپ کی غلامی میں داخل ہو گئے لیکن توہمات پرستی کے اس بھیا نک دور میں کہ جہاں ہر قبیلے کا ایک الگ خدا ہو، شرک و کفر کو نئے اور انوکھے انداز میں رواج دیا جا رہا ہو، نتیجہ پورا خطہ ضلالت کی تاریکیوں سے تاریک تر ہو رہا ہو، ہر طرف گمراہی کے بلاخیز طوفان پوری تیزی و تندگی کے ساتھ چل رہے ہوں، ایسے ماحول میں شیعہ ایمان بغیر دقت و مشقت کے فروزاں ہو جائے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کلمہ پڑھتے ہی مصائب کا ایک طوفان تھا، تعذیبات و تکلیفات کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا جس نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے حصار میں لے لیا، مکہ کا کوئی بڑے خاندان کا فرد ہوتا تو اس کا خاندان ممکنہ حد تک اس کو مصائب سے چھٹکارا دلاتا لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو مکہ میں ایک اجنبی سے زیادہ حیثیت کے مالک نہ تھے۔ کوئی صاحب دولت فرد ہوتا تو اس کی دولت کچھ حمایت کر پاتی لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ جب سے شعور نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا، نہ خاندان کی حمایت،

نہ دولت کی سرپرستی، نہ احبا و اقربا کا جھگھٹ ہے جو کفر و شرک کے ٹھیکیداروں سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حفاظت کرے، بے سہارا حضرت بلال ہیں اور نکالیف شاقہ کے مراحل، ایک غلام ہے اور زرداروں کی دست درازیاں، کمزور اور مفلوک الحال وجود ہے اور طواغیت مکہ کی ریشہ دوانیاں، اگر کوئی ساتھی منس اور غم گسار ہے تو وہ توفیق خداوندی اور تائید ایزدی، یہی تھا اصل سرمایہ اور یہی تھی ان کی قابل فخر پونجی، اسی پونجی سے وہ ایسا سودا کر گئے کہ اب قیامت تک کوئی دوسرا تاجران کی مثال قائم نہیں کر سکتا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صبر کی ایسی ڈھال عطا فرمائی کہ کفار کی سخت سے سخت سزائیں بھی ان کے مزعومہ ہدف کے حصول میں ناکافی ثابت ہوئیں، کوڑوں کی بوچھاڑ ہو یا تپتے صحرا کے ریگزار، عرب کی جھلسا دینے والی چلچلاتی دھوپ کی دوپہریاں ہوں یا سخت سزاؤں کی بے ہوشیاں، سینے پر رکھے بھاری بوجھ ہوں یا گلاباندہ کرکھینچتی اوباشوں کی فوج، کفار کا کوئی حملہ اور تدبیر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نعرہٴ احد لگانے سے روک نہ سکی۔ آئیے تاریخ کے حوالوں سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دی جانے والی کچھ سزاؤں کو دریافت کرتے ہیں:

حضرت بلال کو دی جانے والی سزائیں: حضرت ابن اسحاق اور ان کے سوا دیگر حضرات نے بیان فرمایا ہے: دوپہر کے وقت جب دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر ہوتی تو امیہ بن خلف حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ کی سنگلاخ وادی میں لے کر جاتا، پیٹھ کے بل لٹاتا اور سینے کے اوپر ایک بھاری پتھر رکھواتا (تاکہ پہلو نہ بدل سکے) پھر دھمکی بھرے لہجے میں کہتا: اس عذاب سے امان پانے کی صرف دو صورتیں ہیں یا تو تم مرجاؤ یا پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے لات وعزیٰ کے پجاری بن جاؤ۔ اس وقت جب کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سخت عذاب میں مبتلا ہوتے جواب دیتے: میرا خدا ایک خدا ہے، میں لات وعزیٰ کی خدائی کو کبھی بھی ماننے والا نہیں۔ کبھی امیہ زیادہ غصے میں ہوتا تو گلے میں پھندا ڈال دیتا جس سے آپ کا گلا گھٹ جاتا اور آپ بے ہوش ہو جاتے پھر کچھ دیر بعد آپ کو ہوش آتا۔

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: میں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا، انہیں سخت گرم پتھروں پر سزا دی جا رہی ہے، اتنے گرم پتھر کہ اگر ان پر کچا گوشت رکھ دیا جائے تو اس کی حرارت سے پک جائے، وہ اس حال میں بھی کہہ رہے تھے میں لات وعزیٰ کو اپنا معبود تسلیم نہیں کر سکتا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: میں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس حال میں دیکھا کہ انہیں کچھ لڑکے لمبی رسی میں باندھ کر کھینچ رہے تھے اور وہ احدا حد پکار رہے تھے اور فرماتے تھے: میں لات وعزیٰ اور ہبل وغیرہ کو خدا نہیں مانتا، یہ سن کر امیہ انہیں تپتے ہوئے سنگ ریزوں پر پٹک دیتا۔

عمیر بن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سخت تکالیف دی جاتیں تو وہ احدا حد فرماتے، کفار آپ سے کہتے: وہ کہو جو ہم کہہ رہے ہیں تو آپ فرماتے: میری زبان یہ نہیں کہہ سکتی۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کفار نے مجھے ایک دن اور ایک رات تک پانی نہ دے کر پیاسا رکھا پھر مجھے پتھر لی تہتی زمین پر لا کر سزائیں دینے لگے اور یہ ایک گرم دن تھا۔

حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ورقہ بن نوفل حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزرے، جب کہ انہیں عذاب دیا جا رہا تھا اور وہ احدا حد کہہ رہے تھے، یہ سن کر حضرت ورقہ نے فرمایا: اے بلال! احدا حد ہی کہنا، اللہ کی قسم! وہ ایک ہی ہے۔

(سبل الہدی والرشاد، ج: ۲، ص: ۳۵۸)

چربی پگھلا دینے والی گرمی میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوہے کی زرہ پہنا کر لٹا دیا جاتا پھر انہیں رسی میں باندھ کر اوباشوں کے حوالے کر دیا جاتا، اس کے باوجود کفار ان سے اپنی مرضی کا ایک کلمہ بھی نہیں کہلا پاتے وہ صرف احدا حد ہی کہا کرتے تھے۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۴۸)

ابو جہل آپ کو چہرے کے بل لٹا دیتا اور پیٹھ پر چکی کا پاٹ رکھ دیتا یہاں تک کہ دھوپ میں آپ کی چربی نکل جاتی۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۵)

امیہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کوڑے برساتا تھا۔ (مشاہیر الصحابہ، ج: ۱، ص: ۷۶)
آپ کو گائے کی کھال میں لپیٹ کر گرم زمین پر لٹا دیا جاتا اوپر سے پتھر چن دیے جاتے۔ (الطبقات الکبریٰ، ج: ۱، ص: ۲۱۳)

آپ کے چہرے پر تھپڑ مارے جاتے، نسل اور غلامی کے طعنے دیے جاتے، آپ کے ماں باپ کو گالیاں دی جاتی، بھوکا پیاسا رکھا جاتا، منہ میں گندگی ڈالی جاتی، ہاتھ پیروں میں میخ گاڑ دی جاتی، قتل کی دھمکیاں دی جاتی۔ (جمال بلال، ص: ۲۱۲)

آپ کس کے غلام تھے؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس کے غلام تھے؟ یہ بھی ایک تفصیل طلب بحث ہے، کتب تاریخ میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مالکان کے طور پر چار نام ملتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امیہ بن خلف، ابو جہل اور عبداللہ بن جدعان۔

ہم تاریخ دمشق کی روایت کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے والے واقعے میں ہے کہ جس وقت آپ اسلام لائے اس وقت آپ عبداللہ بن جدعان کی ملکیت میں تھے، اسلام لانے کے بعد آپ نے خانہ کعبہ میں جا کر وہاں رکھے بتوں پر تھوک کر بتوں کی لاچاری و عاجزی کو جگ ظاہر کیا اور صحن کعبہ میں بتوں کی حقارت اور ذلت و رسوائی کا جوڈ نکا بجایا تھا اس سے کفار قریش تلملا اٹھے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سزا دلانے کے لیے ابو جہل اور امیہ بن خلف دونوں عبداللہ بن جدعان کے گھر پہنچے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کارکردگی کا پورا واقعہ دونوں نے عبداللہ بن جدعان کو سنایا، پوری بات سن کر عبداللہ بن جدعان نے اپنے غلام حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے ہوئے ابو جہل اور امیہ بن خلف کو ہبہ کر دیا ”فہو لکما اصنعابہ ما احببتما“ (میں نے اپنا غلام تمہیں ہبہ کر دیا،

اب جو تمہیں پسند ہو اس کے ساتھ کرو) دونوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے قبضے میں لے لیا اور مکہ کی سنگلاخ زمین پر لٹا کر ظلم و زیادتی کی ہر حد کو پار کر دیا یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہاں سے گزر رہا اور آپ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیہ بن خلف سے خرید لیا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۳۷)

اس روایت سے ظاہر ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابتداء عبد اللہ بن جدعان کے غلام تھے پھر عبد اللہ بن جدعان نے امیہ بن خلف اور ابو جہل کو اپنے غلام کا مالک بنا دیا پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیہ بن خلف سے خرید لیا۔ لیکن مذکورہ بالا روایت میں صرف امیہ بن خلف سے خریداری کا پتہ چلتا ہے، ابو جہل سے خریداری کا ذکر نہیں حالانکہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کی ملکیت میں تھے۔ اس لیے ہم ایک دوسری روایت پیش کر رہے ہیں جس میں ابو جہل سے خریداری کا ذکر موجود ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابو جہل کے پاس سے گزرے، وہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سخت تکلیف دے کر دین اسلام کو ترک کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ توحید کا نغمہ گنگنائے جا رہے تھے، ابو جہل نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: آپ اپنے اس بھائی کو خرید کیوں نہیں لیتے؟ دونوں میں قیمت طے ہوئی اور حضرت ابوبکر نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) ابو جہل سے خرید کر فرمایا: بلال! جاؤ، اب تم اسی کے ہو رہو جس کے لیے تم اسلام لائے ہو۔ (فضائل الصحابہ لاحمد، ج: ۱، ص: ۱۵۵)

یہاں بعض دیگر روایات بھی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ خریداری حضرت ابوبکر نے بذات خود نہیں کی تھی بلکہ کسی کو بھیج کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خریدا تھا لیکن دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، دونوں روایتوں کو یوں جمع کیا جاسکتا ہے پہلے خود حضرت ابوبکر نے ابو جہل سے قیمت وغیرہ طے کر لی اور پھر اپنی طرف سے کسی کو بھیج کر ثمن ادا کر دیا

اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے پاس بلا کر آزاد کر دیا۔

ابوبکر کا شوق اور سودے کی عظمت: سخت سے سخت سزائیں دینے کے بعد بھی صناید قریش حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے اپنی مرضی کا ایک حرف بھی جاری نہ کرا سکے۔ آخر کار کائنات کے غمخوار بے کسوں کے حامی و مددگار حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ارشاد فرمایا: ”اگر ہمارے پاس مال ہوتا تو ہم بلال کو خرید لیتے“ غلام وفادار کو جیسے ہی اپنے آقا کی مرضی پر اطلاع ہوئی فوراً حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خریداری کی کوششیں شروع فرمادیں۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۲)

حضرت ابوبکر نے امیہ بن خلف سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سودا کر لیا، سودا کتنے اوقیہ میں ہوا، اس میں مختلف اقوال ہیں۔ (طبقات ابن سعد)

لیکن اس سودے میں خاص حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شوق ہے کہ وہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خریداری پر کتنے حریص تھے، حضرت ابوبکر کا خریداری کا اشتیاق اس حد پر آخر کیوں نہ ہوتا کیونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو محسوس کر لیا تھا۔ آنے والے جملوں سے اندازہ ہوگا کہ حضرت ابوبکر کسی بھی قیمت پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خرید لینا چاہتے تھے، امیہ نے بڑے مہنگے داموں میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیچا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مارکیٹ سے کئی گنا زیادہ قیمت دے کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خرید لیا، امیہ اپنی اس کامیابی پر بڑا خوش تھا اس نے اپنی چالاکی اور ہوشیاری کی ڈینگے مارتے ہوئے کہا: اے ابوبکر! اگر تم اس پر اڑ جاتے کہ میں ایک اوقیہ سے زیادہ نہیں دوں گا تو میں بلال کو ایک اوقیہ قیمت کے بدلے تمہارے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا: اے امیہ! اگر تو ضد کر لیتا کہ میں بلال کو ایک سو اوقیہ سے کم قیمت پر فروخت نہیں کروں گا تو میں بلال کو سو اوقیہ دے کر بھی ضرور خرید لیتا۔ (السیرۃ الحلبیہ، ج: ۱، ص: ۴۸۰، تاریخ دمشق، ج: ۱۰،

ص: ۴۴۳، رجال حول الرسول، ص: ۶۴، مشاہیر الصحابہ، ج: ۱، ص: ۷۶)

امیہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قدر و قیمت کیا سمجھتا؟ اس کی عقل تو کفر کی نجاستوں میں دب کر خراب ہو چکی تھی، ہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نور ایمان سے دیکھ رہے تھے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کان ایمان کا وہ ہیرہ ہے جس کی چمک سے قیامت تک ضیاء پاشیاں ہوتی رہیں گی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فکر و خیال کی تائید و تصدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمادی جب حضرت ابوبکر نبوی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے بعد بارگاہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر حضور کو خوشخبری دیتے ہیں: حضور! میں نے بلال کو خرید لیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خبر سن کر فوراً ارشاد فرماتے ہیں: ابوبکر! اس سودے میں مجھے بھی شریک کر لو۔ (سبحان اللہ کیا عظمت ہے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خریداری کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں خود شریک ہونا چاہتے ہیں) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلامانہ انداز میں عرض کیا: حضور! میں بلال کو پہلے ہی آزاد کر چکا ہوں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۳، سبل الہدیٰ والارشاد، ج: ۲، ص: ۳۵۸، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۴۲)

ابوبکر نے خرید کر آزاد کر دیا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”میری امت پر سب سے زیادہ مہربان جو شخص ہے اس کا نام ابوبکر ہے“۔ دوسری حدیث میں فرمایا: ”امت پر اس امت کے نبی کے بعد سب سے زیادہ رحم فرمانے والی ذات کا نام ابوبکر ہے۔ (الریاض النضرۃ، ج: ۱، ص: ۶۲)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف ایک حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خرید کر کفار کے مظالم سے رہائی نہیں دلائی تھی بلکہ ان کے سوا کئی مبارک و مقدس ہستیاں اور بھی ہیں جنہیں حضرت ابوبکر نے خالص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کی خاطر اپنے ذاتی مال سے خرید کر کفار کی چیرہ دستیوں سے رہائی دلائی اور ہمیشہ کے لیے انہیں آزاد کر دیا۔

پیر کرم شاہ الازہری کے الفاظ میں ”وہی رحم دل اور کریم النفس جو اپنے غریب مسلمان بھائی بہنوں کو ان کے ظالم آقاؤں کی جو رستم کی چکی میں پستے دیکھ کر بے تاب ہو جاتا اپنی جیب سے قیمت ادا کر کے ان کو خریدتا پھر انہیں رضائے الہی کے لیے آزاد کر دیتا“۔ (مقالات، ص: ۴۹۲)

ان کے آزاد کردہ غلاموں میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) حضرت ابو قلیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(۳) حضرت لبیہ جاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (۴) حضرت زنیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
(۵) حضرت نہدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (۶) حضرت ام عیسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (۷)
حضرت عامر بن فیہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (اکامل فی التاریخ ذکر تغذیب المستضعفین، ج: ۱، ص: ۲۶۰)
ہجرت: کفار مکہ نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، اللہ تعالیٰ کے محبوب، حضور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلاموں کو صبر و شکر کی تلقین فرماتے رہے، آخر اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو مکہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ مسلمانوں نے اپنے کاروبار، زمین جائیداد، مال و منال بلکہ اہل و عیال تک کو چھوڑ کر خالی ہاتھ ایمان کی حفاظت کے ساتھ مکہ سے نکل جانے ہی کو غنیمت جانا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس طرح اسلام لانے والوں میں سابقین اولین میں شامل ہیں اسی طرح ان کا نام مہاجرین اولین کی جماعت میں شامل ہے۔ سب سے پہلے کس صحابی نے ہجرت فرمائی؟ یہ مسئلہ علما کے درمیان مختلف فیہ ہے، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تذکرے میں اس سلسلے میں ہم نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے، یہاں ہم صرف بخاری شریف کی ایک حدیث پاک پر اکتفاء کر رہے ہیں۔ حضرت امام بخاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے (اہل مدینہ کے) پاس سب سے پہلے (ہجرت کر کے) حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت ابن ام مکتوم

رضی اللہ تعالیٰ عنہما تشریف لائے اور دونوں حضرات اہل مدینہ کو پڑھایا کرتے تھے، اس کے بعد جلد ہی حضرت بلال، حضرت سعد، حضرت عمار بن یاسر تشریف لائے پھر بیس لوگوں کے ساتھ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تشریف لائے۔ (بخاری، کتاب المناقب باب مقدم النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم المدینہ)

اس حدیث پاک سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہجرت کرنے میں بہت سارے صحابہ کرام پر تقدم حاصل ہے۔ اس مقام پر علامہ بدر الدین عینی علیہ الرحمہ نے ایک اعتراض اور اس کا جواب نقل فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

موسیٰ بن عقبہ نے اس بات پر جزم کیا ہے کہ مہاجرین میں ابوسلمہ بن عبدالاسد ہجرت کرنے میں مطلقاً تمام صحابہ کرام پر مقدم ہیں جبکہ یہاں حدیث بخاری میں مذکور ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر نے سب سے پہلے ہجرت فرمائی۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دونوں حدیثوں کو اس طور پر جمع کیا جائے گا کہ حضرت ابوسلمہ مشرکین کے شر سے بچنے کے لیے مکہ شریف سے نکلے تھے، مدینہ طیبہ میں اقامت کے ارادے سے نہیں نکلے تھے جب کہ حضرت مصعب بن عمیر نے مکہ شریف کو مدینہ طیبہ میں اقامت کی غرض سے چھوڑا تھا تا کہ وہ مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو دینی تعلیم دے سکیں، لہذا ان دونوں میں سے ہر ایک کو اولیت حاصل ہے لیکن اس کی جہتیں الگ الگ ہیں۔ (عمدة القاری، کتاب المناقب باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینہ)

مدینہ میں قیام گاہ: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو حضرت سعد بن خثیمہ کے دولت سرائے میں فروکش ہوئے، اسی مکان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عامر بن فہیرہ بھی قیام پزیر تھے۔ (سمط النجوم العوالی فی انباء الاول والاولی، ج: ۱، ص: ۲۳۹، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۴، صور من حياة الصحابة، ص: ۳۱۷)

مدینہ طیبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے صحت و برکت سے پہلے بیماریوں کا گھر تھا لہذا یہاں کی آب و ہوا مہاجرین کو اس نہیں آئی اور کئی صحابہ کرام سخت بخار میں مبتلا ہو گئے،

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی سخت بیمار ہوئے اس وقت آپ کو مکہ مکرمہ کی یاد بڑی شدت سے آتی اور بہت تڑپاتی، اپنا وطن آخر اپنا وطن ہوتا ہے، جہاں عہد طفولیت، بچپن اور جوانی کی نہ جانے کتنی یادیں انسان کے دل و دماغ میں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں، یادوں کی یہ تازگی محض یادوں کے مجموعے میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ بے قرار کو قرار، مضطرب کو مطمئن، تنگ دل کو خوش دل اور غمگین کو شگفتہ دل اور خوش و خرم بناتی ہے۔ بیماریوں کے حزن اور مجبوریوں کے رنج نے جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر غلبہ کیا تو اپنے شیریں اور دلربا لہجے میں مکہ کے بیابان اور بطحاء کے مغیلان کو یاد کر کے اپنی مترنم آواز میں اشعار گنگنانے لگے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درد کو بخاری شریف کی حدیث کے ذریعے محسوس کیجئے، امام بخاری ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بخار آ گیا اور حضرت ابوبکر کو جب بخار چڑھا تو وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

کل امرئ مصبح فی اہله

والموت ادنی من شراک نعلہ

ہر شخص اپنے گھر میں صبح کو ہوتا ہے اور موت اس کی جوتی کے تسمے سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے۔

اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب بخار اتر جاتا تو وہ بلند آواز سے رورور کر یہ

اشعار پڑھتے تھے:

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة

بواد و حولی اذخر و جلیل

وہل اردن یوما میاہ مجنة

وہل یبدون لی شامة و طفیل

سنو! کاش میں پھر اس وادی میں ایک رات رہوں اور میرے گرد اذخر اور جلیل گھاس ہو اور کیا میں پھر کسی دن مجنہ کے پانی پر پھپھوں گا اور کیا پھر میرے لیے شامہ اور طفیل پہاڑ ظاہر ہوں گے۔

اور انہوں نے دعا کی: اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت فرما، جس طرح انہوں نے ہمیں اپنے وطن سے دارالباء کی طرف نکال دیا ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی: اے اللہ! ہمارے نزدیک مدینہ کو اس طرح محبوب بنا دے جس طرح ہمیں مکہ محبوب ہے یا اس سے بھی زیادہ، اے اللہ! ہمارے صاع (چار کلو کا پیانہ) میں اور ہمارے مد (دو کلو کا پیانہ) میں برکت دے اور مدینہ کی ہوا کو صحت آفریں بنا دے اور اس کے بخار کو الحفہ کی طرف منتقل کر دے، حضرت عائشہ نے بیان کیا: جب ہم مدینہ میں آئے تھے تو وہ اللہ کی زمین میں سب سے زیادہ وبا والی تھی اور مدینہ میں بطحان نام کا ایک نالہ تھا، جس میں تھوڑا تھوڑا پانی بہتا تھا اور وہ بھی بد مزہ اور بدبودار تھا۔ (بخاری، کتاب فضائل المدینہ، باب کراہیۃ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان تقری المدینۃ)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ (سمط النجوم العوالی، ج: ۱ ص: ۲۳۹)

اس حدیث پاک کی شرح کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ علامہ ابو الحسن علی بن خلف ابن بطل مالکی قرطبی متوفی ۴۴۹ھ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جو بخار چڑھا اور انہوں نے اس موقع پر جو اشعار پڑھے، اس کے متعلق بعض علما نے یہ کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرائی اور آپ کے اصحاب کو وطن کے فراق میں اور ان امراض میں مبتلا کیا جو ان کو طبعی طور پر ناپسند تھے تو ان میں سے ہر ایک نے وہی کہا جو اس کے یقین اور مستقبل کے متعلق اس کے علم کا تقاضا تھا، حضرت ابوبکر نے بخار چڑھتے وقت اپنی صبح اور شام کی کیفیات کا ذکر کیا اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہر انسان کی یہی کیفیت ہوتی

ہے، اس لیے انہوں نے کہا: ہر انسان صبح کو اپنے اہل میں ہوتا ہے اور موت اس کے قریب ہوتی ہے یعنی صبح اور شام وہ آفات اور مصائب میں گھرا ہوا ہوتا ہے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تمنا کی کہ وہ اپنے وطن مکہ لوٹ جائیں جہاں وہ ہمیشہ صحت مند رہتے تھے۔ اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ دنیا بہت جلد فنا ہونے والی ہے اور موت ان کی جوتی کے تسمہ سے زیادہ ان کے قریب ہے۔ (نعمۃ الباری، ج: ۴، ص: ۳۴۹)

ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا کہتے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں، جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دل مکہ اور اس کی وادیوں، وہاں کے پہاڑ اور ان کی گھاٹیوں کی سیر کرتا ہو تو ان کو حلاوت ایمانی کی تازہ مٹھاس محسوس ہوتی ہو، خدائے تعالیٰ کی رضا جوئی میں جو سختیاں انہوں نے جھیلیں وہ انہیں خوش ذائقہ لگنے لگتی ہوں کیونکہ مکہ ہی وہ جگہ تھی جہاں انہوں نے اپنے نفس اور شیطان دونوں کو شکست دی تھی۔ (صورن حیاۃ الصحابہ، ص: ۳۱۸)

حضرت بلال کا صحابہ کو نماز کے لیے بلانا: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ سے چند کلومیٹر پہلے مقام قبا میں تشریف فرما ہوئے اور یہاں آپ نے اس مسجد کی بنیاد رکھی جس کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا ”لَمَسْجِدٍ أُسِّسَ عَلَى الثَّقْوَىٰ“ بے شک وہ مسجد کہ پہلے ہی دن سے جس کی بنیاد پر ہیزگاری پر رکھی گئی ہے۔ (سورہ توبہ، آیت: ۱۰۸)

اس مسجد کو ہماری تاریخ کی پہلی مسجد ہونے کا شرف حاصل ہے، قبا ایک چھوٹی بستی تھی اس لیے یہاں صحابہ کرام جماعت میں آسانی سے شریک ہو جایا کرتے تھے، لیکن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہو گئے تو نمازی زیادہ ہو گئے اور رقبہ وسیع لہذا شہر کی گلی کو چوں اور بازاروں تک قیام جماعت کی اطلاع پہنچانے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ رب کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانثاروں سے مشورہ طلب فرمایا کہ وہ کیا طریقہ ہوگا؟ جس کے ذریعے مسلمان نماز کے لیے ایک ساتھ ایک وقت پر جمع ہو جائیں،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق صحابہ کرام نے اپنے اپنے مشورے پیش کیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: مدینہ طیبہ میں آنے کے بعد مسلمان نماز کے وقت جمع ہو کر نماز پڑھ لیتے، اس وقت کوئی شخص اذان نہیں دیتا تھا، ایک دن صحابہ نے اس مسئلے میں گفتگو کی، بعض نے کہا: عیسائیوں کی طرح ناقوس بنا لو، بعض نے کہا: یہودیوں کی طرح سینگھ بنا لو، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ایک آدمی کو کیوں مقرر نہیں کر دیتے؟ جو نماز کے وقت لوگوں کو آواز دے کر بلائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! اٹھو اور لوگوں کو نماز کے لیے بلاؤ۔ (مسلم، کتاب الصلاة باب بدء الاذان)

خیال رہے یہاں حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا: ”یا بلال قم فناد بالصلاة“ اے بلال! اٹھو اور لوگوں کو نماز کے لیے بلاؤ، اس سے مراد موجودہ معروف اذان نہیں تھی بلکہ نماز کی دعوت اور نداء مقصود تھی۔ حضرت ملا علی قاری لکھتے ہیں:

حضور کے حکم کا مطلب تھا کہ وہ لوگوں کو ”الصلاة جامعة“ کہہ کر بلائیں، کیونکہ ایک مرسل حدیث میں ہے کہ اذان مشروع ہونے سے پہلے حضرت بلال ”الصلوة جامعة“ کہہ کر لوگوں کو نماز کے لیے آواز لگایا کرتے تھے۔ (مرقاۃ المفاتیح، ج: ۲، ص: ۵۵۳)

بلند نصیبہ: یہ کتنے بڑے نصیب کی بات ہے کہ ابھی اذان مشروع نہیں ہوئی لیکن جب نمازیوں کو وہ بھی حضور کے اصحاب کو نماز کے لیے اکٹھا کرنے اور جماعت کے لیے بلانے کی بات آئی تو یہ خدمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سپرد کر دی۔ فرمان رب ہے: ”وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا لِّمَنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ“۔ اس سے زیادہ کس کی بات اچھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے نیکی کرے اور کہے میں مسلمان ہوں۔ (سورہ نجم سجدہ، آیت: ۳۳)

اس آیت میں مذکور تمام صفات حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اندر موجود ہیں، پھر جب اذان مشروع ہوئی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کو اسلام کا مؤذن اول بنادیا۔

”ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشنده“

اذان مسلمان کی پہچان: علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں: اذان ہجرت کے پہلے سال شروع ہوئی اور یہ امت محمدیہ کی خصوصیت ہے، اذان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تکریم، کلمہ شہادت اور شعائر اسلام کا اظہار ہوتا ہے، اذان دین اسلام کا خلاصہ ہے، اس میں مؤذن

”اللہ اکبر“ کہہ کر اللہ کی الوہیت اور استحقاق عبادت کا اعتراف کرتا ہے۔

”اشھد اللہ الہ الا اللہ“ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت دیتا ہے۔

”اشھد ان محمد ارسول اللہ“ کہہ کر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتا ہے۔

”حی علی الصلاۃ“ کہہ کر احکام کے مکلف ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔

”حی علی الفلاح“ کہہ کر آخرت پر ایمان کا اظہار کرتا ہے۔

اذان کے ذریعے مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے، پھر اس دعوت کے بعد جو مسلمان اپنے گھروں، کارخانوں اور دکانوں سے اٹھ کر نماز کے لیے چل دیتے ہیں، وہ اپنے اس عمل سے ظاہر کر دیتے ہیں کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے ہیں اور جو اذان سن کر نماز پڑھنے نہیں جاتے وہ اپنی بے عملی سے ظاہر کر دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل اور بے پرواہ ہیں، اسی طرح اذان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار اور غیر اطاعت گزار بندوں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔

اگر اذان کے سبب نماز کا ایک وقت متعین نہ ہوتا اور ہر شخص کو آزادی ہوتی کہ جس وقت چاہے نماز پڑھے اور جس وقت چاہے نماز نہ پڑھے تو مسلم معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار اور غیر فرمانبردار افراد کے درمیان فرق نہ ہو سکتا اور معاشرے کے نااہل افراد کی اصلاح کا کوئی ذریعہ میسر نہ ہوتا۔ ایک مسلمان گفتگو میں، خرید و فروخت میں، دفتر، کارخانے یا گھر کے کاموں میں مشغول اور منہمک ہو اور جیسے ہی اذان کی آواز آئے اور وہ

سب کچھ چھوڑ کر خاموشی سے آواز سننے لگے تو اس کا یہ عمل ظاہر کرے گا کہ واقعی وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم کو ترجیح دیتا ہے۔ جو لوگ قومی ترانے کو تعظیم سے سننے پر زور دیتے ہیں آخر وہ پانچ نمازوں کی اذانوں کی تعظیم کیوں نہیں کرتے اور انہیں غور سے کیوں نہیں سنتے؟ اللہ تعالیٰ سے رحمت اور مغفرت کے حصول کا ذریعہ نماز ہے اور اس کا پیش خیمہ اور مقدمہ اذان ہے، اسی وجہ سے بعض علما نے تصریح کی ہے کہ مصائب کو دور کرنے کے لیے اذان دینی چاہیے۔ (شرح صحیح مسلم، ج: ۱، ص: ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹)

اسلام کی پہلی اذان: علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

ما قبل میں مذکور حدیث سے معلوم ہوا کہ اہم امور میں باہمی مشورہ کرنا چاہیے اور یہ کہ صحابہ کرام اسلام کی روح اور اس کے تقاضوں سے باخبر تھے وہ سمجھتے تھے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اس لیے اس کے ارکان کی ادائیگی کے لیے ایک مربوط نظام ہونا چاہیے لہذا نمازوں کی ادائیگی کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہوا اور سب مسلمان اس وقت میں نماز ادا کریں تاکہ امت ایک وقت پر مجتمع ہو اور وحدت ملی قائم رہے، اس سبب سے تعین وقت کی علامت پر انہوں نے باہم غور و فکر اور مشورہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے طریقہ کو ناپسند فرمایا کیوں کہ اسلام اپنے لیے ایک مستقل نظام کا متقاضی ہے، اسلام کسی اور مذہب کا تابع نہیں بلکہ تمام مذاہب کا ناسخ اور مستقل دین ہے، جس طرح عبادات میں اسلام کسی کا تابع نہیں بلکہ سب سے منفرد اور ممتاز دین ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے تمدن اور معاشرت تہذیب اور ثقافت میں بھی منفرد اور یگانہ ہوں اور کسی قوم کی ثقافتی اقدار کی پیروی نہ کریں، خصوصاً یہودیوں اور عیسائیوں کی تہذیب اور ثقافت سے اپنے آپ کو بالکل الگ رکھیں۔ حضرت عمر نے جو کہا: نماز کے وقت لوگوں کو آواز دے کر بلایا جائے، یہ اذان کی معروف صورت نہیں تھی اس سے محض دعوت اور ندا مقصود تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس رائے کو پسند کر لیا، اس میں ان کی فراست اور صحت رائے کی دلیل ہے، اس واقعے کے بعد حضرت عبداللہ بن زید

نے خواب میں ایک فرشتہ کو اذان کے کلمات کہتے سنا۔ امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن زید کہتے ہیں کہ ایک صبح ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے اپنا خواب بیان کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کو خواب میں سنے ہوئے کلمات بتلاؤ اور پھر یہ ان کلمات کے ساتھ اذان دیں کیونکہ ان کی آواز تم سے زیادہ بلند ہے۔ جب حضرت عمر نے اذان کی آواز سنی تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، میں نے بھی خواب میں یہ کلمات سنے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور وہی لائق ستائش ہے۔

اذان کی مشروعیت کا مدار حضرت عبداللہ بن زید یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے خواب پر نہیں ہے کیونکہ اصحاب کے خواب وحی نہیں ہیں اور نہ وہ شارع ہیں، اذان کی مشروعیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے ہوئی ہے جو آپ نے حضرت عبداللہ بن زید کو دیا جس میں فرمایا کہ ”یہ کلمات بلال کو سکھاؤ تاکہ وہ اذان دیں“ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم نہ دیتے تو ہزار صحابہ کرام بھی ان کلمات کو خواب میں سن لیتے تب بھی اذان ان خوابوں سے مشروع نہ ہوتی۔ (شرح صحیح مسلم، ج: ۱، ص: ۱۰۷۵، ۱۰۷۶)

حضرت بلال اسلام کے پہلے مؤذن: ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا لکھتے ہیں: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ کو اپنا مستقر بنا چکے تھے، قریش کی شداہد اور مکہ میں ان پر نازل ہونے والے مصائب سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں نجات بخش دی تھی، اب وہ ہر مصروفیت سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو کر رہ گئے تھے، سفر و حضر میں وہ حضور کے ساتھ رہتے، صبح ہو یا شام، دوپہر ہو یا وقت کی کوئی اور آن، وہ ہر دم حضور کے مصاحب و ملازم تھے۔ صرف مدینہ طیبہ ہی نہیں سفری مہمات ہوں یا حضور کے غزوات، ہر دم وہ حضور کے ساتھ سائے کی طرح چلا کرتے تھے، اس صحبت و خدمت کو حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کی تعمیر سے فارغ ہو گئے اور جب وقت اذان آیا تو شہنشاہ کونین نے انہیں نہ صرف یہ کہ مسجد رسول کا پہلا مؤذن بنا دیا بلکہ انہیں تاریخ اسلام کا پہلا مؤذن ہونے کا منصب عطا فرمایا۔ (صور من حياة الصحابة، ص: ۳۱۸)

حضرت بلال در رسول پر کھڑے ہو کر یا رسول اللہ کہتے: امام ابن سعد تحریر فرماتے ہیں: جس شخص نے سب سے پہلے اذان پڑھی اس کا نام حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے، جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان سے فارغ ہو جاتے تو اس ارادے سے کہ حضور کی بارگاہ میں عرض کر دیں کہ وہ اپنی اذان دینے کی ڈیوٹی پوری کر چکے ہیں، حضور کی چوکھٹ پر کھڑے ہو جاتے (اور کمال ادب سے) عرض کرتے ہیں ”حی علی الصلاة، حی علی الفلاح، الصلاة یا رسول اللہ“ (پھر جا کر اقامت کی جگہ کھڑے ہو جاتے) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در دولت سے باہر تشریف لاتے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کا دیدار کر لیتے پھر اقامت کہنے کی ابتدا کرتے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۵)

جھوٹی روایات: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یارانِ مکتہ داں نے کئی من گھڑت اور موضوع روایات پہلے گڑھیں پھر ان کو بڑی چابک دستی سے عوام میں پھیلا یا، ماضی قریب میں حدیث کی روایت و درایت سے ناواقف لفاظ و لسان حضرات خاص کر قوال پارٹی نے ان روایات کو خوب رواج دیا، یہاں تک کہ یہ جھوٹی روایات حقیقت ثانیہ کی صورت اختیار کر گئیں، بھلا ہو علمائے ربانین کا کہ انہوں نے طاقت بھر اس جھوٹ کا پردہ فاش کیا اور عوام تک حق پہنچانے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ آپ کی زبان میں لکنت تھی جس کی وجہ سے آپ شین ادا نہیں کر پاتے تھے اور شین کو سین پڑھا کرتے تھے، اس ضمن میں ایک واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بعض یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا مؤذن رکھا ہے جسے سین اور شین کی بھی تمیز نہیں، اس پر (معاذ اللہ) حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دینے سے روک دیا، کسی دوسرے صحابی نے فجر کی اذان دی لیکن اس دن صبح ہی نہیں ہوئی، صحابہ سو سو کر تھک گئے بعض صحابہ نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا: حضور! آج صبح ہو ہی نہیں رہی ہے، تب حضور کی بارگاہ میں حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور! آپ کا رب فرماتا ہے: جب تک بلال اذان نہ دیں گے اس وقت تک صبح نہیں ہوگی اور یہ کہ ہمارے نزدیک بلال کا سین شین ہے۔ (لعلیاذ باللہ)

حضرت بلال فصیح ترین لوگوں میں ہیں: مذکورہ واقعہ غلط، موضوع اور من گھڑت ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار دنیا کے فصیح ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: ”کان من افصح الناس“ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فصیح ترین لوگوں میں شامل ہیں، معاملہ یہ نہیں جو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سین شین شمار کی جاتی تھی یہاں تک کہ بعض لوگوں نے جو حدیث بیان کی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سین اللہ کے نزدیک شین قبول ہوتی ہے، اس حدیث کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اصل ثابت نہیں۔ (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج: ۴، ص: ۶۵، سبل الہدی والرشاد ج: ۱۱، ص: ۴۱۵، الہدایہ والنہایہ ج: ۸، ص: ۳۰۵)

”سین بلال عند اللہ شین“ اس جملہ کو احادیث موضوعہ میں شمار کرنے والے علما کی لمبی فہرست ہے، ہم ان سب کے حوالے دے کر بات کو لمبا کرنا نہیں چاہتے۔

حضرت بلال کے فصیح ہونے کے دلائل: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فصیح اللسان ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان دینے پر مامور فرمایا تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فصحاء عرب کے درمیان اذان جیسی اہم ذمہ داری ایک ایسے شخص کو عطا فرمادیں کہ جو شین بھی ادا نہ کر پاتا ہو؟ اذان کی ابتدا والی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ

بن زید سے فرمایا: ”قم مع بلال فانہ اندی و امد صوتا منک“ تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور انہیں اذان کے کلمات بتاتے جاؤ (تم بتاؤ گے اور حضرت بلال پڑھتے جائیں گے) کیونکہ ان کی آواز تم سے اچھی اور بلند ہے۔ ہم اس عنوان کا اختتام حضرت علامہ محمد رضا علی قادری کی تحریر پر کر رہے ہیں:

حدیث میں بیان شدہ اس واقعے سے ثابت ہوا کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فصیح اللسان تھے، ورنہ شرع شریف میں مؤذن کا بلند آواز والا ہونا اتنا اہم نہیں جتنا مؤذن کا فصیح ہونا اہم ہے لہذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف اس لیے اذان دینے کا حکم یا اجازت نہیں دی کہ ان کی آواز اتنی بلند نہ تھی تو بھلا ہم یہ کیسے مان لیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان پڑھنے کا حکم دے دیں، جو ”اشھد“ کو ”اسھد“ سے بدل کر پڑھتے ہوں؟ لہذا حق یہی ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فصیح اللسان تھے، ان کی زبان ایسی کسی بھی طرح کی خرابی سے بالکل پاک تھی۔

حدیث میں موجود لفظ اندی کی لغوی تحقیق: لغت کی عام و خاص ہر طرح کی کتاب میں اس لفظ کو اچھی اور بلند آواز والے کے معنی میں لیا گیا ہے اور یہ اس کا عام استعمال ہونے والا معنی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تاج العروس اور لسان العرب ج: ۸، ص نمبر: ۷۴۰ میں لفظ اندی کا معنی ظاہر کرنا بھی کیا گیا ہے، جس کی رو سے اسم تفضیل اندی کا معنی سب سے زیادہ ظاہر کرنے والا ہوگا، چنانچہ لفظ اندی میں مؤخر الذکر معنی کی گنجائش بدرجہ اتم موجود ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے لفظ اندی کا استعمال فرمانا اس کا واضح ثبوت ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ زیادہ اچھی اور بلند آواز والے تھے اور الفاظ کو خوب ظاہر کر کے پڑھنے والے بھی تھے، جو کہ اظہار فصاحت کو مستلزم ہے لہذا دوسرے لفظوں میں اگر یوں کہہ دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں حضرت سیدنا بلال

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فصیح اللسان قرار دیا ہے تو یہ معنأً بالکل درست ہے۔

سیدنا بلال فصیح اللسان تھے: (۱) چنانچہ لفظ اندی کو فصاحت کے

معنی میں مراد لینے کی تائید خود علامہ سخاوی نے بھی اپنی کتاب المقاصد الحسنہ ص: ۲۵۵ میں اپنے الفاظ میں یوں کی ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فصیح اللسانی اور حسن الصوت کو اکثر اہل علم حضرات نے بیان کیا ہے اور بذات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اذان کا خواب دیکھنے والے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یوں فرمایا ہے کہ یہ الفاظ بلال کو سکھا دو کیوں کہ وہ تم سے زیادہ ظاہر الصوت ہے۔ (علامہ سخاوی فرماتے ہیں) چنانچہ اگر سیدنا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان مبارک میں تو تلاپن ہوتا تو اس بات کو کثیر تعداد میں اہل علم نقل کرتے، ثناغت (توتلی) والی بات تو ان منافقوں اور گمراہ لوگوں کے منہ سے نکلی ہوئی ہے جو اہل اسلام کی شان میں خرابی پیدا کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے بھلائی کی توفیق کے ہی طلبگار ہیں۔

(۲) اسی کے ساتھ ہم علامہ حافظ ابن کثیر کے البدایہ والنہایہ المعروف تاریخ ابن کثیر ج: ۵، ص: ۱۳۹ میں ذکر کردہ وہ الفاظ بھی بطور دلیل پیش کر دیتے ہیں جس میں واضح طور پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فصیح ہونے کا ذکر ہے، آپ لکھتے ہیں: جب مدینہ میں اذان شروع ہوئی تو حضرت سیدنا بلال اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اذان دیا کرتے تھے، چنانچہ کبھی اذان یہ دیتے تھے اور کبھی یہ، اور حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حسین الصوت اور فصیح اللسان تھے۔

(۳) نیز علامہ صالح دمشقی نے سبل الہدیٰ والرشاد ج: ۱۱، ص: ۴۱۵ میں ماقبل سے بھی واضح عبارت میں بصیغہ تفضیل حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فصاحت کا ذکر کیا ہے، آپ فرماتے ہیں: حضرت سیدنا بلال بن رباح حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں ابن حمامہ بھی کہا جاتا ہے، حضرت حمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ہیں، علامہ الحافظ، علامہ مزنی، علامہ ابن کثیر اور ان کے علاوہ دوسرے علما بھی فرماتے ہیں

کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب لوگوں سے زیادہ فصیح تھے نہ کہ اس طرح جیسا لوگ ان کے بارے میں گمان کرتے ہیں کہ ان کی سین بھی شین ہی ہے حتیٰ کہ وہی بعض لوگ اس بارے میں ایک بے اصل حدیث بھی روایت کر دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”بلال کی سین بھی اللہ کے نزدیک شین ہے۔“

(۴) علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی اپنی کتاب کشف الحفاء و مزیل الالباس کی ج: ۱، ص: ۴۱۱ رقم: ۱۵۱۸ میں فرماتے ہیں: حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فصیح اللسانی اور حسن الصوت کو اکثر اہل علم حضرات نے بیان کیا ہے اور بذات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اذان کا خواب دیکھنے والے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یوں فرمایا کہ یہ الفاظ بلال کو سکھا دو کیونکہ وہ تم سے زیادہ ظاہر الصوت ہیں، چنانچہ اگر حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان مبارک میں تو تلاپن ہوتا تو ایسی بات کو کثیر تعداد میں اہل علم نقل ضرور کرتے، لثاغت والی بات تو ان منافقوں اور گمراہ لوگوں کے منہ سے نکلی ہوئی ہے جو اہل اسلام کی شان میں خرابی پیدا کرنے کی بھرپور کوششوں میں لگے رہتے ہیں، یہ کلام مکمل ہوا۔ نیز علامہ ابراہیم ناجی اپنی کتاب المولد میں فرماتے ہیں کہ میں اللہ کو گواہ بنا کر اللہ کی قسم! کھا کر کہتا ہوں کہ میرے آقا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی بھی ”اشہد“ کی بجائے سین مہملہ کے ساتھ ”اسہد“ نہیں کہا، جیسا کہ علامہ موفق الدین بن قدامہ سے ان کی المغنی میں واقع ہوا ہے اور اس معاملے میں علامہ ابراہیم کے بھتیجے شیخ ابو عمر شمس الدین نے کتاب المقنع کی اپنی شرح میں بھی علامہ ابراہیم ناجی کی ہی تقلید کی ہے بلکہ حق بھی یہی ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں سے زیادہ فصیح اللسان تھے اور ان سب سے زیادہ ظاہر الصوت بھی تھے۔ ”الحمد لله على ذلك“ واضح ہو گیا کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فصیح الناس یعنی تمام لوگوں سے زیادہ فصیح تھے اور یہی حق ہے ورنہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے کسی اور کو اسلام کا پہلا مؤذن بنادیا جاتا۔

نوٹ: ہم نے مصنف کی ذکر کردہ عربی عبارات کو حذف کر دیا ہے، صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے۔ جنہیں عربی عبارات دیکھنا ہوں وہ اصل کتاب کی طرف رجوع کریں۔

غزوات میں شرکت: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سایہ کی طرح رہتے تھے، اس کی برکات انہیں دنیا و آخرت میں حاصل رہیں، حضور کی اس رفاقت نے انہیں بدر سے لیکر تمام غزوات میں شرکت کی سعادت عطا فرمائی۔ علمائے تاریخ بیان فرماتے ہیں: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدر اور اس کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۵، الاصابہ، ج: ۱، ص: ۱۷۱، طبقات، ج: ۳، ص: ۲۲۰)

جنگ بدر سے متعلق حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک خاص واقعہ کتابوں میں درج ہے جسے پڑھ کر اسلام سے محبت کرنے والوں کے چہرے کھل اٹھتے ہیں، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی داستان غم اور واقعات ستم پڑھنے کے بعد اہل محبت کے دل رنج و الم کے خنجروں سے زخمی ہوتے ہیں، یہ واقعہ کسی حد تک زخمی دلوں کی ملم پیٹی اور مرہم نوازی کا کام کرتا ہے، ہم اس تاریخی واقعے کو پیر کرم شاہ ازہری کے الفاظ میں بیان کر رہے ہیں آپ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت بلال نے امیہ سے اپنا بدلہ لے لیا: امام بخاری اور امام ابن اسحاق عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور امیہ دونوں دوست تھے، میرا پہلا نام عبد عمر تھا جب میں مشرف بہ اسلام ہوا تو میں نے اپنا نام بدل کر عبد الرحمن رکھ لیا، جب امیہ مجھے ملتا تو مجھے ازراہ طعن کہتا کہ اے عبد عمر! تم نے اپنا وہ نام ترک کر دیا ہے جو تیرے باپ نے رکھا تھا، میں کہتا: بے شک اس نے کہا: میں الرحمن کو نہیں جانتا اس لیے میں تمہیں عبد الرحمن کہہ کر نہیں بلاؤں گا اور اپنے پہلے نام کو تم نے ترک کر دیا ہے، اس لیے ہم آپس میں تمہارے لیے ایک نام طے کر لیں کہ جب میں تمہیں بلاؤں تو اس نام سے بلا یا کروں چنانچہ ہم نے باہمی مشورہ سے عبد اللہ نام ت جو یز کر لیا، اس کے بعد جب کبھی وہ میرے پاس سے گزرتا تو مجھے عبد اللہ کہہ کر بلاتا اور میں اس کا جواب دیتا۔ جب جنگ بدر میں ہم اکٹھے ہوئے تو میرے دل میں خیال آیا کہ اسے اس جنگ

میں شرکت کرنے سے منع کر دوں، میں نے دیکھا کہ امیہ اپنے بیٹے علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے آ رہا ہے، میرے پاس چند زرہیں تھیں جو میں نے اپنے مقتولوں سے اتاری تھیں، جب اس نے مجھے دیکھا تو اس نے مجھے میرے پہلے نام سے بلایا: یا عبد عمرو! میں نے اسے جواب نہ دیا پھر اس نے مجھے عبداللہ کہہ کر پکارا، میں نے ہاں سے جواب دیا پھر اس نے مجھے کہا: کیا تجھے میری سلامتی کی ضرورت ہے؟ تو پھر ان زرہوں کو پرے پھینک دو اور مجھے بچانے کی فکر کرو، میری جان ان زرہوں سے زیادہ قیمتی ہے چنانچہ میں نے وہ زرہیں پھینک دیں پھر اس کا اور اس کے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا، میں ان کو لے کر چلا، راستے میں اس کے بیٹے علی نے مجھ سے پوچھا: اے عبداللہ! یہ شخص کون ہے، جس نے اپنے سینے پر شتر مرغ کا پر بطور علامت سجایا ہوا ہے؟ میں نے کہا: یہ حمزہ بن عبدالمطلب ہے۔ وہ بولا: ”ذَٰلِكَ الَّذِي فَعَلَ بِنَا الْاِفَاعِيلَ“ یعنی یہ وہ شخص ہے جس نے ہم پر بجلیاں گرائی ہیں، میں انہیں لے کر جا رہا تھا اچانک حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے میرے ساتھ دیکھ لیا، یہ وہی امیہ تھا جو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے مسلمان ہونے کے جرم میں اذیت ناک سزائیں دیتا تھا، آپ نے جب اسے دیکھا تو بلند آواز سے پکارا ”رَأْسُ الْكُفْرِ امِيَّةُ بْنُ خَلْفِ لَانِ جَوْتِ اَنْفَجَا“ یہ ہے کفر کا سرغنہ امیہ بن خلف اگر آج وہ بچ کر نکل گیا تو پھر میرا بچنا محال ہے۔ آپ نے یا معشر الانصار کہہ کر اپنی مدد کے لیے انصار کو بلایا، چند انصاری نو جوان لپک کر ان کے پاس آ گئے اور ہمارے تعاقب میں نکلے، جب میں نے دیکھا کہ وہ ابھی ہمیں آ لیں گے تو میں نے امیہ کے لڑکے کو ان کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اس کے ساتھ الجھ کر مشغول ہو جائیں، اتنے میں امیہ کو میں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں گا، امیہ فرہ اندام تھا اس سے تیزی سے چلا نہیں جاسکتا تھا، میں نے اسے کہا: بیٹھ جاؤ، اور میں اس پر سپر بن کر لیٹ گیا تاکہ اس کو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار کے وار سے بچا سکوں، یہاں تک کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا، وہ اس پر جھپٹ رہے تھے اور میں اس کا بچاؤ کر رہا تھا، اسی اثنا میں کسی نے تلوار کے

وار سے اس کے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی اور وہ دھڑام سے زمین پر گرا، امیہ نے یہ منظر دیکھ کر ایسی چیخ ماری کہ لوگوں کے دل دہل گئے، میں نے ایسی دل دوز چیخ پہلے کبھی نہیں سنی تھی، میں نے امیہ کو کہا: اس کو اب چھوڑو اب اپنی جان بچاؤ، میں اب تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تلواروں کے پیہم واروں سے اس کے پرزے اڑا دیے، حضرت عبدالرحمن بن عوف بعد میں بھی کہا کرتے تھے ”یرحم اللہ بلالا ذہبت ادراعی و فجعی بالسیبری“ اللہ بلال پر رحم کرے میری زربیں بھی چلی گئیں اور میرے دو قیدیوں کو قتل کر کے مجھے ان کے زرفدیہ سے محروم کر دیا۔

وہ حبشی بلال جو دولت ایمان سے مشرف ہونے سے پہلے بنی حج کی ایک مشرک عورت کا زرخیز غلام تھا اور رات دن اس کی خدمت گزاری میں لگا رہتا تھا، اس نے جب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تو حید قبول کر لی تو کفر و شرک کے سرغنے ابو جہل اور امیہ انہیں طرح طرح کی سزائیں دیا کرتے تھے، آپ کے گلے میں رسی ڈال کر چنداواشوں کو پکڑا دیتے، وہ انہیں مکہ کی پتھر بلی گلیوں میں گھیٹے پھرتے، جب ان کا سر کسی پتھر سے ٹکراتا تو یہ قہقہے لگا کر ہنستے اور غشی کی حالت میں بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ سے احدا حد کی صدائیں بلند ہوتیں، آج وہ کمزور اور بے نوا بلال قوت ایمان اور اپنے اسلامی بھائیوں کے تعاون سے اتنا طاقتور ہو کر میدان بدر میں ابھرا کہ اس کی تلوار آج مکہ کے ایک رئیس اعظم اور اس کے نوجوان بیٹے پر اٹھ رہی ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آڑے آئے اور اس کو چھوڑائے اس روح فرسا بلکہ روح پرور منظر سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تصویر سامنے آ جاتی ہے: ”وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُكِّنْ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيْ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمْ مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَخْذَرُونَ ۝“ اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں اور بنادیں انہیں پیشوا اور بنادیں (فرعون کے تاج و تخت کا) وارث اور تسلط بخشیں انہیں سرزمین (مصر) میں اور ہم دکھائیں فرعون اور

ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کی جانب سے (وہی خطرہ) جس کا وہ اندیشہ کیا کرتے تھے۔
(سورۃ القصص، آیت: ۵، ۶، سیرۃ الرسول، ج: ۳، ص: ۳۷۷)

حضور کی خدمت و معیت: یوں تو ہر صحابی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کرنا اپنے لیے باعث ہزار افتخار سمجھتا تھا اور ہر صحابی آپ کا خادم ہی تھا لیکن چند خوش نصیب وہ تھے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خدمت کی خاص اجازت بخشی تھی۔ ان میں حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، اسلم بن شریک، اسماء بن حارثہ، بکیر بن شداد، خالد کے بیٹے حبہ اور سواہ، ذوقم، ربیعہ بن کعب، سعد مولیٰ ابی بکر، عبداللہ بن رواحہ، عقبہ بن عامر، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ کے نام خاص طور پر شمار ہوتے ہیں، ان تمام کے مابین حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۸، ص: ۳۰۴)

حضرت بلال حضور کے نیزہ بردار: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے خادمانہ شان سے نیزہ اٹھائے چلا کرتے، خاص مواقع پر نیزہ لے کر چلنا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقدر تھا، مثلاً عیدین کے لیے نکلنا ہو، یا نماز استسقاء کے لیے باہر جانا، یہ خدمت حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصے میں آتی رہی یہ بات کہ نیزہ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ کیوں چلا جاتا تھا تو اس کی علما نے چند حکمتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) نماز کے وقت کھلی فضا میں نیزہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے نصب کر دیا جائے تاکہ لوگ سامنے سے گزر سکیں۔

(۲) وقت پڑنے پر مدافعت کی جاسکے، مدافعت دشمنوں سے بھی ہو سکتی تھی اور حشرات الارض وغیرہ سے بھی۔

(۳) قضائے حاجت کے وقت جگہ کو نرم کیا جاسکے۔

(۴) اس پر کوئی چیز ٹانگی جاسکے یا وقت ضرورت اس پر ٹیکا لگایا جاسکے۔ (نعمۃ الباری، ج: ۱، ص: ۵۵۴)

شاہ حبشہ حضرت نجاشی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تین نیزے تحفہ بھیجے تھے، یہ نیزے ان عمدہ نیزوں میں سے تھے جنہیں شاہان وقت اپنے لیے پسند کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نیزہ اپنے لیے منتخب فرمایا، دوسرا حضرت علی بن ابی طالب کو عطا کیا اور تیسرا نیزہ حضرت فاروق اعظم کو عنایت فرمایا رضی اللہ عنہم۔ جو نیزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے رکھ لیا تھا اس کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خاص کر دیا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری ظاہری حیات میں عید، بقرہ عید اور نماز استسقاء کے موقع پر اس نیزے کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چلا کرتے، جب حضور (کھلی فضاء میں) نماز پڑھتے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نیزے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گاڑ دیتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وہ اس نیزے کو لے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ چلا کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں یہ ذمہ داری سعد القرظ نے پوری کی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۷، صور من حياة الصحابة، ص: ۳۱۹)

حضرت بلال اور صحابہ پر نیند کا غلبہ: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر کے ساتھی تھے، سفر و حضر میں اذان دینے کی ذمہ داری بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد رہتی تھی، خیبر سے واپسی کے سفر میں رات کے وقت فجر سے پہلے صحابہ کرام نے آرام کرنا چاہا لیکن معاملہ فجر کی بیداری کا تھا کہ فجر کے وقت سب کو بیدار کون کرے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آگے بڑھ کر یہ ذمہ داری قبول کی لیکن رات کی آخری ساعت نے انہیں بھی سلا دیا اور وہ صحابہ کرام کو بیدار نہ کر سکے۔ پورا واقعہ پیر کرم شاہ ازہری سے سنیں:

نماز صبح کا قضا ہونا: خیبر سے مدینہ طیبہ واپسی کے وقت صبح کی نماز قضا ہونے کا واقعہ پیش آیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کو یوں روایت کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ خیبر سے واپسی کے وقت ایک رات سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات

کے پہلے حصے میں سفر شروع کیا، جب رات ڈھل گئی اور نیند محسوس ہونے لگی تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو شبِ باشی کی اجازت مرحمت فرمائی لیکن استراحت فرمانے سے پہلے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے پوچھا: کیا تم میں سے کوئی ایسا صالح شخص ہے جو جاگتا رہے اور جب فجر طلوع ہو تو ہمیں جگا دے؟ ایسا نہ ہو کہ ہم سوتے رہ جائیں اور نماز فجر قضا ہو جائے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس خدمت کے لیے غلام حاضر ہے۔ اس اہتمام کے بعد سب آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو بیدار رکھنے کے لیے نفل پڑھنا شروع کر دیا، جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ نفل ادا کرنے میں مشغول رہے، طلوع فجر سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے اپنے اونٹ کے ساتھ ٹیک لگالی تاکہ جونہی صبح صادق طلوع ہو تو انہیں پتہ چل جائے لیکن اس وقت ان پر نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سو گئے اور ایسے سوئے کے طلوع آفتاب کے بعد جب دھوپ تیز ہو گئی تو سب سے پہلے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ مبارک کھلی، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”ما صنعت بنا یا بلال“ اے بلال! تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! جس ذات نے آپ کو سلائے رکھا اس نے مجھے بھی جاگنے نہیں دیا، حضور نے فرمایا: ”صدقت“ تو نے سچ کہا ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو یہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا، کچھ دور آگے جا کر حضور نے اپنے اونٹ کو بٹھایا اور سب صحابہ کو اپنی سواریاں بٹھانے کی ہدایت کی، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان و اقامت کہی امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والثناء کی اقتدا میں نماز صبح قضا پڑھی گئی، نماز سے فراغت کے بعد ہادی برحق نے اپنے جاں نثاروں کو ارشاد فرمایا: ”اذا نسیتم الصلوٰۃ فصلوها اذا ذکرتموها فان الله عز وجل يقول اقم الصلوٰۃ لذکری“ یعنی اگر تم نماز ادا کرنا بھول جاؤ جیسے ہی تمہیں یاد آئے اس کو پڑھ لیا کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ادا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لیے“۔ (سبل)

الہدیٰ والرشاد، ج: ۵، ص: ۲۳۱، السیرۃ الخلیفہ، ج: ۲، ص: ۱۸۲، تاریخ الخمیس، ج: ۲، ص: ۵۹)

نماز کے قضا ہونے میں حکمت: رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”عینای تنامان ولا ینام قلبی“ یعنی بوقت خواب میری دونوں آنکھیں تو سوتی ہیں لیکن میرا دل اس وقت بھی جاگ رہا ہوتا ہے۔ اس روز بیدار نہ ہونے میں حکمت یہ تھی کہ سب لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اگر کسی وجہ سے وہ نماز ادا کرنے سے قاصر رہیں تو جب یاد آئے تو قضا کر لیں نیز حضور نے فرمایا ہے: ”صلوا کما رایتہمونی اصلی“ کہ تم نماز اس طرح ادا کیا کرو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو اور نماز ادا کرتے ہوئے صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر و حضر میں بارہا دیکھا تھا لیکن نماز قضا کرتے ہوئے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا، جب کہ امت کے بعض افراد سے نماز کا قضا ہونا بعید از امکان نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پر نیند طاری کر کے قضا نماز پڑھنے کا بھی موقع فراہم کر دیا تاکہ اللہ کے محبوب کی امت قیامت تک ادا و قضا میں اپنے نبی رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کی سعادت حاصل کرتی رہے ”وَلِلّٰهِ فِي شَأْنِهِ حَكْمٌ لَا تَعْدُ وَلَا تَحْصَى“ اللہ کے سارے کاموں میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

(سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۳۱۸ تا ۳۲۰)

فتح مکہ دخول کعبہ اور حضرت بلال: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زندگی میں کئی دور دیکھے، مختلف مراحل سے گزرے، شدت وحدت کو برداشت کیا، ایک وہ زمانہ تھا جب ان پر کوڑے برسائے جاتے تھے اور وہ احدا حد کے نعرے لگاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا، ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے لیکن ابتدائی مراحل میں یہاں بھی حالات پرسکون نہ رہے، مرض میں مبتلا ہو گئے، مرض نے اس حد تک جذبات میں ہيجان پیدا کر دیا کہ انہیں مکہ کے بیابان، ریگستان، صحراء، وادیاں اور کہسار یاد آنے لگے، اللہ کے کرم نے دستگیری کی، حالات سازگار ہوتے چلے گئے، مدینہ طیبہ کی پرسکون فضا میں ذکر و فکر کی لذت حاصل ہونے لگی پھر قدرت نے انہیں وہ دن بھی دکھایا جب میدان بدر

میں انہیں ستانے، استہزاء کرنے اور مذاق اڑانے والے بے یار و مددگار پچھڑے پڑے تھے، مسلمانوں کی تلواروں نے کتنوں کے سرتن سے جدا کر دیے تھے، ظلم و تعدی کا وہ پیکر مجسم جس نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی یعنی رسوائے زمانہ امیہ بن خلف خود حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار سے واصل جہنم ہوا پڑا تھا، وہی بلال جو کبھی امیہ کے سامنے اس کی بغیر اجازت زبان کھولنے کے بھی مجاز نہ تھے، آج اسلام نے ان کمزور ہاتھوں کو اتنا طاقتور بنا دیا کہ امیہ بن خلف جیسے طاقتور سورما کو تیغ کر ڈالا ہے، اس کے بعد بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے، سرد و گرم سے آشنا ہے، اتار چڑھاؤ بھرے منازل سے گزرے، آخر وہ دن بھی آیا جس کی بشارت معبود حقیقی نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اور محبوب کے غلاموں کو پہلے ہی ”إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا“ کے مبارک الفاظ میں سنا دی تھی۔ وہ مبارک دن جس کی آرزو میں صحابہ کرام نے نہ جانے کتنے آنسو بہائے تھے، محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں مسلسل تگ و دو کرتے رہے تھے، قربانیاں دی تھیں اور غیر معمولی دکھ سہے تھے، جس کے لیے نہ جانے کتنی مرتبہ جاگتی آنکھوں سے حسین و جمیل خواب دیکھے تھے، آج وہ سارے خواب شرمندہ تعبیر ہو رہے تھے، رب کا محبوب فاتح مکہ کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوا چاہتا ہے، مکہ میں احکام خداوندی کا نفاذ کیا جانا ہے، روئے زمین پر رب کی عبادت کا سب سے پہلا گھر خانہ کعبہ کب سے حضور کے انتظار میں ہے کہ وہ فاتح مکہ بن کر میرے صحن میں خرام ناز فرمائیں، میرے اندر رکھے ہوئے تین سو ساٹھ جھوٹے خداؤں کی جھوٹی خدائی کا پردہ فاش فرمائیں، انہیں ذلت و حقارت سے زمین بوس کر کے شعائر کفر کی نجاتوں سے مجھے پاک فرمائیں، سچے خدا کی کبریائی کا نعرہ بلند کریں اور بندگان خدا کی جبینوں سے میرے گوشے گوشے اور کونے کونے کو معمور فرمائیں۔ آگیا وہ دن قریب تر ہو گئیں وہ ساعتیں جب رب کے برگزیدہ رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم صحن کعبہ سے گزر کر عین کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں جب اللہ کے محبوب بیت اللہ کی

عمارت کے اندر داخل ہوئے تو آپ کے ساتھ کتنے لوگ تھے؟ ان کے اسماء مبارکہ کیا ہیں؟ ہم اس سوال کو امام بخاری کی جانب متوجہ کرتے ہیں وہ ہماری علمی پیاس بجھاتے ہوئے اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

امام بخاری فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور آپ کے ساتھ حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال، حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ (صحیح ابن حبان کی روایت میں ہے کعبہ مقدسہ میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا گیا۔) (حدیث نمبر: ۳۲۰۴) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک خانہ کعبہ میں ٹھہرے رہے اس کے بعد دروازہ کھولا، لوگ تیزی کے ساتھ بیت اللہ کی طرف بڑھے، سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عمر داخل ہوئے دیکھا کہ حضرت بلال دروازے کے پیچھے کھڑے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے عمر نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فوراً پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کس جگہ ادا فرمائی؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارہ کر کے حضرت عبداللہ بن عمر کو وہ جگہ دکھائی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور سر بس جود ہوئے تھے۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی باب دخول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من اعلیٰ مکہ)

آپ نے شان حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملاحظہ فرمائی کہ اس مبارک و مسعود وقت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار ہا صحابہ کے درمیان دخول کعبہ کا موقع حضور کی معیت میں صرف تین صحابہ کو میسر آیا، جن میں ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی اور محبوب صحابی کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید تھے، دوسرے کعبہ مشرفہ کے کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہ تھے، تیسرے ندائے آسمانی کے داعی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک مؤذن، ہمارے مدد و مدد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ (صور من حياة الصحابة، ص: ۳۱۹)

جیسا کہ حدیث پاک میں بیان ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر تک خانہ کعبہ میں ٹھہرے رہے، ایک زمانے کے بعد عبدالکامل، انبیاء و رسل کے امام، پیغمبر اسلام کا سر خانہ کعبہ میں اپنے معبود حقیقی کی بارگاہ میں عجز کی سرزمین پر رکھا ہوا تھا، اس طویل سجدے کی

کیفیات، مناجات کے لمحات، اللہ کے محبوب کا خانہ خدا میں بندگی کا اظہار، ان تمام ساعات کو اپنے دل و دماغ میں بسانے والے اور اپنی نظر کا سرمہ بنانے والے لوگوں کی شناخت اگر تاریخ سے معلوم کی جائے تو روئے زمین پر ایسے خوش نصیبوں کی تعداد صرف تین تھی، ان میں ایک نام حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے ”ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ“ یہ سب اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نواز دیتا ہے۔

فتح مکہ اور اذان بلال: انہیں دل کش مناظر کے سائے میں ظہر کا وقت آ گیا۔ فرزند ان توحید کے ہزاروں ہزار کے مجمع نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے محبتانہ حصار میں لے رکھا ہے، خدام آقا کی حفاظت کے لیے سر بکفن چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، شمع رسالت پر عشق رسالت کے پروانے نثار ہونے کے لیے مکمل تیار ہیں بلکہ مصروف پرواز ہیں، صحن کعبہ مجمع کثیر سے بھرا ہوا ہے، وہ لوگ بھی کعبہ مقدسہ کے آس پاس منڈلا رہے تھے جو کفار قریش میں سے نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ اب وقت ہو چلا ہے کلمہ توحید و رسالت کو بلند کیا جانا ہے، وہ بھی خانہ خدا سے، یہ انتخاب رب کے محبوب کو فرمانا ہے کہ یہ سعادت کس کو بخشی جائے؟ یہاں بھی رب کے محبوب نے ہزاروں ہزار کے بیچ سے اسی پیارے مؤذن کا انتخاب فرمایا، جس کا انتخاب اپنی مبارک مسجد، مسجد نبوی کے لیے فرمایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز دی، لہیک کہتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر خدمت ہو گئے، حکم ہوا: ”بلال خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاؤ، خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر لوگوں کو کلمہ توحید اور نعمۂ رسالت سناؤ“ حکم ملتے ہی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے، اللہ اللہ وہ بلال جو تنہائی میں کلمہ توحید ادا کرتے تھے تو کوڑے کھاتے تھے، تپتی دھوپ میں وزنی پتھر رکھ کر گرم ریت پر لٹا دیے جاتے تھے، گلے میں رسی ڈال کر او باشوں کے حوالے کر دیئے جاتے تھے، وہ انہیں مکہ کی گلیوں میں بے دردی کے ساتھ گھسیٹتے تھے، وہی بلال اسی توحید کا اعلان عام کرنے جا رہے ہیں، اب کوئی روکنے والا ہے نہ مارنے والا، زجر و توبیخ کرنے والا ہے نہ

ڈانٹنے والا، اب بلال ہیں، خانہ کعبہ کی چھت ہے، رب کے محبوب کی غلامی ہے، چہرہ مصطفیٰ کا دیدار ہے، آقا کا سایہ کرم ہے، پرستارانِ توحید کا مجمع ہے، رب کی کبریائی ہے اور نغمہ توحید کی روانی۔

کعبہ کی پر نور فضا میں نغمہ لاہوتی ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کی گونج سنائی دیتی ہے، ہزاروں چہرے اس آواز کی سمت متوجہ ہو جاتے ہیں، نظریں ٹک ٹکی باندھ کر اس امانت کے امین کو دیکھنے لگتی ہیں۔ دیکھا کہ گزشتہ زمانے کا ایک گم نام غلام ہے جو اپنی بلند شیریں اور مدھ بھری آواز میں رب کی کبریائی کے کلمات بلند کر رہا ہے، وہ تھا کبھی گم نام غلام اب تو تاریخ نے اسے آنے والی نسلوں اور صدیوں کا امام بنا کر زمانے کی تختی پر نہ صرف لکھ کر محفوظ کر دیا ہے بلکہ اسے شہرت دوام اور معرفتِ انام بخش دی ہے، اب قیامت تک اسلامی شعور رکھنے والا ہر بچہ، جوان اور بوڑھا نہ صرف حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہچانے گا بلکہ ان کے ساتھ نسبت قائم کرنے کو اپنے لیے عزت، سرخروئی اور باعثِ نجات جانے گا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر کے رس گھولتے ہوئے کلمات پورے ہوئے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے، جیسا کہ ان کی اتباع کرتے ہوئے ہر مؤذن کو کچھ دیر آج بھی توقف کرنا ہوتا ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ٹھہرے اور صحن کعبہ میں موجود جم غفیر نے مبارک کلمات کو پورے خشوع و خضوع کے ساتھ آہستہ آہستہ زیر لب دوہرایا، اہل محبت کے سینے ٹھنڈے ہوئے اور قلوب میں موجود ایمانی دریا موجزن ہو گئے، جن کے قلوب میں حسد اور اسلام دشمنی کی آگ سا لہا سال سے بھڑک رہی تھی، اس آواز نے ان دلوں کو خاکستر کر کے رکھ دیا، دشمنانِ اسلام کے چہرے لٹک گئے اور دل پھٹ گئے، اس منظر کے بارے میں مت پوچھیے جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محبوبِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتے ہوئے اپنی اور قیامت تک کے مسلمانوں کی غلامی کا اعلان کرتے ہوئے کہا: ”اشھد ان محمداً رسول اللہ“ نہ پوچھیے کہ لوگوں نے اس پر کیا کیا تبصرے کیے تھے۔

خدا ہی دے صبر جانِ پرِ غم
دکھاؤں کیوں کر تجھے وہ عالم

ابو جہل کی بیٹی نے کہا تھا: میری جان کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر بلند فرمادیا، نماز تو ہم پڑھیں گے لیکن جن لوگوں نے ہمارے اقارب کو قتل کیا ہے، انہیں کیسے پسند کریں گے۔ (صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۳۲۰، مؤرخا و مبصر)

اذان بلال کے متعلق کچھ تبصرات پیر کرم شاہ الازہری نے اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں، آئیے ان ہی کی زبانی سنتے ہیں، آپ رقم طراز ہیں:

اذان بلال: پہلے دن ہی جب ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ کعبے کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اذان دو، مکہ کی کفر آلود اور تاریک فضاؤں کو نور اسلام سے منور کرنے کے لیے جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان گونجی تو اس وقت ابوسفیان، عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام، حرم شریف کے صحن میں بیٹھے تھے، اذان سن کر غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے عتاب بولا: اللہ تعالیٰ نے میرے باپ اسید پر بڑا کرم فرمایا کہ اسے موت کی نیند سلا دیا، آج اگر وہ زندہ ہوتا اور اذان کے ان کلمات کو سنتا تو یقیناً اس کو بڑا غصہ آتا پھر کہنے لگا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا لے کوئے کے بغیر اور کوئی مؤذن نہیں ملا۔ حارث بن ہشام کہنے لگا: اگر میں جانتا کہ وہ حق پر ہے تو میں ضرور ان کی پیروی کرتا۔ ابوسفیان بولا: ”لا اقول شیئاً لو تکلمت لأخبرت عنی هذه الحصى“ یعنی میں تو کچھ نہیں کہتا اگر میں کوئی بات کروں گا تو یہ کنکریاں حضور کو بتا دیں گی۔

وہ یہی بات کر رہے تھے کہ اللہ کا پیارا رسول ان کے پاس تشریف لے آیا اور فرمایا: ”جو باتیں تم نے کی ہیں ان کا مجھے علم ہے“ ہر ایک کو الگ الگ مخاطب کر کے فرمایا: اے عتاب! تم نے یہ بات کی ہے، حارث تم نے یہ کہا، ابوسفیان بولا: یا رسول اللہ! میں نے تو کوئی بات نہیں کی، حضور اس بات پر ہنس پڑے، حارث اور عتاب نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں

کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ان باتوں کو کسی آدمی نے نہیں سنا اگر کسی نے سنی ہوتی تو ہم یہ سمجھتے کہ اس نے آپ کو ان سے آگاہ کیا ہے، ہم گواہی دیتے ہیں ”آپ اللہ کے سچے رسول ہیں“۔

سعید بن عاص کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے نے جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دیتے ہوئے سنا تو کہنے لگا: اللہ تعالیٰ نے میرے باپ سعید پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ اس کا لے کو کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا دیکھنے سے پہلے وہ ملک عدم کو سدھارا۔ حکم بن ابوالعاص بولا: یہ ایک عجیب و غریب سانحہ ہے کہ بنی نجج کا غلام (بلال) ابوطحہ کی تعمیر کردہ عمارت پر کھڑے ہو کر چیخ رہا ہے، اس تمام شور و غل کے باوجود حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد نبوی کے مطابق کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر مکمل اذان دی، اس ساعت ہمایوں سے لے کر آج تک یہ روح پرور کلمات اس فضا میں گونج رہے ہیں اور نور بر سار ہے ہیں اور قیامت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ (سیرۃ الرسول، ج: ۴، ص: ۷۷، ۷۸، ۷۹)

حضرت بلال کے علاوہ حضور کے مؤذن: علامہ بدرالدین عینی تحریر فرماتے ہیں: صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مؤذن تھے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ یعنی وقت واحد میں دو مؤذن تھے ورنہ ان دو کے علاوہ بھی آپ کے مؤذن تھے۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ میں آپ کے لیے اذان دی ہے اور حضرت سعد القرظ نے آپ کے لیے قبائیں تین مرتبہ اذان دی ہے۔ (نخب الافکار فی تحقیق مباحی الاخبار فی شرح معانی الآثار، ج: ۲، ص: ۷۷، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۲، ص: ۸۶)

حضور کا وصال اور اذان بلال: جس دن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا مؤذن منتخب فرمایا، اس دن سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صدائے بلال سے بڑا انس تھا اور کیوں نہ ہوتا یہ وہی آواز تھی جسے ایک زمانے تک راہ خدا میں سخت سے سخت تکالیف اور شدید ترین

عذابوں میں مبتلا کیا گیا تھا، مگر یہ آواز ہر عذاب و تکلیف برداشت کر کے بھی ادا حد پکارتی رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا، نماز کا وقت ہوا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان پڑھنے کی تیاری کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی جسم پاک کو ابھی قبر میں نہیں اتارا گیا ہے، اس پیکر نور پر صرف ایک چادر ڈال دی گئی ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان دینا شروع کی، اذان پڑھتے پڑھتے جیسے ہی ”اشھدان محمد رسول اللہ“ پر پہنچے، شدت غم سے نڈھال ہو گئے، آنسوؤں کے تقاطر نے گویا کہ گلا گھونٹ دیا، آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی، اہل مدینہ آہیں بھرنے لگے، جدھر نظر اٹھائیے تو بتے آنسو، ہچکیاں لیتے اہل بیت اور سسکیاں لیتے صحابہ نظر آئیں گے، پورا ماحول اس قدر غمگین ہو گیا کہ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین دن تک اذان کہی۔ جب بھی ”اشھدان محمد رسول اللہ“ کا تلفظ کرتے روتے اور صحابہ کرام پر گریہ طاری کرتے۔

(صومن حیاة الصحابة، ص: ۳۲۱، سلوة الکلیب بوفاة الحبيب، ج: ۱، ص: ۲۸)

حضرت بلال اور قبر رسول: بعد وصال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں مدفون ہوئے، قبر مبارک بند کر دی گئی پھر قبر مبارک پر پانی چھڑکا گیا، یہ سعادت بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصے میں آئی کہ قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھوں سے پانی چھڑکا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک مٹک تھی جس میں پانی تھا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرہانے کی دائیں کروٹ سے پانی چھڑکنا شروع کیا اور قدم ہائے مبارک تک چھڑکا اور بائیں کروٹ تک پانی پہنچانے کے لیے حجرہ مبارک کی دیوار کا سہارا لیا گیا کیونکہ اس طرف دیوار کی وجہ سے چکر نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۸، ص: ۱۵۳)

حضور کے بعد حضرت بلال نے اذان پڑھی؟: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی خلیفہ کے دور میں باضابطہ اذان پڑھی یا نہیں، اس سلسلے میں تاریخی روایات مختلف ہیں، بعض روایتوں سے ثابت ہوتا

ہے کہ پھر کسی خلیفہ کے دور میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان نہیں پڑھی، بعض روایات کا مفاد یہ ہے کہ دور صدیقی میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ ذمہ داری نبھاتے رہے لیکن بعد میں آپ نے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

قدرے تفصیل ملاحظہ فرمائیے! ایک روایت میں ہے: جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ’اے خلیفہ رسول اللہ! میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ’’مومن کا سب سے بہتر عمل اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے‘‘ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: میں چاہتا ہوں کہ میں جہاد میں مصروف رہوں، یہاں تک کہ مجھے اللہ کے راستے میں موت آجائے، یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے بلال! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم! دیتا ہوں، میں تمہیں اپنے منصب اور حق کا واسطہ دیتا ہوں (مجھے چھوڑ کر مت جاؤ) میں بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں اور میری موت قریب کھڑی ہے، حضرت ابوبکر کے یہ پرسوز کلمات سن کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ٹھہرے رہے (اور اپنی ذمہ داری نبھاتے رہے) جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات پائی تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور وہی سب کچھ عرض کیا، جو خلیفہ اول سے عرض کیا تھا، حضرت عمر نے بھی وہی جواب دیا جو خلیفہ اول نے دیا تھا لیکن اب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا، اس پر حضرت عمر نے پوچھا: پھر اذان کی ذمہ داری کسے دے دوں؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یہ ذمہ داری حضرت سعد کو سونپ دی جائے کیونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی اذان دی ہے۔ حضرت عمر نے فوراً حضرت سعد کو بلایا اور اذان دینے کی جوابداری انہیں سونپ دی، وہ اذان دیتے رہے اور ان کے

بعد ان کی آل و اولاد اس ذمہ داری کو نبھاتی رہی، اس روایت سے معلوم ہوا کہ زمانہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان پڑھتے رہے۔

اب آپ دوسری روایت پڑھیے! حضرت سعید بن مسیب بیان فرماتے ہیں: ایک جمعہ کو جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر رونق افروز ہوئے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے ابوبکر خلیفہ رسول اللہ! ارشاد فرمایا: ”لبیک یا بلال“ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: امیر المؤمنین آپ نے مجھے اپنی ذات کے لیے آزاد فرمایا تھا یا اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کے لیے؟ خلیفۃ المسلمین نے جواب دیا: بلال! میں نے تمہیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے آزاد کیا تھا، عرض کیا: تو پھر مجھے اجازت دیں کہ میں مجاہدین کے ساتھ غزوات میں شرکت کر سکوں، یہ سن کر امیر المؤمنین نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غزوات میں جانے کی اجازت دے دی، اجازت مل جانے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام چلے گئے وہیں آپ کا وصال ہوا۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۶، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۶۹، صور من حياة الصحابة، ص: ۳۲۲)

اذان کی روایات میں اختلاف اور تطبیق کی صورت: آپ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق کئی روایات ملاحظہ کیں جن میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے اذان پڑھی اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے بھی اذان نہیں پڑھی، ان احادیث کے درمیان حضرت علامہ رضا علی نے تطبیق دینے کی کوشش کی ہے ہم ان کے کلام کو ان کی کتاب سے نقل کر رہے ہیں آپ تحریر فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ ان روایات میں تطبیق دینا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں، چنانچہ میرے نزدیک ان تمام روایتوں میں تطبیق یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی چند روز اذانیں دیں، جیسا کہ

طبقات ابن سعد میں ہیں پھر فرط جذبات کی تاب نہ لاتے ہوئے خلافت صدیقی کے ابتدائی ایام میں جلد ہی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اجازت مانگی اور شام چلے گئے جیسا کہ تاریخ ابن عساکر وغیرہ میں ہے وہاں تھوڑے ہی عرصے بعد (جس کا دروانہ مدارج نبوت ج: ۲، ص: ۵۸۳ میں چھ ماہ بیان کیا گیا ہے) خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے فیض یاب ہوئے اور دور صدیقی میں ہی مدینہ لوٹ آئے، اس وقت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال ہو چکا تھا چنانچہ مسجد نبوی شریف میں اذان دی جیسا کہ تاریخ الخمیس وغیرہ میں ہے اور جب واپسی کا ارادہ کیا تو اس بار سیدنا صدیق اکبر نے انہیں مدینہ میں ہی ٹھہرنے اور اذانیں دینے کے لیے منانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی پھر شام چلے گئے، جیسا کہ ابن عساکر وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے اور اگلے سال پھر مدینہ آکر اذان دی، جیسا کہ تاریخ خمیس میں ہے لیکن اس بار سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پرزور فرمائش کے ساتھ انہیں مدینہ میں ہی اقامت اختیار کرنے اور اذانیں دینے کی ذمہ داری سونپتے ہوئے اپنی محبت اور حق یاد دلا کر رک جانے پر منالیا چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذانیوں کی ذمہ داری پھر سے سنبھال لی حتیٰ کہ دور فاروقی تک وہیں رہے اور اذانیں دیتے رہے جیسا کہ ابن عساکر وغیرہ کی دوسری بعض روایتوں میں ہے لیکن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منصب خلافت پر متمکن ہوتے ہی پھر اجازت لے کر شام چلے گئے جیسا کہ ابن عساکر وغیرہ میں ہے اور وہاں سے ہر سال سابق کی طرح صرف ایک بار اذان دینے کے لیے مدینہ آتے رہے جیسا کہ تاریخ الخمیس میں ہے پھر شام میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد اور فرمائش پر اذان دی جیسا کہ فتوح الشام وغیرہ میں ہے اور وہیں پر وفات پائی جیسا کہ بیشتر کتب میں ہے، میں کہتا ہوں کہ ان صورتوں کا امکان وقوع یکسر نظر انداز کر دینا بھی قطعاً انصاف نہیں ہوگا لہذا یہ تطبیق روایات کی صورت اس امر سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ایک طرح کی روایات کو کلی طور پر چھوڑ کر دوسری کو ترجیح دی جائے لیکن یہ

بھی حق ہے کہ اگر کوئی شخص ہماری اس تطبیق سے اختلاف رکھنا چاہے تو بلاشبہ پوری پوری گنجائش موجود ہے بشرطیکہ کوئی اس سے بھی بہتر تطبیق دے سکے لیکن ایسی توقع کی توقع بھی ان شاء اللہ العزیز بہت کم ہے۔ (جمال بلال، ص: ۲۲۸، ۲۲۹)

ایک مدت کے بعد مدینہ طیبہ میں اذان بلال: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ملک شام کو مستقل طور پر اپنا مستقر بنا لیا تھا (ایک دن قسمت نے ی اور ی کی) خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلال! یہ کیا بے رخی ہے؟ ہماری زیارت کو بھی نہیں آتے“ آقا کی زبان سے یہ الفاظ سن کے سہم گئے، مارے خوف کے آنکھ کھل گئی، غم و اندوہ سے بھری کیفیات کے ساتھ سواری کو تیار کیا اور مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہو گئے، گویا ان کی حالت بیان کر رہی تھی:

پھر اٹھا ولولہ ی یاد مغیلان عرب
پھر کھنچا دامن دل سوئے بیابان عرب
میٹھی باتیں تیری، دین عجم ایمان عرب
نمکیں حسن تیرا، جان عجم شان عرب

سیدھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور پر پہنچے، اپنا چہرہ قبر انور پر لگاتے، رگڑتے اور روتے، یہی حالت تھی کہ حضرت حسنین کریمین تشریف لے آئے پھر کیا تھا کبھی انہیں باری باری سینے سے لگاتے کبھی ان کے جسم نازنین کو بوسہ دیتے، حضرات حسنین نے فرمایا: ”بلال! ہم اس اذان کے سننے کے لیے بڑے مشتاق ہیں جو آپ سحر کے وقت نانا جان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا کرتے تھے“ شہزادوں کی تمنا کو کیسے رد کیا جاسکتا تھا فوراً تیار ہو گئے، مسجد نبوی کی چھت کے اوپر چڑھے اور اس جگہ کھڑے ہوئے جہاں وہ حضور کے سامنے کھڑے ہوتے تھے، جس وقت آپ نے ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کہا، مدینہ منورہ یوں لگتا تھا کہ اس کے در و دیوار میں زلزلہ برپا ہو گیا ہے، جب ”اشھد ان لا الہ الا اللہ“

پر پہنچے تو مدینہ منورہ کے بچکولوں میں اور زیادتی ہو گئی اور جس وقت آپ نے ”اشھد ان محمدًا رسول اللہ“ کا تلفظ کیا تو پھر پردہ نشینان مدینہ گھروں سے باہر آ گئیں، لوگ پکار اٹھے: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا گیا ہے؟ مدینہ منورہ میں اس دن سے زیادہ نہ کسی رونے والے نے آنسوں بہائے اور نہ گریا کرنے والے نے گریا کیا۔ (تاریخ اسلام، للذہبی، ج: ۳، ص: ۲۰۵، تاریخ دمشق، ج: ۷، ص: ۱۳۷، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۷، خلاصۃ الوفاء، ج: ۱، ص: ۴۴، سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۱۲، ص: ۳۵۹، سلوہ الکلیب بوفاء الحلیب، ج: ۱، ص: ۲۹، سیدنا محمد رسول اللہ، ج: ۲، ص: ۹۴، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۸، السیرۃ الخلیب، ج: ۲، ص: ۳۰۸)

بعض حضرات نے اس روایت کی اسناد کو لے کر کلام کیا ہے علامہ ذہبی نے فرمایا: اسنادہ لین وھو منکر (واللہ اعلم) (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۸) لیکن علامہ علی بن عبد اللہ سمہودی نے اس کی اسناد کو جید قرار دیا ہے، اور امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے بھی اسے ثابت رکھا ہے۔ (وفاء الوفاء، ج: ۴، ص: ۱۸۲، فتاویٰ رضویہ، ج: ۹، ص: ۵۳۱)

علامہ علی بن برہان الدین حلبی نے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ جس دن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسنین کریمین کے کہنے پر اذان پڑھی اور ”اشھد ان محمدًا رسول اللہ“ پر آئے تو مدینہ پاک میں کوئی ذی روح ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسوں اور منہ سے چیخ نہ نکل گئی ہو، یہ دن اس کی طرح ہو گیا تھا جس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تھا۔ علامہ حلبی نے مزید لکھا ہے اس واقعے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملک شام واپس چلے گئے لیکن وہ سال میں دو مرتبہ مدینہ طیبہ حاضر ہوتے اور اہل مدینہ کو اذان سناتے۔ (السیرۃ الخلیب، ج: ۲، ص: ۳۰۸)

فتح بیت المقدس اور اذان بلال: جس وقت بیت المقدس فتح ہوا اور حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں تشریف لے گئے، نماز کا وقت ہوا تو حضرت فاروق اعظم نے فرمایا: اے بلال! اللہ آپ پر رحم فرمائے، آج آپ اذان کہیں، اس پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد میں کسی کے لیے بھی اذان نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن اب جبکہ آپ نے مجھے حکم دے دیا ہے تو میں آپ کی اطاعت کرتے ہوئے صرف اسی ایک نماز کے لیے اذان کہوں گا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان کہنا شروع کی، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز سماعت کی تو حضور کی یاد آگئی اور تمام صحابہ زار و قطار رونے لگے، امیر المومنین بھی رونے لگے لیکن سب سے زیادہ جن صحابہ کو روتے دیکھا گیا وہ حضرت ابو عبیدہ اور معاذ بن جبل تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے انہیں یہ کہتے ہوئے چپ کرایا، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے اب بس کرو۔

(السيرة الخليلية، ج: ۲، ص: ۳۰۹، وفیات الاعیان، ج: ۳، ص: ۷۰)

اس مقام پر علامہ حلبی نے بیان کیا ہے جن کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف ایک ہی مرتبہ اذان پڑھی وہ بھی حضرت فاروق اعظم کے ارشاد پر شاید ان مصنفین کی مراد یہ ہے کہ مدینہ طیبہ کے باہر صرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے پر ہی اذان پڑھی اگر یہ مراد ہے تو جو اذان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ طیبہ میں پڑھی جس کا ذکر پچھلے اوراق میں گزرا اس پر کوئی اعتراض نہیں پڑے گا۔ (السيرة الخليلية، ج: ۲، ص: ۳۰۹)

میدان محشر میں اذان: امام طبرانی نے مجمع صغیر اور مجمع کبیر دونوں میں آنے والی حدیث روایت فرمائی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام کا حشر اس طور پر کیا جائے گا کہ انہیں ان کی قبروں سے اٹھا کر چوپایوں پر بٹھا کر میدان محشر لے جایا جائے گا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی اونٹنی پر بٹھا کر لے جایا جائے گا، میرے دونوں بیٹے امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو میری اونٹنی عضباء پر بٹھا کر لے جایا جائے گا، مجھے براق پر بٹھایا جائے گا جس کا ایک قدم منہائے نظر پر پڑے گا، بلال کو ایک جنتی اونٹنی پر بٹھایا جائے گا پھر وہ اذان پڑھیں گے اور حقیقی شہادت دیں گے، پھر جب وہ ”اشھدان محمد رسول اللہ“ پڑھیں گے تو سب مومنین اولین و آخرین اس

بات کی گواہی دیں گے، جس کی گواہی قبول ہونا تھی قبول ہو گئی اور جس کی رد ہونا تھی رد کر دی گئی۔ (المجم الصغیر، ج: ۲، ص: ۲۵۶، المجم الکبیر، ج: ۱۹، ص: ۹۲، شرح ابن ماجہ للمغلطائی، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۵۸، الوانی بالوفیات، ج: ۳، ص: ۴۲۱)

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ میدان محشر میں اذان پڑھیں گے اور یہ کہ ان کا حشر جنتی اونٹنی پر کیا جائے گا، اس سے بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت شان کا پتہ چلتا ہے، اس حدیث کی سند پر کئی علما نے سخت جرح فرمائی ہے مگر چونکہ حدیث حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت سے متعلق تھی اور ہمارے اسلاف میں سے متعدد ماہرین فن علما نے اس کو اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے بس ان کی پیروی کرتے ہوئے میں نے بھی اس حدیث کو یہاں پیش کر دیا ہے۔

حضرت بلال کو جنت کا حلقہ پہنایا جائے گا: بعض روایات میں ہے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے جنت سے دو حلے لائے جائیں گے اور پھر وہ دونوں حلے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنائے جائیں گے، سب سے پہلے جنتی حلقہ جن مسلمانوں کو پہنایا جائے گا وہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صالح مؤمنین ہوں گے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۵۹، الوانی بالوفیات، ج: ۳، ص: ۴۲۱)

حضور کی قربت و عنایات: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا خاص قرب بخشا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص مؤذن بھی تھے اور خادم بھی، ہم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربت و خدمت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شرف باریابی کے چند نمونے پیش کریں گے۔

سرکارِ مدینہ کے خازن: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا خازن ہونے کا شرف عطا فرمایا، یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ سلطنت خداوندی کے مالک و مختار نبی کا خازن مقرر ہو جانا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے بڑے ناز اور فضیلت کی بات ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان تمام چیزوں کی ذمہ

داری سنبھالتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی جاتیں اسے محفوظ رکھتے تھے پھر جسے جو دینے کا حکم ہوتا اسے عطا کرتے۔ (کشف المشكل، ج: ۱، ص: ۱۰۵۶، المفصل فی تاریخ العرب، ج: ۱۴، ص: ۱۳۱، عطر الاحیة، ج: ۱، ص: ۴۵)

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم تھا کہ وہ اللہ کے دیے سے خوب خرچ کیے جائیں، چنانچہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے دیکھا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس کھجور کا ایک ٹوکرا رکھا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلال! یہ کیا ہے عرض کیا: حضور! یہ کھجوریں ہیں جنہیں میں نے آپ کے لیے رکھ لیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلال! کیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں کہ یہ تمہارے لیے جہنم کا ایندھن بن جائے؟ پھر فرمایا: اے بلال! خرچ کیے جاؤ اور عرش کے مالک کی طرف سے کمی کا خوف نہ رکھو۔ (المجم الکبیر، ج: ۱، ص: ۳۴۲)

غسالہ عطا فرمایا: امام بخاری روایت فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں: میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ المکرمہ اور مدینہ طیبہ کے بیچ جعرانہ میں تشریف فرما تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، اتنے میں ایک دیہاتی آیا اس نے آکر حضور سے کہا: کیا آپ وہ وعدہ پورا نہیں کریں گے جو آپ نے مجھ سے کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بشارت قبول کرو، دیہاتی نے کہا: آپ مجھے بشارتیں بہت سنا چکے ہیں، یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم غصہ کی حالت میں حضرت ابو موسیٰ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: اس نے بشارت کو رد کر دیا لہذا تم دونوں قبول کر لو، دونوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے بشارت قبول کر لی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پانی کا برتن منگایا اس میں اپنے دست اقدس اور چہرہ انور کو دھویا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کلی فرمائی اور فرمایا: تم دونوں اسے پی لو، چہرے اور گردن پر ڈال لو اور بشارت قبول کر لو، دونوں نے حضور سے برتن لیا اور جیسا سرکار نے فرمایا تھا ویسا ہی کیا، اتنے

میں حضرت ام سلمہ نے پردے کے پیچھے سے آواز دی: تھوڑا تمہاری ماں کے لیے بھی بچا دو لہذا کچھ پانی دونوں نے حضرت ام المومنین کی بارگاہ میں پیش کیا۔ (صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف، صحیح المسلم، کتاب الفضائل باب من فضائل ابی موسیٰ)

کیا کرم کریمانہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صحابہ کو اپنے چہرہ انور اور دست ہائے اقدس کا غسل عطا فرمایا بلکہ اس پانی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی فرما کر اپنا لعاب دہن بھی ملا دیا، وہی لعاب دہن جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹوٹی پنڈلی پر لگا دیتے تو جڑ جاتی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی دکھتی آنکھوں پر لگا دیتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے شفا یاب ہو جاتی ہیں، کھاری کنویں میں ڈال دیتے ہیں تو شیرہ جاں بن جاتا ہے، اس دہن مبارک کی کس کس برکت کو شمار کیا جائے اور کس ذات میں یہ طاقت کہ شمار کر سکے، اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

وہ دہن جس کی ہر بات وحی خدا
چشمہ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام
جس کے پانی سے شاداب جان و جنناں
اس دہن کی طراوت پہ لاکھوں سلام
جس سے کھاری کنوئیں شیرہ جاں بنے
اس زلال حلاوت پہ لاکھوں سلام

قابل مبارک باد اور باعثِ صدر شک قدسیاں ہیں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ زلال حلاوت کو چکھا، پیا، سیر ہوئے اور دارین کی ان گنت برکات سے سرشار ہوئے۔

خاص مواقع پر حضور کے ساتھ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی بارگاہ کی حضوری اور باریابی خوب بخشی تھی، اس لیے خاص و عام مواقع پر کثرت کے ساتھ حضور کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک عید کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خطاب فرمایا، انہیں صدقہ کی نصیحت فرمائی، اس دوران آپ صلی

اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر ٹیک لگائے ہوئے تھے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کپڑے کی جھولی پھیلائے ہوئے تھے، عورتیں اپنے زیورات اتار اتار کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جھولی میں ڈال رہی تھیں۔

(صحیح المسلم، کتاب العیدین، حدیث نمبر: ۲۰۸۴)

حضور کے لیے عمدہ کھجوریں لائے: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلانے پلانے پر بھی بڑے حریص تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بڑی عمدہ کھجوریں پیش کیں، جنہیں دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! اتنی عمدہ کھجوریں کہاں سے لے کر آئے ہو، اس سے عمدہ کھجوریں کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں؟ عرض کی: حضور! میرے پاس ردی کھجوریں تھیں، میں نے دگنی کھجوریں دیکر یہ اچھی کھجوریں حاصل کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (یہ تو ناجائز ہے) جاؤ! یہ کھجوریں واپس کرو اپنی کھجوریں حاصل کرو، پھر انہیں کسی چیز کے بدلے بیچ دو پھر اسی چیز کے ذریعے ان اچھی کھجوروں کو خرید کر میرے پاس لاؤ، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میں نے ویسا ہی کیا، جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر خدمت ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمتِ ربا والی حدیث بیان فرمائی۔ (المعجم الکبیر، ج: ۱، ص: ۳۹۹)

حضور کے لیے سایہ کرتے: یوم ترویہ (آٹھ ذی الحجہ) کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقام منی سے مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، انہوں نے ہاتھ میں ایک لکڑی پکڑ رکھی تھی، لکڑی پر ایک کپڑا بندھا ہوا تھا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے ذریعے سورج کی تمازت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دور کر رہے تھے۔ (المعجم الکبیر، ج: ۸، ص: ۲۲۴، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۳۰۵)

جذبہ جالِ ثناری: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے سچے عاشق اور خادم تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کے بارے میں پوچھتے تو جواب عرض کرتے اور ساتھ

میں اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ”جعلنی اللہ فداک“۔ ایک مرتبہ حضور نے پوچھا: بلال! برتن میں پانی ہے؟ تو عرض کرتے ہیں ”نعم! جعلنی اللہ فداک“ ہاں حضور پانی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ مجھے آپ پر فدا رکھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۸، ص: ۳۰۸، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۶۸۲۴)

عاجزی و انکساری: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فضائل و مناقب کا عظیم مجسمہ بنا دیا تھا لیکن اس سب کے باوجود وہ کبھی اپنے فضائل پر اتراتے نہ خوبیوں پر نازاں ہوتے بلکہ ہمیشہ عجز و انکسار کا پیکر بنے رہتے، ایک طرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کی تعظیم و توقیر بجالاتے، فاروق اعظم جیسے جلیل القدر صحابی انہیں اپنا سید و سردار قرار دیتے چنانچہ آپ کا یہ فرمان بڑا مشہور ہے ”ابوبکر سیدنا اعتق سیدنا بلال“ ہمارے سردار حضرت ابوبکر نے ہمارے سردار حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزاد فرمایا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۷۲)

حضرت عبداللہ بن عمر کے ایک بیٹے کا نام بلال تھا، کسی شاعر نے بلال بن عبداللہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہا: ”بلال بن عبداللہ خیر بلال“ عبداللہ کا بلال سب سے اچھا بلال ہے۔ یہ سن کر حضرت ابن عمر نے فوراً فرمایا: تم نے جھوٹ کہا، حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ کا بلال سب سے بہتر بلال نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلال سب سے بہتر بلال ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۷۳، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۴۹)

قارئین نے ہمارے بیان کردہ دو واقعات سے اندازہ کیا ہوگا کہ صحابہ کرام کس قدر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف و توصیف اور تعظیم و توقیر کیا کرتے تھے؟ بعض حضرات نے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی افضل کہنا شروع کر دیا، اس پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں زبردست تنبیہ فرمائی کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے، آپ نے فرمایا: تم لوگ مجھے حضرت ابوبکر سے افضل کیسے سمجھ سکتے ہو جبکہ حال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیکیوں میں سے ایک نیکی کا نام حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے، آپ کا فرمان عالیشان ہے: ”انما انا

حسنة من حسناته“۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۹، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۷۵: ۷۴)

اب ہم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ایسا فرمان پیش کرنے جا رہے ہیں جو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عاجزی و انکساری کی سچی تصویر بھی ہے اور قیامت تک کے مؤمنین کے لیے درس عبرت بھی، جب لوگ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ان کی فضیلت کا تذکرہ کرتے اور ان کی خداداد خیر کو یاد کرتے تو آپ فرماتے: ”انما انا حبشی كنت بالامس عبدا“ (لوگو! میری فضیلت کے تذکرے چھوڑو مجھے یاد ہے) کہ میں وہی بلال حبشی ہوں جو کل تک دوسروں کا غلام تھا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۷۵: ۷۴، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۹، الطبقات الکبریٰ، ج: ۳، ص: ۲۱۹)

مبالغہ آرائی سے مکمل پرہیز: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے اور کئی خاص و عام پیغام حضور کی جانب سے لوگوں کو پہنچاتے تھے۔ ظاہر ہے اس اہم اور نازک ذمہ داری کو انہیں بخوبی نبھانا تھا، اس میں وہ اپنی طرف سے بالکل بھی کمی و زیادتی نہیں کر سکتے تھے لیکن اس کے سوا بھی وہ عام معاملات میں جو بات کہتے اس میں بھی صداقت، سچائی اور راست گوئی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، خاص کر ایسے معاملات جہاں خواص بھی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے معاملات میں بھی راہ اعتدال پر قائم رہتے، چنانچہ جب ان کے دینی بھائی حضرت ابورویحہ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اہل یمن کے ایک قبیلے میں اپنی شادی کی سفارش کرانا چاہی تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلا لاگ لپیٹ کے اپنے بھائی کا جو تعارف کروایا اس کو پڑھیے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حق گوئی کی داد دیجئے، آپ نے فرمایا: میں بلال ہوں اور یہ میرا بھائی ہے جو اخلاق و دین میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہے اگر تم چاہو تو اس کے ساتھ شادی کر دو اور نہ چاہو تو مت کرو، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ تبصرہ سن کر گھر والوں نے کہا: اے بلال! جس کے بھائی آپ ہوں ہم اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کو تیار ہیں لہذا انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی آپ کے

بھائی کے ساتھ کر دی۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بھائی نے ایک یمنی قبیلے میں اپنی شادی کا پیغام دیا پھر اپنا اور اپنے بھائی کا تعارف کچھ اس طرح کرایا: میں بلال ہوں اور یہ میرا بھائی ہے ہم دونوں حبشی غلام تھے کہ اللہ نے ہمیں آزادی بخشی، ہم گمراہ تھے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی، اگر تم ہمارے ساتھ اپنی بیٹیوں کا نکاح کرتے ہو تو الحمد للہ! اور اگر نہیں کرتے تو (کوئی حرج نہیں) اللہ سب سے بڑا ہے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۸)

روایت حدیث: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے، حضور کی باتوں کو سنا اور افعال کو دیکھا پھر ضرورت پڑنے پر انہیں بیان بھی فرمایا، صحابہ کرام کو آپ پر کامل اعتماد تھا، اس لیے وہ آپ سے احادیث روایت فرماتے تھے، تابعین حضرات نے بھی آپ سے احادیث روایت فرمائیں، چنانچہ تاریخ دمشق میں ہے: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت فرمائیں اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم اور صحابہ تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت نے احادیث بیان فرمائی ہیں۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۳۶)

علامہ ابن اثیر نے فرمایا: آپ سے جماعت صحابہ میں حضرت ابو بکر صدیق، فاروق اعظم، مولائے کائنات حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، کعب بن عجرہ، اسامہ بن زید، جابر، ابوسعید خدری اور حضرت براء بن عازب نے احادیث روایت فرمائی ہیں۔ تابعین میں سے مدینۃ المنورہ اور شام کے بڑے بڑے علما نے آپ سے روایت فرمائی ہیں۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۷)

آپ کی مرویات کی تعداد: علامہ ذہبی کے بیان کے مطابق آپ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد صرف چوالیس ہے، جن میں سے چار احادیث صحیحین میں مروی

ہیں، ایک متفق علیہ ہے، دو احادیث میں امام بخاری منفرد ہیں، ایک حدیث موقوف میں امام مسلم منفرد ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۶۰)

علامہ ذہبی کے بیان کردہ تعداد سے معلوم ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احادیث کی روایت بہت کم کی ہے اور یہ ان کے جذبہ احتیاط کے پیش نظر تھا، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی لمبی مصاحبت، مصاحبت میں کمال قربت، قربت میں مواقع خدمت وغیرہ کا حاصل ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ ان کی مرویات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی لیکن احتیاط کے جذبات نے انہیں کثرت روایات سے روک دیا، احتیاط کے یہ نمونے اور بھی کئی جلیل القدر صحابہ کی حیات مبارکہ میں پائے جاتے ہیں۔

اذان سے پہلے درود پڑھنے کی دلیل: حضرت عروہ بن زبیر فرماتے ہیں: قبیلہ بنو نجار کی ایک صحابیہ نے فرمایا: مسجد نبوی شریف کے قریب میرا گھر سب گھروں سے اونچا تھا، اسی پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان دیا کرتے تھے، وہ سحر کے وقت جلدی آجاتے اور چھت پر بیٹھ کر طلوع فجر کا انتظار کرتے، جب فجر کا وقت ہو جاتا تو انگڑائی لیتے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور کہتے: ”اللہم انی احمدک واستعینک علی قریش ان یقیمہ دینک“ اے اللہ! میں تیری حمد بیان کرتا ہوں اور قریش کے معاملے میں تیری مدد طلب کرتا ہوں کہ وہ تیرے دین کو قائم کریں۔ (یہ دعا کرتے) پھر اذان پڑھتے صحابیہ فرماتی ہیں: خدا کی قسم! میرے علم کے مطابق ایک رات بھی ایسی نہیں جس میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دعائے مانگی ہو۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاذان فوق المنارہ، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۵۱۹، الاذان فی المنارہ)

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل ہم اہل سنت و جماعت کے لیے اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ اذان سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود و سلام پڑھا جاسکتا ہے کیونکہ جب اذان سے پہلے قوم قریش کے لیے دعا کی جاسکتی ہے وہ بھی ایک بار نہیں مسلسل تو پھر سردار کائنات کے لیے درود و سلام کی دعا کیوں نہیں کی جاسکتی۔

عشق مصطفیٰ نے مدینہ چھڑا دیا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرمانے کے بعد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مدینہ سے ہجرت کرنے کی اجازت چاہی، بعض روایتوں کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق نے ان کو اجازت دے دی اور بعض روایتوں کے اعتبار سے حضرت صدیق اکبر نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روک لیا لیکن فاروق اعظم کے زمانے میں انہوں نے باصرار اجازت حاصل کر لی۔ (روایتوں کا اختلاف ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے) آخر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ الرسول کو چھوڑ کر ملک شام کیوں چلے گئے؟ اس کی دو بنیادی وجہیں علمائے کرام نے بیان فرمائی ہیں: ایک تو وہی جو آپ نے حدیث پاک میں پڑھ لی کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جذبات جہاد سے سرشار تھے، وہ اپنی بقیہ زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گزارنا چاہتے تھے۔ (ان کا یہ مقصد ملک شام رہنے میں آسانی سے حاصل ہو رہا تھا کیونکہ ادھر مجاہدین اسلام دشمنان اسلام سے برسر پیکار تھے) دوسری بڑی وجہ ان کا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا، انہوں نے اپنے آقا و مولا کے ساتھ مدینہ طیبہ میں جو زندگی گزاری تھی اور خدمت رسول کے جو نقوش ان کے دل و دماغ پر منقوش تھے، وہ اتنے عظیم تھے کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کیے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

اپنے دل کا یہ حال خود حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جانشین رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت ابوبکر صدیق کے سامنے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ”انی لا اريد المدينه بدون رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا اتحمل مقام رسول الله صلى الله عليه وسلم خاليا عنه“ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بغیر مدینہ طیبہ میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ میں حضور کے مقام کو خالی دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔

(عمدة القاری، باب مناقب بلال، ج: ۱۶، ص: ۲۴۴)

بے شک حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کی صداقت دنیا نے اس وقت اپنی

کھلی آنکھوں سے دیکھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے سچے عشق کا کچھ حد تک اندازہ کیا، جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور حسنین کریمین کی طلب پر آپ نے اذان دینا شروع کی لیکن جب زبان نے ”اشھد ان محمداً رسول اللہ“ کہا اور نگاہیں چہرہ مصطفیٰ کی دید سے محروم رہیں تو وہی ہوا جس کا پتا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے ہی خلیفہ رسول اللہ کو دے دیا تھا، غش کھا کر گر گئے اور اذان پوری نہ کر سکے۔

نہ زمیں ہے میری قرار گاہ

نہ فلک ہے منزل جذب دل

بڑی دیر سے ہے سفر میرا

تیری یاد سے تیری یاد تک

کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں

تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوچتا نہیں

حضرت ابوذر غفاری کا حضرت بلال سے معافی طلب کرنا: ایک موقع

پر حضرت ابوذر غفاری اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان تیز کلامی ہو گئی، حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں ”میرے اور ایک شخص کے درمیان تیز کلامی ہو گئی، اس کی ماں عجمیہ تھی، میں نے اس کی ماں کو کچھ کہہ دیا، اس نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس بات کو ذکر کر دیا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا تم نے فلاں کو گالی دی ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: اس کی ماں کو کچھ کہا ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: تم میں کچھ جاہلیت ہے، میں نے عرض کیا: اس وقت تک بڑھاپے کے باوجود؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! (بخاری، کتاب العتق و کتاب الادب)

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ شرح قسطانی سے نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ قصہ

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آیا، حضرت ابوذر نے ان کو یہ کہہ دیا تھا ”اوکالی عورت کے بچے“ انہوں نے دربار نبوی میں شکایت کر دی، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم میں جاہلیت ہے، اس ارشاد کو سننے کے بعد حضرت ابوذر نے اپنا رخسار زمین پر رکھ کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں زمین سے اپنا رخسار اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا، جب تک تم میرے رخسار کو قدم سے نہ روندو، بالآخر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی ضد پوری کرنی پڑی۔ (نزہۃ القاری، ج: ۱، ص: ۳۶۶، ارشاد الساری، قسطلانی، ج: ۱، ص: ۱۱۵)

تر بیت صحابہ: سبحان اللہ! کتنے اچھے، کتنے سچے تھے حضور کے صحابہ، ان کے آقا و مولیٰ اور ان پر لاکھوں کروڑوں درود و سلام نازل ہوں، حضور نے ان کی کیسی تربیت فرمائی کہ کبھی بتقاضائے بشریت کسی سے کوئی چوک ہوتی تو فریق ثانی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کاروائی کرنے کے بجائے مقدمے کو اپنے افضل المخلوق آقا و مولیٰ کی بارگاہ میں پہنچا دیتا، پھر انصاف فرمانے والے گروہ کے سردار حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فیصلہ ہوتا وہ فریق اول کو پورا پورا جان و دل سے قبول ہوتا، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کہے گئے چند تادیبی جملے ان میں خوف خدا اور ندامت و شرمندگی کا ایسا احساس پیدا کر دیتے کہ جب تک اپنے ساتھی سے معافی طلب نہ کر لیتے بلکہ معاف نہ کر لیتے اس وقت تک ان کی بے قراری کا اضطراب تھمنے کا نام نہیں لیتا، معافی طلب کرنے کا انداز بھی کتنا زالا کتنا سہانا ہے جسے آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، یہ صرف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی شایاں ہے۔

واقعے کا ایک لطف یہ بھی آپ ملاحظہ فرمائیں وہ خود اپنے خلاف گواہی دیتے تھے، جو پوچھا جاتا سچ سچ بتا دیتے، ان کے خلاف الگ سے کسی گواہ کی ضرورت نہ تھی، انہیں خود اپنے خلاف گواہی دینے میں ذرہ برابر تامل نہ تھا، خدائے تعالیٰ کے فرامین جو انہوں نے مصطفائے کائنات کی زبانی سن رکھے تھے ان پر کامل ایمان رکھتے تھے اور مکمل عمل کرتے تھے۔ اس واقعے میں آیت کریمہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ“ (سورۃ النساء، آیت: ۱۳۵) اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لیے گواہی دیتے رہو انصاف پر خوب قائم رہو پھر یہ گواہی چاہے تمہاری جانوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو (میں مطلوبہ شہادت پر حضرت ابوذر غفاری نے کیا ہی بہترین عملی نمونہ پیش فرمایا ہے پھر

پڑھیے اور ان کے حسن عمل کی داد دیجیے، ہم گواہی دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے بہترین بندے اور سب سے افضل رسول ہیں، بے شک جماعت صحابہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی بہترین گواہ ہے۔

ابوذر اور ایسا کلام: اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری جو جلیل القدر صحابی ہیں، ان کا ایمانی مقام بہت بلند ہے پھر انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ایسا کلام کیوں کیا، جو کسی بھی مسلمان کے ساتھ جائز نہیں ہے؟ اس سوال کو علامہ عینی نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ”کیف جوز ابوذر ذلک وهو حرام“ اس ناجائز فعل کا ارتکاب حضرت ابوذر غفاری سے کیسے وجود میں آ گیا پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں: ”الظاهر ان هذا كان منه قبل ان يعرف تحريمه“ ظاہر یہی ہے کہ یہ سب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس وقت سرزد ہوا جب انہیں اس فعل کے حرام ہونے کا علم نہیں تھا۔ (عمدة القاری، ج: ۱، ص: ۲۰۸)

علامہ عینی کے اس جواب کو سن لینے کے بعد کسی شخص کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق اس سلسلے میں کچھ بھی سوچنے کی گنجائش نہیں بچتی ہے۔

حضرت بلال نے معاف کر دیا: قارئین نے یہ بھی ملاحظہ کیا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو چوک ہوئی اسے لے کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی مخالفت پر جے نہیں رہے بلکہ ان کے آقا نے جو عفو و درگزر کی فضیلتیں بیان فرمائی تھیں وہ انہیں یاد تھیں، لہذا جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معذرت طلب کی تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اپنی طرف سے معافی دے دی اور پھر دونوں حضرات شہر و شکر ہو کر زندگی گزارنے لگے۔ اے کاش! ہم بھی صحابہ کرام کے اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے اپنی زندگی سے عداوت و بغاوت کا خاتمہ کر پاتے۔

حضور کی گواہی بلال سچے ہیں: تعلیمات مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلب و جگر اور فکر و نظر پر ایسی محیط تھیں کہ ان کا کوئی قدم خلاف شریعت

نہیں اٹھتا تھا، صدق مقال تو ان کی ایسی شان تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں اس کی گواہی پیش فرمائی۔ اس سلسلے میں ایک حدیث نقل کر رہے ہیں جو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی زوجہ کے احوال سے متعلق ہے۔ الفاظ حدیث کا انداز یہ بتاتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کوئی بات اپنی زوجہ کو مصطفیٰ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حوالے سے بتائی ہے اور اس پر زوجہ نے ان سے کچھ پس و پیش کا اظہار کیا جو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ناراضگی کا سبب بنا اور بات حضور تک پہنچ گئی، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سچائی کی گواہی عطا فرمائی، اب پوری حدیث پاک ملاحظہ فرمائیں: ”حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ حدیث بیان فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں سلام کیا پھر پوچھا: کیا بلال سے کوئی چوک ہوئی ہے؟ جواب دیتے ہوئے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ عرض گزار ہوئیں: نہیں یا رسول اللہ! سرکار نے پوچھا: پھر کیا تم بلال پر غصہ ہوئی ہو؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ نے عرض کیا: (میں ان پر کیسے غصہ ہو سکتی ہوں جب کہ) وہ مجھ سے بہت محبت فرماتے ہیں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلال! میری جو حدیث بھی تم سے بیان کریں تو بیشک بلال اس میں سچے ہیں کیونکہ بلال جھوٹ نہیں بولتے، اے بلال کی اہلیہ! یہ بات یاد رکھو بلال پر غصہ مت کرنا کیونکہ جب تک تم بلال سے ناراض رہو گی تمہارا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۶۳)

حضرت بلال کا زوجہ کے ساتھ حسن سلوک: حدیث پاک سے یہ بات بھی اچھے طریقے سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اپنی ازواج کے ساتھ معاملات بہت اچھے تھے، حدیث میں بیوی کی جانب سے کہے گئے الفاظ ”انہ یحبنی کثیراً“ (وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں) ہمارے دعوے کی بہترین دلیل ہیں پھر شوہر و بیوی کے درمیان جو معاملہ پیش آیا تھا وہ اپنی جگہ لیکن جب سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی سے پوچھ گچھ کی تو کہیں بھی ان کی اہلیہ نے ذرہ برابر بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

کوئی شکایت نہیں کی، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ اپنی ازواج کے ساتھ سخت گیر نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو حضور کو اس موقع پر ضرور بتایا جاتا پس ثابت ہو گیا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی ازواج کے ساتھ حسن اخلاق کا پیکر مجسم تھے۔

حضرت بلال کی عرض پر معجزے کا ظہور: ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فجر کی اذان پڑھی، یہ رات بڑی سرد تھی، سردی کی وجہ سے لوگ ابھی تک مسجد حاضر نہ ہو سکے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: اے بلال! ابھی تک لوگ مسجد حاضر کیوں نہیں ہوئے؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور ٹھنڈک کی شدت نے لوگوں کو مسجد آنے سے روک دیا ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا: ”اللھم اذهب عنهم البرد“ اے اللہ! لوگوں سے سردی کو دور فرما دے، حضرت بلال کہتے ہیں: حضور کی دعا کا اثر یہ ہوا کہ میں نے دیکھا کہ فجر کی نماز میں لوگ پنکھا جھل رہے تھے۔

(مسند البزار، حدیث: ۱۳۵۶، معرفۃ الصحابہ، حدیث: ۱۱۳۵، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۸)

فضائل و مناقب: ذات باری پر کامل ایمان، اطاعت رسول، حب رسول اور خدمت رسول جیسے اوصاف نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات کو گنجینہ فضائل بنا دیا تھا، قرآن کریم اور احادیث رسول میں وارد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تمام فضائل کو یہاں جمع کر دیا جائے تو کتاب خاصی ضخیم ہو جائے، ہم اختصاراً فضائل کے سمندر سے چند موتی چن کر کتاب کو مزین کرنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن کریم اور حضرت بلال: (۱) اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے ”وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ“ اے محبوب جب آپ کی بارگاہ میں وہ لوگ حاضر ہوں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے فرمائیے تم پر سلام ہو، تمہارے رب نے اپنے ذمہ کرم پر رحمت لازم کر لی۔

(سورۃ النعام، آیت: ۵۴)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ بغوی فرماتے ہیں: یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت بلال، حضرت سالم بن ابی عبیدہ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت حمزہ، حضرت جعفر، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عمار بن یاسر، حضرت ارقم بن ابی ارقم اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے حق میں نازل ہوئی۔ (تفسیر بغوی، آیت مذکور)

علامہ بغوی کی بیان کردہ تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ آیت میں مذکور فضیلت میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل ہیں، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں: جب حضور اس جماعت کو دیکھتے تو فوراً ان کی عزت افزائی کے لیے سلام فرماتے۔ (تفسیر بغوی، آیت مذکور)

بات بالکل ظاہر ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں کہ جن کی عزت افزائی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلام کی ابتداء فرماتے، اس آیت کریمہ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت افزائی سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے پھر یہ کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان بخت آور لوگوں میں ہیں جن کے لیے ان کے رب نے اپنے ذمہ کرم پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

(۲) جب کفار قریش اور رؤسائے عرب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمیں غربا اور شکستہ حالوں کے ساتھ بیٹھنے میں شرم آتی ہے اگر آپ انہیں اپنی صحبت سے جدا کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں، اگر ہم ایمان لے آئیں گے تو خلق کثیر ایمان لے آئے گی تو آیت کریمہ نازل ہوئی ”وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدُوَّةِ وَالْعَشِيِّ یُرِیدُونَ وَجْهَهُ“ اپنی جان ان سے مانوس رکھو، جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی رضا چاہتے ہیں۔ (سورہ کہف، آیت: ۲۸)

آیت کی تفسیر فرماتے ہوئے علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں: کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جب حضور ان (رؤسا) کے ساتھ جلوس فرمائیں تو اس میں غربا شکستہ حال اصحاب جیسے حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت صہیب وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین

شریک نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ان کی بات ماننے سے منع فرمادیا۔
(۳) اور فرمایا: ”وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ“ اور ان لوگوں کو دور نہ کرو جو صبح و شام اپنے رب کو اس کی رضا چاہتے ہوئے پکارتے ہیں۔

(سورۃ النعام، آیت: ۵۳)

اور حکم دیا: ”وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ“ آپ اپنے آپ کو اس جماعت کے ساتھ مانوس رکھیے۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۃ کہف، آیت: ۲۸)

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوا کہ سورۃ النعام کی آیت: ۵۳ اور سورۃ کہف کی آیت: ۲۸، جن اصحاب کے حق میں نازل ہوئیں ان میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شریک ہیں۔
احادیث میں بلال: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت میں کثیر احادیث وارد ہیں، ہم ان میں سے یہاں صرف چند احادیث بیان کر رہے ہیں، امام بخاری بیان فرماتے ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! مجھے یہ بتاؤ تم نے اسلام میں ایسا کون سا عمل کیا؟ جس کے اجر کی تم کو سب سے زیادہ توقع ہے، کیونکہ میں نے آج رات جنت میں اپنے آگے تمہارے چلنے کی آواز سنی، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: میں نے اسلام لا کر کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی منفعت کی مجھے زیادہ امید ہو، سو اس کے کہ میں دن اور رات کے وقت میں جب بھی مکمل وضو کرتا ہوں تو میں اس وضو سے اتنی نماز پڑھتا ہوں جتنی اللہ تعالیٰ نے میرے لیے مقرر کی ہے۔

(صحیح البخاری، حدیث: ۱۱۴۹، مسلم، حدیث: ۵۴۵۸)

(۲) دوسری حدیث میں ہے: اے بلال! تم نے کس عمل کی وجہ سے جنت میں مجھ پر سبقت کی ہے؟ میں گزری رات جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے تمہارے جوتوں کی آواز سنی، اس پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور! میں جب بھی اذان دیتا ہوں تو نماز بھی پڑھ لیتا ہوں۔

دوسری روایات میں ہے: میں جب بھی بے وضو ہوتا ہوں تو وضو کرتا ہوں اور دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں۔ (صحیح ابن خزیمہ، حدیث: ۱۲۰۹، صحیح ابن حبان، حدیث: ۷۰۸۷)

حدیث کے بعض لطائف: علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ حافظ ابن حجر کے حوالے سے لکھتے ہیں: اس حدیث کا سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہر وضو کے بعد نماز پڑھنے کی وجہ سے یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ وہ جنت کے اندر دکھائی دیے، اس حدیث میں یہ جملہ ”اے بلال! تم نے کس عمل کی وجہ سے مجھ پر جنت میں سبقت حاصل کی، یہ جملہ اس مفہوم میں ظاہر ہے کہ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جنت کے اندر دیکھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قصہ خواب کا تھا، اس سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ثابت ہوگئی کیونکہ انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں۔ رہا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے چلنا تو یہ بیداری میں ان کی عادت کے موافق تھا تو خواب میں بھی اسی طرح دکھایا گیا (یعنی جیسے وہ بیداری میں خادم کی حیثیت سے آگے چلتے تھے جنت میں بھی اپنی خادمانہ حیثیت سے حضور کے آگے آگے چل رہے تھے) اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے داخل ہوئے ہوں، کیونکہ یہ ان کا تابع ہونے کا مقام تھا گویا کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشارہ کیا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زندگی میں جو مقام اور بلند مرتبہ ہے وہ بعد (جنت) میں بھی ان کو حاصل رہے گا، اس میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظیم فضیلت ہے، علامہ کرمانی نے کہا: کوئی شخص بھی مرنے سے پہلے جنت میں نہیں جائے گا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندگی میں اور بیداری میں جنت میں گئے، یہ ظاہر اس میں تعارض ہے لیکن علامہ کرمانی کے قول کی یہ توجیہ کی جائے گی کہ غیر انبیاء میں سے کوئی شخص بھی مرنے سے پہلے جنت میں نہیں جائے گا، یا یہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ آپ عالم دنیا سے نکل کر عالم ملکوت میں داخل ہو گئے تھے۔ (فتح الباری، ج: ۲، ص: ۶۳۸؛ ملخصاً بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۳، ص: ۳۰۰)

معمولات اہلسنت کی دلیل: علامہ سعیدی مزید لکھتے ہیں: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اجتہاد سے نفلی عبادت کا وقت معین کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصویب کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ نفلی عبادت کا اپنے اجتہاد سے وقت متعین کرنا جائز ہے، اس میں یہ دلیل ہے کہ معمولات اہلسنت صحیح ہیں کیونکہ اہل سنت نے اپنے اجتہاد سے عید میلاد النبی، گیارہویں شریف، سوئم، چہلم اور عرس کا وقت متعین کیا ہے جس طرح حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر وضو کے بعد دو رکعت پڑھنے کا وقت متعین کیا تھا اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چوں کہ ان کا رد نہیں کیا تھا، اس لیے ان ایام کے معین کرنے میں شرعاً حرج نہیں ہے۔ (نعمۃ الباری، ج: ۳، ص: ۳۰۰)

(۳) حضرت زید بن ارقم فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلال بڑا اچھا آدمی ہے، وہ مؤذنین کا سردار ہے، اسکی اتباع مؤمن ہی کرے گا۔“

(المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۵۱۱۹)

(۴) جنت تین لوگوں کی بہت مشتاق ہے، وہ ہیں حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت بلال رضی اللہ عنہم۔

بعض روایت میں چار لوگوں کا ذکر ہے، چوتھا نام حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور بعض روایات میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ہے، بعض روایات میں دیگر صحابہ کے نام بھی وارد ہوئے ہیں۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۵۱، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۵)

(۵) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اے کاش! میری ماں وہ ہوتی جو بلال کی ماں ہے اور میرے والد بلال کے والد ہوتے اور میں بلال کی طرح ہوتا“ اور حضرت عمر نے فرمایا: ”ہمارے سردار حضرت ابوبکر نے ہمارے سردار حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزاد فرمایا۔“ (شرف المصطفیٰ، ج: ۶، ص: ۵۷)

فضائل کا اختصار: محدثین و مؤرخین نے آپ کے کثیر فضائل کا ذکر اپنی اپنی

کتابوں میں فرمایا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابقین اولین کی جماعت میں شامل ہیں، سابقین اولین میں آپ کا درجہ بہت پہلے ہے، جن سات لوگوں نے سب سے پہلے اپنے اسلام کو ظاہر فرمایا، ان میں ایک حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، اسلام کے سب سے پہلے مؤذن اور تمام عمر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مؤذن ہونا نصیب ہوا، بخت آوری کی انتہا کہ خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا شرف حاصل کیا، اصحاب بدر میں امتیازی حیثیت سے آپ کا شمار ہوتا ہے، تمام غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے اور خدمت کرنے کا شرف حاصل رہا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے آپ کو خوب ستایا گیا، آپ کو تکالیف دینے میں کفار بد اطوار نے ظلم کی انتہا کر دی لیکن خلاف اسلام وہ ایک کلمہ بھی آپ کے منہ سے نہ سن سکے، حضور سے کسی نے پوچھا: آپ کی اتباع کس کس نے اختیار کی ہے؟ تو فرمایا: ایک آزاد اور ایک غلام نے، آزاد سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور غلام سے مراد حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور حضرت ابوبکر سے ان کی خریداری میں شرکت طلب کی، قرآن کریم میں جس کے لیے آیات کا نزول ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے محاسن بیان فرمائے اور ”اشتباقت الجنة الیہ“ کا مژدہ سنایا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سابق الحبشہ کا تمغہ پایا اور سید المؤمنین کا لقب حاصل کیا وغیرہ وغیرہ۔

(عامۃ الکتب التاریخیہ، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۴، ۳۵۹)

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل صفہ میں سے تھے۔ (سیر السلف الصالحین، ج: ۱، ص: ۳۴)

شوق وصال اور عشق رسول: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فطرت کا سب

سے چمکدار جوہر ان کا جذبہ اطاعت و فرمانبرداری اور اپنے آقا کے ساتھ سچا خلوص اور وفاداری تھا، جس طرح اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان نہایت قوی اور مستحکم تھا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو بے حد خلوص اور بے انتہا جذبہ فدائیت بھی حاصل تھا۔ وہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت والفت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے اور ان کی اتباع و پیروی کو خدا کی خوشنودی اور آخرت کا توشہ سمجھتے تھے، وہ دنیا کی زندگی میں اور موت کے بعد عقبہ کی زندگی میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور آپ کی رضا کے سوا کسی شے کے طلب گار نہ تھے۔ (حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ص: ۹۶)

جب حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کی زوجہ نے (جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ تھیں) شدت غم سے نڈھال ہو کر کہا: ”واحزناہ“ (ہائے غم و اندوہ کا عالم) زوجہ کا یہ کلام سن کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”واطر باہ“ (واہ رے خوشی کے عالم) ان الفاظ کے ذریعے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زوجہ کو تنبیہ فرمائی، یہ حزن کا عالم نہیں، یہ تو خوشی کا وقت ہے، پھر آپ نے ایک شعر پڑھا: ”غدا نلقى الاحبة محمدًا وحزبه“ کل ہم اپنے دوستوں سے ملاقات کریں گے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے۔ (شرح شفاء، ج: ۲، ص: ۴۸، مرآة الجنان وعبرة الیقظان، ج: ۱، ص: ۶۵، شذرات الذهب فی اخبار من ذہب، ج: ۱، ص: ۱۷۱، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۵، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۵۹، الوانی بالوفیات، ج: ۱۰، ص: ۱۷۴)

گویا اسی غازی پوری نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عربی الفاظ کو اردو شاعری میں ڈھالتے ہوئے فرمایا:

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی

ہے شب گور بھی اس گل سے ملاقات کی رات

وفات: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے سلسلے میں علمائے سیر و تاریخ نے چند اقوال بیان فرمائے ہیں، سب سے مشہور قول یہ ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ۲۰ھ میں ہوا، بعض حضرات نے آپ کے وفات کا سال ۲۱ھ بھی بیان کیا ہے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۹، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۹)

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: امام بخاری نے فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نے دور فاروقی میں ملک شام میں وفات پائی۔ ابن بکیر نے فرمایا: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ طاعون عمواس کا شکار ہو کر واصل حق ہوئے۔ (الاصابہ، ج: ۱، ص: ۱۷۱)
 علامہ ابن اثیر نے فرمایا: آپ کا وصال ۲۰ھ میں ہوا، بعض حضرات نے ۱۷/۱۸ اور ۱۸ ہجری کا قول بھی نقل کیا ہے۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۱۸۸)
 علامہ ابن کثیر نے بھی آپ کے وفات کا سال ۲۰ھ بیان فرمایا ہے۔

(البدایہ والنہایہ، ج: ۸، ص: ۳۰۵)

وقت وفات عمر شریف: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر مبارک وقت وصال کتنی تھی؟ اس بارے میں تاریخ کی کتابوں میں ”ولہ بضع وستون سنۃ“ جیسے الفاظ بیان کیے گئے ہیں، یعنی آپ کی عمر ۶۰ سال سے زائد تھی۔

(البدایہ والنہایہ، ج: ۸، ص: ۳۰۵، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۳۱۸)

بعض حضرات نے تعیین کے ساتھ آپ کی عمر شریف ۶۳ سال بیان کی ہے۔

(شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، ج: ۱، ص: ۱۷۱)

مزار مبارک: آپ کی قبر انور کے سلسلے میں کئی قول ملتے ہیں، سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ شہر دمشق کے محلہ باب صغیر میں آپ مدفون ہیں، دوسرے قول کے مطابق آپ کی قبر شریف حلب میں باب الرعین میں واقع ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ آپ کو قریہ دار یہ میں دفن کیا گیا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۸۰)

علامہ ابن عساکر نے اس مقام پر یہ صراحت فرمائی ہے کہ آپ کا انتقال قریہ دار یہ میں ہوا پھر وہاں سے آپ کو باب صغیر لایا گیا، وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۸۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۶۰)

علامہ ابن کثیر نے حلب والے قول کو یہ کہہ کر رد فرما دیا ہے کہ حلب آپ کا نہیں بلکہ آپ کے بھائی خالد کا مدفون ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۸، ص: ۳۰۵)

اب ان اقوال کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ قول ہی زیادہ درست ہے

کہ آپ کا مزار مبارک دمشق کے باب الصغیر میں موجود ہے۔ واضح رہے کہ ملک شام کے دارالحکومت کا نام دمشق ہے اور ”داریا“ دمشق کے علاقہ غوطہ میں ایک بڑی بستی کا نام ہے۔

(حاشیۃ السیرۃ الانبیاء لابن کثیر، ج: ۴، ص: ۶۵۷)

ازواج: تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں فرمائیں،

علامہ محمد علی رضا لکھتے ہیں: اس سلسلے میں ہمارے پاس پانچ مختلف روایات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پانچ مختلف شادیاں فرمائیں تھیں۔ (جمال بلال، ص: ۱۵۳)

لیکن ہمیں صرف چار بیویوں سے متعلق ہی روایات مل سکیں جو ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

تاریخ دمشق میں ہے کہ بنو ابی بکیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: حضور! ہماری بہن کا نکاح فلاں سے کر دیں، حضور نے فرمایا: تم بلال کو کیوں بھولے ہوئے ہو؟ یہ لوگ دوبارہ حضور کے پاس حاضر آئے اور اپنی عرض کو دہرایا، حضور نے وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا، پھر تیسری مرتبہ بھی سب کچھ وہی ہوا، اس بار سرکار نے فرمایا: تم جنتی شخص (بلال) کو چھوڑ کر کہاں سرگرداں ہو؟ راوی کہتے ہیں: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ جملہ سن کر انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نکاح کر دیا۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۶۴، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۹)

طبقات ابن سعد کی روایت سے دوسری بیوی کا پتہ چلتا ہے، حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبیلہ بنو ہرہ کی عربی خاتون سے نکاح کیا تھا۔

(ج: ۳، ص: ۲۱۹)

تیسری بیوی کا ذکر علما کی ایک جماعت نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے، علماے کرام نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس زوجہ کا نام ہند الخولانیہ بیان فرمایا ہے۔

(معرفۃ الصحابہ لابی نعیم، حدیث: ۷۸۶۹، اسد الغابہ، ترجمہ نمبر: ۷۳۲۶)

ان تین بیویوں کا پتہ صاف طور پر تاریخ سے ملتا ہے۔ چوتھی بیوی کے بارے میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے اور آپ کے بھائی نے جویمنی قبیلے میں اپنے نکاح کا پیغام دیا تھا۔ (اس روایت کو ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں) اگر اس پیغام کو قبول کرتے ہوئے اہل قبیلہ نے آپ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا تھا تو وہ آپ کی چوتھی بیوی قرار پائے گی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۲۱۸) واللہ اعلم بالصواب

اولاد: حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شادیاں تو کئی فرمائیں، لیکن تاریخ میں آپ کے کسی بیٹے یا بیٹی کا ذکر موجود نہیں۔ مؤرخین فرماتے ہیں: ”بلال بن رباح مولیٰ ابی بکر لا عقب له“ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کوئی اولاد باقی نہ رہی۔ (تہذیب الکمال،

فی اسماء الرجال، ج: ۴، ص: ۲۹۰، تاریخ دمشق، ج: ۱۰، ص: ۴۳۱، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۴۱۸)

بخت اور بلال: ”تم نے خرید کر مجھے انمول کر دیا“ یہ مصرع حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات کا سچا اور اچھا ترجمان ہے، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دین اسلام نے نہ صرف غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلائی بلکہ نعرہ ہائے احدا حد نے ان کو اپنے امثال و اقراں میں ممتاز کر دیا، جہنم سے بچا کر جنت کی ابدی نعمتوں سے مالا مال کر دیا، مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ ان کی زندگی کی سانس سانس یہ پکار رہی ہے:

عرشی ہلال کر دیا فرشی بلال کو

خیر الوری نے چند ہی لمحے بٹھا کے پاس

ان کی تربت اطہر سے آج بھی یہ صدا گونج رہی ہے دین و دنیا کی بھلائیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں چاہتے ہو تو قدم حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ جاؤ، خاک پائے مصطفیٰ کے ساتھ لگا رہنا ہی مومن کی معراج اور ایمان کا کمال قرار پاتا ہے۔ واہ رے بلال! ہم آپ کی زندگی کو سوچتے ہیں تو سوچ کر حیران ہو جاتے ہیں، کہاں آپ کی زندگی پر وہ

غلامی کے بھیانک سائے جہاں امیہ جیسے ظالموں کے ظلم سہنے کے سوا زندگی میں اور کچھ نظر نہیں آتا، آپ امیہ کی غلامی کے بعد محمد عربی کے غلام کیا بنے کہ کائنات کے امام بن گئے، بقول علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ:

سر پہ سر کیوں نہ جھکے ان کے قدم پر ارشد
ایک غلامی ہے تو کونین کی آقائی ہے
حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری زندگی ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے
ساتھ خلوص، وفا، محبت، اطاعت، استقامت اور جذبہ جاں نثاری کا سبق پڑھاتی ہے، ان
کی سیرت کے جھرونگوں سے آج بھی آواز سن سکتے ہیں:
جگر راہ وفا میں نقش ایسے چھوڑ آیا ہوں میں
جس منزل سے گزرا ہوں وہ اب تک یاد کرتی ہے
اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آقا پر، حضرت
بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کے تمام ساتھیوں پر

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود
ان کے اصحاب و عنترت پہ لاکھوں سلام
جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمِيْدُهُ وَنُصْلِيْ وَنُسْلِيْ عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والتسلیم اور حضرت حواء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے انسانوں کو پیدا فرمایا، ان کی اولاد میں برکت رکھی، ان دو جانوں سے پیدا ہونے والی نسل اس کثرت سے بڑھی کہ خالی پڑی خدا کی زمین کے اطراف و جوانب کو بھر دیا، کوئی کہیں بسا تو کوئی کہیں جا پہنچا، زمین کے ویران خطے آباد ہوئے، ان کے نئے نئے نام رکھے گئے، انسانی آبادی مرضی مولیٰ کے مطابق شعب اور قبائل میں منقسم ہو گئی، قبائل کے بھی الگ الگ اور جدا جدا نام پڑ گئے تاکہ شناخت اور پہچان میں آسانی ہو، نہ جانے کتنے خطے ایسے ہیں کہ ہم ان کے ناموں سے بھی آشنا نہیں، نہ وہاں کے مکینوں سے ہمارا کوئی رابطہ اور واسطہ ہے، مگر بعض خطہ زمین ضرور ایسے ہیں کہ وہ بعد مکانی کے باوجود بھی ہماری سماعتوں سے قریب اور ہمارے دل و دماغ میں محفوظ ہیں، اس میں زمین کی تاثیر نہیں بلکہ مکین کے کارناموں کی کار فرمائی شامل ہے۔ مکہ کو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش بننے کا شرف حاصل ہونا تھا لہذا اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی کے استقبال کے لیے کعبہ مقدسہ کو زمین پر پہلے عبادت خانے کے طور پر اپنی معصوم مخلوق فرشتوں کے ہاتھوں تعمیر کروادیا، پھر عہد بعہد اس کی تعمیر نو کے انتظامات بھی فرمادیے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دل شہر مکہ کی طرف جھک گئے اور وہ بندگان خدا کے دلوں کی دھڑکن بن گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی برکت سے مکہ کے اطراف و جوانب میں پھیلے گاؤں اور دیہاتوں کے عظیم سلسلے کو بھی شہرت دوام اور حیات ابد حاصل ہو گئی، گو اس کے اسباب جدا جدا ہو سکتے ہیں لیکن سب کے رابطے کی ڈور جان عالمیاں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے ذکر جمیل سے بندھی ہے۔ ایسی زمینوں میں ایک نام قبیلہ غفار کی سرزمین کا بھی ہے، غفار قبیلہ کنانہ کی ایک شاخ کا نام ہے، جس کی جائے سکونت مکہ کے قریب مقام سرف سے کچھ آگے ہے۔ (معجم البلدان، ج: ۱، ص: ۲۱۴)

ان کے کنوؤں میں بدر اور ان کی وادیوں میں وڈان کا نام شامل ہے، ان کے دیار میں وادی صفراء بھی ہے، جو مکہ المکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان واقع ہے۔

(المعالم الاثیریہ فی السنیۃ والسیرة، ج: ۱، ص: ۲۰۹)

وادی وڈان وہ وادی ہے جو باہری دنیا کو مکہ المکرمہ سے ملاتی ہے، اسی وادی میں ایک قبیلہ سکونت رکھتا اور اپنی گزر بسر کرتا تھا، اس کی معاشی زندگی بڑی کمزور بنیادوں پر قائم تھی، یہاں کے بسنے والے قریش کے ان قافلوں کے دست نگر تھے جو تجارتی اغراض کے تحت مکہ آتے جاتے تھے، یہ تجارتی قافلے ان پر جو رزق ارزانی کر دیتے وہی ان کی زیست کا سامان اور درد کا درماں تھا، اگر تجارتی قافلے بخل سے کام لیتے تو ارض غفار کے باشندے اپنے تیرکمان سنبھال کر قافلوں کے ساتھ لوٹ پاٹ کر کے اپنی خورد و نوش کا انتظام کر لیتے۔

(صومن حیاة الصحابة، ص: ۱۴۲)

حد تو یہ ہے کہ یہ قبیلہ حجاج کے قافلوں کو لوٹنے میں بھی دریغ نہیں کرتا تھا، اس قبیلے کا ایک بچہ عنفوان شباب کو پہنچا، جس کا نام ”جندب بن جنادہ“ تھا، جو لوٹ پاٹ اور غارت گری میں اپنے قبیلے کے عین نقش قدم پر تھا، ہاں شجاعت، بسالت، جرأت، حوصلہ مندی، بہادری، دل کی بے باکی اور عقل کی پختگی میں وہ اپنے اقران میں ممتاز تھا۔ قبیلے والے جب قافلوں کو لوٹنے کا ارادہ کرتے تو انہیں قزاقوں کی ایک ٹولی بنانا پڑتی تھی لیکن بسا اوقات یہ نوجوان قافلے پر اکیلے ہی حملہ کرتا، قافلے سے لوٹے ہوئے ساز و سامان کو مال غنیمت سمجھ کر اپنے گھر لے آتا، نوجوان کی زندگی کی ابتدا تو قزاقی اور غارتگری سے ہوئی تھی لیکن نبی قوت اس کے لیے مددگار ثابت ہوئی، فطری خیر جو ہر فرد بشر کے سینے میں موجود ہوتی ہے، کسی کی بیدار ہو جاتی ہے اور کسی کی ہمیشہ کے لیے مرجاتی ہے، وہ خیر اس نوجوان کے دل میں جلد ہی

بیدار ہو گئی، تاریکیاں نور میں تبدیل ہونا شروع ہو گئیں، نوجوان اپنی دلی کیفیات کو بدلتا محسوس کرنے لگا، یہ بدلاؤ کسی داعی کی دعوت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اس فطرت کا اثر تھا جس کے بارے میں ہمارا خالق فرماتا ہے: ”فُطِرَتِ اللّٰهُ الْيَتٰى فُطِرَ النَّاسَ عَلَیْہَا“

ایک وقت ایسا آیا کہ نوجوان کی شخصیت پورے طور پر بدل گئی، یہ بدلاؤ ایسا تھا کہ جو جاہلیت والی شخصیت سے کوسوں دور تھا، اب جندب کی شخصیت ایسے قالب میں تبدیل ہو گئی تھی جسے شخصیت ماضیہ سے کوئی لگاؤ اور تعلق نہ تھا، یہ جندب میں پوشیدہ خیر کا نتیجہ تھا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں موحد بن گیا، اپنے انداز میں ایک خدا کی عبادت کرنے لگا اور بتوں کی پوجا سے دور رہنے لگا تھا۔ (ابوذر غفاری والشیوعیہ للذکور عبد الحمید محمود، ص: ۱۴)

حضرت خفاف بیان کرتے ہیں کہ آپ بہت بہادر تھے، قافلے کو اکیلے لوٹ لیتے اور اس پر حملہ کرتے اور ایسے حملہ کرتے جیسے درندہ حملہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں اسلام ڈال دیا۔ (تاریخ اسلام، ج: ۳، ص: ۴۰۸)

شاید ابھی آپ جندب بن جنادہ کو پہچان نہ سکے ہوں، لہذا ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ جندب بن جنادہ کوئی غیر معروف ذات نہیں بلکہ وہ تو اسلام کی مشہور ترین شخصیت کا نام ہے، البتہ لوگ انہیں جندب بن جنادہ کے نام سے کم جانتے ہیں، تاریخ اسلام انہیں فقرو تصوف کے امام عظیم المرتبت صحابی ”ابوذر غفاری“ کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ ذیل میں ہم ان ہی کی شخصیت پر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے قدرے تفصیل سے کلام کریں گے۔

نام و نسب: علامہ ابن اثیر نسب نامہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام (اور ان کے والد کے نام میں) کثیر اختلاف پایا جاتا ہے، سب سے زیادہ صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ آپ کا نام جندب اور والد کا نام جنادہ ہے، آپ کے نام اور والد کے نام کے سلسلے میں درج ذیل اقوال بھی موجود ہیں۔

(۱) بریر بن عبد اللہ (۲) بریر بن جنادہ (۳) بریدہ بن عثرقہ (۴) جندب بن عبد

اللہ (۵) جندب بن سکین۔ آپ کا مشہور نسب نامہ درج ذیل ہے:

جندب بن جنادہ بن قیس بن عمرو بن ملیل بن صغیر بن حرام بن غفار۔

(اسد الغابہ، ج: ۶، ص: ۹۶)

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ آپ کے نام اور آپ کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ آپ کا نام جندب بن جنادہ ہے۔ (الاصابہ، ج: ۷، ص: ۶۰)

ماں کا نام: آپ کی ماں کا نام رملہ بنت وقیعہ غفاریہ ہے۔ (الاصابہ، ج: ۷، ص: ۶۰)

۱۶۱، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج: ۱، ص: ۸۰۰)

کنیت: آپ کی کنیت اتی مشہور ہوئی کہ آپ کا نام ہی لوگوں میں مشکوک ہو گیا، بہت کم لوگ ہیں جو آپ کو نام سے پہچانتے ہیں دنیاۓ اسلام میں اپنی کنیت ابوذر کے ذریعے مشہور و معروف ہوئے، آپ کی کنیت آپ کے بیٹے ”ذُر“ کے نام پر ”ابوذر“ مشہور ہوئی۔

علامہ ابن حجر نے الاصابہ میں ذر نامی ایک صحابی کا ذکر فرمایا ہے کہ یہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے تھے، مقام غابہ میں رہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ والی اونٹنیاں چرایا کرتے تھے، اچانک عیینہ بن حسن نے حملہ کر دیا۔ (علامہ عینی نے حملہ کرنے والے کا نام عبدالرحمن بن عیینہ بن حصین لکھا ہے) حملہ آوروں نے ذر کو قتل کر دیا اور ذر کی بیوی کو قیدی بنا لیا، یہی واقعہ غزوہ غابہ جسے غزوہ ذی قرد بھی کہا جاتا ہے کا سبب بنا۔ علامہ ابن حجر آگے لکھتے ہیں: ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے کو غزوہ ذی قرد میں شہید کیا گیا۔ (الاصابہ، ج: ۲، ص: ۱۷۱، عمدۃ القاری، ج: ۱، ص: ۷، ص: ۲۳۳، غزوہ ذی قرد، امتناع الاسماء، ج: ۸، ص: ۳۸۰، غزوہ الغابہ، مدارج النبوة مترجم، ج: ۲، ص: ۲۳۳)

اس واقعے کا ذکر کثیر محدثین و مؤرخین نے فرمایا ہے، بہر حال ہمیں اس سے یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام ذر تھا، جب یہ ثابت ہو گیا تو یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اسی بیٹے کے نام پر ہی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ابوذر رکھی گئی اور اسی لیے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی کو ”ام ذر“ کہا جاتا ہے۔

آپ کی کنیت ”ابوذر“ مشہور ہونے کے سلسلے میں بعض علما نے ایک لطیف واقعہ بھی بیان فرمایا ہے، جسے ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں:

علامہ شمس الدین محمد بن عمر بن احمد سفیری شافعی شرح البخاری للسفیری المعروف بالمواعظ الوعظیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ بعض علما نے یہ افادہ فرمایا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ابوذر پڑنے کی وجہ یہ ہے، ذر کا معنی ہوتا ہے چیونٹی، ہوا یہ کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک روٹی تھی اس پر چیونٹیاں آگئیں تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چیونٹیوں والی روٹی کا وزن کیا، پھر روٹی سے چیونٹیاں ہٹا کر اس کو تولا دونوں کا وزن برابر تھا، یعنی بغیر چیونٹیوں والی روٹی کو جب ترازو میں تولا گیا تو ترازو میں پہلے کے مقابلے کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی، اس پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: دیکھیے دنیا کی ترازو میں اس ذر (چیونٹی) کا اثر ظاہر نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے ترازو کا پلڑا اونچا نیچا نہیں ہوتا مگر آخرت کی ترازو (میزان) اپنی عظمت کے باوجود ایک ذرے سے حرکت میں آجائے گی، اس کا پلڑا اونچا نیچا ہو جائے گا بس اسی سے آپ کی کنیت ابوذر پڑ گئی۔ یہی مضمون علامہ صفوری نے اپنی کتاب نزہۃ المجالس میں لکھا ہے مگر یہ کہ انہوں نے اس قول کی نسبت علامہ ابن عماد کی طرف کی ہے۔

(شرح البخاری للسفیری، ج: ۲، ص: ۴۴، نزہۃ المجالس، ج: ۲، ص: ۲۰۴)

حلیہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قد لمبا جسم گداز (بعض روایتوں میں دبل) رنگ گندمی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے اور داڑھی گھنی تھی۔ (تاریخ مدینہ دمشق،

ج: ۶۶، ص: ۱۷۶، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۷، تہذیب الکمال، ج: ۳۳، ص: ۲۹۵)

مواخات: بعض حضرات کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مواخات حضرت منذر بن عمرو کے ساتھ قائم فرمائی تھی لیکن دوسرے بعض حضرات کا ماننا یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مواخات کسی کے ساتھ بھی قائم نہیں کی گئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ مواخات کا سلسلہ معرکہ

بدر سے قبل تک جاری تھا، جب آیت میراث نازل ہوگئی تو سلسلہ مؤاخات منقطع ہو گیا چونکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لانے کے بعد اپنی قوم کی طرف واپس ہو گئے تھے پھر بدر واحد اور خندق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۹)

تحقیق یہ ہے کہ بدر کے بعد بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی تھی۔ تفصیل جاننے کے لیے کتاب میں موجود مضمون ”مؤاخات“ کا مطالعہ فرمائیں۔

صراطِ مستقیم کی تلاش: ہماری تمہیدی گفتگو میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں روحانی طور پر انقلاب برپا ہو چکا تھا، اپنے انداز میں نماز پڑھا کرتے، خدا کی عبادت کیا کرتے، دل کے اندر ایک خلش تھی جو وصولِ حق کے لیے انہیں بے چین کیے ہوئے تھی، سکونِ قلب کے حصول کے لیے راہیں کیسے ہموار ہوتی ہیں اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندگی کے کس کس موڑ سے گزرتے ہیں؟ اس کا قدرے تعارف ہم استاذ العلماء مفتی فیض احمد اویسی رضوی کے قلم حق رقم سے انہیں کے دیے ہوئے حوالوں کے ساتھ کراتے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں:

جلا وطنی: آپ کے حالات میں ملتا ہے کہ آپ کو اپنے گھر سے جلا وطن کیا گیا تھا اور آپ اپنے ماموں کے یہاں رہائش پذیر ہو گئے تھے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا یہ جلا وطنی کیوں ہوئی؟ بہر کیف آپ کی جلا وطنی کی علت خواہ کچھ بھی ہو آپ نے غفار کو چھوڑا، قریب کے رشتہ داروں میں آپ کے ایک ماموں کسی دوسرے قبیلے میں اقامت گزریں تھے، وہیں کا ارادہ کیا، اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ گھر سے نکل پڑے، قطعِ منازل کے بعد اس قبیلے میں پہنچے، آپ کے ماموں نے جو اپنی بچھڑی ہوئی بہن یعنی آپ کی والدہ کو اس غربت کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا، جی بھر آیا بھان جوں کو تسلی دی خیمے خالی کر دیے غرض ایک ماموں سے جس ہمدردی کی امید ہو سکتی تھی وہاں آپ کو میسر آئی، نہایت چین اور اطمینان کے ساتھ

رہنے لگے یہاں ان کو اپنے مشغلے سے کوئی روکنے والا نہ تھا۔

ماموں کے یہاں سے روانگی: ماموں نے بھی آپ کے عنصر طیب اور جو ہر ذاتی کو پہچان لیا، روز بروز ان کی توجہ زیادہ ہوتی جاتی تھی، آخر اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے ماموں کے یہاں آنے جانے والے لوگوں کے دلوں میں رشک کا مادہ پیدا ہوا، ان دونوں بھائیوں نے بہت سے حاشیہ نشینوں کی جگہ لے لی تھی، ان کے گھر کے کام جواب تک دوسروں کے ساتھ متعلق تھے ان لوگوں کے ہاتھ سپرد ہو گئے۔

الغرض مختلف اسباب و علل نے اس مادے کو تیز کیا یہاں تک کہ رشک نے حسد کی صورت اختیار کی، مخالفوں کی ایک جماعت تیار ہوئی جو ان کے خلاف ہر امکانی کوشش کرنے کی فکر میں مصروف رہتی تھی، آپ کے ماموں کبھی کبھی سیر و شکار کی غرض سے گھر سے باہر بھی جایا کرتے تھے، مخالفوں نے اس کو غنیمت سمجھا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ سبھوں نے مل کر کہا کہ جناب آپ جب باہر جاتے ہیں اور گھر میں کوئی نہیں رہتا تو آپ کے بھانجے انیس گھر والوں پر افسری کرتے ہیں اور ہر قسم کی ابتری پھیلا دیتے ہیں، ان کی وجہ سے لوگوں کی ناک میں دم ہے، آپ کے ماموں کی عنایات گو آپ پر اور آپ کے بھائی پر بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں اور شاید اسی وجہ سے شکایت کا ان پر کوئی غیر معمولی اثر پیدا بھی نہیں ہوا۔ تاہم وہ آدمی تھے ایک دن موقع پا کر انہوں نے پوچھ لیا کہ بھائی انیس ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس قدر جملے کا سننا تھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ سے باہر ہو گئے، ایک تو اس لیے کہ وہ فطری طور پر ایک کڑے مزاج کے آدمی تھے دوسرے غربت و مسافرت میں انسان کا دل بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، وہ کسی کی معمولی بات کی تاب نہیں لاسکتا پھر واقعہ بھی سرے سے غلط، ممکن ہے کہ انجام کا بھی خیال آیا ہو، اگر اسی طرح ہم لوگوں کی شکایتیں ہونے لگیں تو آج تو معاملہ زیادہ خطرناک نہیں، ہو سکتا ہے کہ آئندہ ہمیں اپنے ماموں کے گھر سے بے غیرت ہو کر نکلنا پڑے، بس پھر کیا تھا؟ حسرت بھرے لہجے میں اپنے ماموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: آپ نے تمام گزشتہ احسانات کی نہروں کو گدلا کر

دیا، بس اس کے بعد ہمارا اجتماع آپ کے ساتھ ممکن نہیں، اور اپنے اونٹوں پر لد کر وہاں سے بھی بلا کسی توقف کے روانہ ہوئے، بیچارے ماموں کو کیا خبر تھی کہ محض اتنی سی بات پوچھنے سے حضرت ابوذر کا یہ حال ہوگا وہ تو ہٹکا بٹکا ہو کر رہ گئے، روکتے تھے، تسلیاں دیتے تھے مگر یہاں کون سنتا ہے؟ وہ وقت بھی نہایت دردناک تھا جب کہ ان لوگوں کے اونٹ اس قبیلے سے گزر رہے تھے، خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے: ”فتغطی خالنا بشوبہ وجعل یبکی“ ماموں اپنے منہ کو کپڑے سے ڈھانپ کر روتے جاتے تھے، الغرض رائی پہاڑ بنی اور آپ کو یہاں سے بھی رخصت ہونا پڑا۔

مکہ کی طرف رخ کرنا: مکہ معظمہ عرب کا مشہور شہر تھا آپ نے اپنے اونٹوں کو اس طرف پھیر دیا، خاص شہر میں تو جانا آپ نے مناسب نہ سمجھا لیکن اس کے ارد گرد کسی قریب کے گاؤں میں اتر پڑے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی، اس پر کچھ دن گزر گئے کہ اسی عرصے میں آپ کے بھائی انیس کا جو ایک زبردست شاعر تھے، کسی دوسرے شاعر سے مقابلہ ہو گیا، انیس اپنے اشعار کی تعریف کرتے تھے اور اسے بلند پایہ بتاتے اور دوسرا اپنی شاعری کی مدح سرائی کرتا اسے بڑھاتا، الغرض اسی نوک جھوک میں شرط کی نوبت آ گئی، بات اس پر طے ہوئی کہ جو ہارے وہ اپنے ریوڑ جیتنے والے کی نذر کرے، ایک کاہن حکم مقرر ہوا، دونوں اس کے پاس حاضر ہوئے، خوش قسمتی سے کاہن نے حضرت انیس کے موافق فیصلہ دیا، ان کے اشعار کو خصم کے شعروں سے بہتر بتایا، حضرت انیس خوش خوشی اپنے ریوڑ کے ساتھ اس کے ریوڑ بھی قیام گاہ تک ہٹکا لائے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اس تائید غیبی پر بہت مسرت ہوئی۔

دربار نبوی تک باریابی کے اسباب: یہ وہ زمانہ تھا کہ رافت سماویہ ملت ابراہیمیہ کے اتمام و احیاء کیلئے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت قدسیہ کا انتخاب کر چکی تھی، حراء کا واقعہ، نزول وحی، بعثت کے حوادث گزر چکے تھے، اسلام کی تبلیغ کی آواز عشیرہ واقربین سے گزر کر ام القرئی میں گونج چکی تھی، گھر گھر اس نئے دین کا چرچا تھا، کفار میں

اسلاف پرستی کے اوصاف نمایاں تھے، بچوں سے بوڑھوں تک ہر ایک اپنے خود تراشیدہ معبودوں کی تائید میں سرشار ہو رہا تھا، راہگیروں میں اور مکہ میں آکر بازار کرنے والوں کے اور اعراب و مسافرین کے کان کھڑے ہو چکے تھے، مکہ سے جو باہر جاتا وہ اس کی خبر اپنے شناسا کو ملنے جلنے والے کو تعجب سے سناتا تھا، اس عرصے میں مکہ سے کوئی مسافر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پڑاؤ کی طرف گزرا، آرام لینے کے لیے کچھ دیر شاید وہاں ٹھہرا ہوگا، بات میں بات پیدا ہوئی معلوم نہیں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خیالات سے اسے پہلے سے واقفیت تھی یا اسی وقت ان کی گفتگو سے اسے معلوم ہوا کہ آپ بھی ایک خدا کے ماننے والوں میں سے ہیں، بہر کیف اس نے کہا: ابوذر! یہ تم جو کچھ کہتے ہو مکہ کا ایک شخص اسی کا مدعی ہے، دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کلام نازل فرمایا ہے اور اسے اپنا پیغمبر بنایا ہے، خدا کا حکم ہے کہ اس کے علاوہ اور کسی معبود سے کوئی واسطہ نہ رکھو، اس نے تو رواروی میں یہ خبر سنائی لیکن ادھر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دل بلیوں اچھل پڑا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گو ہر مقصود کی جگہ گاہٹ نے ان کے دل و دماغ کو روشن کر دیا، سمجھ لیا کہ وقت قریب ہے، دل کی بے چینی کی دوا آسمان سے اتر چکی ہے، سنتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے اور نہایت اضطراب کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کرنے لگے کہ اس کا اصلی وطن کہاں ہے؟ کس قبیلے کا آدمی ہے؟ مکہ کے کس خاندان سے اس کا تعلق ہے؟ راہگیر نے سارا نشان و پتہ بتا دیا کہ وہ مکہ کا آدمی ہے اور قبیلہ قریش کے ممتاز خاندان کا آدمی ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۶، ص: ۵۴۴)

اس قدر پوچھ کر آپ چپ ہو گئے، دل میں عجیب کیفیت تھی جو رہ رہ کر مکہ معظمہ کی طرف ان کو گھسیٹ کر لے جانا چاہتی تھی لیکن کچھ اپنے بت پرست بھائی کا خیال کچھ مشرکہ ماں کی خاطر سے دل میں اس انگارے کو دبائے بیٹھے رہے، جو تبلیغ کے بعد ہر ایسے دل میں خود بخود بلا کسی دلیل و حجت کے پیدا ہوتا ہے، حقیقت و الفت کا ایک دریا تھا جو روح حضرت ابوذر میں جوش زن تھا، نہیں سمجھتے تھے کہ کیا ہے کیوں ہے؟ مگر تھا۔ اور وہ اس کے ہیجان سے

بیکل تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں مگر یہاں تو سعادت آپ کی پیشانی چوم رہی تھی، آپ کے رشد و ہدایت کا سامان آسمان پر کیا گیا تھا، انیس رضی اللہ عنہ نے یکا یک آپ سے آکر کہا: بھائی جان! میں مکہ جاؤں گا، آپ ذرا اونٹوں کی نگہداشت فرمائیے گا، ان کے چارہ پانی کا خیال رکھیں، ان شاء اللہ بہت جلد واپس آتا ہوں۔ (مسلم و طبقات ابن سعد)

ایک آواز تھی یا بجلی جس کی رو تمام قوی و حواس پر آناً فاناً دوڑ گئی، خدا جانے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا دیکھا؟ سامنے سے کیا چیز ٹپ کر نکل گئی؟ مگر فوراً کچھ سوچ کر آپ یکا یک تھم گئے اور خود ساختہ طمانیت اور سکون طاری کرتے ہوئے انیس کو آپ نے اجازت دی اور اصل مقصد جس کو بے غرضانہ اسلوب مگردل دوز لفظوں میں ادا کیا ہے۔ میں اسے بخاری شریف سے نقل کرتا ہوں: ”ارکب الی هذه الوادی فاعلم لی علم هذا الرجل الذی یزعم انه نبی یتاہیہ الخبر من السماء واسمع من قوله ثم أتی“۔ (بخاری، ج: ۱، ص: ۵۴۴)

انیس وادی مکہ جاؤ کوئی مضائقہ نہیں مگر ہاں! میرے لیے یہ کرتے آنا جو اپنے کو نبی خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آسمان سے اس کے پاس خبریں آتی ہیں، ذرا اس کی حالت دریافت کرنا، سننا کہ وہ کیا کہتا ہے، یہ کر کے پھر آنا، ادھر حضرت انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو مکہ کو روانہ ہوئے ادھر ایک شعلہ انتظار تھا جو ان کے رخصت ہوتے ہوئے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل و جگر میں بھڑکنے لگا، رہ رہ کر اس کی شدت بڑھ رہی تھی، حتیٰ کہ اس سختی کو آپ اسلام لانے کے بعد بھی نہ بھولے تھے، اپنی داستان سناتے ہوئے فرمادیتے تھے، انیس نے بہت دیر لگائی تھی، بہر کیف دیر ہوئی تھی یا نہیں لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ وقت بہت گراں گزرا، اور شاید اس سے زیادہ شکایت کسی تراخی کو انہوں نے کبھی نہیں کی۔

حضرت انیس واپس ہوئے ایک معمولی انداز کے ساتھ ملے اور پھر پوچھا کہ اتنی دیر تم نے کہاں لگائی؟ حضرت انیس نے فرمایا کہ اسی آدمی سے ملنے میں دیر ہوئی، اس کا

طریقہ وہی ہے جو آپ کا ہے، وہ اچھی عادتوں کی تعلیم دیتا ہے اور یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے آپ کو رسول گمان کرتا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اچھا مکہ والے ان کو کیا کہتے ہیں؟ کیسا آدمی سمجھتے ہیں؟ انیس نے کہا کہ اسے کوئی شاعر کہتا ہے اور کوئی کاہن کہتا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس موقع پر غایت نشاط اور مسرت کے ساتھ اپنے اسلام کی حالت بیان کرتے ہوئے خاص اس مقام پر فرمایا کرتے تھے: انیس حالانکہ اچھا شاعر تھا مگر اس نے یہی کہا کہ صاحب میں نے شعر کے اوزان پر ان کے شعروں کو خوب جانچا، شعر تو وہ یقیناً نہیں ہیں، رہا کاہن تو میں سیکڑوں کاہنوں سے ملا ہوں، ان کی باتیں سنی ہیں لیکن اس شخص کے کلام کو ان کی گفتگو سے کوئی واسطہ نہیں، قسم خدا کی! وہ سب کے سب جھوٹے ہیں لیکن وہ سچا ہے۔ (طبقات و صحاح ستہ)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کیا حال ہوا؟ پوچھنے کی ضرورت نہیں، ناصح جب دل گرفتوں کا ہم خیال و ہمد ہو جاتا ہے اس وقت اطمینان کی جو خنکی دلوں میں محسوس کی گئی ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے کو بھی اسی سے معمور سمجھنا چاہیے، حضرت انیس کے خیال کے اس انقلاب نے ان کے تمام غم غلط کر دیے اور ایک مسرورانہ لہجہ میں فرمایا: ”ماشفیتنی ہماردت“۔ (بخاری)

ہم جس مرض کا علاج چاہتے ہیں، تم اس کی دوائیں لائے اور وہ کہاں سے لاسکتے تھے اس کے بعد کہا کہ انیس ”ا کفنی اذهب فانظر“ تم میری جگہ اب گھر رہو، تاکہ میں جاؤں اور میں بھی تو دیکھوں کہ کون ہے کہ ساری تڑپ اور بے چینی اسی ایک نظر کے لیے تھی اور آہ کہ اس وقت تک کتنوں کو ہے۔ (سوانح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ص: ۹ تا ۱۷)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماموں کا گھر کہاں تھا؟ اس اقتباس میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا لیکن حلیۃ الاولیاء میں اس بات کی صراحت ہے کہ آپ کے ماموں علاقہ نجد کے بالائی حصہ میں رہتے تھے۔ (ج: ۱، ص: ۱۵۷)

گوہر مراد قریب ہوا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس دولت کی

تلاش میں تھے اس کے اسباب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمادیے، وہ وقت قریب سے قریب تر آ پہنچا ہے، جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کا مقصود حاصل ہوگا، وہ رحمت عالمیاں کی آغوش رحمت پناہ میں پہنچ کر اسلام کی دولت لازوال سے مشرف ہوں گے اور ہمیشہ کے لیے داعی اسلام کے ہور ہیں گے، ہمارے قارئین پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ اسلام کی ابتدائی اور پوشیدہ دعوت کا دور ہے اور اس وقت میں مسلمان ہونا گویا اپنے آپ کو مصیبتوں کے منہ میں ڈال دینا ہے، لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دین حق چاہیے تھا، خواہ قیمت کچھ بھی کیوں نہ چکا نا پڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ان کی باریابی اور دامن اسلام میں ان کی پناہ یابی کو ہم علامہ پیر کرم شاہ الازہری کی زبانی بیان کر رہے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں:

اسلام میں داخلہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے توشہ دان میں کھانے کا سامان رکھا، ہاتھ میں عصا تھا اور مکہ کی طرف روانہ ہو گیا، ساری مسافت پیدل طے کر کے مکہ پہنچا، وہاں میری جان نہ پہچان، میں نے سیدھا حرم شریف کا رخ کیا، میں اس شخص کو نہیں جانتا تھا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور جس کی زیارت کا شوق کشاں کشاں مجھے یہاں لے آیا تھا اور کسی سے حضور کے بارے میں پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا، مبادا کسی مشکل میں پھنس جاؤں، میں انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ رات ہو گئی، میں وہیں لیٹ گیا مجھے علی مرتضیٰ نے دیکھا، آپ سمجھ گئے کہ میں مسافر ہوں، میرا یہاں کوئی ٹھکانہ نہیں، اس لیے حرم شریف میں فروکش ہو گیا ہوں، آپ نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا چنانچہ میں آپ کے پیچھے چل پڑا، راستے میں نہ آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے خود کچھ بتایا، رات آپ کے وہاں بسر کی، صبح ہوئی تو اپنا توشہ دان اٹھایا اور حرم میں آ کر ڈیرہ ڈال دیا۔

دوسرا دن بھی گزر گیا حضور کی زیارت نصیب نہ ہوئی، شام ہوئی تو چادر بچھا کر لیٹ گیا، حضرت علی مرتضیٰ کا پھر گزر رہا، مجھے کل کی طرح بے خانماں دیکھ کر اپنے ساتھ لے

گئے، راستے میں سکوت طاری رہا نہ انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا اور نہ میں نے اپنے بارے میں از خود کچھ بتایا، دوسری رات بھی گزر گئی، صبح کا اجالا ہوا تو اپنا سامان اٹھا کر حرم میں آگیا، جب تیسرے دن کا سورج بھی غروب ہو گیا اور شام کے دھند لکے نے اپنی چادر پھیلائی شروع کر دی اور میں فرش حرم پر آرام کرنے کی غرض سے لیٹنے کی تیاری کرنے لگا تو پھر شاہ مرداں علی مرتضیٰ آتے ہوئے دکھائی دیے، میرے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا، جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے مہر سکوت توڑتے ہوئے دریافت کیا کہ تمہارا یہاں کیسے آنا ہوا ہے؟ میں نے عرض کی: اگر آپ میرے ساتھ پختہ وعدہ کریں کہ آپ میرا راز فاش نہیں کریں گے اور میری راہبری کریں گے تو میں اپنی آمد کا مقصد بیان کرتا ہوں، آپ نے مجھے رازداری کا یقین دلایا تو میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا، میری بات سن کر آپ نے فرمایا: بے شک وہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، صبح میں تمہیں اپنے ساتھ ان کی خدمت میں لے جاؤں گا، صبح ہوئی تو حسب وعدہ آپ مجھے ساتھ لے کر جانے کے لیے تشریف لائے، مجھے فرمایا: تم چپکے چپکے میرے پیچھے چلتے آنا اگر مجھے کوئی خطرہ محسوس ہوا تو میں اس طرح کھڑا ہو جاؤں گا جس طرح میں لوٹے سے پانی بہا رہا ہوں یا اپنی جوتی کا تسمہ درست کر رہا ہوں اور اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو میرے پیچھے اطمینان سے چلے آنا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی آگے آگے چلتے رہے، میں آہستہ آہستہ ان کے پیچھے پیچھے، چنانچہ میں آپ کی معیت میں حضور سرور کائنات کی بارگاہ میں حاضر ہوا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میرے سامنے اسلام پیش فرمائیں، حضور پر نور نے بڑے دل نشیں پیرائے میں اسلام کی حقیقت سے مجھے آگاہ کیا، حضور کی ہر بات میرے دل میں اترتی چلی گئی، جب حضور کا ارشاد اختتام پذیر ہوا تو میرا بخت خفتہ بیدار ہو چکا تھا، میرے تار یک دل میں ایمان کی نورانی شمع جگمگانے لگی تھی، شکوک و شبہات کا سارا غبار چھٹ گیا تھا، اسی وقت اور اسی جگہ حضور کے دست ہدایت بخش پر میں نے اسلام کی بیعت کی، حضرت ابو بکر بھی خدمت اقدس میں حاضر تھے، انہوں نے درخواست

کی کہ حضور اپنے جاں نثار غلام سمیت آج رات میرے کلبہ مخزین میں رونق افروز ہوں اور ماہِ حضرت تناول فرمائیں، حضور نے اپنے عاشق صادق کی اس درخواست کو قبول فرمایا، رات کا کھانا سرور کائنات، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر احباب نے کاشانہ صدیقی میں تناول فرمایا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ طائف کے زبیب (خشک میوہ) کھانے سے لطف اندوز ہوا۔ مرشد کریم علیہ افضل الصلوة والتسلیم نے اپنے نوآموز مرید کو دو خصوصی نصیحتیں فرمائیں: ”بایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تأخذہ فی اللہ لومة لائمہ وعلی ان یقول الحق ولو کان مرا“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں پر ان سے بیعت لی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے نیز وہ حق بات کہیں گے خواہ وہ کتنی کڑوی ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایت کی کہ وہ یہاں (مکہ میں) ابھی اپنے ایمان کو ظاہر نہ کریں اور اپنے قبیلے کے پاس واپس چلے جائیں اور انہیں اسلام کی دعوت دیں، جب ہمارے فتح یاب ہونے کی تمہیں اطلاع ملے تو پھر میرے پاس آجانا، آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں تو مشرکین کے مجمع میں جا کر اپنے ایمان لانے کا اعلان کروں گا، چنانچہ ایک روز جب قریش کے قبائل حرم شریف میں اپنی اپنی مجلسیں جما کر بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور پورے زور کے ساتھ اعلان کر دیا ”اشھد ان محمداً رسول اللہ“ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ قریش یہ سن کر بھڑک اٹھے اور مجھ پر ہلہ بول دیا، جو چیز جس کے ہاتھ میں آئی لکڑی، ڈھیلا، ہڈی، پتھر اس سے مجھے زد و کوب کرنے لگے، یہاں تک کہ میں غش کھا کر گر پڑا، اتنے میں عباس آگئے انہوں نے مجھے جھک کر دیکھا تو پہچان لیا اور انہیں جھڑکتے ہوئے کہا: کم بخنوا! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے جسے مار مار کر تم نے ادھمرا کر دیا ہے، تمہیں خبر نہیں کہ تمہارے

تجارتی قافلوں کا راستہ ان کے علاقے سے گزرتا ہے، تب ان لوگوں نے مجھے چھوڑا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اٹھ کر زمزم کے کنویں کے پاس گیا، اس کے پانی سے اپنے جسم پر لگا ہوا خون دھویا، جوتوں کر کے رات گزری، صبح ہوئی تو جنون عشق نے پھر مجبور کیا کہ کفار کے بھرے مجمع میں اپنے محبوب کی رسالت کا پھر اعلان کروں، اس کے جرم عشق میں پیٹا جاؤں اور میرے انگ انگ سے خون کی ندیاں رواں ہوں، چنانچہ دوسرے روز قریش حسب دستور جب اپنی محفلیں جما کر بیٹھ گئے تو میں نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے نعرہ لگایا ”اشھد ان محمداً رسول اللہ“ میں نے یہ اعلان کر کے گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دیا، یہ سنتے ہی سب ب پھر گئے اور غضب ناک ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑے، مکوں، گھونسوں، سونٹوں اور پتھروں سے میری خوب مرمت کی، جگہ جگہ سے خون بہنے لگا غش کھا کر پھر گر پڑا، حضرت عباس پھر میرے لیے نجات کا فرشتہ بن کر آ پہنچے، ان کو خوب ڈانٹا اور انہیں بتایا کہ جس شخص پر تم یہ زیادتی کر رہے ہو، یہ اس قبیلے کا فرد ہے جس کے علاقے سے تمہارے تجارتی کارواں گزرتے ہیں، اس طرح مجھے ان سے چھٹکارا ملا۔

(سیرۃ الرسول، ج: ۲، ص: ۲۴۶)

خانہ کعبہ میں پہلی صدائے حق: استاد خالد محمد خالد لکھتے ہیں کہ ہمارے علم کے مطابق خانہ خدا میں صنادید مکہ کے درمیان حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اعلان اسلام، یہ مسلمانوں کی طرف سے پہلا آوازہ تھا جو خانہ کعبہ میں گونجا تھا، آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نعرہ حق ایسے شخص نے بلند کیا تھا، جو مکہ کا باشتی تھا نہ یہاں اس کا کوئی خاندانی وجود، اس کا کوئی حمایتی تھا نہ سفارشی بلکہ یہ ایک غریب الوطن اور اجنبی انسان کی آواز تھی جس نے مکہ کے گھمنڈیوں کے کانوں میں جھنکار پیدا کر دی تھی، اس کی پاداش میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو کچھ پھیلنا پڑا، ایسا نہیں کہ وہ کوئی غیر متوقع چیز تھی، حضرت ابوذر جیسی حساس طبیعت اور ثاقب ذہن رکھنے والے انسان سے یہ قطعاً توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کو نتائج کا اندازہ نہ تھا بلکہ یہ کلمہ حق کی گواہی کا جوش تھا جو سوائے

اعلان حق کے کسی دوسری چیز سے سرد ہونے والا نہ تھا، خواہ قیمت کچھ بھی چکانا پڑے۔

(رجال حول الرسول، ص: ۴۶)

سب سے پہلے اسلامی سلام: دین اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے، اس کی اپنی تہذیب اور اپنا تمدن ہے، اسلام میں تحیت و سلام کا انداز انتہائی انوکھا، حسین اور پر معنی ہے، دنیا میں موجود آداب و تسلیمات کا کوئی طریقہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، سوال یہ ہے کہ اس سلام کو سب سے سے پہلے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کس نے پیش کیا؟ اگر ہم یہ سوال حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھیں تو جواب دیں گے: ”كنت انا اول من حياہ تحية الاسلام“ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سب سے پہلے سلام تحیت پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا: ”السلام عليك يا رسول الله“ اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وعليك ورحمة الله“۔ (مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل ابی ذر، الاصابہ، ج: ۷، ص: ۶۱، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۶۰)

ڈاکٹر عبدالرحمن پاشا لکھتے ہیں: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے انسان ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اسلامی سلام کو پیش فرمایا، اس کے بعد یہ سلام اہل اسلام کے درمیان مشہور و معروف ہو گیا۔ (صور من حياة الصحابة، ج: ۱۲، ص: ۱۴۶)

خیال رہے کہ اسلام کے اس مقدس طریقہ سلام سے پہلے لوگ ”انعم صباحاً“ جیسے الفاظ سے ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے، حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں: جب اسلام آ گیا تو ہمیں اس جیسے سلام سے روک دیا گیا۔ (فتح الباری، ج: ۱۱، ص: ۴، کتاب الاستئذان باب بدء السلام)

اسلام میں آپ کا نمبر: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام سابقین اولین کی جماعت میں سرفہرست ہے، مؤرخین کے بیان کے مطابق آپ چوتھے یا پانچویں نمبر پر اسلام لائے، بعض حضرات نے چھٹا نمبر بھی بیان فرمایا ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۱۸۶، اسد الغابہ، ج: ۶، ص: ۹۶، صور من حياة الصحابة، ج: ۱۲، ص: ۱۴۶، رجال حول الرسول، ص: ۴۵)

مبلغ مصطفیٰ بن کر مکہ سے رخصت: اسلام لانے کے بعد جتنے دن اللہ تعالیٰ نے چاہا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں ٹھہرے رہے، اس دوران جتنا میسر ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سیکھتے رہے اور اسلام کی تعلیم حاصل کرتے رہے، ان ایام میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قلب مصطفیٰ میں اپنی جگہ بنالی تھی، یہی وجہ رہی کہ جب مصطفیٰ کی بارگاہ میں ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو اللہ کے نبی نے انہیں ایک راز کی بات بتائی، خود فرماتے ہیں: ایک دن میں مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اپنی ہجرت گاہ کے طور پر ایک کھجوروں والی زمین دکھائی گئی ہے، مجھے پوری امید ہے کہ وہ سرزمین یشرب ہے لہذا تم میرے مبلغ کی حیثیت سے ابھی اپنی قوم کی طرف چلے جاؤ، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے انہیں فائدہ پہنچائے گا اور ان کے ذریعے تمہیں اجر عطا فرمائے گا، جس وقت تمہیں یہ اطلاع ملے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں غلبہ نصیب فرما دیا ہے تو تم ہجرت کر کے ہمارے پاس آ جانا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۰۸، صور من حياة الصحابة، ص: ۱۲۸، دلائل النبوة لاسماعيل الاصمہانی، ص: ۱۲۸)

تبلیغ اسلام اور اس کا اثر: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پا کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی قوم کی طرف روانہ ہو گئے، گھر پہنچے تو سب سے پہلے انیس سے ملاقات ہوئی، انیس نے پوچھا: بھائی بتائیے کیا کچھ کر کے آئے ہو؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: الحمد للہ! مسلمان ہو گیا ہوں، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر دی ہے، اللہ تعالیٰ نے انیس کا سینہ کھول دیا، انیس نے یہ کہتے ہوئے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا میں بھی آپ کے دین سے اعراض کرنے والا نہیں ہوں، میں اسلام لایا اور میں نے بھی تصدیق کی، پھر دونوں بھائی اپنی والدہ کے پاس پہنچے، والدہ کو دعوت اسلام پیش کی، والدہ کی زبان سے بھی وہی الفاظ جاری ہوئے جو ابھی کچھ دیر پہلے انیس نے کہے تھے، وہ بھی کلمہ اسلام پڑھ کر داخل اسلام ہو گئیں۔ اس دن سے یہ پورا گھرانہ قبیلہ غفار کو دعوت اسلام دیتا رہا، ان کے سامنے خدائے واحد کی عظمت، رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام کے محاسن بیان کرتا رہا، یہ لوگ دعوت دین سے تھکتے نہ اکتاتے، مسلسل اشاعت دین اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قبیلہ غفار میں سے خلق کثیر کو ہدایت نصیب فرمادی اور یہ لوگ ایمان لے آئے، نماز قائم کر دی گئی، قبیلہ کا سردار ایماء بن رخصہ اپنی قوم کی امامت کے فرائض انجام دیتا، البتہ ایک فریق نے یہ کہا: ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے، یہاں تک کہ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے آئیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف فرما ہو جائیں گے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو قبیلہ غفار کے باقی ماندہ افراد بھی دولت اسلام سے مالا مال ہو گئے۔

(صوَر من حَیَاة صحابۃ، ص: ۱۲۸، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۰۸)

خدائے وحدہ لا شریک کی قدرت کے فیصلوں پر قربان، اس کے فیصلے بڑے عظیم اور حکیمانہ ہوتے ہیں، وہی غفار جو کل تک چوروں اور ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھے، رہزنی جن کا پیشہ تھا اور لوٹ مار ان کا ذریعہ معاش، اللہ تعالیٰ نے ایک حضرت ابوذر کی کیفیت تبدیل فرمائی، راہ حق کی رہنمائی فرمائی، محبوب کی بارگاہ میں باریابی حاصل کرائی، دولت ایمان بخشی اور عظمت صحابیت عطاء فرمائی، پھر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امداد خداوندی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں سے بتوں کے پجاریوں کو خدائے واحد کا عابد، مشرکوں کو موحد اور رہزنوں کو رہبر بنادیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر غیروں کے ہادی بن گئے

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

قبیلہ اسلام میں چراغ حق کی روشنی: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تبلیغی مساعی کا سلسلہ صرف اپنے قبیلہ، قبیلہ غفار تک محدود نہ تھا بلکہ نور محمدی کی جو شمع حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آقا نے ان کے دل میں فروزاں فرمائی تھی اور اس کے ذریعے تاریکیاں دور کرنے کی جو ڈیوٹی لگائی تھی، وہ حضرت ابوذر کو اچھے طریقے

سے یاد تھی، لہذا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے سلسلہ تبلیغ کو قبیلہٴ اسلم تک وسیع کر دیا اور یہاں بھی چراغِ محمدی کی روشنی پھیلا نا شروع کر دی۔ (رجال حول الرسول، ص: ۴۶)

دو قبیلے بارگاہ رسالت میں: خوشی ہو یا غم، زمانے کو اپنی رفتار سے کام ہے، کسی کے غم پر اس کی رفتار کم ہوتی ہے نہ خوشی پر زیادہ، جو ذمہ داری خالق و مالک کی طرف سے عطا ہوئی ہے، لیل و نہار کا آنا جانا پوری پابندی کے ساتھ اس پر گامزن ہے اور ہمیشہ رہے گا، زمانہ گزرتا رہا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اپنی منصبی ذمہ داریاں نبھاتے رہے اور کفار مکہ اپنی طبیعت کے مطابق پیغمبر اسلام اور ان کے دیوانوں پر ظلم ڈھاتے رہے، ادھر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہے، آخر وہ وقت بھی آ گیا جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رب کے حکم سے مسلمانوں کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی اور خود بھی اپنے یار غار کے ساتھ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں فروکش ہو گئے۔

ایک دن کی بات ہے، مدینہ طیبہ کی وادیوں نے ایک قافلے کا استقبال کیا، قافلے میں شامل انسانوں کی لمبی قطاروں نے مدینہ طیبہ کی فضاؤں کو غبار آلود بنا دیا تھا، قافلے میں تکبیرات و تہلیلات کے نغمے سنائی دے رہے تھے اگر یہ تکبیرات کی بلند آوازیں نہ ہوتی تو اہل مدینہ یہی گمان کرتے کہ مشرکین کے کسی غارت گر لشکر نے ان کے اوپر چڑھائی کر دی ہے لیکن ذکر خدا کی صداؤں نے اس گمان کو بالکل مردود بنا دیا تھا، قافلہ اور قریب ہوا اور مدینہ طیبہ میں داخل ہو گیا، اب اس کا رخ مسجد نبوی کی جانب تھا، دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ قافلہ دو قبیلوں کے افراد پر مشتمل ہے، جن میں سے ایک کو غفار اور دوسرے کو اسلم کہا جاتا تھا، قافلے کو لے کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تھے، قافلے میں مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی، مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور بچے سبھی اس میں شامل تھے، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے اسلام لانے پر تعجب خیز نظروں سے دیکھا تھا، کیونکہ پیغمبر اسلام کے

سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جس کا کام قزاقی اور غارت گری تھا، اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا ”إِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ“ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت نصیب فرماتا ہے۔

آج جب کہ پورا قبیلہ نہ صرف غفار بلکہ اس کے ساتھ قبیلہ اسلم بھی اسلام اپنا کر، اللہ کی کبریائی کا نغمہ گا کر، حضور کی غلامی کا قلابہ گلے میں ڈال کر، حضور کی بارگاہ میں حاضر تھا تو حضور کی خوشی اور تعجب کا حال کیا ہوگا؟ آج تو غارت گری میں ممتاز افراد ہدایت و خیر کے ساتھ زمانے میں ممتاز ہو گئے تھے، جو شیطان کے حلیف تھے وہ رحمن کے وفادار بن گئے تھے، اب قرآن کریم کی اس صداقت میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا ”إِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ان پیروکاروں پر ایک نظر فرمائی، ایسی نظر جس میں خوشی اور جذبات محبت کا ایک سیل رواں تھا، حضور قبیلہ غفار کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”غفر الله غفارا“ پھر قبیلہ اسلم کی طرف روئے مبارک کرتے ہوئے گویا ہوئے ”اسلم سالمها الله“ اللہ تعالیٰ قبیلہ غفار کو بخشنے اور قبیلہ اسلم کو سلامت رکھے۔

(رجال حول الرسول، ص: ۴۷)

کیا کوئی گمان کر سکتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی اس عظیم خدمت پر بارگاہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے انعام نہ ملا ہو؟ انعام ملا، خوب ملا اور بڑا عظیم ملا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس پر شاہد و ناظر ہے۔

مدینہ کب حاضر ہوئے اور کب تک رہے: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے حکم سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبلغ کی حیثیت سے اپنے وطن واپس چلے گئے تھے، اپنے قبیلے میں رہ کر تبلیغ کی خدمت انجام دیتے رہے اور یہاں کافی لمبا وقت گزارا، یہاں تک کہ بدر و احد اور خندق جیسے عظیم معرکے گزر گئے، اس کے بعد آپ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے پھر مدینہ طیبہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو لازم پکڑ لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک حضور کے ساتھ رہے، حضرت ابو بکر کے وصال کے بعد ملک شام

چلے گئے اور ملک شام میں ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ خلافت حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں دوبارہ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور کچھ وجوہات کی وجہ سے (جس کا ذکر ہم آگے کریں گے) آپ مقام ربذہ (مدینہ کے پاس ایک گاؤں) چلے گئے اور یہیں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

(الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۱۱، کوثر المعانی الدراری فی کشف خبايا صحيح البخاري، ج: ۲، ص: ۱۲۴)

بعثت سے پہلے خدا کی عبادت: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جب تقریباً پورا عرب کفر و شرک کی غلاظتوں میں غرق تھا، ایسے ماحول میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی بعثت سے تین سال قبل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ وہ ایک خدائے واحد و یکتا کی عبادت اپنے انداز میں کرنے لگے تھے۔ (بعض روایات میں دو سال کا ذکر ہے) یہ خبر خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبداللہ بن صامت کو دی، اس پر حضرت عبداللہ بن صامت نے پوچھا: آپ نماز میں رخ کدھر کرتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا: جدھر اللہ تعالیٰ میرا رخ پھیر دیتا تھا۔

طبقات ابن سعد کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمانہ جاہلیت میں خدا کی عبادت کرتے، لا الہ الا اللہ پڑھتے اور بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔

(الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۵۶۳، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۸۰، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۰۹)

غزوات میں شرکت: یہ توصاف اور واضح ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدر و احد اور خندق تک تو اپنے قبیلے ہی میں موجود تھے، مدینہ طیبہ میں حاضری ہی نہیں ہوئی تھی لہذا ان غزوات میں آپ کی شرکت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، رہے اس کے بعد کے غزوات تو صرف دو غزوات میں آپ کا نمایاں ذکر ملتا ہے، ایک غزوہ حنین اور دوسرا غزوہ تبوک، ان دو غزوات کے سوا ہمیں آپ کا ذکر کہیں نمایاں نظر نہیں آیا، مگر آپ کی فطری، بہادری، جرأت اور شجاعت کا تقاضہ یہی ہے کہ آپ اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے ہوں۔ آپ کی سیرت میں مؤرخین کا یہ لکھنا کہ ہجرت کے بعد آپ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے سفر و حضر میں آپ سے جدا نہیں ہوئے یہ الفاظ بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آپ تمام غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک رہے ہوں۔ مجھے صرف ایک کتاب میں اس بات کا ذکر مل سکا کہ آپ مدینہ پہنچنے کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔

علامہ محمد بن حبان فرماتے ہیں: ”ثم هاجر الى المدينة وشهد جميع المشاهد ومات بالربذة“ پھر آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور تمام غزوات میں شریک رہے۔ (مشاہیر علماء الامصار، ج: ۱، ص: ۳۰)

حنین میں غفار کا جھنڈا: علامہ ابن عساکر تحریر فرماتے ہیں کہ جنگ حنین میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع فرمایا، صف بندی فرمائی، لوگوں کو جھنڈے عطا فرمائے، اس دن بنی غفار کے جھنڈے کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھائے ہوئے تھے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۱۸۶)

جنگ تبوک اور حضرت ابوذر غفاری: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ تبوک کے لیے نکلنا چاہتے تھے، جب یہ خبر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملی تو تیاری شروع کی، اونٹ کی جانب نظر کی تو اس کو بڑا ہی زار و زار پایا، وہ اتنی لمبی مسافت کیسے طے کر سکے گا؟ دل میں سوچا کیوں نہ اسے چند دنوں خوب چارہ کھلاؤں تاکہ یہ موٹا اور فربہ ہو جائے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملوں، منصوبے کے مطابق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سفر شروع کیا، جب مقام ذی المروہ پر پہنچے تو اونٹ کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی، تبوک کا سفر نہایت ہی گرمی کے موسم میں درپیش ہوا تھا، ایک منزل پر پڑاؤ ہوا، صحابہ کرام کا بیان ہے: ایسا لگتا تھا کہ ہم عنقریب پیاس کی شدت سے ہلاک ہو جائیں گے، لوگوں نے پانی کے لیے اپنے اونٹ ذبح کر دیے تاکہ ان کے پیٹ میں موجود پانی پی سکیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارش کی دعا کے لیے عرض کیا، رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رب کی بارگاہ میں اپنے دست ہائے

مبارک دراز فرمائے، ابھی ہاتھ نیچے بھی نہ آنے پائے تھے کہ بارش ہو گئی، لوگ سیراب ہوئے، برتن بھر لیے گئے۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو بارش صرف اتنے ہی حصہ میں ہوئی تھی جتنے میں اصحاب رسول کے لشکر کا پڑاؤ تھا، اس سے باہر ایک قطرہ بھی نہ برسا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر تبوک کی طرف جاری تھا، اس دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب لشکر میں شریک نہ ہو سکے، وہ جنگ سے پچھڑ گئے، جواب میں حضور صرف اتنا فرماتے: ”اس کا ذکر چھوڑو اگر اس کے ارادے نیک ہوں گے تو وہ عنقریب ہم سے آملے گا اور اگر معاملہ اس کے سوا ہے تو جو خدا کا حکم ہوگا وہی فیصلہ ہوگا“ پچھڑنے والوں کا ذکر ہوتے ہوتے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام بھی حضور کے سامنے پیش ہو گیا، حضور! ابوذر بھی پیچھے رہ گئے، ان کے اونٹ کی رفتار بہت سست تھی، حضور نے فرمایا: اس کے ارادے نیک ہوں گے تو عنقریب ہم سے آملے گا ورنہ جیسا خدا کا حکم۔ کیا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں اور کیا وہ مدینہ واپس لوٹ جائیں گے؟ ہرگز نہیں! حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیسے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں؟ نہ وہ منافقوں کے ساتھ مدینہ واپس جاسکتے ہیں، وہ سخت پیاسے ہیں انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ دم نکلا جا رہا ہے، پانی ساتھ نہیں مگر پیاسا مر جانا پیڑھ دکھانے سے بہتر ہے، اونٹ چلتا نہیں، انہوں نے اسے بہت ڈانٹا ڈپٹا کہ کسی طرح نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جا ملے مگر وہ ہلا بھی نہیں تو پھر اب کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ اونٹ کو چھوڑ کر سامان پشت پر رکھ کر دوڑنے لگے تاکہ غازیوں سے جا ملیں یا راہِ حق میں شہید ہو جائیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پشت پر سامان دھرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ ہوئے، گو وہ پیاس اور تھکن سے چور ہو چکے تھے مگر ان کا مؤمن دل ڈھارس بندھا رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ تنگی کے بعد کشادگی آتی ہے، لہذا آپ کا دل قوی ہو جاتا اور سختیوں کی برداشت کی طاقت پیدا ہو جاتی، آپ کمر ہمت باندھتے اور منزل مقصود کی

طرف قدم بڑھاتے جاتے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دور سے مسلمانوں کا لشکر دیکھا تو مردہ آرزوئیں بیدار ہو گئیں، وہ اپنے جسم میں ایک کپ کپی سی محسوس کرنے لگے کہ پر ہوتے تو اڑ جاتے، وہ اپنے بارے میں کسی قسم کی بدگمانی سے لوگوں کو بچانا چاہتے تھے اور بتانا چاہتے تھے کہ ابوذر کیسے واپس لوٹ سکتا ہے؟ ابوذر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا ساتھی اور رفیق ہے، وہ بھلا راہ خدا میں جہاد کرنے سے باز رہ سکتا ہے؟ ایک مسلمان نے دور سے ایک آدمی کو آتے دیکھا تو کہا: یا رسول اللہ! ایک آدمی تنہا آ رہا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کن اباذر“ اے آنے والے! ابوذر ہو جا، لوگ بغور دیکھنے لگے، جب وہ شخص قریب آیا تو پکارا اٹھے: خدا کی قسم! یہ ابوذر ہی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم (حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استقبال کے لیے) کھڑے ہو گئے۔

جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریب پہنچ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مر جا کہا اور پھر ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے، یہ تنہا چلے گا، تنہا مرے گا اور تنہا ہی روز قیامت اٹھایا جائے گا۔ ابوذر! پیچھے کیوں رہ گئے تھے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آقا سے پوری روداد سفر بیان کی، سرکار نے فرمایا: ابوذر تمہارا پیچھے رہ جانا میرے اوپر گراں تھا، اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، مجھ تک پہنچنے میں تمہارا ہر قدم ایک گناہ کو مٹانے والا تھا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا سامان اپنی پیٹھ سے اتارا، پانی طلب کیا، پانی سے اپنے آپ کو بعد میں سیراب کیا، پہلے دیدار نبی سے شوق جذبات کی پیاس بجھائی، سلام ہو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آقا پر اور حضرت ابوذر کی اس جاں نثاری پر۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۸۶، سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۵، ص: ۴۴۴، المنتظم فی تاریخ الامم والملوک، ج: ۳، ص: ۳۶۷، ابوذر غفاری مترجم، ص: ۶۶)

حضور کی نیابت: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود کسی غزوے میں تشریف لے جاتے تو کسی صحابی کو مدینہ طیبہ پر اپنا نائب اور حاکم بنا کر چھوڑ جاتے۔ تاریخ

میں ایسے کئی مواقع آئے جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ مدینہ طیبہ میں حضور کے نائب کے طور پر موجود رہے، غزوہ ذات الرقاع جو چار ہجری میں پیش آیا بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا نائب بنایا۔ غزوہ بنی مصطلق جو چھ ہجری میں واقع ہوا، اس میں بھی بعض حضرات کی رائے کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ پر مقرر فرمایا۔ ایک روایت کے اعتبار سے غزوہ خیبر کے موقع پر بھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا خلیفہ منتخب فرمایا۔ عمرۃ القضاء کے موقع پر بھی آپ کو مدینہ طیبہ پر حاکم بنایا گیا اگرچہ مذکورہ غزوات میں سے اکثر غزوات میں نیابت کے طور پر دوسرے صحابہ کے نام بھی درج ہیں لیکن اس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام بھی شامل ہے۔ واللہ اعلم۔

(سیرت ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۲۰۳-۲۸۹، امتاع الاسماع، ج: ۱، ص: ۳۰۶، و: ص: ۹، ص: ۲۲۷)

غزوہ غابہ اور ابوذر: محقق علی الاطلاق علامہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ غزوہ ذی قرد جس کو غزوہ غابہ بھی کہتے ہیں، غابہ دراصل ایک جنگل ہے اس غزوے کا وقوع حدیبیہ سے پہلے (چھ ہجری) ہے، اس غزوے کے وقوع کا سبب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس ایسی دودھ والی اونٹنیاں جو بچہ جننے کے قریب تھیں، وہ غابہ میں چرتی تھیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں رہتے تھے، اتفاق سے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چند دن کے لیے وہاں سے چلے آئیں، انہوں نے حضور سے اجازت چاہی باوجود اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہ دی تھی، انہوں نے منت و سماجت میں اصرار و مبالغہ کیا تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دے دیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں غطفان سے مطمئن نہیں ہوں، مبادا کہ وہ تم پر حملہ آور ہوں، یہ فرما کر اجازت دے دی، مزید فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ گویا غطفان تم پر حملہ آور ہیں اور

انہوں نے تمہارے بیٹے کو شہید کر دیا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے حال پر تعجب ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرماتے ہیں اور میں اصرار کرتا رہا، بالآخر وہی ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، یہ واقعہ عجیب ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسا واقعہ ہوا، باوجودیکہ وہ جلیل القدر صحابی ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا کی طلب کے ہمیشہ خواستگار رہے ہیں اور ان سے اس معاملے میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم توقف فرما رہے تھے، اصرار و مبالغہ سرزد ہو گیا، تقدیر الہی یہی تھی۔ القصہ عیینہ حصین فزاری چالیس کافروں کے ساتھ حملہ آور ہوا اونٹوں کو لوٹ کر لے گیا اور ان کے دونوں چرواہوں کو شہید کر کے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے کو بھی شہید کر دیا۔ (مدارج النبوة مترجم، ج: ۲، ص: ۲۳۳)

فتح بیت المقدس: فاروق اعظم کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا، اس وقت آپ وہاں حضرت عمر کے ساتھ موجود تھے۔ فتح مصر میں بھی آپ شریک رہے۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۷، حسن المحاضرہ، ج: ۱، ص: ۲۳۵)

علم و فضل: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے حاضر باش تھے، اصحاب صفہ میں ہونے کے ناطے زیادہ تر وقت مسجد نبوی شریف میں گزرتا، خادم نبی ہونے کا شرف بھی آپ کو حاصل تھا اس لیے حاضری کے خوب مواقع میسر آتے، حضرت اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے اور جب خدمت سے فراغت حاصل ہوتی تو مسجد میں آ جاتے، گویا یہی انکا گھر تھا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۱۶۲۳)

علمی تشنگی بجھانے کے لیے حضور کی بارگاہ میں کثرت سے سوال کرتے تھے جیسا کہ ان کی روایات سے ثابت ہے لہذا صحبت و خدمت اور بارگاہ رسالت میں حاضر باشی اور وقت گزاری نے اکتساب فیض کے خوب مواقع فراہم کیے، اخاذ طبیعت نے سوال کر کر کے علم کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتے ہوئے خوب خوب علمی جواہر پاروں کی دستیابی کی۔

صحابہ کرام کے درمیان ان کا صاحب علم ہونا مشہور و معروف تھا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ابوذر نے وہ علم حاصل کیا، جس سے لوگ عاجز رہ گئے پھر علم کے تھیلے کے منہ کو ایسا بند کر دیا کہ اس سے کچھ بھی ضائع نہ ہوا۔ حضرت ابو داؤد نے کہا: ”ابوذر غفاری علم و فضل میں عبد اللہ بن مسعود کے مساوی تھے“ (ابن مسعود کے علم و فضل کے لیے جلد اول کا مطالعہ کریں) (تاریخ اسلام، ج: ۳، ص: ۴۰۶)

اصحاب رسول کے مفتی: آپ کے علم کی یہ بھی ایک ممتاز شان تھی کہ آپ دور صحابہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے، آپ نے حضرت ابو بکر صدیق، فاروق اعظم اور حضرت عثمان غنی تینوں خلفاء کے دور میں فتاویٰ جاری کیے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۶)

مرویات کی تعداد: آپ کی مرویات کی تعداد دو سو اکیاسی ہے، جن میں سے بارہ احادیث متفق علیہ ہیں، دو حدیث میں امام بخاری اور ۱۹/۱ احادیث میں حضرت امام مسلم منفرد ہیں، آپ سے حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت انس، حضرت احنف، حضرت ابو عثمان نہدی اور ان کے علاوہ خلق کثیر نے روایت کی ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال، ج: ۱، ص: ۴۴۹، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۵)

احادیث مرویہ کی یہ تعداد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حاضر باشی اور معیار علم کے اعتبار سے کافی کم ہے، اس کی دو بڑی وجہ ہیں ایک تو یہ کہ بعض صحابہ کرام احادیث بیان کرنے میں بڑی احتیاط فرماتے تھے، دوسرے یہ کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تارک الدنیا شخص تھے، لوگوں سے اختلاط و ملنا جلنا بہت کم کرتے تھے، اس لیے سینے میں موجود علم کے سمندر کا تعلق ندی اور نہروں سے کم ہو سکا، نتیجہً وہ آپ کے ساتھ ہی چلا گیا، ورنہ جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلم اور حصول علم کا سوال ہے تو خود فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں چھوڑا کہ آسمان میں پھڑ پھڑاتے پرندے سے متعلق بھی ہمیں علم عطا فرما دیا۔ اور فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی

اللہ علیہ وسلم سے ہر چیز کے بارے میں پوچھ لیا یہاں تک کہ نماز میں کنکریاں ہٹانے کے بارے میں بھی سوال کر لیا تو حضور نے فرمایا: (اگر ضروری ہو تو ایک بار ہٹالو)۔

(تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۸۷)

جس شخص نے ایسا فیض صحبت پایا ہو، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کیا نہ سنا ہوگا، مگر خدائے تعالیٰ نے جتنا چاہا وہ بیان کر گئے باقی ان کے ساتھ چلا گیا۔

تربیت مصطفیٰ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زہد اور ترک دنیا میں اپنے تمام صحابہ سے ممتاز فرمانا چاہتے تھے، اس لیے وقت و وقت پر انمول نصیحتیں فرمائیں کہ ابوذر غفاری کی ذات ان پر عمل کر کے مجموعہ محاسن بن جائے اور زاہدین میں ان کا مقام ممتاز اور مثالی ہو جائے، اس سلسلے میں ہم چند تربیتی نمونے پیش کر رہے ہیں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوذر! ایک بیعت کرو گے؟ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت نصیب فرمائے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: جی ہاں، اور اپنا ہاتھ حضور کی طرف پھیلا دیا، حضور نے مجھ سے اس بات پر بیعت لی کہ میں لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کروں گا، حضور نے فرمایا: اے ابوذر! کسی شخص سے سوال مت کرنا یہاں تک کہ تمہارا کوڑا اگر ہاتھ سے گر جائے تو سواری سے اتر کر خود اٹھا لیں۔ (کسی سے اٹھا کر دینے کا سوال نہیں کرنا) (مسند احمد، حدیث: ۲۱۵۰۹)

(۲) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ مقدسہ کے سایے میں بیٹھ کر فرما رہے تھے ”رب کعبہ کی قسم! وہ لوگ زیادہ گھائے میں ہیں، رب کعبہ کی قسم! وہ لوگ زیادہ گھائے میں ہیں“ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے دل میں سوچا میرا حال کیا ہے؟ (کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ میں کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو مجھے خسارے میں ڈالنے والی ہے یا میرے متعلق قرآن میں کچھ نازل ہوا ہے) کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے متعلق کوئی چیز دکھائی جا رہی ہے، میرا کیا حال ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ پھر میں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور آپ وہی فرما رہے تھے، اب مجھ میں خاموش رہنے کی طاقت نہ رہی، اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا مجھ پر یہ حالت چھائی رہی، پھر میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ نے فرمایا: وہ لوگ یہی ہیں جن کے پاس مال بہت زیادہ ہو، سوائے ان کے جنہوں نے اس مال کو اس طرح اور اس طرح اور اس طرح خرچ کیا۔ (یعنی جس نے اپنے مال کو بے دریغ مستحقین میں دائیں بائیں آگے پیچھے خرچ کیا)۔ (بخاری، کتاب الایمان والند و رباب کیف کانت یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مسلم، حدیث نمبر: ۹۹۰)

(۳) شام کا وقت تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی سیاہ پتھریلی زمین پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لیے جا رہے تھے، سامنے احد پہاڑ دکھائی دے رہا تھا، آپ نے فرمایا: اے ابوذر! میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو اور اس کے اوپر ایک رات یا تین راتیں گزر جائیں، سوائے ایک دینار کے جس کو میں قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ چھوڑوں مگر میں اللہ کے بندوں سے کہتا ہوں کہ اس طرح اور اس طرح اور اس طرح کریں۔ (مستحقین پر خرچ کریں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے بتایا، پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر! میں نے کہا: ”لبیک وسعدیک یا رسول اللہ“ (حاضر ہوں) آپ نے فرمایا: جو دنیا میں زیادہ مال دار ہیں وہ آخرت میں کم (ثواب والے) ہوں گے، مگر جو اس طرح دے۔ (بخاری شریف، حدیث: ۶۲۶۸)

(۴) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مسجد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، آپ نے فرمایا: اے ابوذر! مسجد میں دیکھو، تمہاری نظر میں رتبے کے اعتبار سے سب سے بلند تر آدمی کون ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ایک شخص (عمدہ) جوڑا پہنے بیٹھا ہوا ہے، اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: حضور یہ ہے، سرکار نے فرمایا: اب یہ دیکھو کہ ان میں سب سے کمتر کون ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے مسکین

شخص کی طرف اشارہ کیا جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے مسجد میں بیٹھا تھا، میرا جواب سن کر حضور نے فرمایا: قیامت کے دن یہ پھٹے پرانے کپڑوں والا اس جیسے عمدہ کپڑے والوں سے (نیکیوں کے وزن میں) زمین بھر زیادہ ہوگا۔

(موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان، حدیث نمبر: ۲۵۶۴، صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۶۸۱)

پیش کردہ احادیث کے ذریعے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ کس طرح معلم کائنات نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تربیت فرمائی کہ ان کے سینے میں حب مال یا مال کے ذخائر جمع کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

نصیحتیں جس نے دنیا بدل دی: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گاہے بگاہے تربیت فرماتے رہتے اور ان پر نصیحت ارزانی فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کی گئی چند نصیحتوں کا بیان حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے الفاظ میں یوں فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے چھ چیزوں کی نصیحت فرمائی:

- (۱) مسکینوں سے محبت کرنا۔
 - (۲) (دنیاوی اعتبار سے) اپنے سے کم درجے والے کو دیکھنا بلند درجے والے کی طرف نظر نہ کرنا۔
 - (۳) حق بات کہنا اگرچہ کڑوی ہو۔
 - (۴) اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی کی ملامت کا خوف نہ رکھنا۔
 - (۵) رشتہ داروں سے رشتہ داری نبھانا۔
 - (۶) لا حول ولا قوۃ الا باللہ کا وظیفہ کرنا۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۵۸، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۸۷، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۰)
- مزید فرماتے ہیں کہ مجھے میرے محبوب نے تین چیزوں کی خاص وصیت فرمائی، میں ان شاء اللہ ان کو کبھی نہ چھوڑوں گا:

(۱) مجھے چاشت کی نماز پڑھنے کی وصیت فرمائی۔

(۲) سونے کے بعد وتر پڑھنے کی وصیت فرمائی۔

(۳) ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھنے کی وصیت فرمائی۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۱۵۱۸)

قوت لایموت پر گزارا: یہ تعلیمات مصطفیٰ کا اثر اور تادیبی کلمات کا نتیجہ تھا کہ آپ دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ کش رہتے، خود دنیا کمانے کے لیے تگ و دو تو کیا کرتے اگر کوئی صاحب تحفہ بھی پیش کرنا چاہتے تو قبول نہ فرماتے، چنانچہ سیدنا ابوبکر بن منکدر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: ملک شام کے گورنر حضرت حبیب بن مسلمہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں تین سو، دینار ہدیہ بھیجے اور کہا: ان سے اپنی گزر بسر کریں، آپ نے وہ دینار یہ کہتے ہوئے واپس کر دیے، اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں دھوکہ کرنے کے لیے اسے میرے سوا کوئی اور نہ مل سکا؟ ہمیں تو زندگی گزارنے کے لیے تھوڑا سا یہ، کچھ بکریاں، ایک باندی جو ہماری خدمت کر سکے، کافی ہے، اس سے زیادہ سے ڈر لگتا ہے۔

ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ جس میں ملک شام سے حارث نامی شخص نے آپ کے لیے تین سو، دینار ہدیہ بھیجے، جب اسے اس بات کا پتہ چلا کہ آپ تنگدستی میں مبتلا ہیں، آپ نے کہا: اسے میرے علاوہ کوئی اور نہ ملا اور دینار واپس کر دیے، مزید فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھا ہے جس کے پاس چالیس دینار ہوں وہ اس کے باوجود بھی سوال کرتا ہے تو اس نے اصرار کے ساتھ مانگا، آل ابی ذر کے پاس چالیس درہم، چالیس بکریاں اور ایک نوکرانی ہے۔ (حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۱، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۸)

تارک الدنیا ابوذر: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ غور کرنے پر دو گروہ میں منقسم دکھائی دیتے ہیں، ایک گروہ وہ ہے جو دین کو سلامت رکھتے ہوئے دنیا کی نعمتوں سے بھی متمتع ہوتا رہا، دوسرا گروہ وہ ہے جس کی نظر میں دنیا کی کوئی وقعت نہ بچی تھی اور دنیا کو انہوں نے بغرض آخرت ٹھوکر مار دی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام دوسرے گروہ میں شمار ہوتا ہے، وہ اس گروہ کے ایک فرد ہی نہیں بلکہ اس جماعت کے امام و

پیشوا اور میر کارواں ہیں، وہ اپنی پارسائی، حق گوئی، مخلوق سے دوری، توکل علی اللہ، زہد و تقویٰ، قناعت، استغنا اور استقامت میں تمام صحابہ کے درمیان ممتاز تھے، وہ اپنے آپ کو انہیں صفات اور احوال پر باقی رکھنا چاہتے تھے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چھوڑ گئے تھے، اس میں وہ کسی بھی تبدیلی کے روادار نہ تھے، انہیں یہ طریقہ صرف پسند ہی نہ تھا بلکہ وہ اس کو اپنی آخرت کی عظیم پونجی تصور کرتے اور اس کو نعمت الہی کے طور پر لوگوں کے سامنے بیان بھی فرماتے، چنانچہ ان کا ارشاد ہے:

اے لوگو! ہر روز قیامت میں تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب رہوں گا، اس لیے کہ میں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے ”قیامت کے دن میرے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو دنیا سے اس طور پر رخصت ہوگا جیسا میں اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں“ پھر فرمایا: ”میرے سوا تم میں سے ہر ایک شخص کسی نہ کسی دنیوی چیز سے وابستہ ہے۔“ (حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۲، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۲، الزہد للامام احمد، ص: ۱۲۱)

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی نے مجھ سے کہا کہ آپ ایسی جائیداد کیوں نہیں بناتے جیسی فلاں فلاں صاحب نے بنا رکھی ہے؟ تو میں نے جواب دیا: میں امیر بننے کا کام نہیں کرتا میرے لیے ہر دن پینے کے لیے پانی یا دودھ کی کچھ مقدار اور ہفتے بھر میں گیہوں کا ایک قفیز (ایک پیمانہ) کافی ہے۔

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی پاک صاحب لولاک سیاح افلاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں میری خوراک صرف ایک صاع تھی اور اب میں ساری زندگی اس مقدار پر اضا فہ نہیں کروں گا۔

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ”ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! تم نیک انسان ہو، عنقریب میرے بعد تمہیں آزمائش آئے گی، میں نے عرض کی: کیا یہ آزمائش راہ خدا میں آئے گی؟ ارشاد فرمایا: ہاں! تو میں نے عرض کیا: میں رضائے الہی میں

آنے والی ہر آزمائش کو مرحبا کہتا ہوں۔“

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنو امیہ نے مجھے قتل اور فقر کی دھم کیاں دیں حالانکہ مجھے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے اور ناداری مالداری سے زیادہ پسند ہے، اس پر کسی نے کہا: اے ابوذر! کیا بات ہے؟ جب بھی آپ کسی قوم کے پاس بیٹھے ہیں تو وہ آپ کو چھوڑ کر اٹھ جاتے ہیں، فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان کو مال جمع کرنے سے منع کرتا ہوں۔

آگ کا انگارہ: حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل محبوب رب جلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا کہ جو بھی سونا چاندی جمع کرے گا یہ اس کے لیے آگ کا انگارہ ہوگا مگر یہ کہ اسے راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے۔

(حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۲، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۰)

اچھے مکانات سے بیزاری: حضرت ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت سیدنا ابوذر داء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزرے جو اپنا گھر تعمیر کروا رہے تھے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم پتھروں کو لوگوں کی پشت پر اٹھا رہے ہو، انہوں نے کہا: میں اپنے لیے گھر بنوا رہا ہوں، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر وہی بات کہی، انہوں نے جواب دیا: اے میرے بھائی! شاید آپ اس کام کو اچھا نہیں سمجھتے؟ فرمایا: تمہارا اپنے گھر والوں کی گندگی میں ہونا مجھے تمہاری اس حالت سے زیادہ پسند ہے جس میں، میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ لوگ مرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، ویران کرنے کے لیے مکان تعمیر کرواتے ہیں، فنا ہونے والی چیز کی حرص رکھتے ہیں اور باقی رہنے والی (آخرت کو) بھلا دیتے ہیں سنو موت اور غربت کتنی اچھی ہیں حالانکہ لوگ انہیں ناپسند جانتے ہیں۔

(الزہد، ص: ۱۲۰، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۳، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۱)

حساب کا ڈر: حضرت سیدنا ابو شعبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہو کر کچھ مال پیش کیا، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے پاس دودھ کے لیے بکری سواری کے لیے گدھا اور خدمت کے لیے بیوی ہے اور ایک چادر ضرورت سے زائد ہے اور میں اس کی وجہ سے خوفزدہ ہوں کہ کہیں مجھ سے اس کا حساب نہ لے لیا جائے۔

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم پر ایک ایسا زمانہ ضرور آئے گا کہ مالدار پر اس طرح رشک کیا جائے گا جس طرح آج عاشر (صدقہ وصول کرنے والے) پر کیا جاتا ہے۔ (حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۳، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۲)

ہر مال میں تین حصے دار ہیں: حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مال میں تین حصے دار ہوتے ہیں:

(۱) تقدیر یہ وہ حصہ دار ہے جسے بھلائی اور برائی (مال یا تجھے ہلاک کرنے) میں تیری اجازت کی حاجت نہیں۔

(۲) دوسرا حصہ دار تیرا وارث اسے اس بات کا انتظار ہے کہ تو مرے اور یہ تیرے مال پر قبضہ کر لے اور

(۳) تیسرا حصہ دار تو خود ہے مذمت کیا ہوا یقیناً تم ان دونوں حصے داروں کو عاجز نہیں کر سکتے لہذا اپنا مال راہ خدا میں خرچ کر دو۔

بیشک اللہ تعالیٰ کا فرمان عالیشان ہے: ”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ“ اس آیت کریمہ کی تلاوت کرنے کے بعد آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اونٹوں کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے ”مجھے میرے مال میں یہ اونٹ سب سے بڑھ کر پسند ہیں اس لیے میں انہیں خیرات کر کے اپنے لیے آخرت میں ذخیرہ کرنا پسند کرتا ہوں“۔

(حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۳، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۲)

علوم میں برتری اور خوف خدا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتوں اور تربیتی

مجلسوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ذاتِ مصطفیٰ کا آئینہ بنادیا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سن رکھا تھا، بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو گے کم، روؤ گے زیادہ، عورتوں سے دور ہو جاؤ گے اور جنگلوں میں نکل جاؤ گے۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۱۹۰)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضور کے رنگ میں رنگ گئے تھے چنانچہ فرماتے تھے: خدا کی قسم! جو میں جانتا ہوں اگر وہ تم جان لو تو تم روؤ گے زیادہ اور ہنسو گے کم، تم اپنی بیویوں سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دو گے، تمہیں اپنے بستروں پر قرار نہ ہوگا، تم جنگلوں کی جانب نکل جاؤ گے چیختے روتے۔ اے کاش! مجھے خدا نے درخت بنادیا ہوتا جسے کاٹ لیا جاتا اور پھل کھا لیا جاتا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، ج: ۷، ص: ۱۲۳، حدیث نمبر: ۳۶۸۲، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۴)

فکر آخرت: کسی شخص کے بارے میں عموماً اس کی اہلیہ اس کے احوال سے زیادہ خبردار اور واقف کار ہوتی ہے، کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص گھر کے باہر تو پارسائی اور خدا ترسی میں مشہور ہوتا ہے لیکن گھر والوں کی نظر میں اس حیثیت سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور یہ وہیں ہوتا ہے جہاں ظاہر و باطن دو متضاد حقیقتیں ہوتی ہیں لیکن جس کا باطن ظاہر سے زیادہ صاف و شفاف ہو وہاں ایسے خیالات کی گنجائش کہاں؟

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوفِ خدا کی اس منزل پر فائز تھے کہ جہاں باطن ظاہر سے زیادہ خوف زدہ ہوتا ہے، چنانچہ ایک شخص بصرہ سے چلتا ہے کہ وہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عبادت و ریاضت کے سلسلے میں ان کی اہلیہ سے کچھ معلوم کرے، یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ وصال فرما چکے تھے۔ آنے والے نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ ام ذر سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عبادت و ریاضت سے متعلق دریافت کیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دیا: ”ان کا پورا دن ایک کونے میں آخرت کی فکر میں گزرتا تھا“۔ (صفۃ الصفوة، ج: ۱، ص: ۵۹۱)

کعبہ میں خطابت و نصیحت: حضرت سیدنا سفیان ثوری علیہ الرحمۃ والرضوان سے مروی ہے کہ حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا: اے لوگو! میں جندب غفاری ہوں، اپنے شفقت و نصیحت کرنے والے بھائی کے پاس جمع ہو جاؤ، سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی سفر پر جاتا ہے تو کیا وہ زادراہ (سفر میں کام آنے والے ضروری سامان) ساتھ نہیں لیتا؟ جس سے ضروریات پوری ہوں اور اپنی منزل تک پہنچ سکے، لوگوں نے عرض کی: کیوں نہیں؟ فرمایا: تو سنو قیامت کا سفر سب سے طویل ہے، اس کے لیے خوب زادراہ تیار کرو جو تمہارے کام آ سکے، حاضرین نے پوچھا: وہ کیا ہے جو اس میں ہمارے کام آئے؟ فرمایا: بڑے بڑے دشوار کاموں کو آسان کرنے کے لیے حج کرو، روز قیامت کی گرمی و تپش سے حفاظت کے لیے سخت گرمی کے دنوں میں بھی روزے رکھو، قبر کی وحشت و گھبراہٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے رات کی تاریکی میں نماز ادا کیا کرو، حساب کے دن پیشی کے لیے اچھی بات کہو اور بری سے باز رہو، قیامت کی سختیوں سے بچنے کے لیے اپنا مال صدقہ کرو۔ دنیا میں صرف دو قسم کی محفل اختیار کرو، ایک وہ جو طلب آخرت کے لیے ہو اور دوسری وہ جو طلب حلال کے لیے ہو، اور ان کے علاوہ کوئی تیسری محفل اختیار نہ کرنا کہ اس میں تمہارے لیے کوئی نفع نہیں بلکہ وہ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی، اسی طرح اپنے مال کو بھی دو حصوں میں بانٹ لو ایک حصہ اہل و عیال پر خرچ کرو اور دوسرا راہ خدا میں خرچ کر کے اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کر لو، ان کے علاوہ کوئی تیسرا حصہ مت بناؤ کہ اس میں سراسر نقصان ہے فائدہ کچھ نہیں، اس کے بعد آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلند آواز سے فرمایا: لوگو! حرص سے بچو کہ اس میں تمہارے لیے ہلاکت ہے کیونکہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی تم اسے پورا کر سکتے ہو۔ (حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۵، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۵، صفحہ

الصفوۃ، ج: ۱، ص: ۵۹۲)

ایک آیت کا وظیفہ: حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں

کہ سرکارِ والا تبار ہم بے کسوں کے مددگار شفیع روز شمار صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت بار بار پڑھتے اور مجھے سناتے ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۖ وَيُزِدْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ“ اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے نجات کی راہ نکال دے گا اور اسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو۔ (سورہ طلاق، آیت: ۲)

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ شہنشاہِ مدینہ قر اقلب و سیدہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! ایک ایسی آیت ہے کہ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہ انہیں کفایت کرے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے بار بار اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۖ وَيُزِدْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ“ اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے نجات کی راہ نکال دے گا اور اسے وہاں سے روزی دے گا جہاں اس کا گمان نہ ہو۔

(حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۶، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۶)

ابوذر کے سوالات رحمتِ عالم کے جوابات: ہم یہ بات لکھ آئے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں طلبِ علم کے لیے کثرت سے سوال عرض کیا کرتے تھے، جو موقع بھی تعلیم و تعلم کا میسر آتا اس کو ضائع نہیں کرتے، ایک دن حسین موقع میسر آیا دل کھول کر حضور سے سوالات کیے۔ گو سوالات و جوابات کا سلسلہ خاصا طویل ہے لیکن علمی جواہر پاروں کا ایک خزانہ ہے اس لیے ہم اس کو مکمل طور پر حلیۃ الاولیاء اور اس کے ترجمے اللہ والوں کی باتوں سے نقل کر رہے ہیں:

حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو حضور نبی رحمت شفیع امت صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف فرما تھے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھ گیا تو ارشاد فرمایا: ابوذر! دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کر لو، فرماتے ہیں: میں وہاں سے اٹھا، نماز ادا کی اور پھر خدمتِ بابرکت میں حاضر ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے مجھے نماز پڑھنے کا حکم دیا، یہ ارشاد فرمائیں کہ نماز کیا ہے؟ ارشاد

فرمایا: نماز کم ہو یا زیادہ اس میں خیر ہی خیر ہے، میں نے عرض کی: افضل ترین عمل کونسا ہے؟ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، میں نے عرض کی: ایمان میں کامل کون ہے؟ ارشاد فرمایا: سب سے اچھے اخلاق والا، میں نے عرض کیا: اسلام میں کامل کون ہے؟ ارشاد فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں، میں نے عرض کی: افضل ترین ہجرت کونسی ہے؟ ارشاد فرمایا: گناہوں کو ترک کر دینا، میں نے عرض کی: افضل نماز کون سی ہے؟ ارشاد فرمایا: جس میں قیام طویل ہو۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! روزوں کے بارے میں ارشاد فرمائیے، ارشاد فرمایا: روزے فرض ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وہاں اس کا اجر کئی گنا ہے، میں نے عرض کی: افضل جہاد کونسا ہے؟ ارشاد فرمایا: جس میں گھوڑے کے پاؤں کٹ جائیں اور اس کا خون بہ جائے، میں نے عرض کی: کیسا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ ارشاد فرمایا: جو قیمتی اور مالک کو پسند ہو، میں نے عرض کی: افضل صدقہ کونسا ہے؟ ارشاد فرمایا: مال کم ہونے کی صورت میں بھی فقیر کی حاجت روائی کرنا، میں نے عرض کی: قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت کونسی ہے؟ ارشاد فرمایا: آیت الکرسی، فرمایا: ابوذر! کرسی اور ساتوں آسمان کی حیثیت میدان میں بڑی انگوٹھی کی مانند ہے اور عرش کی فضیلت کرسی پر ایسی ہے جیسی میدان کی فضیلت انگوٹھی پر، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد کتنی ہے؟ ارشاد فرمایا: کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰)۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے کتنے رسول مبعوث فرمائے؟ ارشاد فرمایا: تین سو تیرہ کا جم غفیر، میں نے عرض کی: یہ کثرت تو اچھی ہے پھر عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پہلے نبی کون ہیں؟ ارشاد فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا وہ نبی مرسل ہیں؟ ارشاد فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں اپنی طرف کی روح پھونکی پھر سب سے پہلے انہیں ٹھیک (سالم الاعضاء) بنایا۔

حضرت سیدنا احمد بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے پھر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابو ذر! چار نبی سریانی ہیں، حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت خنوخ اور وہ ادریس علیہم السلام ہیں اور یہ پہلے انبیاء ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا ہے اور نوح علیہ السلام اور چار نبی عربی ہیں، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام اور اے ابو ذر! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں، ارشاد فرمایا: سو صحیفے اور چار کتابیں، پچاس صحیفے حضرت شیث علیہ السلام پر، تیس صحیفے حضرت ادریس علیہ السلام پر، دس صحیفے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور دس صحیفے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تو رات سے پہلے نازل کیے، اس کے علاوہ تو رات، انجیل، زبور اور قرآن حکیم نازل فرمایا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ ارشاد فرمایا: وہ سب عبرت و نصیحت پر مشتمل تھے، اس میں تھا کہ اے دنیا کے دھوکے میں مبتلا بادشاہ! ہم نے تمہیں دنیا اکٹھی کرنے نہیں بھیجا بلکہ تمہیں مظلوم کی حاجت روائی کرنے کے لیے بھیجا ہے، کیوں کہ میں مظلوم کی دعاؤں نہیں کرتا اگرچہ کافر ہو، اس میں یہ بھی تھا کہ عقلمند کو چاہیے کہ جب تک اس کی عقل مغلوب نہ ہو اپنے وقت کو اس طرح تقسیم کرے کہ ایک گھڑی اپنے پروردگار عزوجل سے مناجات کرے، ایک گھڑی اپنا محاسبہ کرے، ایک میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور و فکر کرے اور ایک گھڑی کھانے پینے کے لیے چھوڑ رکھے، عقلمند صرف تین چیزوں کے لیے سفر کرتا ہے آخرت بنانے، روزی کمانے یا حلال چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے، عقلمند پر لازم ہے کہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف اس کے معاملات سے آگاہ ہو اور اپنی زبان کی حفاظت کرے، باتیں کرنے کے بجائے کام کرے اور اس کا کلام فضول باتوں پر مشتمل نہ ہو۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ ارشاد فرمایا: ان تمام میں عبرت کا بیان تھا کہ تعجب ہے اس پر جو موت کا

یقین رکھتا ہے پھر بھی خوش ہوتا ہے، تعجب ہے اس پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے پھر بھی رزق کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، تعجب ہے اس پر جو دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہے پھر بھی اسے قبول کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور تعجب ہے اس پر جسے یقین ہے کہ کل اسے حساب دینا ہے پھر بھی نیک اعمال نہیں کرتا۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمائیے۔
ارشاد فرمایا: میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں کیوں کہ تقویٰ تمام اچھے اعمال کی بنیاد ہے۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید ارشاد فرمائیے۔
ارشاد فرمایا: قرآن مجید کی تلاوت اپنے اوپر لازم کر لو کہ یہ زمین میں تمہارے لیے نور اور آسمانوں میں تمہارے تذکرے کا باعث ہے۔

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید ارشاد فرمائیے۔
ارشاد فرمایا: زیادہ ہنسنے سے بچو کیونکہ اس سے دل مردہ اور چہرہ افسردہ ہو جاتا ہے۔
میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! مزید ارشاد فرمائیے۔
فرمایا: اچھی بات کے سوا کچھ نہ کہو، شیطان تم سے دور بھاگے گا اور نیکیوں میں مدد ملے گی۔
میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید ارشاد فرمائیے۔
ارشاد فرمایا: جہاد کو لازم پکڑ لو یہ میری امت کی رہبانیت ہے۔
میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید ارشاد فرمائے۔
فرمایا: غریبوں سے محبت اور ان کی صحبت اختیار کیا کرو۔
میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید ارشاد فرمائیے۔

ارشاد فرمایا: (دنیاوی معاملات میں) اپنے سے کم درجے والوں کو دیکھو بلند درجے والوں (اپنے سے زیادہ مالداروں) کی طرف نہ دیکھو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی کمی کا احساس ہو۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید نصیحت فرمائیے، ارشاد

فرمایا: اپنے رشتے داروں سے صلہ رحمی کرو اگرچہ وہ تم سے قطع تعلقی کر لیں، مزید فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی کی ملامت سے نہ ڈرو اور حق بات کہو اگرچہ کڑوی ہو۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مزید کچھ ارشاد فرمائیے، ارشاد فرمایا: دوسروں کی ان خامیوں پر اعتراض نہ کرو جو تمہارے اندر پائی جاتی ہیں اور ان کاموں پر غصہ نہ کرو جنہیں تم خود بھی کرتے ہو اور کسی کی غیبت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ تم اس کے بارے میں ایسی بات کہو جسے اپنے لیے برا جانتے ہو۔ حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست اقدس میرے سینے پر مار کر فرمایا: اے ابوذر! کفایت شعاری سے بڑھ کر کوئی عقل مندی نہیں، گناہوں کو چھوڑنے سے بڑھ کر کوئی تقویٰ و پرہیزگاری نہیں اور حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی شرافت نہیں۔ (حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۶، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۱۶)

انسان بھی شیطان ہوتا ہے: مسند احمد کی روایت میں کچھ سوالات الگ ہیں، اس روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: اے ابوذر! جن و انس کے شیاطین سے اللہ کی پناہ مانگو، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ تو حضور نے فرمایا: ہاں! انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۵۴۶)

جذبہ ایثار: عطا بیان کرتے ہیں میں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک معمولی دھاری دار چادر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ تو کہا: اے ابوذر! کیا آپ کے پاس اس کے سوا کوئی کپڑا نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر میرے پاس اس کے سوا کپڑا ہوتا تو تم مجھے پہنے ہوئے دیکھتے، میں نے کہا: چند دن پہلے میں نے آپ کو دو کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بات تو تمہاری صحیح ہے لیکن میں نے وہ کپڑے ایسے شخص کو دے دیے جنہیں ان کپڑوں کی مجھ سے زیادہ ضرورت تھی، میں نے کہا: خدا کی قسم! آپ کو خود اس کی ضرورت تھی، آپ نے (غصے میں) فرمایا: اللہ تمہیں

معاف فرمائے، تم نے دنیا کو عظیم جانا ہے (مجھے اس سے زیادہ ضرورت نہ تھی) کیا تمہیں میرے اوپر یہ چادر دکھائی نہیں دیتی؟ مسجد جانے کے لیے میرے پاس ایک اور چادر بھی ہے، میرے پاس دودھ کے لیے بکریاں، بوجھ اٹھانے کے لیے سواریاں اور کھانا پکانے کے لیے خادم ہے تو جو نعمتیں ہمارے پاس ہیں اس سے زیادہ بہتر اور کیا چاہیے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۴)

شرف خدمت اور غیب کی خبر: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عزت افزائی متعدد انعامات کے ذریعے فرمائی، انہیں انعامات میں سے ایک خدمت کا موقع نصیب فرمانا بھی ہے، ایک دن کی بات ہے کہ خدمت سے فارغ ہو کر آرام فرمانے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور غیب کی ایک عظیم خبر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنائی، آپ خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی سنیے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا جب خدمت سے فارغ ہو جاتا تو مسجد نبوی میں آ کر لیٹ جاتا، ایک دن کی بات ہے میں مسجد میں سو رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے قدم اقدس سے جگایا تو میں اٹھ بیٹھا، آپ نے فرمایا: ابوذر! یہاں سو رہے ہو، میں نے عرض کیا: حضور اور کہاں سوؤں؟ اس کے سوا میرا اور گھر کہاں ہے؟ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے کر بیٹھ گئے، فرمایا: ابوذر! اس وقت کیا کرو گے جب لوگ تمہیں یہاں سے نکال دیں گے؟ عرض کیا: تو میں ملک شام چلا جاؤں گا، ملک شام ہجرت کی سرزمین ہے، میدان محشر بھی ہے اور ارض انبیاء بھی ہے، میں بھی وہاں کا باشندہ ہو جاؤں گا، ابوذر! اس وقت کیا کرو گے؟ جب لوگ تمہیں ملک شام سے بھی نکال دیں گے، حضور! میں پھر مسجد نبوی میں حاضر ہو جاؤں گا پھر یہی میرا ٹھکانہ ہوگا، ابوذر! اس وقت کیا کرو گے جب لوگ تمہیں یہاں سے دوبارہ نکال دیں گے؟ حضور! اس وقت میں اپنی تلوار اٹھا کر ان لوگوں سے قتال کروں گا یہاں تک کہ شہید ہو جاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ

وسلم مسکرائے اپنا ہاتھ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رکھا، دوسری روایت میں حضور نے تین مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے دعا فرمائی ”اللہ تعالیٰ ابوذر کی مغفرت فرمائے“ حضور نے فرمایا: کیا میں اس سے بہتر چیز نہ بتا دوں؟ عرض کیا: ضرور یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ان لوگوں کی اطاعت کرنا وہ جیسا کہیں ویسا کرنا۔ دوسری روایت میں ہے جو بھی حاکم ہوا گرچہ وہ ایک حبشی غلام ہو اس کی نافرمانی مت کرنا وہ جدھر کا حکم کرے ادھر چلے جانا۔

(مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۵۸۸، ۲۱۲۹۱)

یہ غیبی خبر تھی جو ایک نہیں کئی چیزوں پر مشتمل تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنے والی زندگی میں خبر کی تصدیق ہوگئی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ چھوڑ کر شام پھر شام سے مدینہ اور مدینہ طیبہ سے ربذہ جانا پڑا، جس کی تفصیل عنقریب ان شاء اللہ آپ ملاحظہ کریں گے۔

محرم راز ابوذر: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند فرمایا، خدمت کا موقع عطا فرمایا اور پھر اپنا محرم راز بھی بنا لیا، اللہ ہی بہتر جانے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے اسرار کے رازدار تھے لیکن یہ بات واقعی ہے کہ ان کے سینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز موجود تھے، امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا: میں آپ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی معاملے سے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں ارشاد فرمایا: تم جس معاملے سے متعلق سوال کرنا چاہتے ہو اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راز ہوگا تو میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۲۴۳)

اس واقعے سے دو چیزیں خاص معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محرم راز تھے، دوسری یہ کہ آپ دوسرے علوم تو لوگوں کو بتا دیتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسرار کسی پر منکشف نہیں فرماتے تھے۔

ذکر محبوب کی حلاوت: رشتہٴ محبت بھی عجیب ہوتا ہے متکلم کا کلام خود محبت کے باہمی رشتے کا پتہ دیتا ہے، لہجے کا اتار چڑھاؤ، کلام میں مستعمل الفاظ کی شناسائی، انداز کلام، بیچ بیچ میں مخصوص اشارات، کبھی محبوب کے ذکر کی مٹھاس، تو کبھی محبوب سے دوری و مہجوری کا ملال، چہرے پر کبھی مسرت و انبساط کا بانگین، کبھی تدبر کی شکن، تو کبھی تفکر کی لکیریں یہ تمام تر چیزیں محب کے دل میں موجود محبوب کی محبت کی وارفستگی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کلام میں ایسے نمونے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کبھی فرماتے: ”اوصانی جی“ میرے محبوب نے مجھے وصیت کی ہے، کبھی فرماتے ہیں: ”اوصانی خلیلی“ میرے خلیل نے مجھے وصیت کی ہے، وصیت بیان کرنے کے بعد آپ کا یہ فرمانا: میں اس کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا، یہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ محبت والفت الفاظ تک محدود نہ تھی جس طرح انہیں لب جاناں سے نکلے ہوئے الفاظ سے پیار تھا ایسے ہی محبوب کے مقصود و مطلوب کا بھی انہیں مکمل پاس و لحاظ تھا۔ (تفصیل کے لیے مسند احمد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے مروی احادیث کا مطالعہ کریں)

محبوب اور خلیل کے الفاظ سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان الفاظ کو ذکر کرنے میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرحت حاصل ہوتی تھی، تو کبھی کبھی یہی الفاظ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یاد جاناں میں اتنا بے قرار کر دیتے کہ آپ بے خود ہو جاتے، بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے اور حدیث کو پورا کر پاتے، ملاحظہ ہوا ایک مثال:

حضرت اخف بن قیس کہتے ہیں کہ میں بیت المقدس میں داخل ہوا، میں نے ایک شخص کو دیکھا سجدے پر سجدہ کیے جا رہا ہے تو مجھے (اٹپٹا) محسوس ہوا، جب اس شخص نے سلام پھیرا تو میں نے پوچھا: جناب آپ کو معلوم ہے کتنی رکعت پر سلام پھیرا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: اگر میں نہیں بھی جانتا ہوں تو میرا خدا تو جانتا ہے پھر فرمایا: مجھے میرے محبوب ابو القاسم نے خبر دی ہے، بس اتنا کہا اور وہ شخص رونے لگا، پھر کہا: مجھے میرے محبوب ابو القاسم نے خبر دی ہے اور پھر رونے لگا پھر تیسری مرتبہ کہا: مجھے میرے محبوب ابو القاسم صلی

اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے، بندہ اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر سجدے کے بدلے بندے کے درجے کو بلند فرماتا ہے، ایک گناہ بخشتا ہے اور ایک نیکی عطا فرماتا ہے۔ اخف کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، یہ تو بتائیے کہ آپ ہیں کون؟ تو اس شخص نے فرمایا: میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی ابوذر غفاری ہوں، جواب سن کر اخف شرمسار ہو گئے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۳۵۲)

اگر محبوب کے عمل کی طرح عمل نہ ہو: محبت میں محب بڑی دور کی سوچتا ہے
اور سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہے؟ سچا مسلمان تو دنیا کی کم اور آخرت کی زیادہ سوچتا ہے، جیسے دنیا میں آدمی اپنے محبوب کے ساتھ رہنا چاہتا ہے آخرت میں بھی اس کی یہی چاہت ہوتی ہے کہ قربت محبوب میسر ہو۔ ہم جو حدیث پیش کرنے جا رہے ہیں، اس کا انداز یہ بتاتا ہے کہ شاید حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی انہی جذبات نے مغلوب کر دیا کہ آخرت میں کیا ہوگا؟ دنیا میں محبوب دو عالم سے صحبتیں رہی ہیں، مواقع خدمت میسر آئے ہیں، صبح و شام خسروانہ نوازشات کی برسات ہوئی ہے، سب سے بڑھ کر شربت دیدار یار سے جو روح کو تازگی اور بے قراری کو قرار ملتا ہے آخرت میں یہ مزے ہوں گے یا نہیں؟ کیونکہ محبوب کا مقام اور اللہ کی بارگاہ میں ان کا انعام بہت عظیم ہے، یہاں تو امید ہے کہ محبوب کے تصدق سے جنت ارزانی ضرور ہوگی مگر کہاں ہماری منزل اور کہاں جان عالمیاں کا بالا خانہ پھر دیدار یار کیسے ہوگا؟ بس ان ہی خیالات کے اضطراب نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مضطرب کر دیا اور حضور کی بارگاہ میں جا پہنچے، عرض کرتے ہیں: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آدمی کسی سے محبت کرتا ہے؟ مگر اس کی طرح عمل نہیں کر سکتا (حضور اس کا آخرت میں کیا ہوگا؟ غلام کی بے قراری رحمت عالمیاں نے سمجھ لی اور فرمایا) ”انت یا اباذر مع من احببت“ (اے ابوذر! تم جس سے محبت کرتے ہو اسی کے ساتھ رہو گے) حضور کی زبان سے اتنا سنا تو پکارا ٹھے ”فانی احب اللہ ورسولہ“ بے شک میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں، حضور نے فرمایا: اے ابوذر! تم اس کے ساتھ رہو

گے جس سے تم محبت کرتے ہو، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے جاتے ”بے شک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں“ اور حضور فرماتے جاتے: ابوذر! تم اسی کے ساتھ رہو گے جس سے تم محبت کرتے ہو، یہ سلسلہ کلام تین مرتبہ مکرر ہوا۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۱۴۶۳)

عنایاتِ محبوبانہ: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کبھی اپنے عاشق و خادم کو محروم نہیں فرماتے تھے بلکہ جذبہ محبت کی تسکین کے لیے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حضور کی عنایات بے پایاں کا ابر بہاراں برسا اور اتنا برسا کہ محبت کی کھیتی کو ہمیشہ کے لیے شاداب کر گیا، مخصوص اوقات میں نوازشات کے خاص تحائف انہیں کی زبان میں ملاحظہ کیجیے:

ایک شخص نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا، یہ بتائیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سے ملاقات کرتے تو کیا اس کے ہاتھ پکڑ کر مصافحہ فرماتے تھے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم نے صحیح جگہ سوال کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بھی مجھ سے ملاقات ہوئی تو حضور نے مجھ سے مصافحہ فرمایا، یہ کوئی ایک مرتبہ کا ذکر نہیں ہے (ہمیشہ کا معمول تھا) اور حضور سے جو میری آخری ملاقات تھی (اس کا حال مت پوچھو اس میں تو رحمت خداوندی جھوم کر برسی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلانے کے لیے کسی کو میرے پاس بھیجا، اس وقت سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز تھی اور اسی مرض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا۔ میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ سرکار بستر ناز پر آرام فرما ہیں، بس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر جھک گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور مجھے اپنے آپ سے چمٹا لیا۔

(مسند احمد، حدیث: ۲۱۴۴۲، ۲۱۴۴۳)

مصطفیٰ کا صدر منشرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے سے ملا، سمندر کا تعلق نہر سے ہوا، نہر نے اپنی بساط کے مطابق کتنا جمع کیا یہ راز و نیاز تو اللہ تعالیٰ کے بعد مصطفیٰ جانیں اور مصطفیٰ کے بعد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جانیں۔ ہمیں یہ لگتا ہے

کہ سینہ مصطفیٰ سے علم کے خزینے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے میں منتقل کر دیے گئے، قلب مصطفیٰ میں صرف اور صرف محبت الہی ہی جاگزیں تھی، اس کے سوا وہاں کسی کی رسائی نہیں بس اس سینے کا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مس ہونا تھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے سے ساری خواہشات آرزوئیں سلب کر دی گئیں، حرص، لالچ اور دنیا طلبی کے سارے مادے جل کر خاکستر ہو گئے، بزبان علامہ فیض احمد ایسی عالم یہ ہو گیا:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئینہ فقر محمدی بن کر زندہ رہے سادگی کا یہ حال لباس کی بھی پرواہ نہیں، کبھی صرف کمبل سے جسم کی پوشش کر لیتے اور اس معاملے میں ملامت گروں کی ملامت بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی، کبھی عربی جوڑا زیب تن ہوتا اور کبھی فقر کی گدڑی ہی میں لپٹے رہتے، بال پریشان رہتے، داڑھی الجھی رہتی، کوئی اس حال میں دیکھتا تو نہ ہلا دھلا کر کپڑے بدل دیتا، رنگ گندمی تھا جو اسی حالت جذب میں دھوپ وغیرہ سے سیاہ ہو گیا تھا، ٹاٹ کا بستر تھا کسی نے پوچھا: آپ نرم گدا کیوں نہیں بنا لیتے، تو ہاتھ اٹھا کر عرض کرنے لگے: یا اللہ! دنیا میں جو چیزیں تو نے اپنی مرضی سے عطا کی ہیں میں ان کے متعلق بھی مغفرت کا طلب گار ہوں۔ (سوانح ابوذر غفاری، ص: ۷۳)

ذوق عبادت اور امت کے لیے بشارت: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا تعلق دنیا سے نہ کے برابر قائم رکھا تھا، وہ سارے تنعمات، تعیشات اور خواہشات کو ترک کر کے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہور ہے تھے۔ زندگی ”وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا“ (سب سے کٹ کر اسی کے ہور ہو) کی آئینہ دار تھی۔ فرائض کے ذوق کا اندازہ ان کے نوافل کے ذوق سے با آسانی لگایا جاسکتا ہے، فرائض کے متعلق تو قرآن کریم میں اور احادیث کریمہ میں جو تاکیدات ہیں انہیں دیکھ کر کوئی سلیم الفطرت مومن بھی ترک فرائض کی ہمت نہیں کرتا، چہ جائے کہ صحابی رسول۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو ان کے آقائے وہ طریقہ بھی بتا دیا تھا جہاں فرائض کی ادائیگی میں بظاہر مشقت

پیدا ہو رہی ہو، ایسے وقت میں کس طرح وہ رب کے فریضے سے عہدہ برآ ہوں گے۔
 حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے ابوذر! اگر تمہارے زمانے میں ایسے لوگ رہیں جو نماز کو مؤخر کریں تو تم اپنی نماز کا کیا کرو گے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ عرض کرتے، اس سے پہلے ہی آقائے کریم نے طریقہ ارشاد فرمایا: اے ابوذر! تم نماز کو وقت پر ادا کر لینا، پھر اگر جنہوں نے نماز نہیں پڑھی ہے وہ نماز پڑھنے آجائیں تو ان کے ساتھ بھی نماز پڑھ لینا، یہ نماز تمہارے لیے نفل ہو جائے گی، اللہ کے رسول نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ضرر سے بچانے کے لیے فرمایا: تم ان لوگوں سے یہ نہ کہنا کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے۔ (اس لیے اب تمہارے ساتھ نہیں پڑھوں گا) (مسند احمد: ۸، ۲۱۴، ۲۱۳۹۰)

فرائض کی پابندی کا یہ عالم ایک وقت ان کو تیمم کا مسئلہ معلوم نہ تھا اور یہ مدینہ طیبہ کے باہر اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سونپی تھیں، اہلیہ ساتھ میں تھیں غسل کی حاجت پیش آگئی بغیر غسل کے ہی نماز ادا کر لی لیکن دل میں بہت پریشان تھے، موقع ملتے ہی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے ہانپتے کانپتے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا، ارشاد فرمایا: کیا ہوا؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورا معاملہ بیان کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوا کر انہیں غسل کرنے کے لیے بھیجا، جب غسل کر کے حاضر بارگاہ ہوئے پھر تیمم کے بارے میں بتایا، نیز فرمایا: ابوذر! پاک مٹی انسان کے لیے پاکی ہے اگرچہ دس سال تک آدمی پانی نہ پائے۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۳۳)

نفلی عبادت کا ذوق اس حد تک تھا کہ پوری پوری رات نماز پڑھتے رہتے، سجدے پر سجدہ کرتے رہتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاک میں لگے رہتے کہ حضور کب تشریف لے آئیں اور نماز میں حضور کی معیت حاصل ہو جائے۔ ہم دلیل کے طور پر ایک حدیث پاک پیش کر رہے ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر

کے دوران عشاء کی نماز پڑھائی، لوگ حضور کے نماز پڑھانے کے بعد بھی وہاں نماز پڑھ رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قیام گاہ میں تشریف لے گئے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا کہ اب لوگ جگہ خالی کر کے چلے گئے ہیں، حضور دوبارہ وہاں تشریف لا کر نماز پڑھنے لگے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تاک رہے ہوں) کہتے ہیں: میں بھی حاضر ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا، حضور نے مجھے اپنی داہنی جانب کا اشارہ فرمایا، اور میں حضور کی دائیں جانب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں عبد اللہ بن مسعود حاضر ہو گئے اور وہ میرے اور حضور کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے، انہیں حضور نے بائیں جانب کھڑے ہونے کا اشارہ فرمایا اور وہ بائیں جانب کھڑے ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم اپنی اپنی نماز پڑھ رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر نماز میں ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے رہے یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز ادا کر لی، جب صبح ہو گئی تو میں نے عبد اللہ بن مسعود کو اشارہ کیا کہ وہ حضور سے پوچھیں کہ رات کے اس فعل میں (ایک آیت کی تکرار) کیا حکمت تھی؟ تو عبد اللہ بن مسعود نے مجھے اشارے سے جواب دیا: جب تک حضور خود ہی ارشاد نہ فرمادیں میں حضور سے سوال نہیں کر سکتا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: تو پھر میں نے حضور سے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کو تو پورا قرآن کریم یاد ہے لیکن آج آپ نماز میں پوری رات ایک ہی آیت کی تکرار کرتے رہے، اگر ہم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ہم تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابوذر! میں نے اپنی امت کے لیے دعا کی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور رب کی طرف سے کیا جواب ملا، ارشاد فرمایا: ابوذر! ایسا جواب ملا کہ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے تو بہت سارے لوگ نماز کو ہی ترک کر دیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور! کیا میں لوگوں کو اس بشارت کی خبر نہ دے دوں (حضور کا دریائے کرم جوش پر تھا) فرمایا: کیوں

نہیں (اس کی خبر دے دو) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ نے ابوذر کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے بھیج دیا تو لوگ بشارت ہی پر بھروسہ کر لیں گے اور عبادت چھوڑ بیٹھیں گے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز لگا کر روکا گیا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس حاضر ہو گئے۔

وہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کو رات بھر نماز میں پڑھ رہے تھے یہ تھی ”إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ ﴿۱۵﴾

(المائدہ: ۱۱۸، مسند احمد، حدیث: ۲۱۴۹۵)

حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات بھر نماز نوافل پڑھتے رہے یہ ان کا ذوق عبادت تھا، جہاں عبد اللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکے وہاں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرضی لگائی، سوال کیا بلکہ سوال پر سوال کیے، یہ بارگاہ رسالت میں ان کی وجاہت ہے اور یہ کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خوب منہ لگے تھے۔ یہ بشارت امت کو سنانے سے اگر چہ منع کر دیا گیا لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بشارت شفیق المذنبین سے خود اپنے کانوں سے سنی تھی، اس سے پختہ سبب علم ان کے لیے اور کیا ہو سکتا تھا لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کا ذوق عبادت یہ سننے کے بعد کم ہوا بلکہ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی لوگ انہیں سجدے پر سجدہ کرتے ہوئے پاتے تھے، وہ لوگ کم ہمت اور دین میں کمزور ہوتے ہیں بشارتیں جن کا ذوق طلب گھٹا دیتی ہیں، اللہ والے، عظیم الہمت لوگ وہ ہیں کہ بشارتیں جن کا ذوق طلب بڑھا دیتی ہیں۔

دوران سفر سواری پر نماز: ذوق عبادت کا یہ عالم تھا کہ دوران سفر آپ اپنی سواری پر بھی نماز ادا کرتے تھے، ابو عثمان نہدی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاری کو

سواری پر دیکھا تو میں سمجھا کہ آپ کو نیند آ رہی ہے، میں نے قریب جا کر پوچھا: کیا آپ سو رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں! میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۸)

انتہائے شوق پر برہم مزاجی: ہم یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منہ لگے تھے اس لیے موقع بہ موقع حضور کی بارگاہ میں کثرت سے سوال کیا کرتے تھے، خود فرماتے ہیں کہ میں حضور کی بارگاہ میں سارے لوگوں سے زیادہ سوال کرتا تھا لیکن جب شوق حدود کو پار کر جائے تو پریشانی پیدا کر دیتا ہے اور کبھی کبھی عتاب کا باعث بن جاتا ہے۔

ایک دن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شب قدر کے بارے میں معلوم کیا کہ یہ رمضان میں ہوتی ہے یا کسی اور مہینے میں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان میں، پھر پوچھا کہ یہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی ظاہری زندگی میں ہوتی ہے یا اس کے بعد بھی قیامت تک باقی رہے گی؟ فرمایا: قیامت تک باقی رہے گی، عرض کیا: رمضان میں کب؟ جواب ملا: اس کو رمضان کے پہلے اور آخری عشرے میں تلاش کرو پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کچھ دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ موقع کی تلاش میں رہے جیسے ہی موقع ملا پھر سوال کر لیا، حضور دونوں میں سے کون سے عشرے میں شب قدر ہوتی ہے؟ حضور نے فرمایا: آخری دس راتوں میں تلاش کرو، ساتھ ہی سرکار نے فرمایا: اب اس کے بعد کچھ نہ پوچھنا (لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ امت کی بھلائی کی فکر میں انتہائے شوق کو پہونچے ہوئے تھے تھوڑی دیر خاموش رہے) حضور باتوں میں مشغول ہوئے جیسے ہی موقع دیکھا پھر پوچھ لیا (اس بار پوچھنے کا انداز بھی الگ تھا) حضور اس غلام کا آقائے کریم پر جو حق ہے (حضور کا بخشا ہوا) اس حق کا واسطہ مجھے بتا دیجیے، ان دس راتوں میں شب قدر کب ہوتی ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے اوپر ایسے غصہ ہوئے کہ ایسا غصہ آپ نے مجھ پر پہلے کبھی فرمایا تھا نہ اس کے بعد (عتاب تو

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سرکار نے فرمایا لیکن جواب سے محروم نہ فرمایا (فرمایا: آخری سات راتوں میں شب قدر کو تلاش کرو اور اب اس متعلق کچھ بھی سوال مت کرنا۔) (المستدرک للحاکم، حدیث نمبر: ۱۵۹۶، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۸۷۸۸)

امام ابو عبد اللہ الحاکم نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے اور امام مسلم کی شرط پر ہے، امام بخاری و مسلم نے اس کو تخریج نہیں فرمایا ہے۔

خود نمائی اور بڑائی سے دور رکھنے والا خطاب: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیہ نے صحابہ میں ممتاز کر دیا تھا، مال و منال کی بے ثباتی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ میں ایسی قائم فرمائی کہ انہوں نے سونے چاندی کے ڈھیروں کو اگر دیکھا تو بنظر حقارت ہی دیکھا، کبھی زراندوزی کا سودا ان کے دل میں نہ سما سکا، عبادت و ریاضت اور گوشہ نشینی کا رنگ ایسا چڑھا کہ تمام عمر دنیا کی رنگینیوں کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا لیکن ان سب کے باوجود خود پسندی، تکبر اور عبادت و ریاضت کے گھمنڈ سے بچانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے فرمان الہی کے وہ نمونے پیش فرمائے کہ انہیں سن لینے کے بعد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو کہاں کوئی صحیح الحواس مؤمن بھی اپنے عبادت و ریاضت پر اترا سکتا ہے نہ تکبر و گھمنڈ جیسی کوئی چیز اس کے قریب آسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو وہ حدیث قدسی جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنائی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے پوری انسانیت کو اس کی اوقات یاد دلائی، اس روایت کو کثیر مؤرخین و محدثین نے الفاظ کی قدرے کمی و بیشی کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔ ہم امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تخریج کردہ حدیث بیان کر رہے ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کر دیا لہذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ

کرو، اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوا اس کے جس کو میں ہدایت دوں، اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے اس کے جس کو میں کھانا کھلاؤں، بس تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم سب بے لباس ہو سوائے اس کے جس کو میں لباس پہنا دوں لہذا تم سب لباس مانگو میں تم کو لباس پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم سب دن رات گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخشا ہوں تم مجھ سے بخشش طلب کرو میں تم کو بخش دوں گا، اے میرے بندو! تم کسی نقصان کے مالک نہیں کہ مجھے نقصان پہنچا سکو اور تم کسی نفع کے مالک نہیں کہ مجھے نفع پہنچا سکو، اے میرے بندو! اگر تمہارے اول و آخر اور تمہارے انسان و جن تم میں سب سے زیادہ متقی شخص کی طرح ہو جائیں تو میرے ملک میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اول و آخر اور تمہارے انسان و جن تم میں سے سب سے زیادہ بدکار شخص کی طرح ہو جائیں تو میرے ملک سے کوئی چیز کم نہیں کر سکتے اور اے میرے بندو! تمہارے اول و آخر اور تمہارے انسان و جن کسی ایک جگہ کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کا سوال پورا کر دوں تو جو کچھ میرے پاس ہے اس میں سے صرف اتنا کم ہوگا جس طرح سوئی کو سمندر میں ڈال کر (نکالنے سے) سمندر میں کمی ہوتی ہے، اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے جمع کر رہا ہوں پھر میں تم کو ان کی پوری پوری جزا دوں گا پس جو شخص خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جس کو خیر کے سوا کوئی اور چیز (مثلاً آفت یا مصیبت) پہنچے تو وہ اپنے نفس کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔ سعید بیان کرتے ہیں کہ ابو ذر یس خولانی جس وقت یہ حدیث بیان کرتے تھے تو گھٹنوں کے بل جھک جاتے تھے۔ (صحیح المسلم، کتاب البر باب تحریم الظلم)

حدیث پاک میں ہے کہ تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جس کو میں ہدایت دوں، اس گمراہی سے مراد وہ گمراہی ہے جو فطرت کے بعد رسولوں کے آنے سے پہلے تھی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ“ تمام لوگ ایک طریقہ (گمراہی) پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دینے والے

اور ڈرانے والے نبی بھیجے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتا اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا اور لوگ اسی تن آسانی عیش پرستی اور دلائل توحید میں عدم تدبر کے حال میں رہتے تو لوگ گمراہ ہو جاتے۔ اس حدیث میں ہے جو کچھ میرے پاس ہے اس سے صرف اتنا کم ہوگا جس طرح سوئی کو سمندر میں ڈال کر نکالنے سے اس میں کمی ہوتی ہے۔ چونکہ سوئی کو سمندر میں ڈال کر نکالنے سے بظاہر کوئی کمی نہیں ہوتی اس لیے مثال دی گئی ورنہ سمندر متناہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ غیر متناہی ہے۔ (شرح صحیح مسلم، ج: ۷، ص: ۱۵۸)

اللہ تعالیٰ کے اس کلام (حدیث قدسی) میں جلال و جمال کے مظاہر دیکھ لینے اور ان پر یقین کر لینے کے بعد کیا کوئی شخص اپنی خوبی پر اتراسکتا ہے؟ کمال پر غرور و تکبر کا شکار ہو سکتا ہے؟ جب واشگاف انداز میں بتا دیا گیا تم سب گنہگار و خطا کار ہو تو اپنے زہد و ورع پر کس دماغ میں پندارتقوی و طہارت سما سکتا ہے؟ جب ابتدائے آفرینش سے لیکر صبح قیامت تک کے عابد و زاہد و صغیر و کبیر، نیک اور پارسا سب مل کر بھی اس صاحب جلال مالک الملک کی سلطنت قاہرہ میں مکھی کے پر کے برابر اضافہ نہیں کر سکتے تو پھر کوئی خاک کا پتلا مغرور و متکبر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ جب سب اسی کا ہے اور سب اسی کے ہیں: جمال و جلال کی یہ کہکشاں، فضل و کمال کے یہ درخشندہ ستارے، زہد و تقویٰ اور عفت و طہارت کے لہلہاتے گلشن اسی کی شان کریمی اور جود و نوال کے مرہون منت ہیں اگر وہ اپنے رحم و کرم اور جود و نوال کی عنان ایک لمحے کے لیے موڑ لے تو سارے محاسن، سارے کمالات، زمین و آسمان بھری نی کیاں اسی لمحے میں راکھ کا ایک ڈھیر یا ریت کے ٹیلے میں تبدیل ہو جائیں۔ (العیاذ باللہ) تو پھر کوئی عاقل خدائے واحد کی حمد و ثنا چھوڑ کر اپنی مدح سرائی میں رطب اللسان کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس کا مقام بارگاہ خداوندی میں جتنا عظیم ہے وہ اسی قدر صبر و شکر، عبادت و ریاضت، توبہ و استغفار، عاجزی و انکساری کا پیکر جمیل بنا ہوا ہے۔

منزل عشق میں تسلیم و رضا مشکل ہے

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

تعلیمات نبویہ کے یہی وہ بیش بہا نمونے تھے جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سما گئے تھے۔ یوں تو آفتاب نبوت کے نور سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سینہ خوب منور ہوا، ان کی ہر نیکی پیغمبر اسلام کی مساعی کا نتیجہ اور مواعظ حسنہ کا ثمرہ ہے، ان کی زندگی کے ہر ورق پر رنگ محمدی چڑھا ہوا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح آسمان دنیا کا آفتاب مطلع انوار پر طلوع ہوتا ہے، کائنات اس کے جلووں سے فیض پاتی ہے، قرص آفتاب سے صادر ہونے والی کرنیں بظاہر ایک جیسی ہیں لیکن فیض پانے والی کائنات میں اس کا جلوہ جدا جدا رنگوں میں نظر آتا ہے۔ عالم نباتات پر ہی غور کر لیجئے کوئی پتہ پیلے رنگ کا، کوئی ہرے رنگ کا، پتوں کا رنگ الگ ہے، شاخوں کا الگ، پھولوں کا الگ تو پھلوں کا الگ، ایک ہی درخت پر لگنے والے تمام پھل جسم میں، جسمانیات میں، حجم میں، جثے میں، ضخامت میں، لطافت میں، کثافت میں، مزے میں اور ذائقے میں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بلاشبہ آفتاب نبوت سے فیض پانے والے آسمان ہدایت کے چاند تارے صحابہ کرام سب کے سب ایک ہی آفتاب سے اکتساب نور کرتے رہے مگر کسی میں شان صدیقیت کی جلوہ نمائی ہوئی، کوئی پر توے عدالت بن گیا، تو کسی نے حیاے نبوی کے جلووں کو اپنی ذات میں سمولیا، کوئی شجاعت نبوی سے فیضیاب ہوا اور کوئی قضاے نبوی کے جواہر پاروں سے مزین ہو گیا۔

امت کے سب سے بڑے زاہد: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات میں جو رنگ سب سے نمایاں نظر آتا ہے وہ حضور کی زاہدانہ زندگی کا رنگ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مختار کائنات بنایا، عظمت شان کا یہ عالم کہ اگر چاہیں تو سونے کے پہاڑ ساتھ چلا کریں لیکن فقر کے اختیار کی یہ شان کہ گھر میں دو ماہ تک چولہا نہیں جلتا۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۶۴۵۹، شرح النبی للبخاری: ۳۶۸۳، شعب الایمان: ۱۳۹۵)

کل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا

اس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

اسی رنگ سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رنگارنگ ہو گئے، زبان رسالت مآب سے وہ تمنغہ پایا کہ جس تمنغے نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امت کا ممتاز اور مایہ ناز زاہد بنا دیا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَنْظُرَ اِلٰى زَهْدِ عِيْسٰى بْنِ مَرْيَمَ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى اَبِي ذَرٍّ“ جو شخص حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام کے زہد کو دیکھ کر مسرور ہونا چاہے وہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نظارہ کرے۔ (جامع الاحادیث، حدیث نمبر: ۱۹۷۷۸، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۴، تاریخ دمشق، ج: ۶، ص: ۲۹۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۵۹)

رہبانیت سے پاک زہد: اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا کہ انسان خدا کی عبادت اور زہد و تقویٰ کے نام پر آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلات میں بسیرا کر لے، گھروں اور مکانات سے نکل کر پہاڑوں اور غاروں کی کھوہوں کو اپنا مسکن بنا لے، آبادیوں کو ترک کر کے صحراؤں اور بیابانوں کو ہی اپنا وطن بنا لے، ترک نکاح کر کے تجردانہ زندگی جیے، معاش اور تربیت اطفال کے چکروں میں پھنسنے کے بجائے تنہائی میں اللہ اللہ کرتا رہے، یہ سب کچھ تعلیمات اسلام سے میل نہیں کھاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زاہد بنایا تھا راہب نہیں۔ اسی لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شادی بھی کی، ان کے یہاں اولاد بھی ہوئی، بچوں کی پرورش بھی کی، لوگوں کے ساتھ وعظ و نصیحت میں مشغول بھی رہے، جس جگہ رہے اپنے اہل خانہ کو ساتھ رکھا، وہ راہب بن بھی کیسے سکتے تھے؟ جب کہ ان کے آقا نے انہیں اچھے طریقے سے یہ سبق ازبر کر دیا تھا: اے ابوذر! تمہارا راستے سے ہڈی (تکلیف دہ چیز) کو ہٹا دینا صدقہ ہے، کسی کو راستہ دکھا دینا صدقہ ہے، اپنی طاقت سے کسی ضعیف کی مدد کرنا صدقہ ہے، کسی گناہ کو گناہ ظاہر کر دینا صدقہ ہے، تمہاری بیوی کے ساتھ تمہارا ہمبستر ہونا یہ بھی صدقہ ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! ہم تو اپنی بیویوں سے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ہم بستر ہوتے ہیں، اس پر ہمیں اجر کیوں ملتا ہے؟ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابوذر! یہ بتاؤ اگر تم اپنی شہوت کو حرام طریقے پر پورا کرو تو تم گناہ گار ہو گے یا نہیں؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ہاں حضور ہم اس وقت ضرور گناہ گار ہوں گے (تو پھر جائز طریقے سے پورا کرنے پر ثواب کیوں نہیں پاؤ گے) فرمایا: تم لوگ گناہوں کو شمار کر لیتے ہو اور فی کیاں بھول جاتے ہو۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۳۶۳)

حدیث پاک میں بیان کردہ انواع و اقسام کے یہ صدقے چھوٹی چھوٹی سی چیزوں پر جزاء کی یہ دل خوش کر دینے والی بشارتیں خود اپنی حاجت روائی اور تسکین نفس پر ثواب کا ذخیرہ، کیا غاروں کی کھوہوں، پہاڑوں کی چوٹیوں، صحراؤں کی تنہائیوں، کسب معاش کی بے فکریوں اور تجربہ دانہ زندگی کی بے کیفیوں میں میسر آ سکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! یہ آغوش محمدی میں تربیت یافتہ وہ افراد ہیں جن کی مثال عالم میں نایاب ہے، یہ دنیا میں رہتے ہوئے تارک الدنیا ہوتے ہیں، آبادیوں کی بھیڑ میں بھی عبادت و ریاضت کے اس مقام پر ہیں کہ گوشہ نشین حضرات پوری زندگی تنہائی میں گزار کر بھی ان کے مقام کے عشر عشر کو بھی نہیں پہنچ سکتے، یہ سب صدقہ ہے جان عالمیاں حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کا۔

ایک تم دنیا میں رہ کر تارک دنیا رہے

رہ کے دنیا میں دکھائے کوئی دنیا چھوڑ کر

(تاج الشریعہ)

ابوذر کے زہد کی نمایاں خوبیاں: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا

زہد بڑا ہی عمدہ تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ زہد میں جنگلات کا رخ کر لینے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ معاشرے میں رہ کر خود نیکی کرتے اور لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور نیکی کو پسند فرماتے، وہ لوگوں کو زہد کی دعوت دیتے تھے تاکہ لوگوں کا حساب قیامت کے دن آسان ہو جائے، کثرت مال قیامت میں لوگوں کے لیے وبال جان نہ بن جائے اس لیے وہ مالداروں پر سخت تنقید کرتے، انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے فرامین سناتے کیونکہ یہ بات اسلام میں ثابت شدہ ہے کہ قیامت میں انسان سے اس کے مال کے بارے میں

پوچھا جائے گا، اس نے اپنا مال کہاں خرچ کیا؟ وہ چاہتے تھے کہ لوگ پل صراط سے باسانی گزر سکیں، کثرت مال ان کے پاؤں کے لیے زنجیر ثابت نہ ہو، وہ اپنے لیے یہ پسند کرتے تھے کہ ان کے پاس اتنا غلہ اور سامان ہو جو ان کے اور اہل و عیال کے لیے پورے سال کھانے پینے میں کفایت کر سکے، اس سے زیادہ کو وہ گھر میں رکھنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ اس کا راہ خدا میں صدقہ کر دینا ہی ان کے یہاں متعین تھا، اپنے پاس چند جانور رکھتے تاکہ ان پر سواری کر سکیں، دودھ والی بکریوں کو دودھ کر خود دودھ پی سکیں اور لوگوں کو بھی پلا سکیں، یہی طرز زندگی وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کرتے تھے۔ (ابوذر غفاری واثیو عیہ، ص: ۲۵)

کیفیت مجذوبانہ: علامہ فیض احمد اویسی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

آپ کا جذب ہمارے مجذوبوں کی طرح نہ تھا کہ نہ حقوق العباد کا خیال اور نہ حقوق اللہ کا دھیان، نہ فرائض کی فکر نہ سنتوں کی پرواہ، نہ ستر کا ہوش نہ حلال و حرام کی تمیز، ان کا جذب ایسا نہیں تھا کہ نماز روزہ اور دیگر شرعی امور سے آزاد ہو گئے ہوں بلکہ وہ ایسے مجذوب تھے جو ہمارے بڑے بڑے عاقلوں سے زیادہ عاقل اور باہوش تھے۔ فرائض میں تو کسی قسم کی کوتاہی ان سے قطعاً ثابت نہیں، نوافل وغیرہ میں کچھ بے ضابطگیاں ہو جایا کرتی تھیں، مثلاً رکوع پر رکوع کرتے جاتے تھے یا سجدے پر سجدے ہی کرتے جاتے، اس کے باوجود کہ بعض اوقات بے خود ہو جاتے تھے، محمدی جذب کا اثر تھا کہ اپنے محبوب کی اداؤں کی سختی سے پابندی فرماتے تھے، ایک مرتبہ کسی بات پر غصہ آگیا تو بیٹھ گئے پھر فوراً ہی کیچڑ سے بھری زمین پر لیٹ گئے پوچھا گیا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم میں سے جس کسی کو غصہ آئے وہ کھڑا ہو تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے کہ اس سے غصہ جاتا رہتا ہے ورنہ پھر لیٹ جائے۔ (سوانح ابوذر، ص: ۳۸)

حضرت ابوذر غفاری کا وظیفہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابقین

اولین صحابہ میں تھے، بیت المال سے آپ کے لیے خاص مقدار میں رقم بطور وظیفہ متعین تھی چنانچہ آپ کو بیت المال سے چار ہزار (دینار) سالانہ نذر کیے جاتے تھے، اس سے متعلق

آپ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جس دن وہ وظیفہ ملتا آپ اپنے خادم کو بلاتے، اس سے معلوم کرتے: ایک سال کی ضروریات کے لیے کیا کیا چاہیے؟ وہ جو بتاتا اس کے مطابق غلہ اور ساز و سامان خرید لیا جاتا، باقی جو بچتا اس کے پیسے بنا لیے جاتے پیسہ اس لیے بنا لیے جاتے تھے تاکہ سونا اور چاندی جمع کرنے والوں میں آپ کا شمار نہ ہو۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۶، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۳، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۶، ۲۰۷)

طبقات ابن سعد کی دوسری روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ پیسے اس لیے کرتے تھے تاکہ راہ خدا میں خرچ کرنے میں آسانی ہو، اور سونا چاندی جمع کرنے والوں میں آپ کا شمار نہ ہو۔ آپ بھی غور فرمائیں، حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جب گھریلو ساز و سامان خرید لیا جاتا اور کچھ بچ رہتا تو آپ اس کے پیسے خرید لیتے، میں نے عرض کیا: کاش! آپ دیناروں کو اپنی حاجت یا مہمانوں کی مہمان نوازی کے لیے رکھ لیتے تو آپ نے فرمایا: میرے خلیل نے مجھ سے عہد لیا ہے جو مال بھی سونے یا چاندی کی شکل میں ہو اور اس کو کن جو سی کے ساتھ سنبھال کر رکھا جائے تو وہ آگ کا انگارہ ہے، اس کے مالک کے لیے، یہاں تک کہ اس کو راہ خدا میں خرچ کر دیا جائے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۶، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۳۸۵)

روایت میں مذکور الفاظ سے مجھے یہ لگتا ہے کہ آپ پیسے اس لیے خرید لیتے تھے تاکہ سہولیت کے مطابق حاجت مندوں پر خرچ کریں اور سونا چاندی جمع کرنے کی وعید سے بھی بچے رہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امت میں سب سے سچے: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل میں سے ایک بڑی فضیلت یہ ہے کہ انہیں زبان رسالت مآب اور دہن عدیم المثال کہ جس کی ہر بات وحی خدا ہے سے ایک عظیم سند حاصل ہوئی، نبی رؤف رحیم نے ارشاد فرمایا ”مَا أَظَلَّتِ الْخُصْرَاءُ وَلَا أَقَلَّتِ الْغُبَرَاءُ أَصْدَقَ مِنْ آيِ ذُرِّ“۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۰۱)

آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ

سچا آدمی نہیں ہے، یہ سب کرم فرمائی ہے ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ“ کی شان والے نبی کی کہ اپنے اصحاب کو نرالی شان عطا فرمائی۔

علامہ ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ علامہ توربشتی نے فرمایا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے سچے ہیں یہ بطور مبالغہ ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ علی الاطلاق سب سے زیادہ سچے ہیں کیونکہ وہ بالا جماع حضرت ابوبکر سے زیادہ سچے نہیں ہیں، دوسری جگہ لکھتے ہیں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ سچے ہیں کیونکہ حضرت ابوبکر اس امت کے صدیق ہیں اور امت میں سب سے زیادہ افضل ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح، کتاب المناقب، حدیث نمبر: ۶۲۳۸، ۶۲۳۹)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمان ظاہری طور پر ان کے سچے ہونے کی سند ہے اور اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ جملہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مستقبل کی پیغمبرانہ تلخیص ہے۔ یہ صدق بے باک حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا جو ہر حیات ٹھہرا، ان کی پوری زندگی صدق سے عبارت ہو گئی، اس صداقت نے ان کے ظاہر و باطن کا احاطہ کر لیا، فرمان رسالت میں زبان و مقال کی صداقت کے ساتھ صداقت عقیدہ و صداقت اعمال بھی مضمحل ہے یعنی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری زندگی میں خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی سچے ہی رہیں گے نہ اپنے نفس کو دھوکہ دیں گے نہ کسی غیر کے ساتھ کوئی چال چلیں گے نہ کسی کو مغالطہ آفرینی کا موقع فراہم کریں گے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے ایک ایک لمحے نے فرمان مصطفیٰ کی حقیقی تصدیق فرمائی، ایک اور بات جو ان کی زندگی سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ جس صدق کو قابل فضیلت سمجھتے تھے وہ صدق اعلانیہ تھا، وقت ضرورت سچائی کا اعلان انکی قابل ذکر خوبی و خصلت قرار پائی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس سچائی کو نگاہ نبوت نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا، نگاہ مصطفیٰ نے یہ بھی دیکھ لیا تھا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صداقت کے ساتھ جب صلابت کا ملاپ ہوگا تو کئی مرتبہ حالات کشیدہ ہو جائیں گے، تلواریں میان سے باہر

آجائیں گی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمیشہ صبر، عاجزی، فروتنی اور حکام وقت کی اطاعت کا حکم دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انہیں حکم دیا تھا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر سچا عمل کر کے دکھایا وہ آخر ایسا کیوں نہ کرتے جب وہ ہر قول و فعل اور عمل میں سچے ہی ٹھہرے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۴۸)

امارت طلب فرمانا: ایک دن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پوری رات گزارنے کا موقع ملا، پوری رات راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اس وقت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: حضور مجھے بھی کہیں کا حاکم بنادیں، حضور نے فرمایا: کسی جگہ کی امارت یہ بہت بڑی امانت ہے اگر اس کا حق ادا نہ کیا جاسکے تو قیامت کے دن یہ شرمندگی اور ندامت کا سبب بن جائے گی۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۵۱۳، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۵۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی جگہ کا امیر کیوں نہیں بنایا؟ اس کی وجہ سرکار نے دوسری حدیث پاک میں بیان فرمائی، اے ابوذر! تم اس معاملے میں کمزور ہو، میں تمہارے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں تم کبھی دو لوگوں کے بھی امیر نہ بننا اور کبھی یتیم کے مال کے متولی مت بننا۔ علامہ ذہبی نے فرمایا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جو کمزوری بیان کی گئی وہ ضعف رائے پر محمول ہے (ورنہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بڑے بہادر اور نڈر تھے) کیونکہ امیر کے اندر حلم و مدارات چاہیے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اندر تیزی زیادہ تھی اگر انہیں کسی یتیم کے مال کا والی بنا دیا جاتا تو سارا مال خیر کی راہ میں خرچ کر دیتے اور یتیم کو فقیر بنا دیتے کیونکہ ان کے نزدیک سونا چاندی کو جمع کرنا جائز نہ تھا، اس لیے حضور نے وہ نصیحت فرمائی جو آپ نے پڑھی۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۵)

جب وہ علامہ ذہبی کے کہنے کے مطابق یتیم کا پورا مال خیر کے کاموں میں خرچ کر دیتے تو جس علاقے کے وہ امیر ہوتے وہاں بھی سارے مال کو فقرا پر خرچ کر دیتے جو

یقیناً مصلحت کے خلاف ہوتا۔

حضور کے ہر فرمان پر عمل کر کے دکھایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک غلام عطا فرمایا تھا، ساتھ ہی فرمایا: اپنے غلام کو وہی کھلانا جو تم کھاؤ اور وہی پہنانا جو تم پہنو، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک ہی کپڑا تھا آدھا خود استعمال کر لیا اور آدھا غلام کو دے دیا، بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو سرکار نے فرمایا: ابوذر! تمہارے کپڑے کی کیا حالت ہے؟ حضور سے پورا قصہ عرض کر دیا، اب حضور نے مزید فرمایا: اس کے ساتھ بھلائی کرنا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر آئے اور غلام کو آزاد کر دیا پھر حضور نے پوچھا: ابوذر! تمہارے خادم کا کیا حال ہے؟ عرض کیا: حضور! میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے، میں نے اس کو آزاد کر دیا، حضور نے فرمایا: اے ابوذر! اللہ تمہیں اجر عطا فرمائے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۸۹)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ جو حضور نے فرمایا: ہر حالت میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا حاصل کی۔

آقا اور غلام دونوں کا لباس ایک: حضرت معروفرماتے ہیں کہ میں نے مقام ربذہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی، میں نے دیکھا جو لباس ان پر تھا ویسا ہی لباس ان کے غلام پر تھا، میں نے ان سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: میں نے ایک شخص کو (غلام کو) ماں کی گالی دی تھی، اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی، اس پر حضور نے فرمایا: اے ابوذر! تم نے اس کو ماں کی گالی دی ہے؟ تم میں کچھ جاہلیت ہے، تمہارے خدام تمہارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے، جس کے ماتحت اس کا کوئی بھائی ہو تو اسے چاہیے کہ جو خود کھائے ایسا ہی اسے کھلائے، جیسا پہنے ویسا ہی اسے بھی پہنائے، ان کو ایسا کام نہ دو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو اور اگر ایسا کام دو تو ان کی مدد کرو۔

(صحیح البخاری، کتاب الایمان باب المعاصی من امر الجاہلیۃ، حدیث نمبر: ۳۰)

ابوذر غفاری کا بلال سے معافی طلب کرنا: ایک موقع پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت بلال کے درمیان تیز کلامی ہو گئی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ”میرے اور ایک شخص کے درمیان تیز کلامی ہو گئی، اس کی ماں عجمیہ تھی، میں نے اس کی ماں کو کچھ کہہ دیا، اس نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس بات کو ذکر کر دیا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا تم نے فلاں کو گالی دی ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: اس کی ماں کو کچھ کہا ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: تم میں کچھ جاہلیت ہے، میں نے عرض کیا: اس وقت تک بڑھاپے کے باوجود؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! (بخاری، کتاب الاعتق و کتاب الادب)

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ شرح قسطلانی سے نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ قصہ حضرت بلال کے ساتھ پیش آیا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو یہ کہہ دیا تھا ”اوکالی عورت کے بچے“ انہوں نے دربار نبوی میں شکایت کر دی، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں جاہلیت ہے، اس ارشاد کو سننے کے بعد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا رخسار زمین پر رکھ کر حضرت بلال سے فرمایا: میں زمین سے اپنا رخسار اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک تم میرے رخسار کو قدم سے نہ روند دو، بالآخر حضرت بلال کو ان کی ضد پوری کرنی پڑی۔

(نزہۃ القاری، ج: ۱، ص: ۳۶۶، ارشاد الساری (قسطلانی)، ج: ۱، ص: ۱۱۵)

تربیت صحابہ: سبحان اللہ! کتنے اچھے کتنے سچے تھے حضور کے صحابہ، ان کے آقا و مولیٰ اور ان پر لاکھوں کروڑوں درود و سلام نازل ہوں، حضور نے ان کی کیسی تربیت فرمائی کہ کبھی بتقاضہ بشریت کسی سے کوئی چوک ہوئی تو فریق ثانی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کاروائی کرنے کے بجائے مقدمے کو اپنے افضل المخلوق آقا و مولیٰ کی بارگاہ میں پہنچا دیتا، پھر انصاف فرمانے والے گروہ کے سردار حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فیصلہ ہوتا وہ فریق اول کو پورا پورا جان و دل سے قبول ہوتا ہے، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب

سے کہے گئے چند تادیبی جملے ان میں خوف خدا اور ندامت و شرمندگی کا ایسا احساس پیدا کر دیتے کہ جب تک اپنے ساتھی سے معافی طلب نہ کر لیتے بلکہ معاف نہ کرا لیتے اس وقت تک ان کی بے قراری کا اضطراب تھمنے کا نام نہیں لیتا، معافی طلب کرنے کا انداز بھی کتنا زالا، کتنا سہانا ہے جسے آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، یہ صرف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی شایاں ہے۔

واقعے کا ایک لطف یہ بھی آپ ملاحظہ فرمائیں: وہ خود اپنے خلاف گواہی دیتے تھے، جو پوچھا جاتا سچ بتا دیتے، ان کے خلاف الگ سے کسی گواہ کی ضرورت نہ تھی، انہیں خود اپنے خلاف گواہی دینے میں ذرہ برابر تامل نہ تھا، خدائے تعالیٰ کے فرامین جو انہوں نے مصطفائے کائنات کی زبانی سن رکھے تھے ان پر کامل ایمان رکھتے تھے اور مکمل عمل کرتے تھے۔ اس واقعے میں آیت کریمہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ“ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لیے گواہی دیتے رہو انصاف پر خوب قائم رہو پھر یہ گواہی چاہے تمہاری جانوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو) (سورۃ النساء، آیت: ۱۳۵) میں مطلوبہ شہادت پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا بہترین عملی نمونہ پیش فرمایا ہے۔ پھر پڑھیے اور ان کے حسن عمل کی داد دیجیے ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے بہترین بندے اور سب سے افضل رسول ہیں، بے شک جماعت صحابہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی بہترین گواہ ہے۔“

ابوذر اور ایسا کلام: اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو جلیل القدر صحابی ہیں، ان کا ایمانی مقام بہت بلند ہے پھر انہوں نے حضرت بلال کے ساتھ ایسا کلام کیوں کیا جو کسی بھی مسلمان کے ساتھ جائز نہیں ہے؟ اس سوال کو علامہ عینی نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ”کیف جوز ابوذر ذلك وهو حرام“ اس ناجائز فعل کا ارتکاب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیسے وجود میں آ گیا پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں: ”الظاهر ان هذا كان منه قبل ان يعرف تحريمه“ ظاہر

یہی ہے یہ سب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس وقت سرزد ہوا جب انہیں اس فعل کے حرام ہونے کا علم نہیں تھا۔ (عمدة القاری، ج: ۱، ص: ۲۰۸)

علامہ عینی کے اس جواب کو سن لینے کے بعد کسی شخص کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کچھ بھی سوچنے کی گنجائش نہیں بچتی ہے۔

محبوب کی ڈانٹ محبوب اور نئی فخر بھی: اگر کسی موقع پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا لہجہ ترش ہوا تو اس ترشی کو بھی وہ اپنے لیے قابل فخر سمجھتے تھے، کیوں کہ آقا کی ڈانٹ بھی غلام کے لیے رحمت ہوتی ہے۔ حدیث بیان کرتے وقت ناز بھرے انداز میں بیان فرماتے تھے کہ مجھ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم غصہ ہوئے، ایسے غصہ ہوئے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غصہ ہوئے نہ اس کے بعد۔

امام بخاری و مسلم اور کثیر محدثین نے آنے والی حدیث روایت فرمائی ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا، حضور سفید کپڑا اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے، تھوڑی دیر کے بعد پھر حاضر ہوا، حضور حسب سابق اب بھی سوئے ہوئے تھے، تھوڑی دیر بعد پھر حاضر خدمت ہوا تو حضور نیند سے بیدار ہو چکے تھے، میں حضور کے پاس بیٹھ گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بھی ”لا الہ الا اللہ“ کی گواہی دی پھر اسی اعتقاد پر اس کا انتقال ہو گیا تو وہ شخص ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا کہ اگرچہ وہ زنا کرے، چوری کرے، حضور نے فرمایا: (ہاں) اگرچہ وہ زنا کرے اگرچہ وہ چوری کرے، تین مرتبہ تک حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہی سوال کرتے رہے اور حضور بھی حسب سابق جواب دیتے رہے، جب چوتھی مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوال کو مکرر کیا تو حضور نے جواب دے کر ارشاد فرمایا: ”وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ“ ہاں وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ناک خاک آلود ہو جائے۔ (مسلم کتاب الایمان، باب من مات لا یشک باللہ شیعاً، بخاری، حدیث: ۵۸۲۷)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کو بڑا جان رہے تھے کہ آدمی مرتکب کبائر ہو کر جنت میں کیسے داخل ہوگا؟ اس لیے بار بار سوال کر رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اپنی بات کو دہرا رہے تھے تاکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کو بڑا اور قابل تعجب نہ جانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تکرار پر حضور نے ارشاد فرمایا: اگرچہ ابوذر غفاری کی ناک خاک آلود ہو جائے۔ اس جملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناپسندیدگی بھی دکھائی دیتی ہے اور اس میں حکیمانہ انداز پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے ڈانٹ بھی تھی، مگر واہ رے ابوذر! تم عشق رسول میں کیسے کندن بن گئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈانٹ کو بھی اپنے لیے وجہ صد افتخار سمجھتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بھی اس حدیث کو بیان فرماتے تو آخر میں یہ الفاظ ضرور کہتے تھے ”وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ“۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۱۴۶۶، بخاری، حدیث: ۵۸۲۷)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسا کیوں کرتے تھے، اس کا جواب علامہ عینی نے یہ دیا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کو اپنے لیے باعث شرف اور وجہ افتخار سمجھتے تھے۔ (عمدة القاری، کتاب اللباس باب الثیاب البیض)

علامہ سعیدی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: اس حدیث میں مذکور ہے ”عَلَى رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ“، یعنی وہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ناک کو خاک میں ملاتا ہوا جنت میں داخل ہوگا یہ کلام بطور مجاز استعمال ہے یعنی خواہ وہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناپسند ہو پھر بھی وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حکایت کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے محبت و شرف اور افتخار کی وجہ سے تھا۔ (نعمۃ الباری، ج: ۱۲، ص: ۳۱۶)

شرف رداقت اور تلقین صبر: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھنے کا موقع بہت کم صحابہ کرام کو نصیب ہوا۔ جن کو حضور نے اس شرف سے مشرف فرمایا، ان بخت

آوروں میں ایک نام حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی ہے، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دراز گوش پر سوار تھے اور پیچھے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سوار فرمایا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل کے راز ہائے سربستہ سے پردہ اٹھانا شروع کیا اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صبر کی تلقین فرمائی، اے ابوذر! اس وقت کیا کرو گے؟ جب لوگوں میں سخت بھک مری پھیل جائے گی اور بستر سے مسجد تک جانے کی طاقت نہ بچے گی؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: برداشت کرنا اور کسی سے سوال نہ کرنا، اس وقت کیا کرو گے جب موت اس کثرت سے واقع ہوگی کہ قبر کی کھدائی کی قیمت غلام کی قیمت کے برابر ہو جائے گی؟ عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم، ارشاد فرمایا: صبر کرنا، اے ابوذر! اس وقت کیا کرو گے؟ جب لوگ اس کثرت سے قتل کیے جائیں گے کہ جبارۃ الزیت (ایک مقام کا نام ہے مدینہ منورہ میں) مقتولین کے خون میں ڈوب جائے گا، عرض کیا: اللہ ورسولہ اعلم، فرمایا: دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ جانا، عرض کیا: اگر وہاں بھی بچاؤ کی صورت نظر نہ آئے؟ فرمایا: اپنے اسی قبیلے میں چلے جانا جہاں سے تم آئے تھے، عرض کیا: حضور کیا میں ہتھیار نہ اٹھا لوں؟ فرمایا: اس سے فتنہ اور بڑھے گا لیکن جب تمہیں یہ خوف ہو کہ تلوار تم تک پہنچ چکی ہے تو اپنے چہرے کو چادر میں ڈھانک لینا اس طرح ظالم پردہ راگناہ ہوگا۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۱۳۲۵)

حدیث پاک سے معلوم ہوا حضور چھوٹی سواری پر بھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سوار کر لیتے تھے حالانکہ چھوٹی سواری پر عموماً کسی کو سوار نہیں کیا جاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو راز و نیاز کی باتیں کیں، اس سے بارگاہ رسالت میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بلند مرتبے کا پتہ چلتا ہے۔

کریمانہ نوازشات: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رحمت عالم کا کرم جھوم کر برساتا تھا، اس غلام وفادار اور خادم خاص سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس قدر انس ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب بھی (عطا و بخشش کا) کوئی معاملہ

فرماتے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ محفل میں موجود ہوتے تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کام کی ابتدا فرماتے اور اگر محفل میں موجود نہ ہوتے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں دریافت فرماتے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۵۸، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۸۷، الاصابہ، ج: ۷، ص: ۶۲)

سادگی: علامہ فیض احمد ایسی لکھتے ہیں: ظاہر ہے کہ تربیت کنندہ جتنا کامل تر ہوگا تربیت یافتہ بھی کامل و اکمل ہوگا، ہر صحابی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تربیت نے گوہر آبدار بنا دیا لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ خصوصی رنگ میں رنگے گئے۔ آپ اکثر سواری گدھے پر کرتے، زمین پر آپ نے کبھی مکان کے لیے دیوار نہ بنائی، ہمیشہ کمبل کے خیموں میں رہائش اختیار کرتے، مدینہ شریف، شام یا زبدہ جہاں بھی رہے، یہی آپ کا مکان ہوتا، بستر ہمیشہ ٹاٹ کا ہوتا جس پر ہمیشہ یہ اصدق المسلمین آرام فرماتے، آپ کا اصل طرہ امتیاز نسبت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا احترام ہے جس کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کسی لمحہ بھی آپ نے مجروح نہیں ہونے دیا، اپنی زندگی کو جس صبغۃ اللہ میں آپ نے رنگین کیا تھا وہی رنگ سارے زمانے پر غالب کر دینا چاہتے تھے، احقاق حق اور ترویج سنت کا فریضہ آپ نے تادم حیات سرانجام دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے اس عظیم تلمیذ کو اس کی زندگی کے مختلف مراحل کے لیے خطوط عمل مرتب کر دیے تھے۔ (سوانح ابوذر، ص: ۴۳)

عاجزی: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بایں عظمت شان اپنے چھوٹوں کے ساتھ عاجزی سے پیش آتے تھے، ایک مرتبہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غصیف نامی ایک نوجوان کی تعریف کی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تعریف امیر المومنین سے سماعت کی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غصیف سے ملاقات کی اور فرمایا: بھائی میرے لیے دعائے مغفرت کیجیے تو نوجوان نے حقیقت بیان کرتے ہوئے عرض کیا: حضور! آپ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں

آپ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ میرے لیے استغفار کریں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ غصیف کیا ہی بہترین نوجوان ہے، عمروہ ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان پر حق جاری فرما دیا ہے“ (انہوں نے جو فرمایا ہے وہ حق اور سچ ہے لہذا تم میرے لیے دعا کرو) (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۲۹۵)

حق گوئی: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کو بلا خوف و تردد بیان فرماتے تھے، وہ اس بات کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ان کی حق بیانی کس کے خلاف ہے؟ وہ اس کو بیان کرتے تھے چاہے وہ کسی امیر کے خلاف ہو یا غریب کے، خواہ اس کی قیمت انہیں کچھ بھی چکانا پڑے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ عمدہ مکانات میں خود رہتے تھے نہ ان کو بنانا پسند کرتے تھے، اگر کوئی بناتا تو اس پر سخت تنقید کرتے تھے، اس سلسلے میں حضرت ابوذر داء کا واقعہ گزر چکا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو مکان بناتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: تمہارا اپنے گھر والوں کی گندگی (بیت الخلاء) میں ہونا مجھے تمہاری اس حالت سے زیادہ پسند ہے۔ (حلیۃ الاولیاء ج: ۱، ص: ۱۶۳)

دمشق میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی الخضر اء نامی عمارت بنوا رہے تھے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا تو فرمایا: اے امیر معاویہ! اگر یہ عمارت اللہ کے مال (بیت المال) سے بنائی جا رہی ہے تو یہ خیانت ہے اور اگر آپ کے ذاتی مال سے بنائی جا رہی ہے تو یہ اسراف ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سن کر خاموش رہے، کوئی جواب نہ دیا۔

(انساب الاشراف، ج: ۵، ص: ۵۲۲، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۷۴)

آپ حکام پر تنقید کرتے ہوئے اعلانیہ فرماتے تھے: خدا کی قسم! میں ایسے اعمال دیکھ رہا ہوں جو کتاب اللہ میں ہیں نہ سنت رسول اللہ میں، حق کے چراغ کو بجھایا جا رہا ہے اور باطل کو فروغ دیا جا رہا ہے، سچے کو جھٹلایا جا رہا ہے اور جھوٹے کو ترجیح دی جا رہی ہے۔

(انساب الاشراف، ج: ۵، ص: ۵۴۲)

ایک بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور فرمایا: آپ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کیوں کہتے ہیں؟ اس پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ابوذر! اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، کیا ہم اللہ کے بندے اور مال اللہ کا مال نہیں ہے؟ سب اسی کا تو ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: بے شک سب اسی کا ہے لیکن اس مال کو مسلمانوں کا مال کہیے۔ (التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان لابن عبد اللہ محمد بن یحییٰ، ج: ۱، ص: ۸۴)

حق گوئی پر حضرت علی کی گواہی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت لی تھی کہ وہ ہمیشہ حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملے میں کسی بھی ملامت کا خوف نہیں کریں گے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بیعت پر مردانہ وار قائم رہے اپنے آقا سے کیا وعدہ ہمیشہ نبھاتے رہے، ہم سند کے طور پر حضرت مولائے کائنات علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کا ارشاد پیش کر رہے ہیں:

حضرت علی ارشاد فرماتے ہیں: آج ہر شخص اللہ تعالیٰ کے معاملے میں ملامت کرنے والے کی پرواہ کرتا ہے سوائے ابوذر کے، کہ وہ حق کہنے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے، میں اپنے آپ کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دے رہا ہوں، یہ کہتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر مارا۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۶۲، تاریخ اسلام، ج: ۳، ص: ۴۰۷، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۹۴)

عہدے داروں سے دوری: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو دولت و ثروت سے دور بھاگتے ہی تھے، وہ حضرات جن کا تعلق کسی نہ کسی طور پر مال و منال سے ہوتا ان سے ملاقات بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو جلیل القدر صحابہ میں شمار کیا جاتا ہے، جب عراق کے گورنر بنے اور واپس آئے تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کی، بڑی خندہ پیشانی اور بڑے ہی پر تباک انداز میں ملے، ابو موسیٰ جوشِ محبت میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ چمٹ جانا چاہتے تھے،

بھائی بھائی کہہ کر آگے بڑھے لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑے واضح انداز میں کہا: ابو موسیٰ تم میرے بھائی اس وقت تھے جب گورزنہ تھے، آج تم میرے بھائی نہیں ہو، مجھ سے دور ہی رہنا۔ اسی دوران آپ کی ملاقات حضرت ابو ہریرہ سے ہوئی ان سے بھی آپ نے دوری بنائی، حضرت ابو ہریرہ آپ کو گلے لگانا چاہتے تھے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھ سے دور رہنا، اس کے بعد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے چند سوالات کیے، جوابات سن کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مطمئن ہو گئے کہ ابو ہریرہ دنیا دار نہیں بنے ہیں تو پھر پورے جوش کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ہاں! تم میرے بھائی ہو، تم میرے بھائی ہو، ملاقات کے لیے راضی ہو گئے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۶، طبری، ج: ۱، ص: ۵۳۳، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۰)

مہمانوں اور ہمسایوں کا خیال: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ اپنے پاس مال کے ڈھیر نہ رکھتے تھے تاہم جو کچھ بھی ان کے پاس تھا اس میں قطعاً کن جوسی سے کام نہ لیتے تھے، انہوں نے اپنے محبوب سے پڑوسیوں اور مہمانوں کے بارے میں جو سن رکھا تھا اس پر مکمل حد تک عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے، غربت کی وجہ سے ضیافت و خدمت میں جو کمی رہ جاتی اس پر نہایت ہی عاجزی کے ساتھ معذرت کرتے۔

خود بھوکے رہ جاتے لیکن مہمانوں اور پڑوسیوں کو کھلاتے: عیسیٰ بن عمیلہ کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے خبر دی جس نے بچشم خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عمل کو دیکھا کہ آپ نے بکریوں کا دودھ نکالا اور سب سے پہلے اپنے پڑوسیوں اور مہمانوں کو پلایا۔ ایک رات میں نے ان کو دیکھا بکری کے تھنوں میں کچھ دودھ تھا اس کو اپنے ہاتھوں سے نکالا پھر اپنے مہمان اور پڑوسیوں کے پاس لائے، ساتھ میں تھوڑی سی کھجوریں بھی پیش کیں پھر ان لوگوں کے سامنے عذر پیش کرتے ہوئے کہنے لگے: اگر میرے پاس اس سے بہتر ہوتا تو ضرور اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔ خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حال یہ تھا کہ انہوں نے اس رات کچھ بھی نہ چکھا تھا۔ (تاریخ

دُشَق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۳)

دنیا سے کنارہ کش لوگ عام طور پر اکھڑ مزاج ہوتے ہیں لیکن یہ صحبت حضور کی بہاریں تھیں کہ کبھی بھی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کی فضیلت سے عاری نہیں ہوئے۔

سب سے محبوب اور سب سے مبغوض: نعیم بن قعب ریاچی فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے، ان کی اہلیہ نے بتایا کہ وہ کھیت پر گئے ہوں گے، میں نے دیکھا کہ دو اونٹ آگے پیچھے چل رہے ہیں اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں ہانکتے ہوئے لارہے ہیں، اونٹوں کے گلوں میں مشکیں بندھی ہوئی تھیں، جب گھر پہنچ کر مشکیں اتار لیں تو میں نے عرض کیا: ابوذر! آپ ایسے شخص ہیں کہ مجھے آپ کی ملاقات سے زیادہ کسی شخص کی ملاقات محبوب نہ تھی اور نہ آپ کی ملاقات سے زیادہ کسی کی ملاقات مبغوض (ناپسند) تھی۔ آپ نے فرمایا: یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے عرض کیا: جناب میں زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے والا شخص ہوں، لہذا مجھے آپ کی ملاقات اس لیے بڑی محبوب تھی کہ آپ میرے لیے اس گناہ کی کوئی توبہ تجویز فرما کر مجھے اس گناہ سے نجات دلائیں گے (اور میں اس ڈر سے ملاقات سے نفرت کرتا تھا) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ فرمادیں کہ تمہارے لیے معافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا کہ یہ جاہلیت (زمانہ کفر) کی بات ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: (اسلام لانے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف فرمادیا۔ (کیونکہ اسلام ماقبل کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے)

بیوی کے ساتھ بردباری: پھر آپ نے اپنی اہلیہ کو اشارہ کیا کہ میری ضیافت کے لیے کچھ پیش کریں، یہ سن کر محترمہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ناراض ہو گئیں (شاید اس لیے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مہمانوں کے شایان شان گھر میں کچھ بندوبست نہیں رکھتے تھے بلکہ فقر و فاقہ کی زندگی گزارتے تھے) آپ نے دوبارہ فرمایا: بیوی نے پھر ناراضگی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔

پھر آپ نے فرمایا: محترمہ رہنے بھی دیجیے، کیا اس سے بھی آگے گزر جانے کا خیال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے بارے میں فرما چکے ہیں؟ نعیم نے عرض کیا: حضور نے عورتوں کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ”عورتوں کی تخلیق ٹیڑھی پسلی سے کی گئی ہے اگر تم ان کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو یہ ٹوٹ جائے گی اور اگر ان کو چھوڑ دو گے تو ٹیڑھ کے باوجود فائدہ دیں گی۔“

روزہ اور کھانا دونوں ساتھ ساتھ: اب محترمہ گئیں اور کھانے کے لیے ٹرید لے کر آئیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے فرمایا: آپ کھائیں اور میری پرواہ نہ کریں کیونکہ میں روزہ دار ہوں، آپ نے یہ فرمایا اور نماز پڑھنے لگے، آپ نے ہلکی نماز پڑھی، میں نے دیکھا آپ غور کر رہے تھے کہ میں شکم سیر ہو گیا ہوں، اب آپ تشریف لائے اور میرے ساتھ کھانا کھانے لگے، میں نے پڑھا: ”اَنَا لِلّٰهِ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ فرمایا: کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا: کم سے کم میں آپ کے بارے میں تو جھوٹ کا گمان نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا: جب سے ملاقات ہوئی آپ کو میری کونسی بات جھوٹی لگی؟ میں نے عرض کیا: کچھ دیر پہلے تو آپ نے کہا تھا کہ آپ روزہ دار ہیں اور اب میرے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، آپ نے فرمایا: (میں نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ کہا تھا، یہ الگ بات ہے تم سمجھ نہ سکتے) بے شک میں نے یہی کہا تھا (اب میری بات کی تفصیل سنو) میں نے اس مہینے کے تین روزے رکھ لیے ہیں (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس نے تین روزے ایک ماہ میں رکھ لیے تو وہ پورے ماہ روزہ دار ہے) لہذا میرے لیے پورے ماہ کے روزوں کا ثواب بھی ثابت ہو گیا اور تمہارے ساتھ کھانا بھی جائز ہو گیا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۳۳۹)

کم و بیش ایسا ہی ایک واقعہ آپ کا حضرت عبداللہ بن شقیق عقیلی کے ساتھ بھی مروی ہے۔ دربار فاروقی میں دونوں کو داخل ہونا تھا (حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرے کو دیکھ کر) حضرت عبداللہ نے کہا کہ آپ روزے سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں!

دونوں دربار میں داخل ہوئے کچھ چیز کھانے کے لیے پیش کی گئی تو عبداللہ کے ساتھ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کھانے لگے، عبداللہ نے اشارے سے روزہ یاد دلا یا تو آپ نے فرمایا: جو میں نے کہا تھا میں بھولا نہیں ہوں، میں اس ماہ میں تین روزے رکھ چکا ہوں لہذا میں پورے مہینے روزہ دار ہی ہوں۔

السنن الکبریٰ میں تقریباً ایسا ہی ایک اور واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی موجود ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر: ۸۲۲۱)

حضرت ابوذر غفاری کی کل کائنات: ایک شامی شخص حضرت ابوذر غفاری رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچا، اس نے دیکھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ چولہا جلا کر کچھ پکا رہے ہیں، لکڑیاں گیلی ہونے کی وجہ سے چولہا جلانے میں مشقت کا سامنا تھا حال یہ تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، یہ حال دیکھ کر ان کی بیوی نے کہا: اگر آپ چاہیں تو اس مشقت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ (یہ سن کر آپ غصہ ہو گئے) آپ نے فرمایا: سنو! میں ابوذر ہوں اور جو تم دیکھ رہی ہو یہی میری زندگی ہے اگر تمہیں پسند ہے تو بہتر ورنہ السلام علیکم، یہ کہہ کر بیوی کو بالکل خاموش کر دیا۔ جب پتیلی پک چکی تو اس کو ایک بڑی پلیٹ میں انڈیل دیا اور اس میں موٹی موٹی روٹی چوردی گئی، ہمیں بھی کھلایا اور اپنی بیوی کو بھی کھلایا، پھر آپ کی خادمہ نے ہمیں بکری کا دودھ پلایا، میں نے کہا: آپ گھر میں کچھ تو آسائش زندگی رکھ لیجیے، آپ نے فرمایا: اے اللہ کے بندو! کیا تم مجھے اس سے زیادہ حساب دینے پر مجبور کرنا چاہتے ہو؟ یہ بستر ہے جس پر ہم آرام کرتے ہیں، یہ ایک کپڑا ہے جسے ہم بچھا لیتے ہیں، یہ چادر ہے جسے ہم اوڑھ لیتے ہیں، یہ پتیلی ہے جس میں ہم پکا لیتے ہیں، یہ پلیٹ ہے جس میں ہم کھا لیتے ہیں، یہ تیل کی بوتل اور یہ آلے کا تھیلا ہے، کیا اس سے زیادہ حساب دلانا چاہتے ہو؟ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۷)

گلے پر چھری ہو تب بھی حدیث بیان کروں گا: حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے میرے پاس آ کر کہا: امیر المومنین حضرت

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عاملین (زکاۃ کے وصولی پر مقرر کردہ افراد) زکاۃ کے معاملے میں ہم پر زیادتی کرتے ہیں تو کیا ہم بقدر زیادتی اپنا مال چھپالیا کریں؟ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: نہیں! بلکہ تم اپنا مال ان کے سامنے رکھو اور ان سے کہو کہ جتنا حق بنتا ہے اتنا ہی لو اور جس میں حق نہیں بنتا اسے چھوڑ دو پھر بھی اگر وہ تم پر ظلم کریں تو ان کا یہ ظلم نیکیوں کی صورت میں کل بروز قیامت تمہارے نامہ اعمال میں رکھا جائے گا، وہاں اس وقت ایک قریشی نوجوان کھڑا تھا اس نے کہا: کیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر المؤمنین حضرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتویٰ دینے سے منع نہیں کیا تھا؟ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کیا تم میرے نگہبان ہو؟ اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم میرے گلے پر چھری بھی رکھ دو اور مجھے یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو چھری چلنے سے پہلے نافذ کر سکتا ہوں تو میں ایسا ضرور کروں گا۔ (فتح الباری، ج: ۱، ص: ۱۰۸، عمدۃ القاری، ج: ۲، ص: ۸۳، باب العلم قبل القول، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۰، اللہ والوں کی باتیں، ج: ۱، ص: ۳۰۶)

شرعی مسائل میں اختلاف: زمانہ صحابہ سے لے کر آج تک مسائل فرعیہ، فقہیہ میں اختلاف ہوتا چلا آیا ہے اور یہ اختلاف قیامت تک جاری رہے گا، لیکن حکم یہی ہے کہ جمہور کی رائے پر عمل کیا جائے اور منفرد رائے کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجتہد خواہ اپنے مقام و مرتبہ میں کتنا بھی عظیم کیوں نہ ہو اس کی رائے جمہور کے مخالف ہو سکتی ہے۔ مجدد اعظم امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

صحابہ کرام سے ائمہ اربعہ تک رضی اللہ عنہم اجمعین کوئی مجتہد ایسا نہ ہوگا جس کے بعض اقوال خلاف جمہور نہ ہوں۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مطلقاً جمع زر کو حرام ٹھہرانا، ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نوم کو اصلاً حدیث نہ جاننا، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسئلہ ربا، امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسئلہ مدت رضاع، امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسئلہ متروک التسمیہ عمداء، امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسئلہ طہارت سور کلب وتعبید

غسلات سبع، امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسئلہ نقض وضوء بلغم جزو وغیرہ مسائل کثیرہ۔

(فتاویٰ رضویہ، ج: ۱۸، ص: ۲۹۳)

اجتہاد کی اہلیت رکھنے والے مجتہد سے اگر اجتہاد میں غلطی بھی ہو جائے تب بھی اسے ثواب دیا جاتا ہے لہذا مجتہدین کرام لعن طعن کے نہیں بلکہ تعظیم کے مستحق ہیں۔

حدیث پاک کا مفہوم ہے اگر اجتہاد کرنے والے کا اجتہاد صحیح ہو تو اسے دوا جر ملتے ہیں اور اگر اجتہاد میں خطا ہو جائے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔ (بخاری شریف، حدیث: ۷۳۵۲)

حضرت ابوذر غفاری کا منفرد فقہی مذہب: شارح بخاری حضرت مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ حاجت سے زیادہ مال جمع کرنا حرام ہے، وہ اپنے اس اجتہاد پر بہت سخت تھے لوگوں پر اس سلسلے میں بہت سخت تنقید فرماتے جس سے خلفشار مچا رہتا۔ (نزہۃ القاری، ج: ۱، ص: ۳۴۵)

حضرت ابوذر غفاری کا مذہب جمہور صحابہ کے خلاف تھا: شارح بخاری علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف یہ تھا کہ انسان پر اپنی ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنا حرام ہے لیکن یہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اجتہاد تھا اور ان کی انفرادی رائے تھی، جمہور صحابہ کا یہ موقف نہیں ہے اگر انسان پر اپنی ضرورت سے زائد مال جمع کرنا حرام ہو تو پھر زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی کیونکہ جو مال انسان کی ضرورت سے زائد ہو اور وہ نصاب کی مقدار کے برابر ہو تب اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور جب وہ مال جمع ہی نہیں کر سکتا تو پھر زکوٰۃ اس پر کیسے فرض ہوگی، اس طرح قربانی بھی ساقط ہو جائے گی اور اس پر حج بھی فرض نہیں ہوگا کیوں کہ اتنا مال جمع کرنا ہی اس کے لیے جائز نہیں ہوگا، اسی طرح نفلی صدقات بھی ساقط ہو جائیں گے اور چوری اور ڈاکے کی سزاؤں کی بھی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ جب اتنا مال جمع ہی نہیں ہوگا تو پھر کوئی کیسے چوری کرے گا اسی وجہ سے جمہور صحابہ نے حضرت

ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظریات کا ساتھ نہیں دیا۔ (نعمۃ الباری، ج: ۳، ص: ۶۱۶)

حضرت ابوذر غفاری کا حضرت امیر معاویہ سے اختلاف: امام بخاری نے بخاری شریف میں حدیث بیان فرمائی:

حضرت زید بن وہب نے کہا کہ میں ربذہ سے گزرا تو میری ملاقات حضرت ابوذر غفاری سے ہوئی، میں نے ان سے کہا: کس چیز نے آپ کو اس جگہ پہنچایا؟ تو انہوں نے فرمایا: میں شام میں تھا مجھ میں اور معاویہ میں اس آیت کے بارے میں اختلاف ہوا جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دو، معاویہ نے کہا: یہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، میں نے کہا: یہ ہمارے اور ان کے دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس سلسلے میں میرے اور ان کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس میری شکایت لکھی اس پر حضرت عثمان نے مجھے لکھا کہ تم مدینے آ جاؤ، میں مدینہ گیا، لوگ میرے پاس بکثرت جمع ہو گئے گویا اس سے پہلے مجھے انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا، میں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا: اگر تم چاہو تو کہیں قریب پاس میں گوشہ نشین ہو جاؤ اسی وجہ سے میں یہاں ہوں اور اگر لوگ حبشی کو امیر بنادیں تو اس کا بھی حکم سنوں گا اور مانوں گا۔ (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر: ۱۴۰۶)

اختلاف کی تفصیل: شارح بخاری حضرت مفتی شریف الحق صاحب امجدی علیہ

الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:

ربذہ مدینہ سے تین منزل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے، حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے زکوٰۃ کے اونٹوں کی چراگاہ بنادی تھی۔ مسند ابویعلیٰ میں زید بن وہب سے مروی ہے کہ خود حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! جب مدینہ کی آبادی کوہ سلع تک پہنچ جائے تو تم شام چلے جانا، اسی ہدایت کے بموجب جب مدینہ طیبہ کی آبادی کوہ سلع تک پہنچ گئی تو یہ شام دمشق

چلے گئے، وہاں اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی تھے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ جتنی آمدنی ہو حاجت سے جو بچے سب کا صدقہ کرنا فرض ہے، حاجت سے زائد جمع کرنا حرام ہے، آدمی بہت پر جوش اور جری تھے، آپ اس مسلک کی علانیہ تبلیغ فرماتے تھے، اس سے وہاں ایک خلفشار مچا ہوا تھا چونکہ سابقین اولین میں سے تھے اور بہت معزز صحابی تھے اس لیے عوام کا رجحان ان کی طرف زیادہ تھا، آخر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زوردار گفتگو ہوئی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت کریمہ مذکورہ تلاوت فرمائی، ان کا اجتہاد یہ تھا کہ اس آیت میں ”وَلَا يَنْفِقُونَهَا“ سے مراد بقدر حاجت سے جو زائد ہو سب کا سب خرچ کرنا ہے صرف بقدر زکوٰۃ صرف کرنا مراد نہیں۔ اور حضرت معاویہ کا خیال تھا کہ یہ یہود و نصاریٰ، احبار اور رہبان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ آیت کا ابتدائی حصہ یہ ہے ”إِنَّ كَيْفِيًّا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ“ (بہت سے احبار اور رہبان لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں) حالانکہ دونوں حضرات سے خطا ہوئی۔ نہ یہ آیت کریمہ اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے اور نہ (وَلَا يَنْفِقُونَهَا) سے کل مال مراد ہے بلکہ یہ آیت کریمہ عام ہے اور (وَلَا يَنْفِقُونَهَا) سے زکوٰۃ ادا کرنا مراد ہے، کل مال کا صرف کرنا نہیں، اس پر اجماع ہے اور یہ آیات و احادیث سے بھی ثابت ہے، ارشاد باری ہے: ”وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا“ اور ہاتھ ایک دم مت پھیلا دے پھر ملامت خردہ حسرت زدہ ہو کر بیٹھا رہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی تھے اور ان کا مذہب پوری امت سے الگ تھا، اس لیے لوگ جوق در جوق آتے، ان سے طرح طرح کے سوال کرتے جس سے گھبرا کر حضرت عثمان کی خدمت میں شکایت کی، حضرت عثمان نے دو باتیں پیش کیں، آپ چاہیں تو میرے گھر رہیں، اونٹنیاں دروازے پر حاضر کی جائیں گی یعنی نہ کہیں جائیں

نہ کسی سے ملیں جلیں یا چاہیں تو مدینہ کے قریب کہیں بود و باش اختیار کر لیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسری صورت اختیار کر لی اور ربذہ جا کر فروکش ہو گئے، یہ بہتان ہے کہ حضرت عثمان نے انہیں جلاوطن کر کے ربذہ بھیجا تھا، یہ ہو سکتا ہے کہ جب ان کے گھر رہنا پسند نہ فرمایا تو ربذہ رہنے کی راے دی ہو جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبول فرمائی۔ (نزہۃ القاری، ج: ۴، ص: ۱۶۸)

صحابہ کے ذریعے کنز کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش: آپ پڑھ آئے ہیں کہ مال جمع کرنے کے مسئلے میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف جداگانہ تھا، دمشق میں جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے موقف کی تبلیغ فرمائی تو حضرت معاویہ نے صحابہ کرام کے ذریعے ان کے سامنے مسئلہ کی وضاحت کرانا چاہی لیکن اس سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہو سکا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے موقف پر اڑے رہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

حضرت قنبر کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت امیر معاویہ پر سخت تنقید کرتے تھے تو اس سلسلے میں حضرت امیر معاویہ نے حضرت عبادہ بن صامت، حضرت ابودرداء، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضرت ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے اپنی بات رکھتے ہوئے کہا: آپ سب حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، جو معاملہ پیش آ رہا ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو اس سلسلے میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بات کریں (انہیں سمجھانے کی کوشش کریں) پھر حضرت امیر معاویہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تشریف لانے کا پیغام بھیجا اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے، جب صحابہ کرام کی اس جماعت نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سمجھانے کی کوشش کی تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر ایک سے جدا جدا خطاب کیا، چنانچہ آپ نے حضرت

عبادہ بن صامت سے فرمایا: اے ابوولید! رہے آپ تو بے شک آپ مجھ سے پہلے ایمان لائے، آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور آپ مجھ پر فضیلت بھی رکھتے ہیں (کیونکہ آپ نے حضور کی صحبت مجھ سے زیادہ پائی ہے) اس فضیلت کے باوجود آپ کا اس محفل میں شریک ہونا مجھ پر گراں ہے (آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے) اور اے ابوذر داء! آپ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب ایمان لائے ہیں، اس کے بعد بے شک آپ ایک صالح مؤمن ثابت ہوئے (لیکن حضور کے ساتھ آپ کو رہنے کا موقع اتنا نمل سکا جتنا ہم نے پایا تو آپ ہم سے کیا بات کر سکتے ہیں) اور اے عمرو بن عاص! رہے آپ تو آپ کا زیادہ تر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں گزرا (مسائل سیکھنے کا موقع آپ کو زیادہ نمل سکا تو آپ ہم سے کیا بات کر سکتے ہیں) رہیں محترمہ ام حرام تو آپ ایک عورت ہیں، آپ کی عقل ایک عورت کی عقل ہے آپ کو اس (پیچیدہ مسئلہ) سے کیا سروکار؟ حضرت عبادہ کہتے ہیں: اس کے بعد میرا کبھی ایسی محفل میں بیٹھنا نہ ہوا۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۱۳۰۹)

حضرت معاویہ نے امتحان لیا: آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سونا چاندی دراہم اور دنانیر جمع کرنے کے سخت خلاف تھے، اس سلسلے میں ان کا حضرت معاویہ سے مناظرہ بھی ہو چکا تھا، یہ جانچنے کے لیے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے قول و فعل میں کس حد تک سچے ہیں؟ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ہزار دنانیر سے بھری ایک تھیلی رات کی تاریکی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجی، قاصد رات کی تاریکی میں تھیلی دے کر واپس آ گیا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد قاصد کو بلایا اور فرمایا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو میں غلطی سے تھیلی آپ کو دے گیا تھا وہ تھیلی امیر معاویہ نے کسی اور شخص کے لیے بھیجی تھی، برائے کرم اب میری جان امیر معاویہ کی سزا سے بچائیے اور وہ تھیلی مجھے واپس کر دیجیے، قاصد کو جو بتایا گیا تھا اسی کے مطابق اس نے عمل کیا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تھیلی واپس کرنے کا

مطالبہ کیا (حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوئی دنیا دار صوفی یا زاہد تو تھے نہیں، یہاں تو باطن ظاہر سے زیادہ پاکیزہ اور مصفا تھا) آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قاصد سے فرمایا: بیٹے! امیر معاویہ سے کہنا وہ دنیا نیر تو ہم نے صبح ہونے سے پہلے ہی خرچ کر ڈالے، صبح تک ہمارے پاس اس میں سے ایک بھی دینار باقی نہ رہا، ہاں! اگر ان کو اپنے دینار واپس چاہیے تو ہمیں تین دن کی مہلت دیں ہم دینار کا انتظام کر کے انہیں واپس کر دیں گے، اس سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یقین اور پختہ ہو گیا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فعل ان کے قول کی مکمل تصدیق کر رہا ہے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۰)

مال متعلق حدیث سخی کے ساتھ سناتے: حضرت اخف بن قیس نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ میں قریش کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا، پس ایک شخص آیا جس کے بال سخت اور کپڑے موٹے تھے اور اس کی شکل معمولی تھی حتیٰ کہ وہ اس جماعت کے پاس کھڑا ہو گیا اور ان کو سلام کیا اور کہا: مال جمع کرنے والوں کو یہ خوشخبری سنا دو کہ دوزخ کی آگ میں ایک پتھر گرم کیا جائے گا پھر اس کو ان میں سے کسی ایک کے پستان کے سر پر رکھ دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ اس کے کندھے کی اوپر والی ہڈی کے پار ہو جائے گا پھر وہ پتھر اس کے کندھے کی اوپر والی ہڈی پر رکھ دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اس کے پستان کے سر سے نکل جائے گا پھر وہ پتھر اسی طرح لرزتا رہے گا پھر اس نے پیٹھ پھیری اور ایک ستون کی طرف بیٹھ گیا، میں اس کے پیچھے آیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تمہاری بات سن کر ناراض ہوئے ہیں، اس نے کہا: یہ بے عقل لوگ ہیں۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۰۷)

حضرت ابوذر غفاری کے نظریہ سے سونلزم پر استدلال: حضرت علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نظریہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے مال میں سے صرف اپنی ضرورت کی اشیاء اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور جو چیزیں اس کے کھانے اور پینے

سے زائد ہوں ان کا صدقہ کرنا اس پر واجب ہے اور جس شخص نے اپنی ضرورت سے زائد چیزوں کو صدقہ نہیں کیا اس کی چیزیں اور مال کنز (خزانہ) ہے، جس پر قرآن مجید نے عذاب کی وعید سنائی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يُخْمَلُ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فُتُكُومٌ بِهَا جَبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَذَا مَا كُنْتُمْ لَا تُفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿۳۵﴾“ (سورہ توبہ: ۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے، جس دن (ان کا جمع کردہ مال) جہنم کی آگ میں پتیا جائے گا، جس سے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ وہ مال ہے جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا اب اپنے جمع کردہ مال کا مزا چکھو۔

جو لوگ اپنی ضرورت سے زائد اشیاء کو صدقہ نہیں کرتے تھے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک وہ اس آیت کے مصداق تھے، ایک اور آیت سے بھی اس نظریے پر استدلال کیا جاتا ہے، ”وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْغَفْوُ ط“ (بقرہ: ۲۱۹) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جو چیز تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔ بعض لوگ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظریے سے سوشلزم کے جواز پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضرورت سے زائد اشیاء کو قومی ملک میں لینا عین اسلامی نظریہ ہے، یہ بات قطعاً باطل ہے کیونکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اجتہاد سے مستحب چیزوں کو واجب قرار دیتے تھے، ان کا یہ نظریہ ان کی اجتہادی خطا تھی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی نے ان کی موافقت نہیں کی، ان کے نظریہ کے بطلان پر قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں واضح دلائل ہیں، اگر انسان پر زائد اشیاء کا صدقہ کرنا واجب ہو تو زکاۃ، عشر اور خراج بے معنی ہو گئے، حج اور قربانی کے احکام لغو ہو جائیں گے کیونکہ جب کسی کے پاس ضرورت سے زائد مال نہیں ہوگا اور اس

کو شرعاً رکھنا جائز نہیں ہوگا تو زکوٰۃ کس چیز کی دے گا؟ عشر اور خراج اور خمس کس مال سے نکالے گا؟ حج اور عمرہ کیسے ادا کرے گا؟ اور کس چیز کی قربانی دے گا؟ نیز چوری اور ڈاکے پر قرآن مجید نے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے جو احکام بیان کیے ہیں ان کا کوئی محل نہیں رہے گا، کیونکہ جب کسی شخص کو ضرورت سے زائد اشیا رکھنے کی شرعاً اجازت ہی نہیں ہے تو پھر کسی شخص کے پاس مال کہاں ہوگا؟ جس کی وہ حفاظت کرے گا اور اس کو چوری اور ڈاکہ کا کب خوف ہوگا؟ قرآن مجید میں قتل خطا، قسم اور ظہار کے کفارے میں جو غلام آزاد کرنے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے، ان حالات میں ان کی مشروعیت بے معنی رہے گی، قتل خطا میں قرآن مجید نے دیت واجب کی ہے اور حدیث شریف سے دیت کی مقدار سو اونٹ بیان کی ہے، سوال یہ ہے کہ جب کسی شخص کو دو جوڑے کپڑے اور دو وقت کی روٹی سے زیادہ مال جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے تو ایسے لوگوں پر سو اونٹوں کی ادائیگی کا حکم نازل کرنا کس طرح صحیح ہوگا؟ قرآن مجید میں مسجد تعمیر کرنے کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے ”إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“ (سورہ توبہ: ۱۸) اللہ کی مساجد صرف وہ لوگ تعمیر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد بنانے پر جنت کی بشارت دی ہے تو کیا خدا اور رسول نے ان لوگوں کو جنت بنانے کا مکلف کیا ہے جن کو دو جوڑے کپڑے اور دو وقت روٹی کے انتظام سے زیادہ مال جمع کرنے کی اجازت نہیں دی، کیا یہ لوگ مسجدیں بنا سکتے ہیں؟ مجاہدوں کو سامان حرب خرید کر دے سکتے ہیں، اور جن صدقات جاریہ کی احادیث میں ترغیب ہے وہ یہ لوگ کر سکتے ہیں؟ جو لوگ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظریہ سے اشتراکیت کے جواز پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیداوار کے اجتماعی مآخذ کو قومی تحویل میں لینا واجب ہے، وہ مغالطہ آفرینی کرتے ہیں، اس نظریہ کو قبول کر لینے سے آدھے سے زیادہ اسلام کے احکام ختم ہو جاتے ہیں نیز اشتراکیت انسانوں کو انسان کا غلام بناتی ہے جبکہ اسلام انسانوں پر انسان کا تسلط ختم کر کے سب انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا تسلط

قائم کرتا ہے، یہ خوبصورت فریب دیا جاتا ہے کہ اشتراکیت کے ذریعے زمین داری اور کارخانہ داری ختم ہو جائے گی اور کوئی مزدور اور کسان نہیں رہے گا، سب مالک ہو جائیں گے حالانکہ اشتراکیت میں مزدور پہلے سے زیادہ مزدور اور کسان پہلے سے زیادہ کسان ہو جاتا ہے، پہلے جائز مالکین کیلئے مزدوری کرتا تھا اور اب ناجائز قابضین کے لیے مزدوری کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ضرورت کے وقت مالداروں سے دولت مانگ لی تھی چھینی نہیں تھی، سواد عراق سے مغالطہ دینا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ حضرت عمر نے عراق کی مفتوحہ زمین مجاہدین کی ملک میں نہیں دی تھی یہ نہیں کیا تھا کہ کسی کی مملوکہ چیز کو قومی تحویل میں لے لیا ہو۔ (شرح صحیح مسلم، ج: ۲، ص: ۹۲۰)

کعب احبار کو لاٹھی مار دی: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے موقف پر کس سختی کے ساتھ قائم تھے؟ اس کا اندازہ آنے والی حدیث سے لگائیں، حضرت کعب احبار نے ان کے موقف کے خلاف مسئلہ بیان کیا تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو لاٹھی دے ماری۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے حضرت عثمان غنی کی خدمت میں حاضری کی اجازت مانگی، اجازت مل گئی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں لاٹھی تھی (وہاں کعب احبار پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے) حضرت عثمان نے فرمایا: اے کعب! حضرت عبدالرحمن کی وفات ہوئی، انہوں نے بہت مال چھوڑا، اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ فرمایا: اگر اس میں اللہ کا حق ادا کرتے ہوں تو کوئی حرج نہیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لاٹھی اٹھا کر کعب کو ماری اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے ”مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس اس پہاڑ برابر سونا ہو جسے میں خیرات کروں اور وہ قبول ہو جائے کہ اس سے چھداوقیہ اپنے پیچھے چھوڑ دوں۔“ اے عثمان! تمہیں اللہ کی قسم! کیا تم نے حضور کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے؟ یہ آپ نے تین بار فرمایا: آپ نے کہا: ہاں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۱۸۸۲)

حضرت ابوذر غفاری کا ماریا حالت جذب میں تھا: حدیث پاک کی شرح کرتے ہوئے علامہ احمد یار خان نعیمی تحریر فرماتے ہیں:

حضرت عثمان غنی نے حضرت ابوذر غفاری کی موجودگی میں کعب احبار سے مسئلہ پوچھا کہ عبد الرحمن بن عوف بہت مال چھوڑ کر وفات پا گئے ہیں، تمہارا کیا خیال ہے؟ آیا مال جمع کرنا اور بال بچوں کے لیے چھوڑ جانا جائز ہے یا نہیں؟ مرقاۃ میں ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے دو لاکھ دینار چھوڑے تھے، خیال رہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زاهد ترین صحابہ میں تھے، ان کا خیال تھا کہ

تج ڈال مال و دھن کو کوڑی نہ رکھ کفن کو

جس نے دیا ہے تن کو دے گا وہی کفن کو

زہد و ترک دنیا کی احادیث پر سختی سے عامل تھے اس لیے ان کی موجودگی میں یہ سوال و جواب ہوئے تاکہ وہ حکم شرعی اور زہد میں نیز تقویٰ اور فتویٰ میں فرق کر لیں، یعنی مال جمع کرنا بعد وفات چھوڑ جانا حلال ہے جبکہ اس سے زکاۃ، فطرہ، قربانی، حقوق العباد ادا کیے جاتے رہے ہوں، یہ کنز میں داخل نہیں جس کی قرآن کریم میں برائی آئی ہے۔

یہ ماریا بحالت جذب تھا، آپ اپنے نفس پر قابو نہ پاسکے چونکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بزرگ ترین صحابی تھے، تمام صحابہ آپ کا بہت احترام کرتے تھے، ان کی ناراضگی یا مار پر ناراض نہ ہوتے تھے۔ جیسے آج بھی سعادت مند جوان محلہ کہ بزرگوں کی سختی پر ناراض نہیں ہوتے، اس لیے خلیفۃ المسلمین نے ان سے قصاص کے لیے نہ کہا، نہ حضرت کعب نے کچھ برا مانا، ہو سکتا ہے کہ آپ کی یہ ماریا دیب و سرزنش کے لیے ہو کہ تم تو کہہ رہے ہو کہ مال جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں، حالانکہ امیر سخی بھی مسکینوں سے پانچ سو برس بعد جنت میں جائیں گے، حساب میں دیر لگے گی، یہاں مرقاۃ میں ہے کہ بعد میں حضرت عثمان نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ منورہ سے مقام ربذہ میں بھیج دیا تھا آپ تا وفات وہاں ہی رہے کیونکہ آپ کی طبیعت بہت جلالی تھی۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ اے کعب! تم تو کہتے ہو مال جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس سے فرائض ادا کر دیے جائیں مگر میں نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ”مال سارے کا سارا خیرات کر دینا کچھ باقی نہ رکھنا سنت ہے اور جمع کرنا خلاف سنت“ کیا خلاف سنت میں حرج نہیں ہوتا؟ مگر یہ جو دو سنا حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے کہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سب گھروالے سید المتوکلین تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث سننے کا اقرار تو کیا مگر حدیث کا مطلب سمجھایا کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ اپنے لیے فرمایا ہے، عام مسلمانوں کو اس کا حکم نہ دیا۔ (مرآۃ المناجیح، ج: ۳، ص: ۱۰۰، حدیث: ۱۸۸۲)

لوگ ابوذر پر ناراض نہیں ہوتے تھے: صحابہ کرام اور تابعین کے دلوں میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بڑا احترام تھا، سب آپ کی باتوں اور رد عمل کو کمال حلم کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے، آپ نے دیکھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت کعب احبار کو ڈنڈا مار دیا لیکن حضرت عثمان نے ان سے کچھ کہا نہ حضرت کعب احبار نے۔ صحابی رسول حضرت ابوذر کی ایک گواہی اور ملاحظہ کر لیں، فرماتے ہیں: اگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے ماریں یا میرے ہاتھ کاٹ دیں، تب بھی میں ان سے ناراض نہ رہوں گا۔ (الزہد لامام احمد، ص: ۱۲۱)

کیا آپ کو ربذہ میں رہنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا: بعض لوگ امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات پر معاذ اللہ یہ کہتے ہوئے طنز کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ سے شہر بدر کیا تھا۔ ابھی آپ حضرت مفتی شریف الحق کے حوالے سے پڑھ آئے ہیں ”یہ بہتان ہے کہ حضرت عثمان نے انہیں جلاوطن کر کے ربذہ بھیجا تھا“ اس بات کی تائید میں ہم مزید چند حوالے پیش کر رہے ہیں:

تاریخ دمشق میں ہے کہ حافظ ابوالقاسم رحمہ اللہ نے فرمایا: حضرت ابوذر غفاری

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ربذہ نہیں بھیجا تھا، جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس فتنے کا خوف ہوا جس سے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا تھا تو وہ از خود ربذہ چلے گئے۔ چونکہ کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ربذہ جانا اس واقعے (مسئلہ کنز کی سمجھائش و فہمائش) کے بعد ہوا تھا، جو آپ کے اور حضرت عثمان کے درمیان پیش آیا تھا، اس بات سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ حضرت عثمان نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ربذہ بھیجا تھا (یہ بات حضرت ابو القاسم نے یوں ہی نہیں کہہ دی ہے بلکہ اس پر ایک مضبوط سند پیش کی ہے) حضرت عبداللہ بن صامت کہتے ہیں: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ حضرت ام ذر فرماتی ہیں: خدا کی قسم! حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہیں نکالا تھا، بلکہ جب مدینہ طیبہ کی آبادی کوہ سلع تک پہنچ گئی تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ملک شام روانہ ہو گئے، پھر وہاں سے واپس مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور پھر آپ مقام ربذہ چلے گئے وہیں آپ نے انتقال فرمایا۔

حضرت غالب قطان فرماتے ہیں کہ میں نے حسن سے کہا: اے ابوسعید! کیا حضرت عثمان نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (مدینہ طیبہ سے) نکالا تھا؟ حضرت ابوسعید نے فرمایا: ”معاذ اللہ“ (میں اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں)

(تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۲)

یہی روایات علامہ ذہبی نے بھی اپنی کتاب میں نقل فرمائی ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۲) علامہ ابن سعد نے جو روایت نقل فرمائی ہے اس میں ہے ”جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ آگئے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے فرمایا: آپ میرے پاس رہیں، آپ کے لیے صبح و شام دودھ کی اونٹنیاں حاضر کی جائیں گی، آپ نے فرمایا: مجھے ضرورت نہیں، آپ مجھے ربذہ چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ اس پر حضرت عثمان نے انہیں ربذہ جانے کی اجازت دے دی۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۳)

حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی مرضی سے ربذہ رہنے لگے تھے۔ (انساب الاشراف، ج: ۵، ص: ۵۴۵)

ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو جلاوطن کر کے ربذہ بھیجا تھا، یہ واقعی حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بہتان ہے، اس سلسلے میں ابھی آپ حضرت ابوذر کی زوجہ کا بیان پڑھ آئے ہیں، ان کی زوجہ سے بہتر ان کے بارے میں خبر کون دے سکتا ہے؟ انہوں نے قسم کھا کر فرمایا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو جلاوطن نہیں فرمایا تھا۔

تنبیہ: جن کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ حضرت عثمان نے انہیں ربذہ بھیجا تھا، اس کا مطلب یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں ربذہ جانے کی اجازت دی تھی۔

اطاعت شعار ابوذر: صحابہ کرام اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان مسئلہ کنز میں بہت بڑا علمی اختلاف پایا جاتا تھا، جس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف سب سے جدا اور منفرد تھا۔ اس سلسلے میں وہ کسی کی بات مانتے تھے نہ اپنے موقف سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کے روادار تھے، وہ اپنے موقف کو بیان بھی کرتے اور اس کی تبلیغ بھی فرماتے تھے، انہوں نے اپنے موقف کو لے کر نہ کبھی دمشق کے امیر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سمجھوتا کیا اور نہ ہی امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتنہ پرور تھے نہ فتنہ پروروں کے ساتھی بلکہ وہ ایک سچے مؤمن اور مومنوں کے اچھے خیر خواہ تھے، وہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے خواہاں تھے، انتشار و افتراق سے ان کا دور کا بھی تعلق نہ تھا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے علمی اختلاف کے باوجود وہ انہیں امیر شہر اور امیر مملکت تسلیم کرتے تھے، ان کا جو حکم نائب خلیفہ یا نائب رسول اللہ کی حیثیت سے ہوتا تو اس پر وہ فوراً تسلیم خم کر دیتے، خلیفہ کے کسی بھی حکم سے وہ سرتابی نہیں کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے ”مجھے اگر حبشی غلام کی اطاعت کا حکم بھی دیا جائے گا تو میں اس کو بغیر چوں و چرا

تسلیم کر لوں گا، ان کا یہ دعویٰ صرف زبانی نہ تھا بلکہ انہوں نے ایسا عملی طور پر کر کے بھی دکھایا۔ قادر مطلق کی قدرتوں کی جانب سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صداقت کی تائید اور ان کے خلوص کے اظہار کا بھی عجیب حسن انتظام تھا کہ وہ ربذہ جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آخری قیام گاہ اور برزخی آرام کے لیے مقرر تھا، اس گاؤں کا امام حضرت امیر المؤمنین کی جانب سے ایک حبشی غلام ہی مقرر تھا۔

نماز کے وقت جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس حبشی غلام نے دیکھا تو صحابی رسول کے احترام میں مصلیٰ امامت چھوڑ کر اس امید پر پیچھے ہٹ گیا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ امامت فرمائیں گے، لیکن اس نقتہ جاں اور سوختہ جگر دیوانے کے سینے میں کوئی آرزو و امنگ مرضات خدا و رسول کے سوا زندہ بچی ہی کہاں تھی کہ وہ امامت فرما کر اس کو پورا کر لیتے۔ حکم ہوا: آپ ہی امامت فرمائیں، مجھے اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے، اگرچہ ذات مطاع حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو (اس حکم پر عمل کرنے کا موقع بھی آج میسر آ گیا ہے) کیونکہ آپ ایک حبشی غلام ہیں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۲۱۳)

بھڑکانے کی کوشش: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ربذہ منتقل ہو جانے کو بعض موقع پرستوں اور اسلام کے بدخواہوں نے بھنانا چاہا چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فتنہ برپا کرنے کے لیے اکسایا، فتنہ پرور شاید یہ بھول گئے تھے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس درسگاہ کے فاضل اجل ہیں؟ انہیں جس درسگاہ سے شرف تلمذ حاصل تھا اس درسگاہ کا ہر فارغ خلوص و وفا کا کفن ہمیشہ اپنے سر سجائے رکھتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ڈورے ڈالنے کے لیے اہل کوفہ کا ایک وفد ربذہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کرتا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی تلقین کرتا ہے، اس وقت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان فتنہ پروروں کو جو جواب دیا وہ تاریخ کا ایک زریں باب ہونے کے ساتھ ساتھ، ابوذر

کے خلوص و وفا کا سچا ترجمان، ان کی پاکیزہ سیرت کا چمکتا آفتاب، جماعت مسلمین کی خیر خواہی کا آئینہ دار اور اطاعت رسول و عشق رسول کی تاریخی دستاویز ہے۔

آپ نے فرمایا: میرے سامنے یہ باتیں نہ کرو۔ جو سلطان اسلام کو ذلیل کرے گا اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ خدا کی قسم! اگر عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے اونچے پہاڑ اور سب سے اونچے درخت پر مجھے سولی چڑھا دیں تب بھی میں ان کی اطاعت و پیروی کروں گا، اس پر صبر کروں گا اور ثواب کی امید رکھوں گا اور اس کو اپنے حق میں بہتر جانوں گا۔ اگر وہ مجھے اتنے فاصلے پر بھیج دیں جتنا فاصلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہے تو میں ان کی بات مانوں گا، اطاعت کروں گا، صبر کروں گا، ثواب کی امید رکھوں گا اور یقین کروں گا کہ یہی میرے لیے بہتر ہے، اور اگر وہ مجھے میرے گھر بھیج دیں تب بھی ان کی اطاعت کروں گا، صبر کروں گا اور اس پر ثواب کی امید رکھوں گا اور اپنے حق میں اسی کو بہتر سمجھوں گا۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۳)

قارئین غور کر سکتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغیر حیلہ و حجت اور بغیر کسی افہام و تفہیم کے کس انداز میں فتنے کی جڑوں کو کاٹ دیا؟ فتنہ پروروں کی ساری چالوں کو تار عنکبوت کی طرح بکھیر دیا، اس رد عمل کے بعد باطل دوبارہ حیلہ سازی کر سکتا ہے نہ پلٹنے کی ہمت۔

حاکم کی اطاعت کی ایک اور مثال: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کسی بھی عمل سے خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کرنے کے قائل نہ تھے وہ حتی الامکان مسلمانوں میں اتفاق دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی بہترین مثال آنے والا واقعہ ہے۔

موسم حج میں مقام منی کے اندر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے کسی نے بیان کیا کہ حج کے دوران منی میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چار رکعت نماز پڑھی ہے (نماز میں قصر نہیں کی ہے) یہ بات حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بہت

گراں گزری اور آپ بھڑک گئے، کافی سخت جملے استعمال کیے۔ فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ دو رکعات پڑھی ہے (حضور نے نماز میں قصر کیا ہے) اور حضرت ابوبکر و عمر کے ساتھ بھی میں نے نماز ادا کی ہے (انہوں نے بھی قصر کیا تو حضرت عثمان نے قصر کیوں نہیں کیا) اس کے بعد حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا فرمائی۔ لوگوں نے کہا: ابھی تو آپ اس سلسلے میں امیر المؤمنین پر ناراض ہو رہے تھے پھر آپ نے وہی عمل کیا جس پر آپ ناراض تھے، آپ نے فرمایا: اختلاف بہت بڑی اور بری چیز ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں ایک دن خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”میرے بعد ایک سلطان ہوگا اس کو ذلیل کرنے کی کوشش مت کرنا جس نے ایسا ارادہ کیا تو بے شک اس نے اسلام کی غلامی کا قلاوہ اپنی گردن سے نکال پھینکا، اس کی توبہ اس وقت تک قبول نہ ہوگی جب تک کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی درار کو بھرنہ دے اور وہ ایسا نہ کر سکے گا، ہاں! اگر وہ سلطان کی نافرمانی سے باز آجائے تو وہ سلطان کے عزت کرنے والوں میں شمار ہوگا“، ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ (سلاطین وقت) ہم پر تین چیزوں میں غالب نہیں آنا چاہیے۔ نیکی کا حکم دینے، اور برائی سے روکنے، اور لوگوں کو حضور کا طریقہ سکھانے میں۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۴۶۰)

حاکم امیر اور خلیفہ کی اطاعت کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت عثمان نے منیٰ میں قصر کیوں نہیں کی تو اس کا جواب علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ سے سنیے، آپ فرماتے ہیں: صحیح جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منیٰ میں شادی کر لی تھی اور جو شخص جس جگہ شادی کر لے وہ بھی اس کا وطن ہو جاتا ہے اور وہاں اس کو پوری نماز پڑھنا لازم ہے۔ (تفصیل کے لیے شرح مسلم کا مطالعہ کریں)

(شرح صحیح مسلم، ج: ۲، ص: ۳۸۱)

جذبات کا عالم یہ خیالات کا عالم: موسم حج فرزند ان توحید کے لیے مژدہ جانفزا سے کم نہیں، شوال المکرم کا چاند طلوع ہوتے ہی مؤمنوں کے دل خانہ کعبہ کی طرف خاص

طور پر کھینچنے لگتے ہیں، دل خانہ خدا کی جانب کیوں نہ کھینچیں کہ خدا کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہ الفاظ شامل تھے ”اے میرے معبود! لوگوں کے دلوں کو شہر مکہ کی طرف جھکا دے“ دعائے خلیل کے سر اجابت کا سہرا سجایا گیا، شہر مکہ اہل ایمان کے لیے اطمینان و سکون کا مرکز بن گیا، ہر شے اپنے مرکز کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتی ہے، جیسے ماہی بے آب کو پانی کے بغیر سکون نہیں ملتا، مؤمن کے دل کو خانہ خدا کے بغیر اطمینان حاصل نہیں ہوتا، جن دیوانوں کو اس سفر کا موقع میسر آتا ہے ان کے سفر کی دیوانگی بھی قابل دید ہوتی ہے، کوئی پیادہ پاسفر کرتا ہے تو کوئی قدم قدم نوافل کا اہتمام کرتا ہے، کوئی صدقہ و خیرات کو سفر کی زینت بناتا ہے تو کوئی کمزوروں کو بدنی مدد پہنچاتا ہے، یہ سب چلتا رہتا ہے اور سفر سوائے حرم جاری رہتا ہے۔

ہمارے ممدوح و موصوف حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی جب جوان، توانا اور تندرست تھے تو اس مبارک سفر میں پیدل چل کر اپنے رب کی رضا حاصل کرتے، جیسا کہ تاریخ دمشق میں روایت موجود ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ سے پیدل حج فرماتے تھے۔ (ج: ۶۶، ص: ۲۱۲)

لیکن یہ ان کی جوانی تھی آج وہ وقت آ گیا ہے کہ اعضاء جواب دے رہے ہیں، جسمانی قوتیں ساتھ چھوڑ رہی ہیں، لوگ حج کا احرام باندھے ہوئے مقام ربذہ کی عموماً سونی پڑی رہنے والی راہوں کو بارونق بناتے ہوئے گزر رہے ہیں، اسی ربذہ میں اپنے ٹاٹ کے خیمے میں بے کسی کے عالم میں عالم اسلام کی وہ شخصیت موجود ہے جس کے پاکیزہ وجود پر اسلام اور اہل اسلام کو ناز ہے، حاجیوں کا ترانہ توحید جسے ترانہ اظہار بندگی یا غلامی کا اعلان عام بھی کہا جاسکتا ہے، جب حاجیوں کے مشکیں لبوں اور عنبری زبانوں سے نکلتا ہے فضائے بسیط کو چیرتا ہوا عالم بالا کی سرحدوں سے گزرتا ہوا ملاء اعلیٰ کے ملائک تک جا پہنچتا ہے، فرشتے فرش گیتی پر ریگنے والے حجاج کے قافلوں کے لیے اپنے معبود سے رحمت و مغفرت کی سفارشیں کرنے لگتے ہیں۔ یہی ترانہ جب سفر حج سے محروم رہ جانے والوں کے کانوں تک

پہنچتا ہے تو ان کے دلوں میں حسرت و یاس، محرومی و مہجوری کا نیا اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ ۳۲ ہجری کا حج ادا کرنے کی تیاریاں چل رہی ہیں، بندگان خدا ہر طرف سے لبیک کا گیت گاتے ہوئے مکہ شریف کی جانب رواں دواں ہیں، مدینہ طیبہ سے امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنفس نفیس مناسک حج کی جملہ رسوم ادا کرنے اور کرانے کے لیے تشریف لانے والے ہیں، خلیفۃ المسلمین کی آمد سے مومنوں کے دلوں میں جذبات شوق کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا تھا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس سے بے خبر نہ تھے، ذرا عالم تصور میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خیالات کا جائزہ لیجیے، وہ اس سفر کے لیے کتنے بے قرار اور مضطرب رہے ہوں گے، وادی مکہ سے ان کی کتنی یادیں وابستہ تھیں؟ انہیں ایمان کی سرمدی دولت اسی وادی میں تو میسر آئی تھی، رب کے مظہر اتم محبوب پروردگار کا دیدار بھی تو انہیں یہیں مقدر ہوا تھا، شہادت توحید و رسالت کی پاداش میں کفار مکہ کی سختیوں کا کڑوا جام جو ان کے لیے جام کوثر کی ضمانت ٹھہرا، اسے بھی تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہیں نوش کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

لبیک کا پیارا ترانہ حاجیوں کی مبارک زبانوں سے ربذہ کی فضاؤں میں گونجا ہوگا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس ترانے نے کتنا تڑپایا ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، مگر اتنا طے ہے کہ اس کا اثر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بہت عظیم ہوا ہوگا، جب یہ ترانہ ایک عام مومن کے دل کو ہلا سکتا ہے تو جس کا دل اپنے رب کی یاد میں پہلے ہی سے جل کر کباب ہو چکا ہو، جسم کی رنگت بدل گئی ہو، جو رب کی خاطر پوری کائنات سے کٹ کر صرف اسی کے ہو چکا ہے، اب مرض، ضعف اور نقاہت کا عالم، نیم جاں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیروں کی بیڑیاں بن جائے تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روح اس کو کیسے برداشت کر لیتی۔ انجام کار وہی ہوا جس کا ہر ذی روح سے خدائی وعدہ ہے وعدہ وفا ہونے کا وقت قریب آگیا، جان جاں آفریں کو سپرد کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

جو منہ سے کہہ دیا بے شک وہ بات ہو کے رہی: اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے جو فرما دیا وہ حقیقت میں وحی الہی ہوتی ہے، اس لیے رب تبارک و تعالیٰ محبوب کی بات کو سچا ثابت فرماتا ہے، زمانے نے ان گنت مرتبہ زبان رسالت کی سچائی کا مشاہدہ کیا ہے، ہم اہل سنت کا تو عقیدہ یہی ہے جدھر رب کے محبوب کا حکم ہوتا ہے کائنات کا رخ ادھر ہی مڑ جاتا ہے۔ جنگ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے جملوں (تہا رہے گا تنہا مرے گا) کا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات سے ملان اور مقابلہ کر لیجیے۔ واللہ العظیم مراد مصطفیٰ سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی ایک ذرے کے برابر بھی منحرف نہیں ہو سکی، زندگی آپ نے ملاحظہ فرمائی کہ وہ زمانے کی بھیڑ سے کس طرح الگ تھلگ رہے؟ وہ کثرت اثر دھام میں بھی ہمیشہ تنہا رہے، فرمان مصطفیٰ کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے مدینہ منورہ اور دمشق کی چہل پہل کو چھوڑ کر ربذہ کی تنہائیوں میں جا بسے اور پھر زندگی بھر وہیں رہے، حضور نے فرمایا: تنہا مرے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفر آخرت کا مطالعہ کر لیجیے کہ ربذہ اگرچہ چھوٹا سا گاؤں تھا تاہم اس کی آبادی اتنی توتھی کہ کسی میت کو نہلا دھلا سکے، کفن و دفن کر سکے لیکن زبان نبوت سے نکل گیا تھا ”تنہا مرے گا“، تو ربذہ کی تنہائی کا یہ عالم ہو گیا کہ آپ پر وفات کے آثار دیکھ کر آپ کی اہلیہ زار و قطار رونے لگیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا: بیوی روتی کیوں ہو؟ تو عرض کرتی ہیں: میرے سر تاج! آپ ربذہ کی تنہائیوں میں اپنی جاں جاں آفریں کو سو نپنے کی تیاری کر رہے ہیں، میں اکیلی عورت ذات آپ کے کفن و دفن کا کیا انتظام کروں گی اور کیسے کروں گی؟

(تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۳۲۱)

قدرت کا انتظام بھی کیا کہیے حج کے بہانے پورا ربذہ خالی ہو گیا، اب حضرت ابوذر غفاری ہیں اور ربذہ کی تنہائیاں اور ویرانیاں پھر ملک الموت کی روح نکالنے والی کارروائیاں۔
وقت وصال بیوی کو تسلی دی: بیوی کے آنسو دیکھ کر حضرت ابوذر غفاری رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: محترمہ رونے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ارشاد فرمایا تھا میں خود بھی اس جماعت میں موجود تھا، تم میں سے ضرور ایک شخص جنگل میں انتقال کرے گا، اس کے جنازے میں مسلمانوں کی ایک جماعت آکر شریک ہوگی، میرے علم کے مطابق اس جماعت کا ہر فرد کسی نہ کسی آبادی میں وفات پا چکا ہے، تنہا میں بچا ہوں، آج اس ویرانے میں دم توڑ رہا ہوں، نہ میں جھوٹ بول رہا ہوں نہ مجھ سے جھوٹ بولا گیا ہے، بیوی جاؤ اور راستے پر بیٹھ کر مسلمانوں کی آنے والی جماعت کا انتظار کرو، فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ”اب مسافروں کی جماعت کہاں سے آئے گی، حجاج سب کے سب جا چکے ہیں، راستے سنسان پڑے ہیں؟“ فرمایا: جاؤ! دیکھو تو سہی۔ حکم کی بجا آوری کے لیے بی بی صاحبہ انھیں اور راستے کی طرف چلیں، فرماتی ہیں: میں تیزی سے ریت کے تودے تک جاتی، کھڑی ہو کر دور تک نظر دوڑاتی پھر جاں بلب شوہر کا حال دیکھنے والپس خیمے میں آجاتی، اسی دوڑ دھوپ میں تھی اچانک شتر سواروں کی ایک جماعت نظر آئی، ان لوگوں نے جب ایک عورت کو اس طرح کھڑے دیکھا تو بہت تیزی کے ساتھ شتر سوار عورت کے قریب پہنچ گئے، انہوں نے پوچھا: اللہ کی بندی یہاں کیوں کھڑی ہے؟ بیوی صاحبہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: ایک مسلمان ہے جو مرنے کے قریب ہے، کیا تم لوگ اس کے کفن دفن کا انتظام کر سکو گے؟ آنے والوں نے پوچھا: وہ کون شخص ہے اس کا نام تو بتاؤ؟ جو اب ملا ابوذر غفاری! ابوذر غفاری اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی؟ جی ہاں! وہی ہیں، ان پر تو ہمارے ماں باپ قربان! صاحبہ جلدی چلیے اور ہمیں بتائیے آخر وہ کہاں ہیں؟ آنے والے حضرات حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچ چکے تھے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس جاں کنی کے عالم میں ہی ان کا استقبال کیا (ابھی سانسیں چل رہی ہیں، آواز نکل رہی ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو غنیمت جانا اور حدیث پاک سننا شروع کر دیا) جو الفاظ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

منہ سے نکلے وہ یہ تھے ”تمہیں بشارت ہو (حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس بات کی بشارت انہیں دینا چاہتے تھے وہ بہت بڑی بشارت تھی آنے والوں کے اسلام اور ایمان کی بشارت تھی کیونکہ حضور نے فرمایا تھا: ”جنگل میں مرنے والے کے جنازے میں شریک ہونے والے مسلمان ہوں گے“ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اسلام کی زبان سے اس کے ایمان و عقیدے کی صحت کی سند مل جائے (اب حدیث پاک سننا شروع کی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ”دو مسلمانوں (ماں باپ) کے اگر دو یا تین بچے انتقال کر جائیں پھر یہ لوگ اپنے بچوں کی موت پر صبر کر لیں اور اپنے رب سے ثواب کی امید رکھیں تو اللہ تعالیٰ انہیں جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔“

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہی بشارت بھری حدیث ان لوگوں کو سنائی، جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آنے والوں کے ایمان کی گواہی موجود تھی پھر آپ نے فرمایا: آج میرے گھر میں میرا یا میری اہلیہ کا کوئی ایسا کپڑا موجود ہوتا جو میرے کفن کے لیے کافی ہوتا تو میرا جنازہ اسی کفن میں تیار کیا جاتا لیکن آج گھر میں ایسا کوئی کپڑا موجود نہیں ہے لہذا تم لوگ مجھے اپنے کپڑوں میں کفن کرنے کا انتظام کرنا لیکن میں تم لوگوں کو اللہ کی قسم! دیتا ہوں کسی ایسے شخص کا کپڑا میرے کفن کا حصہ نہ بنا دینا، جو خود حاکم و امیر ہو یا امیر کا عریف یعنی بعض امور کا ذمہ دار یا پھر ڈاکو ہو۔

جب اس جماعت نے ایک دوسرے کے متعلق غور کیا تو تمام افراد کے مابین صرف ایک انصاری جوان ایسا تھا جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بتائے شرائط پر کھرا اترتا تھا، باقی لوگ کسی نہ کسی طرح ارباب اقتدار میں شامل تھے، انصاری نو جوان کی آواز بلند ہوئی، حضور! میں آپ کو اپنے کپڑوں میں کفن دوں گا، ایک یہ میری چادر دوسرے دو کپڑے جو میری والدہ نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیے ہیں، اس طرح کفن کے تینوں کپڑوں کا انتظام میرے پاس موجود ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تو پھر تم ہی میرے کام کے ہو، تمہیں مجھے اپنے کپڑوں کا کفن دینا۔

وقت وصال مہمانوں کا خیال: اسی دوران جب کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ اپنے سر تاج کے کفن و دفن کے لیے سرگرداں اور پریشان تھیں، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی کو ایک بڑی ذمہ داری سونپی، بیٹی تم ایک بکری ذبح کرو اور اس کو پکا کر تیار کر لو، میرے انتقال کے بعد جو لوگ میرے کفن و دفن کا انتظام کریں گے انہیں بغیر کھانا کھلائے رخصت مت کرنا، ان سے کہنا والد گرامی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ لوگوں کو قسم دی ہے کہ بغیر کھانا کھائے یہاں سے ہرگز رخصت نہ ہوں، فرماں بردار بیٹی اپنے بے مثال والد کے حکم کے مطابق کھانا بھی پکاتی رہی اور والد محترم کی تیارداری بھی کرتی رہی۔

ابوذر قبلہ رو اور خیمہ معطر: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نزع کا عالم طاری ہو گیا، خیمہ کستوری کی خوشبو سے مہک رہا تھا، آنے والوں نے اہل خانہ سے پوچھا: یہ بھینی بھینی خوشبو خیمے سے کیوں کر آرہی ہے؟ جواب ملا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا ”ابھی ایک ایسی جماعت بھی حاضر ہوگی جو کھانا نہیں کھاتی، خوشبو پسند کرتی ہے، لہذا ان کے لیے خوشبو کا اہتمام کرو“ مشک کو پانی میں ملا کر خیمے میں چھڑک دو، لہذا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خواہش کے مطابق خیمے کو خوشبو سے معطر کر دیا گیا ہے۔ اب اقلیم فقر کا شہنشاہ رب کے حضور حاضری کے لیے پا برکاب ہے، جس نے رب کو راضی کرنے کے لیے دنیا کی طرف ایک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، ٹاٹ کے کپڑے، کمبل کے خیمے، بوریوں کے بچھونے، روکھے سوکھے کھانے استعمال کر کے جسم کی رنگت بگاڑ لی، بکھرے بال، الجھی داڑھی، چہرے پر سچی دیوانگی جس نے اپنی پہچان بنالی جو اللہ اور رسول کے لیے ساری دنیا سے روٹھ گیا جس نے دنیا کے سامنے ببا ننگ دہل یہ اعلان کر دیا۔

توحید تو جب ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اب یہ دیوانہ دنیا سے رخصت ہوا چاہتا ہے خیمے میں آواز بلند ہوئی مجھے قبلہ رخ کر

دیا جائے۔ وہی قبلہ جہاں پہلی مرتبہ خدا کی توحید اور نبی کی نبوت و رسالت کی گواہی خلوص کے اس پیکر مجسم نے دی تھی وہ بھی صنادید قریش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو کفار نے مار مار کر ادھ مرا کر دیا تھا وہی قبلہ آخری دم پھر یاد آ رہا ہے۔ مرد درویش کا یہ آخری حکم تھا جو اس نے دنیا والوں کو دیا تھا، پھر دنیا ہمیشہ کے لیے اس کا کوئی بھی حکم سننے سے محروم ہو گئی، چاہت کے مطابق حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رو بقبلہ کر دیا گیا، پھر اس لاغر و نحیف وجود نے اپنی ساری قوتیں یکجا جمع کیں اور راہی راہ خدا نے اپنی خلوص و وفا والی زبان سے با آواز بلند کہا: ”بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ وَعَلَىٰ صَلَواتِ رَسُولِ اللَّهِ“ یہ کلام حقیقت میں ان کی زندگی کا حاصل تھا، جو انہوں نے آخری جملوں کے طور پر دنیا والوں کو سنایا، سامعین کو اپنے ایمان و عقیدے پر گواہ بنایا اور جاں جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ آج حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر بھر کی ساری بے قراریاں، بے تابیاں اور جگر کاویاں اطمینان پا گئیں، عمر بھر تڑپنے والا، جگر کو بریاں کرنے والا ہمیشہ کے لیے سکون کی نیند سو گیا، عالم پر زہد و فقر اور عبادت و ریاضت کی رو پہلی کر نیں بکھیرنے والا مہر تاباں اپنی زندگی کا چکر پورا کر کے عدم کی اوٹ میں سما گیا اور حق گوئی کی لافانی مثال قائم کرنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ ”إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ“

تجہیز و تکفین: بعد وصال انہیں شتر سواروں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جسد مبارک کو حکم شریعت کے مطابق تیار کیا، غسل دیا گیا اور وصیت کے مطابق انصاری نو جوان کے کپڑوں میں ملبوس کر کے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازے کو نماز جنازہ پڑھنے کے لیے تیار کر دیا گیا۔

ابن مسعود نماز جنازہ کے امام: چلتی سانسوں اور نکلتی آوازوں کے وقت آپ نے ایک خاص وصیت یہ بھی کی تھی جب میرے جنازے کو غسل و کفن دے کر تیار کر لیا جائے تو جنازہ خیمے سے اٹھا کر راستے کے بیچ و بیچ رکھ دینا، سواروں کا سب سے پہلا دستہ جو میرے جنازے کے پاس سے گزرے تو اس سے کہنا: یہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کے صحابی ابوذر غفاری ہیں، ان کو دفنانے میں ہماری مدد کیجیے (ایسا لگتا ہے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہوں کے سامنے سے حجاب اٹھا دیے گئے تھے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ دور تک راہ چلتے افراد کو دیکھ رہے تھے، ان کے حالات و مقامات اور مراتب کو بھی ملاحظہ کر رہے تھے) حسب وصیت جنازہ تیار کر کے برسر راہ رکھ دیا گیا، خدا کی قدرت جس قافلے کا وہاں سے سب سے پہلے گزر ہوا اس کے میرکارواں صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعود تھے، جو عمرہ کرنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ شریف جا رہے تھے۔ سر راہ پڑے جنازے کو دیکھ کر قافلہ ٹھٹھک کر رک گیا، جنازے کے پاس کھڑے لڑکے نے کہا: یہ اللہ کے رسول کے صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنازہ ہے، ان کی تدفین میں ہماری مدد کیجیے۔

عبداللہ بن مسعود نے جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام سنا تو چیخ مار کر رونے لگے پھر فرمایا: سچ فرمایا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ابوذر اکیلا چلے گا، اکیلا رہے گا، اکیلا مرے گا اور اکیلا اٹھایا جائے گا“ دیر تک روتے رہے، روتے جاتے اور کہتے جاتے: میرا بھائی، میرا دوست، اکیلا رہا، اکیلے زندگی گزاری، اکیلے وصال فرمایا، اکیلے ہی ان کو اٹھایا جائے گا۔ ابوذر تمہیں مبارک ہو، حضرت عبداللہ بن مسعود نے نماز جنازہ پڑھائی اور دونوں قافلوں کے لوگوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمیشہ کے لیے خدا کی زمین کو بطور امانت سونپ دیا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۲، ص: ۲۱۹، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۶، اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۵۶۳، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۶، تاریخ طبری، ج: ۴، ص: ۳۰۸،

(الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۱۱)

نوٹ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفر آخرت کے احوال ہم نے مذکورہ بالا کتب کی روایات کو سامنے رکھ کر اپنے ذوق کے مطابق مرتب کیے ہیں، ساتھ میں اپنی جانب سے کچھ تبصرے بھی شامل کیے ہیں تاکہ مضمون کا تسلسل باقی رہے، تاہم پورے مضمون کے بنیادی عناصر مذکورہ حوالوں میں ضرور موجود ہیں۔

بیٹی نے کھانا کھلایا: جب قافلے والے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سپرد خاک کرنے کی جملہ ذمہ داریاں نبھا چکے تو چلنے کے لیے تیار ہوئے لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی بیٹی کو پہلے ہی تاکید حکم دے چکے تھے کہ کوئی بھی صاحب بغیر کھانا کھائے ہرگز روانہ نہ ہوں۔ بیٹی مہمانوں کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی، عرض کیا: ابو نے آپ حضرات کو سلام کہا ہے اور قسم دی ہے کہ کوئی بھی مہمان بغیر کھانا کھائے گھر سے نہ جائیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قسم کی لاج رکھنے اور بیٹیا کے اصرار پر عمل کرنے کے لیے اہل قافلہ نے کھانا کھایا اور رخصت ہو گئے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۷)

کون ہے جو مجھ سے اسی حالت میں ملے: رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا: وہ کون ہے جو مجھ سے اسی حالت پر آ کر ملے گا؟ جیسا کہ میں اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس وقت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز بلند ہوئی تھی ”یا رسول اللہ! ان شاء اللہ میں آپ سے اسی حالت میں آ کر ملاقات کروں گا جیسا آپ چھوڑ کر جا رہے ہیں“ حضور نے فرمایا: ابوذر! تم نے سچ کہا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۴)

اس حدیث پاک میں ہمارے ذوق کے مطابق اسی حالت پر ملنے سے مراد دین پر عمل اور دنیا سے دوری ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سفر آخرت نے ہمیں بتا دیا، بیشک حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ٹھیک انہیں احوال کے ساتھ اپنے رؤف و رحیم آقا سے ملنے جا رہے ہیں جن احوال پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آقا نے غلام کو دنیا میں چھوڑا تھا، جذبہ دینی کے تصلب کا اندازہ تو آپ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مہمان نوازی سے کیجیے کہ حالت نزاع میں بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر پاس و لحاظ تھا کہ جاتے جاتے بھی اپنے مہمانوں کو بھوکا نہیں رکھا، انتقال بعد میں فرمایا پہلے کھانا پکوا کر تیار کرادیا، اپنی قسم اپنی امانت دار بیٹی کے حوالے فرما کر مہمانوں کے لیے خلوص و اصرار کی ساری حدیں پار کر دیں، گویا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد بھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قسم اپنے مہمانوں سے

پورے خلوص کے ساتھ کھانا کھانے کا اصرار کر رہی تھی، جس کی زندگی میں سنت رسول کی حفاظت کا اس قدر اہتمام ہو تو وہاں فرائض و واجبات کا کیسا انتظام اور منہات شرعیہ سے کیسا اجتناب ہوگا؟ رہی دنیا سے دوری تو یہ بات ٹھیک ہے کہ کوئی بھی مرنے والا خواہ امیر ہو یا غریب، دنیا سے کچھ لے کر نہیں جاتا لیکن اتنا تو ماننا پڑے گا کہ مرنے والا عموماً اپنے یا رشتے داروں کے گھر کا کفن ضرور ساتھ لے جاتا، لیکن واہ رے ابوذر! تمہاری دنیا سے دوری تم دنیا کے سامنے یہ اعلان کر گئے نہ کچھ لے کر آیا تھا نہ کچھ لے کر جا رہا ہوں، بعد مرگ جسم چھپانے کے لیے خود کا اہلیہ کا اور بیٹی کا کوئی کپڑا بھی موجود نہیں، جسے کفن بنایا جاسکے۔ بھلا ہو اس اجنبیوں کی جماعت کا خاص کر جماعت میں شامل اس انصاری نوجوان کا جس کے کپڑے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آخری لباس بنے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مبارک ہو دنیا سے اسلام رب کے حضور تمہارے حق میں یہ گواہی دینے کے لیے بے قرار ہے کہ تم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا وعدہ پورا پورا نبھادیا تھا۔

ربذہ کی تنہائی میں ابن مسعود کی آمد: مشہور مقولہ ہے ”مَنْ كَانَ لِلَّهِ كَانَ اللَّهُ لَهُ“ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس بے کسی کے حال میں انتقال فرمایا کہ تجہیز و تکفین کے لیے بھی وہاں بقدر حاجت لوگ موجود نہیں، ظاہری حالت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے گور و کفن ہی پڑے رہ جاتے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے سب کچھ قربان کر دیتا ہے تو قادر مطلق کی قدرتیں اس کی یاری کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ خدا و رسول کا ابوذر بے گور و کفن کیسے رہے گا؟ تجہیز و تکفین کے لیے اجنبیوں کی جماعت بھیج دی گئی، اجنبی بھی ایسے جن کے ایمان کی گواہی زبان نبوت سے تقریباً بیس سال پہلے ہی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے کانوں سے سماعت کر لی۔ امامت کے لیے اس شخص کا انتظام کیا جا رہا

ہے جس کے حسن قرأت کی داد مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دیتے ہیں، صاحب قرآن خود ان سے قرآن سماعت کرتے ہیں، امت کو اس سے قرآن سیکھنے کا حکم دیتے ہیں، صحابہ نے جس کے علم کا لوہا مانا جو معلم امت ہونے کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے ”معلم“ فرمایا، جس کی مرضی کو مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رضا فرمایا، ان جیسی کثیر صفات محمودہ سے متصف حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے ربذہ بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ

عاشق کا جنازہ ہے ذرا شان سے اٹھے

سنہ وفات: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سنہ وفات میں مؤرخین کے اقوال کافی مختلف ہیں جس قول کو زیادہ تر مؤرخین نے اولیت کے ساتھ بیان کیا وہ ۳۲ ہجری ہے، کئی مؤرخین نے ۳۱ھ کے قول کو ترجیح کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

علامہ ابن حجر نے فرمایا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ۳۱ھ میں مقام ربذہ میں ہوئی لیکن اکثر لوگوں کا ماننا یہ ہے کہ آپ کی وفات ۳۲ ہجری میں ہوئی۔ (اسد الغابہ، ج: ۱، ص: ۵۶۴، الاصابہ، ج: ۷، ص: ۶۳، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۲۲، شرح الزرقانی، ج: ۴، ص: ۵۱۴)

علامہ ذہبی نے فرمایا: کہا گیا ہے کہ آپ کی وفات ماہ ذی الحجہ میں ہوئی۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۴)

بعض مؤرخین نے آپ کی وفات کے سلسلے میں ۲۴ ہجری اور ۲۵ ہجری کے اقوال بھی بیان فرمائے ہیں۔

(المختصر فی اخبار البشر، ج: ۱، ص: ۱۶۶، مستعدب الاخبار باطبیب الاخبار، ج: ۱، ص: ۳۴۳)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے تقریباً دس دن بعد حضرت عبداللہ بن مسعود بھی انتقال فرما گئے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۷۴)

حضرت ابوذر غفاری کا ترکہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زہدانہ

زندگی اور فقیرانہ مزاج ہم بار بار بیان کر چکے ہیں۔ بیشک وہ بیان کے لائق ہی ہے، ایک روایت اور سن لیجیے تاکہ بعد ممت ان کا ترکہ سمجھنا آسان ہو جائے۔ ایک بزرگ جن کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نماز ادا کرنے کا موقع بار بار میسر آیا ہے، انہوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”اس شخص کی چادر کی قیمت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کی کل پونجی سے ضرور زیادہ ہے“ وہ ذات جس کے زہد نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یادیں تازہ کر دیں، بعد وصال جب لوگوں نے گھر کا مشاہدہ کیا تو مندرجہ ذیل اشیاء اس کی کل کائنات تھی، جسے وہ اپنے اہل خانہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ محمد نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھانجے سے پوچھا: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا چھوڑ کر وصال فرمایا؟ انہوں نے جواب دیا: دو گدھی، ایک گدھا، چند بکریاں اور کچھ سواریاں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ترکہ تھا۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۱۷)

فضائل کا اختصار، علم فنا اور بقا کے موجد: حضرت ابو نعیم نے فرمایا: حضرت ابوذر غفاری بعثت سے تین سال پہلے ہی خدا کی عبادت کرنے لگے تھے، اسلام کی دعوت کے اولین مراحل میں ایمان لا کر چوتھے مسلمان کہلائے، حضور کو سب سے پہلے اسلامی سلام کیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس بات پر بیعت کی کہ وہ حق کہنے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت و ریاضت اور فقر و فاقہ بھری زندگی کو دیکھ کر انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی، جب تک دنیا میں رہے فضولیات کو کبھی اپنے پاس نہ آنے دیا، دنیا سے دور رہنے کا جو عہد انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا اسے آخری سانس تک نبھاتے رہے، وہ دنیا داری کو ذلت و رسوائی اور دنیا سے دوری کو نعمت و رحمت سمجھتے تھے، مسکینوں سے محبت کرنے والی حضور کی وصیت کو اپنے خوب خوب محفوظ رکھا، حضور کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد مسجد نبوی ہی ان کا ٹھکانہ تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زاہدین کے سردار اور تارکین دنیا کے آقا ہیں،

علم فنا اور بقا کے سلسلے میں سب سے پہلے آپ ہی نے کلام فرمایا، وہ علم سے بھرا ہوا ایسا برتن تھے کہ کبھی ان سے علم کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۱۷۶)

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زہد و صدق علم و عمل کے سرچشمہ تھے، خوب خوب حق کہنے والے تھے اور حق کہنے میں کسی کی پرواہ ہرگز نہ کرتے تھے، مزاج میں تیزی تھی۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۷)

ازواج و اولاد: اللہ تعالیٰ نے آپ کو کئی بچے عطا فرمائے لیکن سب زندہ نہ رہ سکے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے وقت صرف ایک بیٹی حیات تھی، جس کو آپ نے مہمانوں کے لیے کھانا پکانے کی وصیت کی تھی، ایک بیٹی کی شہادت غزوہ غابہ سے پہلے ہوئی، بیٹی کی شہادت غزوہ غابہ پیش آنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ تھی، اپنے بعض بچوں کی وفات کا ذکر خود آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات سے کچھ دیر قبل فرمایا تھا۔

(عمدة القاری، ج: ۱۷، ص: ۲۳۳، تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۷-۲۲۰)

اولاد کے انتقال پر اللہ کی حمد: کسی نے کہا کہ ابوذر غفاری تمہارے بچے زندہ نہیں رہتے تو جواب میں ایک بے مثال جملہ ارشاد فرمایا: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ یَاْخُذُھُمْ مِنْ دَارِ الْفَنَاءِ وَ یُدْخِلُھُمْ فِیْ دَارِ الْبَقَا“ تمام تعریفیں اس پروردگار کے لیے ہیں جس نے میرے بچوں کو فانی گھر سے لے کر باقی رہنے والے گھر میں ذخیرہ بنا دیا۔

دوسری شادی سے انکار: آپ نے ایک ہی نکاح فرمایا، یہ بیوی بھی کوئی حسین و جمیل نہ تھیں بلکہ ان کا رنگ کالا تھا، کسی نے مشورہ دیا کہ دوسرا نکاح فرمالیں (کسی خوبصورت عورت سے) تو آپ نے فرمایا: جس بیوی کی وجہ سے لوگ مجھے کمتر سمجھیں اس کو میں ایسی عورت سے بہتر سمجھتا ہوں جس کی وجہ سے لوگ مجھے عزت بخشیں۔

(حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۱۶۱، طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۲۲)

بیوی کی ایک نہ مانی: تنگدستی اور مشقت بھری زندگی دیکھ کر اہلیہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کبھی کہا ہوگا کہ ہم لوگ عراق چلیں تاکہ یہ دقتیں ختم ہو

جائیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو منظور نہ فرمایا بلکہ بیوی کی اس عرض پر طنز کرتے ہوئے اپنے بعض مہمانوں سے فرمایا: آپ لوگ اس کالی عورت کے حال پر غور نہیں کرتے یہ مجھ سے عراق جانے کو کہتی ہے، میں عراق جاؤں تاکہ لوگ میری طرف اپنی دنیا لے کر رغبت کریں، میرے خلیل نے تو مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ پل صراط کے پاس ایک بہت پھسلنے والا راستہ ہے میں اس راستے پر اقتدار کا بھاری بوجھ لے کر گزروں اس سے میں یہ زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ میں (مال و دولت سے) ہلکا ہو کر آسانی سے گزر جاؤں۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۴، ص: ۲۲۲)

ایک مرتبہ گھریلو پریشانی دور کرنے کے ارادے سے بیوی نے صرف اتنا کہہ دیا: اگر آپ چاہیں تو یہ دقت دور ہو سکتی ہے، یہ سن کر آپ ناراض ہو گئے تھے اور آپ نے فرمایا: بیوی سنو! یہ ہے ابوذر اور یہ ہے اس کی زندگی، اگر اس پر تم راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ تمہاری مرضی۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۰۶)

اس طرح آپ نے اپنے اوپر اپنی نہ کسی غیر کی حتیٰ کہ بیوی بچوں کی خواہشات تک کو کبھی سوار نہ ہونے دیا۔

ساز و سامان آخرت کے گھر بھیج دیا: ایک شخص حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں داخل ہوا، ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن اسے گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: آپ کے گھر میں کچھ ساز و سامان دکھائی نہیں دے رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہمارا ایک اور گھر ہے (آخرت میں) ہم سارا اچھا سامان وہیں بھیج دیتے ہیں، اس شخص نے کہا: جب تک آپ اس گھر میں ہیں کچھ سامان کی تو بہر حال ضرورت ہے، آپ نے فرمایا: گھر کا مالک ہمیں اس گھر میں نہیں چھوڑے گا۔

(تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۱)

برے ساتھی سے تنہائی بہتر: حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک اونٹنی چادر میں لپیٹے ہوئے مسجد میں تنہا بیٹھے ہوئے

دیکھا، آپ فرما رہے تھے: تنہائی برے ساتھی سے اچھی ہے، نیک ساتھی تنہائی سے بہتر ہے، بری بات بولنے سے خاموشی بہتر ہے، اچھی بات بولنا خاموشی سے بہتر ہے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۵)

بے مثال ابوذر: حضرت ابواسود دہلی کہتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب کی زیارت کی تو کسی کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشابہ نہیں دیکھا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۶)

ابوذر کے اہل و عیال کی حضرت عثمان نے کفالت کی: حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے ساتھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تدفین کے بعد جب مکہ المکرمہ جانے لگے تو سوچا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اہل و عیال کو ساتھ لے چلیں تاکہ مکہ پہنچ کر ان کو امیر المؤمنین کے حوالے کر دیں، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: امیر المؤمنین مکہ ہی میں موجود ہیں، چل کر انہیں بتائے دیتے ہیں جو مناسب ہوگا وہ فیصلہ کریں گے۔ اہل قافلہ نے مکہ پہنچ کر حضرت امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کی خبر دی، خبر سن کر امیر المؤمنین نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے رحمت و مغفرت کی دعائیں کیں اور جب مکہ سے مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے تو قصداً آپ نے ربذہ والے راستے کو اختیار کیا پھر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عیال کو ساتھ لے لیا اور اپنے عیال میں شامل فرمالیا۔ (تاریخ دمشق، ج: ۶۶، ص: ۲۱۸)

کھجور پر پانی پی کر تمہاری طرح جلتا ہوں: حضرت نافع طاحی کہتے ہیں کہ میری ملاقات حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی، انہوں نے مجھ سے پوچھا: کہاں کے باشندے ہو؟ میں نے عرض کیا: عراق کا! فرمایا: عبداللہ بن عامر کو پہچانتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: وہ میرے ساتھ رہ کر فقہ سیکھتا تھا پھر وہ بصرہ کا امیر (حاکم) بن گیا، جب تم بصرہ جاؤ تو اس سے ملاقات کرنا اور تنہائی میں کہنا ”حضرت ابوذر

غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ ابوذر رکھ جو رکھتا ہے، پانی پیتا ہے اور ایسے ہی زندہ ہے، جیسے تم زندہ ہو، جب میں نے عبداللہ بن عامر سے ملاقات کر کی اور اسے بتایا کہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاصد ہوں تو عبداللہ بن عامر خوف میں مبتلا ہو گیا پھر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سلام کہا اور پیغام پہنچایا تو امیر بصرہ اپنا منہ اپنے گریبان میں ڈال کر روتا رہا یہاں تک کہ گریبان تر ہو گیا۔ (صفۃ الصفوة، ج: ۱، ص: ۵۹۴)

یہ تھیں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی کی نورانی شعائیں جو آج بھی حرص، لالچ، حق تلفی، ناجائز زراںدوزی اور فتنہ پروری کی تاریکیوں میں بھٹکتی دنیا کو زہد، توکل، استغنیٰ اور اطاعت شعاری کی روشنی فراہم کر رہی ہیں۔ زمانہ ہوا کہ یہ عابد شب زندہ دار اور زہد حضرت مسیح کا سچا امین دنیا سے چلا گیا لیکن اس کی لحد کی خاک آج بھی حرص و ہوس کے دیوانوں اور پکے دنیا داروں کو دار آخرت کے جنون کا سبق پڑھا رہی ہے، آفتاب نبوت کے نور سے روشن ہونے والا یہ چراغ اگرچہ بنام ابوذر غفاری وادی ربذہ میں گل ہو گیا لیکن گل ہونے سے پہلے ایمان، ایقان، زہد، ورع، تقویٰ، توکل، استغنیٰ، عشق رسول، محبت رسول، اطاعت رسول کے ان گنت چراغ روشن کر گیا، جو قیامت تک ہر تاریکی کو اپنی جھلملاہٹ سے دور کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور مومنوں کے سینے ان کے نور سے مستنیر ہوتے رہیں گے۔

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود

ان کے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام

جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر

اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمِيْدًا وَتُصْلِيًّا وَنُسْلًا عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ

حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: رب تبارک و تعالیٰ نے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا رسول بنا کر مکہ میں مبعوث فرمایا، پھر مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرائی اور اس نور کا اتمام فرمایا، جس کے سامنے آفتاب و مہتاب کا نور ماند پڑ گیا، عالم کو نئی حیات میسر آئی اور ایک نئی تاریخ مدون ہوئی، یہ پوری تاریخ جان عالمیاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے لیکن کچھ نفوس قدسیہ اس تاریخ کا ایسا انمٹ حصہ بنے کہ جب بھی حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کا بیان ہوگا تو مؤرخ پوری رضا و رغبت کے ساتھ آپ کے ان غلاموں کا بھی ذکر کرے گا، ایسے ہی ایک غلام کا ہم ذکر کرنے چلے ہیں، جو انصار کے سابقین اولین کا عظیم حصہ ہے، مکہ کی وادی میں کی گئی بیعت عقبہ ہو یا بدر و احد خیبر و خندق وغیرہ غزوات کے قاتل لحات، یہ جاں نثار ہر جگہ حاضر ہے، بیعت رضوان کے جاں نثاروں میں بھی جس کا نام جلی حروف کے ساتھ درج ہے، فتح مکہ اور حجتہ الوداع میں حضور کے ساتھ پارکاب ہے، جس نے زمانہ ابوبکر صدیق سے لے کر مولائے کائنات تک کبھی غزوات کو پیٹھ نہیں دکھائی، پھر حضرت امیر معاویہ کے ساتھ بھی مصروف جہاد رہا، جو غفوان شباب سے لے کر بڑھاپے کی دہلیز تک صافنات جیاد (تیز دوڑنے والے خوبصورت گھوڑے) کی پیٹھوں پر سوار رہا، یہی قسمت کا سکندر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں خصوصی میزبان رہا، آج اہل سیاست کے گھروں پر اعظم، دنیا داروں کے ہاں سلطان اعظم اور دین داروں کے مفتی اعظم اور متقی اعظم قدم رنجہ فرمادیں تو سیاست کے ایوان، دنیا داروں کے محلات، دینداروں کے مکانات، باعث رشک جہاں بن جاتے ہیں۔ ذرا اندازہ کیجئے اس میزبان کی قسمت کا

جس کے گھر محبوب رب العالمین، رحمۃ للعالمین، سید المرسلین، امام الانبیاء، باعث تخلیق کائنات، فخر جان و جہان، رشک قدسیاں، تاجدار عرب و عجم، مالک رقاب ام، آفتاب نبوت، و مہتاب رسالت، روحی فدا، حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مہمان بنے ہوں، وہ بھی چند لمحات، گھنٹوں اور دنوں کے لیے نہیں، تقریباً ایک سال تک جس کے مکان میں نزول اجلال فرمایا ہو، کیا کہیں اس مکان کو اور کیا کہیں صاحب مکان کو؟

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد

ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

یہ اسی میزبانی کا شرف ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ میزبان رسول سے آشنا ہوا اور انہیں تاریخ اسلام میں وہ شہرت دوام حاصل ہوئی کہ مرور زمانہ کی طویل مسافت اس پر کچھ بھی اثر انداز نہ ہو سکی، ان کے ذکر جمیل کو وہ حلاوت میسر آئی کہ اہل محبت کی زبانیں آج بھی اس کی مٹھاس محسوس کر رہی ہیں، آپ ان کی ذات، عالی صفات اور نام نامی سے بخوبی واقف ہیں، لذت ذکر کے لیے مزید پڑھیں، انہیں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا جاتا ہے۔

نام و نسب: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام ”خالد“ ہے۔ نسب نامہ اس طور پر ہے: خالد بن زید بن کلیب بن ثعلبہ بن عبد بن عوف بن غنم بن مالک بن نجار بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج۔

والدہ کا نام: آپ کی والدہ کا نام ہند بنت سعید بن عمرو بن امراء القیس بن مالک بن ثعلبہ ہے۔

کنیت: آپ کی کنیت ابویوب ہے۔ آپ اپنی کنیت کے ذریعے ہی لوگوں میں مشہور ہوئے۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۱، الاصابہ، ج: ۲، ص: ۸۹، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۳۳)

ہم نے نسب نامہ علامہ ابن اثیر کے بیان کے مطابق تحریر کیا ہے۔ (مذکورہ بالا بعض کتابوں میں آپ کے نسب کے تعلق سے کچھ تغیر پایا جاتا ہے)

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت نام پر ایسی غالب آئی کہ لوگ ان کا نام بھول گئے۔ رہی آپ کی ذات تو وہ مؤمنین کے درمیان شہرت عظیم کی حامل ہے کہ مسلمانوں کا ہر وہ بچہ جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہجرت سے متعلق کچھ معلومات رکھتا ہے، وہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ضرور آشنائی رکھتا ہے، کنیت کے سلسلے میں آپ کا معاملہ حضرت ابو ہریرہ کی طرح ہے، اسلام کا ہر قاری حضرت ابو ہریرہ کو جانتا ہے، لیکن آپ کا نام بہت کم لوگوں کو یاد ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت تو ان کے نام پر اس قدر غالب تھی کہ صحابہ کرام بھی ان کے نام کو نہ پہچانتے تھے، وہ بھی صرف کنیت ہی جانتے تھے، نام کا راز تو اس وقت فاش ہوا جب حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن ان کے نام کا ذکر فرمایا۔ پورا واقعہ آپ امام محمد بن جریر طبری اور علامہ ابن اثیر جزری سے سنیے، آپ فرماتے ہیں:

جن دنوں باغیوں نے خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان غنی ذوالنورین کو محصور کر رکھا تھا، مسجد نبوی کے مؤذن حضرت سعد القرظ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: لوگوں کو نماز کون پڑھائے گا؟ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خالد بن زید کو کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حضرت سعد نے خالد بن زید کا نام لے کر آواز لگائی کہ وہ نماز پڑھائیں۔ تو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، یہ پہلا دن تھا جب لوگوں نے یہ جانا تھا کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام خالد بن زید ہے۔ (تاریخ طبری، ج: ۲، ص: ۶۹۴، الکامل فی التاريخ، ج: ۳، ص: ۷۶)

مواخات: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کی مواخات مبلغ دربار رسالت، داعی مدینۃ المنورہ، اسلام کے سفیر اول، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ قائم فرمائی۔ (الاصابہ، ج: ۲، ص: ۹۰، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۹۰، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۱)

حضرت ابویوب کا خاندان: علامہ ذہبی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

آپ خزرجی، نجاری، بدری صحابی ہیں۔ (اپنے خاندان کے) بڑے سردار ہونے کے ساتھ خاندان بنونجار میں یہ شرف صرف آپ کو حاصل ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی قیام گاہ کے طور پر آپ کے گھر کو زینت بخشی۔ جب تک مسجد نبوی سے متصل امہات المؤمنین کے حجرے تعمیر نہ ہو گئے رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وہاں قیام پذیر رہے اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کو رشک قدسیاں بنائے رکھا۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۰۲)

خاندان مصطفیٰ سے قدیم مراسم: ڈاکٹر علی محمد صلابی اپنی کتاب السیرۃ النبویہ میں لکھتے ہیں:

خاندان بنونجار سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نہالی رشتہ تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ اسی خاندان کی شہزادی تھیں۔ (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پردادا) حضرت ہاشم نے سلمیٰ بنت عمرو سے نکاح کیا تھا اور عمرو خاندان بنونجار کے چشم و چراغ تھے۔ (السیرۃ النبویہ، عرض وقائع و تحلییل احداث، ج: ۱، ص: ۲۶۴)

اب ہم خاندان مصطفیٰ سے خاندان بنونجار کے قدیم تعلقات کو پیر کرم شاہ الازہری کی زبانی قدرے تفصیل سے بیان کر رہے ہیں، آپ تحریر فرماتے ہیں:

عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے کا نام ”ہاشم“ تھا۔ سب سے چھوٹے کا نام ”مطلب“ تھا۔ ہاشم تجارت کے لیے ملک شام جا رہے تھے۔ راستے میں ان کا گزریثرب کی بستی سے ہوا، عمرو بن لبید خزرجی جو خانوادہ بنی نجار کے سردار تھے، ان کے ہاں چند روز کے لیے ٹھہرے، اس اثناء میں عمرو کی بیٹی سلمیٰ کو دیکھا، ہاشم نے اس کا رشتہ اس کے باپ سے طلب کیا، عمرو نے بڑی خوشی سے اپنی بچی کا رشتہ مکہ کے قریشی سردار ہاشم کو دینا منظور کر لیا، شادی طے پائی لیکن رخصتی نہیں ہوئی، البتہ عمرو نے یہ شرط لگائی کہ جب اس کی بچی کے یہاں اولاد پیدا ہونے کا وقت آئے گا تو وہ بچہ بچی اپنے گھر میں جنے گی، ہاشم اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ملک شام کو روانہ ہو گئے، اپنی کاروباری مصروفیتوں سے فارغ

ہونے کے بعد واپسی پر اپنے سسرال آئے، عمرو نے اپنی بیٹی کو رخصت کیا، آپ اسے لے کر مکہ پہنچے، کچھ عرصہ وہاں رہے، وہ حاملہ ہو گئیں، جب بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا تو حسب وعدہ آپ نے اپنی زوجہ کو اس کے باپ کے پاس یثرب بھیج دیا، جب مولود مسعود پیدا ہوا تو اس کے سر کے بالوں میں چند سفید بال تھے، اس لیے ان کا نام شبیبہ (بوڑھا) تجویز ہوا، ہاشم پھر تجارتی کارواں کے ہمراہ شام گئے، وہاں ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ شبیبہ اور ان کی والدہ سلمیٰ یثرب میں ہی رہ گئیں، سات سال کا عرصہ گزر گیا، اتفاقاً بنو حارث بن عبد مناف کا ایک آدمی یثرب سے گزرا، اس نے وہاں کمسن بچوں کو نشانہ بازی کرتے دیکھا، ایک بچہ جب اس کا تیر نشانہ پر جا لگتا تو بڑی مسرت اور فخر سے نعرہ لگاتا ”انا ابن ہاشم انا ابن سید البطحاء“ یعنی میں ہی ہاشم کا فرزند ہوں میں بطحا کی وادی کے سردار کا بیٹا ہوں، جب وہ شخص مکہ واپس آیا تو مطلب کے پاس گیا، وہ اس وقت حجر میں مجلس جمائے بیٹھے تھے، اس نے انہیں سارا واقعہ کہہ سنایا اور کہا: یہ کسی طرح مناسب نہیں کے ہاشم کا بیٹا غریب الوطنی کی زندگی بسر کرتا رہے، جاؤ! اور اسے ضرور اپنے وطن واپس لاؤ، تاکہ اپنے خاندان کے بچوں میں پروان چڑھے، مطلب نے کہا کہ میں ابھی یثرب جا کر اپنے بھتیجے کو لے آتا ہوں، اس آدمی نے اس سفر کے لیے اپنی اوٹنی پیش کی، مطلب اس پر سوار ہوئے تیزی سے مسافت طے کرتے ہوئے یثرب پہنچے۔ صحیح قول یہی ہے کہ آپ نے اپنے بھائی کی بیوہ سلمیٰ کو کہا کہ وہ بچے سمیت ان کے ہمراہ مکہ چلے تاکہ بچے کی صحیح ماحول میں مناسب تربیت اور پرورش ہو سکے، سلمیٰ نے خود کو مکہ آنے سے انکار کر دیا لیکن اپنے بیٹے کے مستقبل کی خاطر بچے کو مکہ بھیجنے پر رضامند ہو گئیں، مطلب نے اپنے بھتیجے شبیبہ کو اوٹنی پر اپنے پیچھے بٹھایا اور مکہ کے لیے روانہ ہو گئے، مکہ پہنچے تو دو پہر کا وقت تھا، بڑے بڑے رئیس اپنی اپنی مجلسیں جمائے بیٹھے تھے، جب مطلب ان کے پاس سے گزرے، انہوں نے پوچھا: یہ بچہ کون ہے؟ آپ نے جواب دیا: یہ میرا غلام ہے، گھر پہنچے، بیوی نے بچے کے بارے میں استفسار کیا تو اسے بھی یہی جواب دیا کہ یہ میرا غلام ہے، اس طرح شبیبہ عبدالمطلب کے نام

سے مشہور ہو گئے پھر مطلب نے بچے کو نہلایا، نیا لباس پہنایا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ میرے بڑے بھائی ہاشم کا تخت جگر ہے لیکن عبدالمطلب کے نام کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ عمر بھر اسی نام سے پکارے جاتے رہے، شیبہ جو ان کا اصلی نام تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی، جب عبدالمطلب سن رشد کو پہنچے اور اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہو گئے تو آپ کے مشفق چچا مطلب نے آپ کے باپ کی جائیداد ان کے حوالے کر دی، نیز رفادہ، سقایہ وغیرہ مناصب جو ہاشم کے سپرد تھے وہ بھی ان کے حوالے کر دیے۔ (سیرۃ الرسول، ج: ۱، ص: ۴۴۵)

حضور کے والد بنو نجار کے مہمان بنے: پیر کرم شاہ از ہری لکھتے ہیں:

حضرت عبدالمطلب کے حالات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ آپ کے والد گرامی حضرت ہاشم نے یثرب کے بنی نجار خاندان کے رئیس عمرو بن لبید کی صاحبزادی سلمیٰ سے شادی کی، جس کے بطن سے شیبہ (عبدالمطلب) پیدا ہوئے، حضرت ہاشم ایک تجارتی سفر پر فلسطین گئے ہوئے تھے کہ غزہ کے مقام پر انتقال فرمایا اور یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عبد اللہ شادی کے بعد کچھ عرصہ مکہ میں رہے، پھر بغرض تجارت شام گئے، جب واپس لوٹے تو ان کا گزر یثرب سے ہوا، چند روز کے لیے اپنے والد حضرت عبدالمطلب کے نہال میں قیام کیا، اسی اثناء میں وہ بیمار ہو گئے، آپ کے دوسرے ساتھیوں نے چند روز انتظار کیا لیکن جب آپ کی طبیعت نہ سنبھلی تو وہ لوگ مکہ روانہ ہو گئے لیکن آپ رک گئے کہ صحت درست ہو تو سفر اختیار کریں لیکن مشیت الہی کو کچھ اور ہی منظور تھا، آپ کی طبیعت بگڑتی چلی گئی یہاں تک کہ آپ نے یثرب میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا، جب یہ جانکاہ خبر مکہ پہنچی ہوگی تو عبدالمطلب کے خاندان پر بجلی بن کر گری ہوگی، حضرت عبدالمطلب کو اپنے جواں سال اور فرخندہ فال لخت جگر اور آپ کے بھائی بہنوں کو اپنے بلند اقبال اور نخستہ نصال بھائی کی وفات نے جس طرح تڑپایا ہوگا، اس کا باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن حضرت آمنہ کے معصوم دل پر اس جانکاہ صدمہ سے جو چوٹ لگی ہوگی، اس کے درد کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ ابھی تو انہوں نے اپنے ماہ تمام کو جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا، کتنی

آرزوئیں زندہ درگور ہو گئی ہوں گی، کتنی امنگیں ادھوری رہ گئی ہوں گی؟ ایک کامیاب اور ہر نوع کی سعادتوں سے مالا مال زندگی بسر کرنے کے سارے حسین خواب چور چور ہو گئے ہوں گے، سیدہ کے قلب حزیں نے کتنا چاہا ہوگا کہ اڑ کر یثرب جائیں اور اس مٹی کے تودے کو دیکھیں اور اس کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنائیں، جہاں ان کا قرار جاں استراحت فرما ہے، لیکن وہ امانت جس کا آپ کو امین بنایا گیا تھا اس کی حفاظت کے احساس نے ان کے دل ناصبور کو اپنے محبوب کی مرقد کی زیارت سے باز رکھا، یہاں تک کہ وہ نور حق محمد معصوم کے پیکر رعنا میں ظاہر ہوا، پھر حضور کی پرورش کا فرض اس شوق فراواں کی تکمیل میں حائل رہا، جب اس لخت جگر اور نورے نظر کی عمر چھ سال ہو گئی اور آپ سات، آٹھ سال کی عمر کے بچوں سے بھی زیادہ توانا اور تندرست معلوم ہونے لگے اور غمزہ ماں کو یقین ہو گیا کہ ان کے گلشن آرزو کا یہ گل رنگیں اب یثرب کے طویل اور کٹھن سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو گیا ہے، تو انہوں نے اپنے سرسرخ حضرت عبدالمطلب سے اپنی اس دیرینہ آرزو کا ذکر کیا اور اجازت چاہی کہ آپ یثرب جا کر اپنے دولہا کی قبر کی زیارت کریں جو انہیں اپنی ایک سہانی جھلک دکھا کر شب ہجر کی تاریکیوں کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے ان سے بچھڑ گیا ہے، حضرت عبدالمطلب اپنی بہو کی اس درخواست کو مسترد نہ کر سکے اور یثرب جانے کی اجازت دے دی۔

حضور بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ بنو نجار کے مہمان بنے: سیدہ آمنہ اپنے فرزند دل بند کو لے کر یثرب روانہ ہوئیں، ان کے ساتھ ان کی کنیز ام ایمن تھی، اس خوش بخت خاتون کا نام برکت تھا اور اس کا تعلق حبشہ سے تھا، یہ حضور کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی، یہ مختصر سا قافلہ حضور کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کے نہال بنو عدی بن نجار کے یہاں جا اتر اور ایک ماہ تک وہاں مقیم رہا، مہینہ بھر کے قیام کے دوران جو واقعات رو پزیر ہوئے، سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت کے بعد جب یہاں تشریف فرما ہوئے تو بسا اوقات حضور ان یادوں کو تازہ فرمایا کرتے تھے، جب اس مکان کو دیکھتے جہاں

اپنی پیاری ماں کے ساتھ رہائش فرمائی تھی تو فرماتے: ”اس مکان میں میں اپنی والدہ کے ساتھ اتر اٹھا اور میں نے بنی عدی بن نجار کے تالاب میں تیرنے میں مہارت حاصل کی تھی“۔

(السیرة النبویة لزیبی دحلان، ج: ۱، ص: ۶۵)

اس مختصر قیام کے دوران ایک یہودی نے مجھے دیکھا تو پوچھا: ”یا غلام ما اسمک“ اے بچے! تمہارا نام کیا ہے؟ میں نے کہا: میرا نام احمد ہے، پھر اس نے میری پیٹھ کی طرف دیکھا، پھر میں نے اس کو یہ کہتے ہوئے سنا: ”هذا نبی هذه الامة“ یہ اس امت کا نبی ہے، پھر وہ اپنے یہودی علما کے پاس گیا اور انہیں جا کر یہ بتایا، میری والدہ کو بھی اس کا پتہ چل گیا، ان کے دل میں یہودی طرف سے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے، ام ایمن کہتی ہے کہ میں نے ان یہودیوں کو جو حضور کو دیکھنے کے لیے یکے بعد دیگرے آتے تھے یہ کہتے سنا: ”هو نبی هذه الامة وهذه دار هجرتہ“ کہ اس امت کے یہ نبی ہیں اور یہ جگہ ان کی دار ہجرت بنے گی، ان اندیشوں کے باعث حضرت آمنہ نے یہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور مکہ جانے کی تیاری شروع کر دی، ہم مدینہ سے روانہ ہوئے اور جب ابواء کے مقام پر پہنچے تو آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ ابو نعیم نے دلائل النبوة میں اسماء بنت رہم سے روایت کیا ہے: انہوں نے کہا کہ میری ماں حضرت آمنہ کی وفات کے وقت حاضر تھی، آپ نے اپنی بالین کے قریب اپنے فرزند کو دیکھا تو کچھ اشعار پڑھے ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

”میں نے جو خواب میں دیکھا ہے اگر وہ صحیح ہے تو آپ تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے جائیں گے۔

حل اور حرم سب جگہ آپ نبی ہوں گے، آپ کو آپ کے باپ ابراہیم کے دین اسلام پر مبعوث کیا جائے گا۔

میں آپ کو بتوں سے خدا کا واسطہ دے کر روکتی ہوں کہ آپ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر ان کی دوستی نہ کریں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا: ہر زندہ موت کا مزہ چکھے گا، ہر نئی چیز پرانی ہو جائے گی

اور ہر بڑی چیز فنا ہو جائے گی، میں تو مر رہی ہوں لیکن میرا ذکر ہمیشہ باقی رہے گا کیونکہ میں نے ایک پاکباز بچہ جنا ہے۔

علامہ زرقانی شرح مواہب اللدنیہ میں ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ اشعار اس بات پر صراحتاً دلالت کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ موحده تھیں، انہوں نے دین ابراہیمی کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ آپ کا فرزند اسلام کے ساتھ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوگا اور بتوں کی دوستی سے اپنے فرزند کو منع فرمایا۔ کیا یہی توحید نہیں؟ کیا ان عقائد کے علاوہ توحید کسی دوسری چیز کا نام ہے؟۔ (سیرت الرسول، ج: ۲، ص: ۷۵ تا ۷۷)

حضور نے ابوالیوب کے خاندان کو سب سے بہتر بتایا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گروہ انصار سے غایت درجہ محبت فرماتے تھے، آپ کی یہ محبت تمام انصار کے لیے عام تھی، لیکن انصار کے بعض قبیلوں کی مدح سرائی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خاص طور پر فرمائی، ان میں حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبیلے کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے قبیلے کے بارے میں ارشاد فرمایا: ”انصار میں سب سے بہتر قبیلہ بنو نجار کا قبیلہ ہے“

ملاحظہ ہوں انصار کے لیے زبان رسالت سے نکلے ہوئے توصیفی کلمات:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انصار میرا معدہ اور زنبیل ہے (میرے معتمد خاص اور پکے رازدار ہیں) اس حدیث پاک میں حضور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام انصار کی تعریف فرمائی۔

دوسری حدیث پاک میں فرمایا: انصار کے گھرانوں میں سب سے بہتر بنو نجار ہیں، پھر بنو عبد الاشہل پھر بنو الحارث پھر بنو ساعدہ ہیں اور انصار کے تمام گھرانوں میں خیر ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل باب فی خیر دور الانصار)

اس حدیث پاک میں بنو نجار کا ذکر ہے، جو حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبیلہ تھا، آپ اس قبیلے کے عظیم الشان سردار تھے، حضور نے صاف الفاظ میں فرمایا:

انصار کے گھرانوں میں سب سے بہتر بنو نجار ہیں۔

خاندان ابوالیوب کا ایک اور شرف: یوں تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کے خاندان کے بارے میں جو فرمایا، اسے کچھ حد تک آپ پڑھ آئیں ہیں، پھر اسی خاندان کو آپ نے اپنی میزبانی کا شرف عطا فرمایا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس قبیلے کو تعمیر مسجد نبوی کے دوران ایک لازوال شرف اور بھی عطا فرمایا، وہ یہ کہ جب بنو نجار کے نقیب حضرت اسعد بن زرارہ کا انتقال ہو گیا تو بنو نجار حضور کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور ہمارے قبیلے کے کسی شخص کو نقیب متعین فرمادیں، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں خود بنو نجار کا نقیب ہوں، لہذا کسی اور کو نقیب متعین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ سن کر بنو نجار کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا اور اس سعادت کو انہوں نے اپنے لیے ہمیشہ باعث افتخار سمجھا۔

(انساب الاشراف، ج: ۱، ص: ۱۰۵، عیون الاثر، ج: ۱، ص: ۳۱۵، تاریخ ابن خلدون، ج: ۲، ص: ۱۶)

مدینے میں صبح نور اور ابوالیوب کا اسلام میں داخلہ: مدینہ طیبہ میں جن نفوس قدسیہ نے سب سے پہلے دامن اسلام کے سایہ رحمت میں اپنی جگہ بنائی وہ انصار کے چند افراد تھے، ان کے مبارک اسماء درج ذیل ہیں:

اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر اور جابر بن عبد اللہ۔ ہم بڑے اختصار کے ساتھ ان حضرات کے اسلام قبول کرنے والے واقعے کو بیان کر رہے ہیں:

اعلان نبوت کے گیارہویں سال مدینہ طیبہ کے مذکورہ بالا چھ افراد موسم حج میں مکہ مکرمہ حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی عادت کے مطابق مکہ میں آئے، دور دراز کے قبائل کو دعوت حق پہنچانے کی غرض سے میدان منیٰ میں تشریف لائے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عقبہ کے پاس پہنچے تو وہاں مذکورہ حضرات سے ملاقات ہوئی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں اپنا تعارف کرایا اور دعوت حق پیش کی، قرآن سنایا اور اسلام کے بارے میں بتایا، یہ گروہ انصار مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ نشست و برخاست کی وجہ سے

حضور کے بارے میں کچھ باتیں اور علامتیں جانتا تھا، کیونکہ یہود مدینہ اپنی محفلوں میں نبی آخر الزماں کا تذکرہ کرتے اور کچھ علامتیں بیان کرتے تھے، اب حضور کی گفتگو سے انہیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا تذکرہ آسمانی کتابوں میں موجود ہے، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بغیر تاخیر کیے ہوئے اسلام لے آئے، مدینہ طیبہ کے مومنین کا یہ پہلا گروہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچا اور اپنی قوم کو دعوت اسلام پیش کی، جس کو توفیق خداوندی نصیب ہوئی وہ ایمان لے آیا، ان کی دعوت پر بہت زیادہ لوگ ایمان تو نہ لاسکے لیکن ان کی زبان سے نکلے ہوئے پیغام کا چرچا انصار کے گھر گھر میں عام ہو گیا۔

بیعت عقبہ اولیٰ: اگلے سال جو اعلان نبوت کا بارہواں سال تھا مدینہ طیبہ سے ۱۲ افراد پر مشتمل انصار کا ایک قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا، جن میں پانچ افراد تو وہی تھے جو پچھلے سال حاضر بارگاہ ہوئے تھے۔ (ان چھ حضرات میں سے جابر بن عبد اللہ حاضر نہ ہو سکے) باقی سات افراد پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تھے، نو وارد افراد کے نام یہ ہیں:

معاذ بن حارث، ذکوان بن عبد قیس، عبادہ بن صامت، یزید بن ثعلبہ، عباس بن عبادہ، ابوالحشیم بن تہان، عویم بن ساعدہ۔

یہ کل بارہ افراد تھے جنہوں نے عقبہ کے مقام پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کی، اسی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے، پھر اہل مدینہ کی طلب پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیر کو مدینہ طیبہ روانہ فرمایا، تاکہ وہ ساکنین مدینہ کو دین سکھائیں اور قرآن پڑھائیں، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تھے) نے اپنی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی، اللہ تعالیٰ نے ان کی مساعی قبول فرمائیں اور مدینہ طیبہ میں بہت سارے افراد دولت اسلام سے مالا مال ہو گئے۔

بیعت عقبہ ثانیہ: اعلان نبوت کے تیرہویں سال حضرت مصعب بن عمیر کی کارکردگی میں انصار کے ستر مرد اور دو خواتین حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مکہ

مکرمہ حاضر ہوئے، بعض روایات میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے والے انصار کی تعداد اس سے زیادہ بیان کی گئی ہے، چنانچہ عیون الاثر کی روایت کے مطابق انصار کی تعداد پچھتر تھی، جن میں تہتر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ (ج: ۱، ص: ۲۷۷)

ان خوش نصیبوں نے عقبہ کے پاس حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک دست پاک پر حفاظت و نصرت پر بیعت کی، اس بیعت کو تاریخ اسلام میں بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ علامہ محمد بن محمد المعروف بن سید الناس نے اس مقام پر اپنی کتاب عیون الاثر میں ان پچھتر حضرات کی فہرست، نام مع قبائل تحریر فرمائی ہے، قبیلہ بنو نجار کے افراد کا شمار کراتے ہوئے سب سے پہلا نام آپ نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تحریر فرمایا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں: ”ومن الخزرج ثمد من بنی النجار ابو ایوب خالد بن زید بن کلیب۔“ (البدء والتاریخ، ج: ۲، ص: ۱۶۶، الطبقات الکبری، ج: ۱، ص: ۱۷۱، عیون الاثر، ج: ۱، ص: ۲۷۸)

علامہ ابن سید الناس کے علاوہ کثیر مؤرخین نے حضرت ابویوب کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ بیان فرمائے ہیں: ”شهد العقبة“ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ عقبہ (ثانیہ) میں شریک ہوئے۔

(الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۹۶، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۱، الاصابہ، ج: ۲، ص: ۹۰)

مذکورہ بالا تفصیل سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار ان صحابہ کرام میں ہے، جنہیں انصار میں سابقین اولین کہا جاتا ہے اور یہ کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کوششوں کے نتیجے میں اس وقت اسلام قبول فرمالیا تھا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت بھی نہ فرمائی تھی۔

حضور کی ہجرت اور ابویوب کی قسمت: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے، بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، حضور کا دیدار کیا اور حضور کے

دست مبارک پر بیعت کی، ان تمام فیروز بختیوں نے گواہی نہیں بعد الانبیاء کائنات کا سب سے بڑا شرف، شرف صحابیت حاصل کر دیا تھا لیکن حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات کو ذکر ابد اور شہرت دوام جس چیز نے عطا فرمائی وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سفر ہجرت ہے کہ جس سفر کی بدولت حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور کی میزبانی کرنے کا شرف میسر آیا اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تاریخ اسلام کا ایک انمٹ حصہ ہو گئے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس سفر کی کچھ تفصیلات پیش کی جائیں۔ سفر ہجرت کو پیر کرم شاہ ازہری نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، ہم انہیں کے بعض اقتباسات کو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

سرو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبا میں تشریف آوری: اہل مدینہ کو جب سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مکہ سے روانگی کی اطلاع ملی، اسی دن سے ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی، انتظار کے یہ لحظات انہیں قیامت سے زیادہ طویل نظر آنے لگے، مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کا فاصلہ عام طور پر بارہ دنوں میں طے ہو جاتا ہے، یہ بارہ دن تو انہوں نے بیقرار دلوں کو تسلی دیتے ہوئے گزار لیے لیکن اب ان کے صبر کا یہ پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، وہ اجتماعی شکل میں اپنے آقا کے استقبال کے لیے مدینہ طیبہ سے باہر ایک پتھر لیے میدان میں جمع ہو جاتے اور سورج کے ڈھلنے تک انتظار کرتے، پھر مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ جاتے، دن کے وقت سورج کی تپش ناقابل برداشت ہوتی ہے، گرم لوجسم کو جلانے دیتی ہے، اس لیے اہل عرب صحراؤں کو عبور کرنے کے لیے راتوں کو سفر کرتے ہیں تاکہ چاشت کے وقت تک اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں، اگر ایسا نہ ہو سکتے تو پھر دوپہر سے پہلے کسی سایہ دار درخت کے نیچے دن گزارتے ہیں، پھر جب رات آتی ہے تو سفر شروع کرتے ہیں، انصار مدینہ کا یہ معمول تھا کہ صبح سویرے استقبال کے لیے جمع ہو جاتے اور چاشت کے وقت تک انتظار کرتے ہیں، جب حضور کی تشریف آوری کا متوقع وقت گزر جاتا

تو گھروں کو لوٹ آتے، انتظار کا پہلا دن کرب میں اور آنے والی رات پہلو بدلتے بے چینی کی نذر ہو گئی۔

دوسرے دن علی الصبح وہ پھر اپنے محبوب کریم کے دیدار کے شوق میں نئے عزم کے ساتھ سراپا شوق بن کر استقبال کے لیے اسی پتھر یلے میدان میں جمع ہو گئے، جوق در جوق، گروہ در گروہ، فرزند ان اسلام وہاں انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ موسم گرما کے آفتاب نے دھوپ میں ٹھہرنا محال بنا دیا اور انہیں مجبوراً واپس آنا پڑا، بیم ورجا کی اس کیفیت میں دو دن گزر گئے لیکن وہ حبیب دلربا بھی تک تشریف نہ لایا تھا۔ (السيرة النبوية ليزيد بن دحلان، ج: ۱، ص: ۳۲۱)

تیسرے دن پھر وہ صبح کے وقت اپنے آقا کی راہ میں دل و نگاہ کو فرش راہ بنانے کے لیے اس میدان میں انتظار کرنے لگے، سورج ڈھلنے کے قریب ہو گیا، دیواروں کے سائے بھی سمٹ کر ختم ہو گئے، انہیں یقین ہو گیا کہ اس ماہ مبین کے طلوع ہونے کا بظاہر اب کوئی امکان نہیں رہا تو وہ آہستہ آہستہ گھروں کو لوٹنے لگے، یہاں تک کہ وہ میدان خالی ہو گیا، عین اس وقت ایک مختصر قافلہ ادھر آ رہا تھا، رحمت الہی اور عنایت ربانی اس پر سایہ فگن تھی، تقدس کا نورانی ہالہ ان کے گرد حلقہ زن تھا، لطف خداوندی رم جھم برس رہا تھا، اس وقت ایک یہودی اپنے کسی کام کے سلسلہ میں ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا تھا، اس نے اس نور افشاں کارواں کو دیکھا تو پہچان گیا، جھٹ اس نے بلند آواز سے نعرہ لگایا جس سے یثرب کی ساری وادیاں گونج اٹھیں اور فضا میں خوشی و مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اس نے بلند آواز سے کہا: ”یا بنی قبیلة هذا جدکم قد جاء“ ایک قبیلہ کے فرزندوں یہ ہے تمہارا بخت بیدار دیکھو، یہ تمہارے پاس آ گیا ہے۔ (قبیلہ انصار کی ایک وادی کا نام تھا) جس کسی کے کان میں یہ آواز پہنچی وہ اپنے آقا کے دیدار اور استقبال کے لیے بھاگا ہوا چلا آ رہا تھا، اس اثنا میں حضور سرور کائنات اور حضرت صدیق کھجور کے ایک درخت کے سائے میں پہنچ گئے، اپنی اوٹنیوں کو بٹھایا اور ان سے اتر کر اس کھجور کے سایے میں تشریف فرما ہو گئے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی حضور کی آمد کے موقع پر انصار و فاشعار کی مسرت

وشادمانی کا یوں بیان کرتے ہیں:

جب ٹیلے پر کھڑے ہو کر یہودی نے اعلان کیا ہے مسلمانوں تمہارا مقصد و مقصود تشریف لے آیا ہے، مسلمانوں میں مسرت و شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی، اپنے ہتھیاروں کو لیے ہوئے سرور کائنات کے استقبال کے لیے بھاگے چلے آ رہے تھے، حرا کے میدان میں ملاقات کا شرف نصیب ہوا، ایک دوسرے کو مبارک بادیں دے رہے تھے، طرح طرح سے خوشیوں کا اظہار کر رہے تھے، جوان اور بچے، عورتیں اور مرد، چھوٹے اور بڑے سب نعرہ لگا رہے تھے ”جاء رسول اللہ، جاء نبی اللہ“ اللہ کے رسول تشریف لے آئے ہیں، اللہ کے نبی تشریف لے آئے ہیں۔ (مدارج النبوة، ج: ۲، ص: ۶۳)

حضرت انس فرماتے ہیں: میری عمر اس وقت آٹھ، نو سال کی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے در و دیوار حضور کی طلعت زبیا کے انوار سے چمک رہے ہیں، گویا کہ سورج طلوع ہو گیا، حضرت ابوبکر حضور کریم کے ہم عمر تھے، بہت کم فرق تھا، اہل مدینہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر نے حضور کو پہلے دیکھا نہ تھا اس لیے پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی، چند لمحوں میں زائرین کی بھیڑ لگ گئی، حضرت ابوبکر نے لوگوں کی اس پریشانی کو بھانپ لیا، انہوں نے اٹھ کر حضور سرور کونین صلی تعالیٰ علیہ وسلم پر اپنی چادر تان کر سایہ کر دیا، اس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ مخدوم کون ہے اور خادم کون، آقا کون ہے اور غلام کون؟

(سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۳، ص: ۷۷)

جس بستی میں حضور نے نزول اجلال فرمایا، اس کا نام قبا تھا، مدینہ طیبہ کے قریب ایک چھوٹی سی آبادی تھی، جہاں عمرو بن عوف کا قبیلہ آباد تھا، یہی وہ خوش بخت لوگ تھے جن کو اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا تھا، یہی وہ بلند اقبال قبیلہ تھا جسے رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سفر ہجرت کی طویل اور پر خطر مسافت طے کرنے کے بعد استراحت فرمانے کے لیے منتخب فرمایا تھا، پل بھر میں پانچ سو کے قریب جاں نثار انصار کا ہجوم اکٹھا ہو گیا، سب نے عرض کی: ”انطلقا آمنین

مطاعین“ اپنی اوٹنیوں پر سوار ہو جائیں، بڑے اطمینان سے ہمارے ہاں تشریف لے چلیں، آپ یہاں امن و امان میں ہوں گے، ہم سب غلام آپ کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہیں گے۔ (سیرت ابن کثیر، ج: ۲، ص: ۲۶۹)

قبائیں رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کلثوم بن ہدم جو قبیلہ عمرو بن عوف کا ایک سردار تھا کہ گھر میں قیام فرمایا، بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قبائیں حضور کے میزبان سعد بن خیشمہ تھے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ قبائیں حضور کا قیام تو کلثوم بن ہدم کے ہاں تھا لیکن جب لوگ ملاقات کے لیے جمع ہو جاتے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کلثوم کے مکان سے نکل کر حضرت سعد کی حویلی میں تشریف لے جاتے تھے، وہ کھلی حویلی تھی، نیز حضرت سعد کے بیوی بچے بھی نہ تھے، یہاں بے تکلفی اور آسانی سے سب زائرین سے ملاقات ہو سکتی تھی، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ مہاجرین جن کے ساتھ ان کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے وہ سب سعد کے مہمان بنا کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کا گھر بیت العزاب کے نام سے مشہور تھا۔

مسجد قبائیں تعمیر: رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب تک قبائیں تشریف فرما رہے، ملاقات کرنے والوں، زیارت کرنے والوں اور دعوت حق سننے والوں کا تانتا بندھا رہا، سعادت مند روئیں اس چشمہ صافی سے اپنے دلوں کی پیاس کو بجھاتی رہیں، چند روز قیام کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یثرب کی پیاسی سرزمین کو سیراب کرنے کے لیے روانہ ہوئے، لیکن یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے دست اقدس سے اس بستی میں ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر فرمائی، اس مسجد کو مسجد قبائیں کہا جاتا ہے۔ (حضور نے قبائیں کتنے دن قیام فرمایا، اس کو ہم ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے)

حضرت شمس بنت نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما مسجد قبائیں کی تعمیر کا چشم دید حال بیان کرتی ہیں: میں نے اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت کی، جب حضور قبائیں تشریف لائے، یہاں اقامت فرمائی اور مسجد تعمیر کی، جب مسجد

قبائلی تعمیر ہو رہی تھی تو میں نے حضور کو دیکھا کہ حضور پتھر خود اٹھاتے تھے اور اس پتھر سے گرنے والی مٹی حضور کے چمکتے ہوئے شکم مبارک پر پڑتی تھی، حضور کی خدمت میں کوئی صحابی حاضر ہوتا اور عرض کرتا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ حضور پر قربان ہوں، یہ پتھر مجھے عطا فرمائیں، میں آپ کی طرف سے اٹھا کر لے جاؤں تو حضور فرماتے: ”لا، خذ مثله“ اسے رہنے دو، تم اس جیسا کوئی اور پتھر اٹھا کر لے جاؤ، یہاں تک کہ وہ مسجد پائے تکمیل تک پہنچی۔ یہ مسجد ایک ایسے میدان میں تعمیر کی گئی جہاں پہلے کھجوریں خشک کی جاتی تھیں اور یہ کلثوم بن ہدم حضور کے میزبان کی ملکیت تھی، انہوں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد تعمیر کرنے کے لیے حضور کی خدمت میں پیش کیا، یہ پہلی مسجد تھی جسے ہجرت کے بعد سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعمیر کیا اور اس میں بھاری بھر کم پتھر اٹھا کر لائے اور اس کی تعمیر میں شریک ہوئے، یہی وہ مسجد ہے جس کے بارے میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی ”لَمَسْجِدُ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَخَطَّوْا ۖ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ“ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، پہلے دن سے وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے۔

(سورہ توبہ: ۱۰۸)

اس آیت کا یہ مقصد نہیں کہ صرف یہ مسجد ہی ایسی ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی مسجد نہیں جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہو، بلکہ اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ بھی بے شمار مسجدیں ہیں جو اس کے بعد تعمیر ہوئیں اور ان کی بنیاد بھی تقویٰ پر رکھی گئی تھی جیسے مسجد نبوی اور دیگر مساجد۔

قبائلی مدت قیام: سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتنے روز قبائلی قیام فرمایا، اس کے بارے میں علماء سیرت و حدیث کے چار اقوال ہیں:

(۱) اولین سیرت نگار امام ابن اسحاق فرماتے ہیں: سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیر کے دن دوپہر کے فوراً بعد قبا میں تشریف فرما ہوئے۔ منگل، بدھ، جمعرات کو یہاں قیام فرمایا اور چوتھے روز جمعہ کے دن تک چاشت کے وقت یہاں سے عازمِ یثرب ہوئے۔

(۲) موسیٰ بن عقبہ نے قبا میں مدت قیام بائیس شب بتائی ہے۔

(۳) واقدی کے نزدیک یہ عرصہ چودہ روز ہے۔

(۴) لیکن سیدالحمیدین امام محمد بن اسماعیل البخاری نے اس کے بارے میں اپنی صحیح میں امام زہری اور حضرت عروہ کے واسطے سے یہ روایت نقل کی ہے یعنی سرورِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دس شب سے چند روز زیادہ یہاں قیام فرمایا اور انہیں ایام میں مسجد قبا کی تعمیر پایہ تکمیل تک پہنچی۔ (سیرت ابن کثیر، ج: ۲، ص: ۲۶۷)

مندرجہ بالا روایات میں سے سند کے اعتبار سے یہی روایت زیادہ قابلِ اعتماد ہے، حالات اور واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں، مسجد تعمیر کرنے کے لیے جگہ کا تعین، عمارت کے لیے پتھروں کی فراہمی پھر اس کی تعمیر کی تکمیل، ان تمام کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اتنے دنوں کا صرف ہونا اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

قبا سے روانگی: نوریدہ عاشقان، راحتِ قلوب مشتاقان، حبیب الرحمن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جتنے روز بھی قبا میں قیام فرما رہے، یثرب کے فرزند ان اسلام صبح و شام ہر وقت شمعِ جمالِ مصطفویٰ پر پروانوں کی طرح تصدق ہوتے رہتے تھے، اللہ کے محبوب کے دیدار کا شوق کشاں کشاں انہیں یہاں لاتا، بے قرار دل اور بے چین آنکھیں اس جمالِ جہاں آرا کی زیارت میں ہمہ وقت محو رہتیں، یہ سب لوگ اس لمحے کے انتظار میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتے، جب ان کا ہادی و رہبر اپنے ورودِ مسعود سے ان کے قلب ہائے احزان کو منور فرمائے گا، ان کے مضطرب دلوں اور بے چین روحوں کی جھولیوں کو سچی اور ابدی مسرتوں سے معمور کرے گا، صرف انصار ہی اس ساعت ہمایوں کے لیے مضطرب نہ تھے بلکہ یثرب کے مکانوں کے درو دیوار اس روئے انور کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے

قرار تھے اور اس بستی کے کوچہ و بازار ان کے قدم ناز کو بوسہ دینے کے لیے بے چین تھے، طیبہ کے نخلستانوں کی بلند قامت کھجوریں جھوم جھوم کر اس شاہ والا تبار کی بلائیں لے رہی تھیں، آخر جمعۃ المبارک کی وہ صبح صادق طلوع ہوئی، ہر طرف نور ہی نور پھیل رہا تھا، ہر طرف اجالا ہی اجالا انسانیت کی شب تار کو روز روشن میں بدل رہا تھا، اندھیروں کا طلسم ٹوٹ رہا تھا، ظلمتوں کے دبیز پردے چاک ہو رہے تھے، اس نیر اعظم کی نورانی شعاعوں کی ہیبت سے ہر نوع کی تاریکیوں پر لرز اٹاری تھا، ویسے تو ہر رات کے بعد ہمیشہ صبح طلوع ہوتی ہے اور ہر صبح کی روشنی زمین کے گوشے گوشے کو منور کرتی رہتی ہے لیکن آج کی صبح نزالی صبح تھی، اس کے اجالوں میں اتنی شوخی اور تابانی تھی کہ کوئی تاب نہیں لاسکتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ”جس روز رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں نزول اجلال فرمایا، مدینہ کی ہر شے جگمگانے لگی تھی۔“ حضرت ابو خثیمہ کے فرزند فرماتے ہیں کہ ”میں اس روز وہاں موجود تھا جس روز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شہر مدینہ میں قدم رنجہ فرمایا، میں نے آج تک کوئی ایسا دن نہیں دیکھا جو اس روز سعید سے زیادہ حسین ہو یا زیادہ روشن ہو۔“ (سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۳، ص: ۳۸۶)

چند روز قبل کی بستی کو بقیعہ نور بنائے رکھنے کے بعد یمن و سعادت کا پیکر ہمایوں، خیرات و برکات کا قاسم کریم، نوع انسانی کا بخت بیدار، کائنات کی برکات کا من موہنا اور سچیلہ دولہا، آج اس سرزمین کو عرش پایہ بنانے کے لیے روانہ ہو رہا تھا، جس کی خاک کے ذرے ازل سے اس کے پائے ناز کو بوسہ دینے کے لیے تڑپ رہے تھے، جس کی نسیم سحر کے جھونکے اس کی زلف عنبریں کو چومنے کے لیے دیوانہ وار سرگرداں رہا کرتے تھے، ان کچے مکانوں، کھجوروں کی شاخوں سے بنے ہوئے چھپروں جن کو آج تک غربت و افلاس نے جنم لینے والی محرومیوں نے اپنا گھر بنایا ہوا تھا، وہ فخر دودہ آدم آج انہیں ایسی رونقیں بخشنے کے لیے تشریف لا رہا تھا، جن پر شاہ ایران کا قصر ابیض اور قیصر روم کے مر مر میں محلات سو جان سے فدا ہونے والے تھے، چاشت کا وقت ہو گیا ہے، عرب کا سورج

اپنی جملہ تمازتوں کے ساتھ جلوہ فشاں ہے، یثرب کے سارے کلمہ گوا اپنے آقا، اپنے ہادی اور اپنے نبی کو اپنے ہمراہ اپنی بستی میں لے جانے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ جشن استقبال میں شرکت کرنے والے تمام حضرات نے بہترین لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں، ہتھیار اپنے جسم پر سجائے ہوئے ہیں، خارہ شکاف شمشیروں کی چمک سے سورج شرما رہا ہے اور نیزوں کی سنائیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، ان کی چمک اور تیزی سے اہل باطل کے جگر گداز ہو رہے ہیں، حبشہ کے سیاہ رنگ حبشی بھی اظہار مسرت میں کسی سے پیچھے نہ تھے، وہ اپنے آقا کے جلوے میں سرخوش و سرشار ہو کر اپنے ہتھیاروں سے جنگی کرتب دکھا رہے تھے، آج وہ کیوں کر خوش نہ ہوتے، آج وہ تشریف لا رہا ہے جس کے قدموں کی خاک نے ان کی کالی رنگت کو وہ ملاحتیں بخش دی تھیں جن پر فردوس بریں کی حوریں بھی سوجان سے قربان ہونے لگی تھیں، اب انہیں کوئی ان کی سیاہ روئی کا طعنہ نہ دے سکے گا، ان کے موٹے ہونٹوں اور چھوٹی ناکوں کے باعث کوئی انہیں حقیر اور ذلیل نہ سمجھ سکے گا بلکہ امت مسلمہ کا امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم انہیں سیدنا بلال کہہ کر پکارے گا، جب مکہ فتح ہوگا، جب بیت اللہ شریف بتوں کی نجاستوں سے پاک کر دیا جائے گا، اس روز کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی توحید، کبریائی اور اس کے محبوب بندے کی رسالت اور شان مصطفائی کا اعلان کرنے کے لیے کسی عرب کو، کسی قریشی کو، کسی ہاشمی کو منتخب نہیں کیا جائے گا بلکہ اہل حبش کے ایک فرد کو نگاہ رسالت منتخب فرمائے گی اور اسے حکم دے گی: اے بلال! چڑھ جا کعبہ کی چھت پر اور اذان دے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ”جس روز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ شریف تشریف لائے، اس روز حضور کی یہاں آمد پر مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہوئے حبشیوں نے اپنے ہتھیاروں کے ساتھ جنگی کرتب دکھائے۔“

اللہ تعالیٰ نے بڑی فیاضی سے اہل یثرب کو حسن و جمال کی نعمت ارزانی فرمائی ہے، لیکن آج تو ان کے شباب اور ان کی رعنائیوں کا رنگ ہی نرالا ہے، چاندان کی طلعت زیبا کو دیکھ کر ماند پڑ گیا ہے اور شگفتہ پھول ان کے رخساروں کی رنگت کے سامنے شرمسار ہو

رہے ہیں، وہ خوش نصیب آج اللہ تعالیٰ کی شان تخلیق کے شاہکار کے حسن کے جلوؤں کے مشاہدے میں مستغرق ہیں، دلوں کے جام اس نازنین ازلی کی محبت کی شراب طہور سے لبالب بھرے ہیں، انہوں نے اپنے سینوں کو ہر قسم کی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک کر دیا ہے تاکہ ان کے کریم آقا کے دل آویز انوار کی جلوہ گاہ بن سکیں۔ آخر کار وہ سعید لمحہ آتا ہے جس کے انتظار میں عرصے سے وہ دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہیں، قصویٰ نامی ناقہ پیش کی جاتی ہے، جس پر ایک سادہ سا پالان کسا ہوا ہے، مرکب کون و مکان کا یکتا شہسوار رکاب میں قدم مبارک رکھ کر اس پالان پر جلوہ فرما ہے، گلشن ہستی پر بہار آ جاتی ہے، ہر طرف عید کا سماں ہے، نبض ہستی کوئی جولانیاں بخش دی گئی ہیں، نسیم رحمت کے جھونکے دلوں کے غنجوں کو شگفتہ پھول بنا رہے ہیں، اپنے آقا کو یوں سوار دیکھ کر دل و جاں نثار کرنے والے غلاموں پر کیف و مستی کا ایک عجیب سماں طاری ہو جاتا ہے، اچانک نعرے بلند ہونے لگتے ہیں: ”اللہ اکبر قد جاءنا رسول اللہ، اللہ اکبر جاء محمد، اللہ اکبر جاء محمد، اللہ اکبر جاء رسول اللہ“ ان پر جوش نعروں سے ساری فضا گونج اٹھتی ہے، باطل و طاغوت کے پرستاروں کے دل پھٹنے لگتے ہیں، اصنام و اوثان کے پجاریوں کے گھروں میں صف ماتم بچھ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے محبوب نبی کی رسالت کے نعروں سے حق کا پرچم بلند ہو جاتا ہے۔ جاں نثاروں کا بے پناہ جوم ہے، گلیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں، ارد گرد کے مکان اور ان کی چھتیں شوق دیدار میں بے خود اور بے قابو ہونے والوں سے بھری ہوئی ہیں، بچے، جوان، بوڑھے، کمسن بچیاں اور پردہ دار خواتین کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں، معصوم بچیاں اور اوس و خزرج کی عفت شعار دوشیزائیں دفیں بجابجا کر دل و جان سے محبوب تر اور عزیز تر اپنے مہمان کو ان اشعار سے خوش آمدید کہہ رہی ہیں:

طلع البدر علينا من ثنيات الوداع

وجب الشكر علينا ما دعا لله داع

ايها المبعوث فينا جئت بالامر المطاع

ثنیۃ الوداع (وہ چوٹی جہاں مہمانوں کو الوداع کی جاتی ہے) سے چودھویں کے چاند نے ہم پر طلوع فرمایا ہے۔

جب تک اللہ تعالیٰ کو پکارنے والا اس کو پکارتا رہے گا ہم پر لازم ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں۔

اے ہمارے پاس نبی بن کر تشریف لانے والے! آپ اس طرح تشریف لے آئے ہیں کہ آپ کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے گی۔

ہر لحظہ جوم بڑھتا چلا جا رہا ہے قصویٰ کے لیے چلنا دشوار ہو رہا ہے گویا اس کے کانوں میں کوئی یہ کہہ رہا ہے:

قدم اے راہرو آہستہ تر نہ چوما ہر ذرہ اودردمند است

اس مرکب ہمایونی کو حرکت میں آئے کافی وقت گزر گیا ہے لیکن بمشکل چند فرلانگ کا فاصلہ طے ہوا، اہل صدق و صفا رباب عشق و وفا کا یہ قافلہ اپنے مرشد و رہبر اپنے محبوب و دلبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قیادت میں بنی سالم بن عمرو بن عوف کے محلہ میں جب پہنچا تو سورج ڈھل گیا تھا اور نماز جمعہ ادا کرنے کا وقت ہو گیا تھا، وہیں ایک کھلے میدان میں نماز جمعہ ادا کرنے کا حکم صادر ہوا، چند لمحوں میں صحابہ کرام نے اپنی صفیں درست کر لیں، بصد ادب اور بہزار خضوع اپنے رب قدیر و کریم کی بارگاہِ صمدیت میں نماز ادا کرنے کے لیے بیٹھ گئے، فصیح العرب والجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا، اس کی فصاحت و بلاغت نے سامعین پر وجد و محویت کی ایک عجیب کیفیت طاری کر دی، سچے موتیوں سے زیادہ آبدار کلمات میں معانی و معارف کے جو سمندر موجزن تھے انہوں نے دلوں کی دنیا بدل کر رکھ دی، اذہان کی سوچیں بدل گئیں، سود و زیاں فنا و بقا کے نئے معیاروں کی نقاب کشائی کر دی گئی، یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو تمام انبیاء و رسل کے امام کی قیادت میں اوس و خزرج کے اہل ایمان اور جملہ مہاجرین کو ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، یہ جمعہ کا پہلا خطبہ تھا جو یثرب کے آزاد ماحول میں محسن انسانیت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان کو بادیہ

ضلالت سے نکال کر راہ راست پر گامزن کرنے اور انہیں منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔

جس علاقے میں بنی سالم محلہ تھا، اس کا نام وادی رانونا تھا۔ یہاں کھلے میدان میں حضور سرور کائنات علیہ اطمینان الصلوٰۃ وازکی التسلیمات نے پہلی نماز جمعہ ادا کی، وہاں بعد میں مسجد تعمیر ہوئی، وہ مسجد ”غیبیہ“ کے نام سے مشہور ہوئی۔ نماز جمعہ سے فراغت کے بعد نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی ناقہ قصویٰ پر سوار ہوئے تو قبیلہ بنی سالم کے چند حضرات خدمت اقدس میں حاضر ہوئے جن کی قیادت ان کے دوسرے حضرت عتبہ بن مالک اور عباس بن نضلہ کر رہے تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور آکر گزارش کی ”یا رسول اللہ اقم عندنا فی العدد والعدة والمنعة“ یا رسول اللہ! ہمارے ہاں قیام فرمائیں، ہمارے قبیلہ کی تعداد بھی کافی ہے، ساز و سامان اور اسلحہ بھی وافر مقدار میں ہے اور ہم حضور کے دفاع کی بھی پوری طاقت رکھتے ہیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا: ”خلوا سبیلہا فانہا مامورۃ“ میری اونٹنی کا راستہ خالی کر دو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے حکم مل چکا ہے، یہ حکم الہی کے مطابق ٹھہرے گی اپنے آقا کا ارشاد سن کر دلوں میں خلوص و محبت کے جو طوفان اٹھ رہے تھے سہم گئے، کسی کو مزید اصرار کی ہمت نہ ہو سکی، سب نے سر تسلیم خم کر دیا اور اونٹنی کے لیے راستہ صاف کر دیا، وہ خوش بخت اونٹنی شہسوار میدان نبوت و رسالت کو اپنے اوپر اٹھائے خراماں خراماں اس منزل کی طرف روانہ ہوئی، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کی مستقل قیام گاہ بننے کے لیے چنا تھا، کیا سہانا منظر ہوگا؟ غریب پرور اور دل نواز آقا کی سواری آگے بڑھ رہی ہے، سراپا خلوص و ایثار غلاموں کا جم غفیر اپنے آقا کے گرد حلقہ باندھے ہے، سارے راستے اور گلیاں بھری ہوئی ہیں، مکانوں کے صحن اور ان کی ساری چھتوں پر خواتین سراپا انتظار بنی، وارفستگی شوق میں ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں: ”ایہم ہو ایہم ہو“ ہماری آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور کون سا ہے؟

چلتے چلتے یہ موکب ہمایوں بنی بیاضہ کے محلہ کے نواح میں پہنچتا ہے تو زیاد بن ولید

اور فروہ بن عمرو اپنے قبیلے کے چند چیدہ افراد کی معیت میں خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں: یا رسول اللہ! ہمارے ہاں تشریف رکھیے، ہمارے قبیلے کی تعداد بھی کافی ہے، جنگی ساز و سامان بھی وافر مقدار میں ہیں اور ہم حضور کے دفاع کی پوری طاقت رکھتے ہیں، سرور دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں بھی ارشاد فرمایا: اس کا راستہ خالی کر دو، اللہ تعالیٰ کی طرف اسے حکم مل چکا ہے، یہ حکم الہی کے مطابق قیام کرے گی، یہ لوگ بھی فرمان نبوت کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور اونٹنی کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ جلوس دار بنی ساعدہ کے پاس پہنچتا ہے، قبیلہ بنو ساعدہ کے دور نیس سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو چند ہمراہیوں کے ساتھ حاضر خدمت ہو کر عرض کرتے ہیں: یا رسول اللہ! ہمارے پاس تشریف رکھیے ہمارے قبیلہ کے افراد کی تعداد بھی کافی ہے جنگی ساز و سامان بھی بکثرت ہے اور ہم حضور کا دفاع کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں، نبی اکرم نے ان کو بھی وہی جواب دیا کہ میری اونٹنی کا راستہ خالی کر دو، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ٹھہرے گی، وہ بھی سامنے سے ہٹ گئے اور اونٹنی نے چلنا شروع کیا۔ جب حضور بنو حارث بن خزرج کے علاقہ میں پہنچے تو سعد بن ربیع، خارجہ بن زید، عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بنو حارث کے دیگر افراد کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی، حضور علیہ السلام نے اپنا پہلا جواب دہرایا۔ انہوں نے بھی اپنی عقیدت و محبت کے شدید تقاضوں کو حکم رسالت پر قربان کر دیا اور راستہ خالی کر دیا۔

یہ قافلہ چلتے چلتے نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نہال کے محلہ دار بنی عدی بن نجار میں پہنچا، جہاں بنو عدی بن نجار سکونت پذیر تھے، حضور کے جد امجد حضرت عبد المطلب کی والدہ ماجدہ سلمیٰ بنت عمرو اسی خانوادہ کی خاتون تھیں، ان کی شادی حضرت ہاشم کے ساتھ ہوئی تھی، انہی کے شکم طاہر سے حضرت عبد المطلب کی ولادت ہوئی تھی، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو سلیط بن قیس اور اسیرہ بن خارجہ اپنی قوم کے افراد کے ساتھ حاضر خدمت ہو کر عرض پرداز ہوئے: یا رسول اللہ! اپنے نہال کے پاس تشریف لائیے ان

کی تعداد بہت زیادہ ہے، ساز و سامان سے لیس ہے، قوت دفاع بھی زیادہ ہے، حضور نے ارشاد فرمایا: اس کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے، وہ راستے سے ہٹ گئے ناقہ آگے رواں ہوئی۔ جب بنی مالک بن نجار کے محلہ میں پہنچی تو وہ اونٹنی اس جگہ بیٹھ گئی جہاں اب مسجد نبوی ہے، اس وقت وہ کھلا میدان تھا جہاں لوگ اپنی کھجوریں دھوپ میں خشک کیا کرتے تھے، یہ میدان بنو نجار کے دو قبیلوں سہیل اور سہیل فرزند ان عمرو کی ملکیت تھا، جب اونٹنی یہاں بیٹھی تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نیچے نہیں اترے اس کے اوپر ہی بیٹھے رہے، تھوڑی دیر کے بعد اونٹنی پھر کھڑی ہو گئی اور آگے چل دی، حضور نے اس کی مہار اس کی گردن پر ڈالی ہوئی تھی، حضور اسے کسی طرف موڑتے نہیں تھے چند قدم آگے چل کر اونٹنی خود بخود واپس مڑی اور جہاں پہلے بیٹھی تھی وہاں آ کر بیٹھ گئی، پھر اس نے جھر جھری لی در ماندہ ہو کر بیٹھ گئی اور گردن زمین پر ڈال دی۔ (سیرت ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۱۱۲)

پل بھر میں بنو نجار کی بچیاں دفین لیے ہوئے یہ شعر گاتی ہوئی اپنے محبوب نبی اور جلیل القدر مہمان کو مرحبا اور خوش آمدید کہنے کے لیے اکٹھی ہو گئیں، وہ گارہی تھیں: ہم بنو نجار کی بچیاں ہیں یا رسول اللہ! (فداک ابی و احی) آپ کتنے بہترین پڑوسی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان بچیوں کا یہ محبت آگس شعر سن کر ان سے پوچھا: کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟

ہاں! بیشک یا رسول اللہ! ہم محبت کرتی ہیں۔

تو رحمت عالم نے ارشاد فرمایا: ”بمخدا میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں، بمخدا میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں، بمخدا میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں، بمخدا میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“ (سبل الہدیٰ والارشاد، ج: ۳، ص: ۳۹۰)

فخر آدم و بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اپنی ناقہ سے اترے اور حضور نے چار مرتبہ یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی ”وَقُلْ رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبَارَكًا وَاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۹“

اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔

اس وقت حضور پر نزول وحی کی کیفیت طاری ہوئی، کچھ دیر کے بعد یہ کیفیت ختم ہو

گئی، حضور نے فرمایا: یہ ہماری قیام گاہ ہے۔ ”ان شاء اللہ“

یہاں سب سے قریب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا، وہ آئے اور نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سامان اٹھا کر اپنے گھر لے گئے، حضور نے اپنی رہائش کے لیے ان کے گھر کو ہی پسند فرمایا، اس طرح ارض و سما کے خالق و مالک کا حبیب و محبوب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا بڑے بڑے محلات کشادہ ہو بیلیوں اور شاندار مکانات سے صرف نظر کرتا ہوا اپنے ایک درویش صفت غلام کے گھر کو اپنے قیام سے مشرف و مکرم فرماتا ہے۔

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد

ہمایوں کشورے کاں عرصہ راشا ہے چنیں باشد

انتخاب دارابی ابویوب انصاری کی وجہ: محبوب رب العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قیام کے لیے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کو کیوں پسند فرمایا؟ اس کے بارے میں اولین سیرت نگار ابن اسحاق نے اپنی تالیف ”المبتدا“ میں اور امام ابن ہشام نے ”التبیان“ میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ دمشق میں اور دیگر متعدد علما نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ میں تاریخ ابن عساکر کے حوالہ سے اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

تبع مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ شریف کی زیارت کرنے کے بعد اور اسے غلاف پہنانے کے بعد اپنے لشکر جہاد رسمیت یثرب کی طرف روانہ ہوا، اس وقت یثرب ایک پانی کے چشمے کا نام تھا، جہاں کھیتی باڑی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ تبع کے ہمراہ لشکر کے علاوہ صاحب کمال علما و حکما کا بھی ایک جم غفیر تھا جو اس نے مختلف علاقوں سے چن چن کر اکٹھے کیے تھے، یثرب پہنچ کر اس نے وہاں قیام کیا، ایک روز چار سو علما بادشاہ کے دروازہ پر آکھڑے ہوئے اور گزارش کی کہ ہم اپنے شہروں کو چھوڑ کر ایک طویل عرصے سے جہاں پناہ کے ساتھ سفر کرتے رہے ہیں، اب ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سکونت اختیار کریں، یہاں تک کہ ہمیں

موت آجائے، بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور کہا کہ ان کے حالات پر غور کرے اور وہ وجہ معلوم کرے جس کے باعث لوگوں نے میرے ساتھ چلنے کا عزم ترک کر دیا ہے حالانکہ مجھے ان کی سخت ضرورت ہے، وزیر ان کے پاس گیا، ان سب کو ایک جگہ جمع کیا اور بادشاہ نے اسے جو کہا تھا اس نے انہیں آگاہ کیا، انہوں نے وزیر کو کہا: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کعبہ کی عزت اور اس شہر کا شرف اس ہستی کی وجہ سے ہے جو یہاں ظہور پذیر ہوگی، ان کا نام نامی محمد ہوگا، حق کے امام ہوں گے، وہ صاحب قرآن، صاحب قبلہ اور صاحب لواء و منبر ہوں گے، وہ یہ اعلان کریں گے ”لا الہ الا اللہ“ ان کی پیدائش مکہ میں ہوگی، ان کی ہجرت گاہ یہ شہر بنے گا، پس خوشخبری ہے اس کے لیے جو ان کو پائے گا اور ان پر ایمان لے آئے گا، ہماری یہ آرزو ہے کہ ہم ان کی زیارت سے مشرف ہوں یا ہماری آنے والی نسلوں میں سے ہمارا کوئی بچہ ان کے زمانے کو پالے اور ان پر ایمان لے آئے، وزیر نے جب یہ بات سنی تو اس کے دل میں یہاں رہائش پذیر ہونے کا شوق پیدا ہوا، جب بادشاہ نے کوچ کرنے کا ارادہ کیا تو ان سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہم یہاں سے ہرگز نہیں جائیں گے، ہم نے اس کی وجہ آپ کے وزیر کو تفصیل سے بتادی ہے، بادشاہ نے وزیر کو بلا کر دریافت کیا، اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا، بادشاہ سوچ میں پڑ گیا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک سال حضور کی آمد کے انتظار میں یہاں ٹھہرے گا، بادشاہ نے حکم دیا کہ ان چار سو علما کے لیے چار سو رہائشی مکانات تعمیر کیے جائیں، اس نے چار سو کنیزیں خریدیں انہیں آزاد کیا پھر ان کا نکاح ایک ایک عالم سے کر دیا، انہیں زر کثیر بخشا تا کہ وہ یہاں کے اخراجات آسانی سے برداشت کر سکیں، ایک خط لکھا جسے سونے کے ساتھ سر بمبر کر دیا اور ان علما میں سے جو سب سے بڑا عالم تھا اس کے سپرد کیا اور اس سے التماس کیا کہ اگر اس کو حضور کی زیارت نصیب ہو تو یہ عریضہ وہ خود حضور کی بارگاہ میں پیش کرے ورنہ اپنی اولاد در اولاد کو وصیت کرتا جائے کہ جس کو وہ عہد سعید دیکھنا نصیب ہو اور رحمت عالم کی زیارت کا شرف میسر آئے تو وہ اس کا عریضہ بارگاہ رسالت میں پیش کرے، اس کے عریضے کے چند اہم فقرے یوں بیان کیے گئے ہیں:

”اے اللہ کے رسول! (محمد) میں آپ پر اور آپ کی کتاب پر ایمان لایا ہوں، جو اللہ تعالیٰ آپ پر نازل فرمائے گا، حضور کا دین قبول کیا ہے اور آپ کی سنت پر عمل کروں گا، آپ کے رب پر اور کائنات کے پروردگار پر ایمان لایا ہوں اور جو احکام شریعت آپ اللہ کی طرف سے لے آئیں گے ان پر محکم یقین رکھتا ہوں، اگر مجھے حضور کی زیارت نصیب ہو جائے تو یہ میری انتہائی خوش بختی ہوگی اور اگر میں زیارت کی سعادت سے بہرہ ور نہ ہو سکوں تو قیامت کے روز میری شفاعت فرمائیں اور مجھے فراموش نہ کیجئے، میں حضور کے ان فرماں بردار اور اطاعت گزار امتیوں سے ہوں جو حضور کی آمد سے پہلے حضور پر ایمان لائے تھے“

تبع کی وفات کے بعد پورے ایک ہزار سال گزر گئے تو حضور کی ولادت باسعادت ہوئی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب مکہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کی اور اہل یثرب کو پتہ چلا تو انہوں نے مشورہ کیا کہ اس خط کو حضور کی خدمت میں کیسے پہنچایا جائے؟ حضرت عبدالرحمن بن عوف جو مکہ سے ہجرت کر کے یثرب پہنچ گئے تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ ایک قابل اعتبار شخص کا انتخاب کریں اور یہ خط دے کر حضور کی خدمت اقدس میں روانہ کریں، چنانچہ انہوں نے ایک زیرک آدمی جس کا نام ابولیلی تھا اور انصار کے قبیلے میں سے تھا، اسے یہ خط دے کر بھیجا۔ اسے پرزور تاکید کی کہ اس خط کو بڑی حفاظت سے رکھے اور حضور کی خدمت میں پیش کرے، وہ روانہ ہو گیا، جب اثنائے سفر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قبیلہ سلیم کے ایک شخص کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے، وہاں پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور فرمایا: ”انت ابولیلی“ تم ابولیلی ہو؟ اس نے عرض کی: ہاں! پھر حضور نے پوچھا: تبع اول شاہ یمن کا خط تمہارے پاس ہے؟ وہ یہ سن کر ششدر ہو گیا اور سراپا حیرت بن کر پوچھنے لگا: آپ کون ہیں؟ آپ جادوگر تو نہیں؟ حضور نے فرمایا: نہیں! بلکہ میں محمد ہوں (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ”ہات الکتاب“ وہ خط پیش کرو، اس نے اپنا سامان کھولا جس میں اس نے وہ خط چھپا کر رکھا ہوا تھا، اس کو حضور کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ابوبکر نے یہ خط پڑھ کر سنایا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کا

خط سن کرتین بار فرمایا کہ میں اپنے نیک بھائی کو مرحبا کہتا ہوں، پھر حضور نے ابولیلیٰ کو حکم دیا: وہ واپس یثرب چلا جائے اور وہاں کے لوگوں کو حضور کی آمد کے بارے میں آگاہ کرے۔
امام محمد بن یوسف الصالحی نے سبل الہدیٰ میں اس واقعے کو متعدد حوالوں سے نقل کیا ہے اور وہ اشعار بھی لکھے ہیں جو اس نے اپنے عریضے میں تحریر کیے تھے، آپ اشعار کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

”میں گواہی دیتا ہوں کہ احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اس اللہ کے رسول ہیں جو تمام روحوں کو پیدا کرنے والا ہے۔

اگر میری زندگی نے وفا کی اور میں نے حضور کا زمانہ پالیا تو میں حضور کا وزیر بنوں گا اور چچا زاد بھائی کی طرح ہر موقع پر امداد کروں گا۔
میں تلوار کے ساتھ آپ کے دشمنوں سے جہاد کروں گا اور حضور کے سینے میں جو فلکرو اندیشہ ہوگا اس کو دور کروں گا“

علامہ احمد بن زینی دحلان نے بھی السیرۃ النبویہ میں یعینہ یہ واقعہ لکھا ہے۔ (سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۳، ص: ۳۹۰، السیرۃ النبویہ، ج: ۱، ص: ۳۲۶، بحوالہ سیرت الرسول، ج: ۳، ص: ۱۰۲ تا ۱۳ مختصراً)
تنبیہ: واضح ہو کہ پیر کرم شاہ ازہری نے اس طویل اقتباس کو جس مقصد کے لیے نقل کیا تھا، وہ پورے اقتباس میں کہیں حاصل نہ ہو سکا، ان کا مقصد ان کی لگائی گئی سرنی ”انتخاب دارابی ابوب انصاری کی وجہ“ سے خوب ظاہر ہے لیکن ہمارے قارئین پر یہ بات مخفی نہیں کہ وجہ پورے اقتباس میں کہیں مذکور نہیں، یا تو پیر صاحب کی توجہ ادھر سے ہٹ گئی یا پیر صاحب نے تو لکھا مگر کتاب صاحب نے اپنا کمال دکھاتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم، بہر حال اب آپ وہ وجہ ملاحظہ کریں جس کے لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دارابی ابوب انصاری کو اپنی قیام گاہ کے لیے منتخب فرمایا۔

حضور اپنے ہی مکان میں ٹھہرے: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ کا وہ مکان جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نزول اجلال فرمایا تھا، یہ ملک

تبع نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ہی بنوایا تھا، یہ مکان اس وقت بنوایا جب اسے اپنے علما کے ذریعے معلوم ہوا کہ حضور کی بعثت مکہ مکرمہ میں ہوگی اور آپ سرزمین مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے۔ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس عالم کی اولاد میں سے تھے جس نے تبع کو کعبے سے متعلق خیر کی نصیحت کی تھی، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل مدینہ ان علما کی اولاد میں سے تھے جو تبع کے بنوائے ہوئے گھروں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے انتظار میں رہے، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس مکان میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ٹھہرے وہ تبع بادشاہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ہی بنوایا تھا اور نسل بعد نسل وراثت جاری ہوتے ہوئے اس وقت حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملکیت میں تھا، گویا حضور اپنے ہی مکان میں ٹھہرے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۱، ص: ۱۴، خلاصۃ الوفا باخبار المصطفیٰ، ج: ۱، ص: ۵۴۹، شرف المصطفیٰ، ج: ۱، ص: ۱۰۵، شرح الزرقانی علی المواہب، ج: ۲، ص: ۱۴۶)

علامہ عیسیٰ رضوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: وہ مکان جو خاتم الانبیاء کے لیے بنایا گیا تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدم رنجہ فرمانے تک موجود رہا، کہتے ہیں کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ مکان جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد نزول اجلال فرمایا تھا یہ وہی مکان تھا۔ (سیرت مصطفیٰ جان رحمت، ج: ۱، ص: ۲۴۷)

ادب رسول میں میاں بیوی کا اضطراب: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر دو منزلہ تھا، جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کو زینت بخشی اور ان کے گھر میں قیام کرنا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکان کا بالا خانہ حضور کے لیے خالی کر دیا، اوپری منزل میں جس قدر گھر کا ساز و سامان تھا اس سب کو دوسری جگہ منتقل کر دیا، پھر بارگاہ رسالت میں عرض گزار ہوئے: حضور بالائی منزل میں آرام فرمائیں، میری تمنا ہے کہ آقا اوپر قیام فرمائیں اور خدام نیچے رہیں، لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے

اپنے لیے گھر کے نچلے حصے کو پسند فرمایا، حضور کے حکم پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آقا کی رہائش کا انتظام گھر کی نچلی منزل (گراؤنڈ فلور) میں کر دیا۔ اپنی بساط کے مطابق سکونت کے تمام بند و بست درست کر دیے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی مرضی کے مطابق گھر کی پہلی منزل میں قیام پذیر ہو گئے، دن ڈھلا شام آئی اور پھر رات کا ایک حصہ گزرنے کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے بستر ناز پر محو استراحت ہوئے، حضور کے آرام کرنے پر مطمئن ہو کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی وفا شعار شریکہ حیات خود آرام کرنے کے لیے اپنے گھر کے بالا خانہ پر چڑھ گئے، جیسے ہی بالا خانہ کا دروازہ بند کیا کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اہلیہ کو ”و یحک ما اذا صنعنا“ (ہائے تباہی میں نے یہ کیا کیا) کہہ کر سخت انداز میں تنبیہ کی اور آگے بہت کچھ کہتے چلے گئے، کیا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نیچے رہیں؟ کیا ہم لوگ حضور کے اوپر رہیں گے؟ کیا حضور کے سر کے اوپر چلیں گے؟ کیا ہم وحی اور مہبط وحی کے درمیان حائل رہیں گے؟ پھر تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ ابویوب خود تو حیران تھے ہی آپ کے ان جملوں نے زوجہ محترمہ ام ایوب کو بھی تصویر حیرت بنا ڈالا، دونوں میاں بیوی حیرت کی اس چوٹی پر کھڑے تھے کہ جہاں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا، کہ آخر وہ کیا کریں جو انہیں اس ورطہ حیرت سے نجات عطا کر دے، تائید غیبی نے کچھ رہنمائی فرمائی تو قدرے سکون کی ایک راہ نظر آئی اور وہ یہ کہ اپنے وجود اور اس کی تمام تر ضروریات کو بالا خانہ کے اس حصے میں محدود کر دیں کہ جس کے ٹھیک نیچے ذات رحمت عالمیاں کے موجود ہونے کا وہم و گمان بھی نہ ہو اور جس وقت میاں بیوی کے لیے بالا خانہ پر چلنا ناگزیر ہو تو صرف بالا خانہ کے کناروں کا استعمال کیا جائے، وسط مکان کی جانب ہرگز قدم نہ بڑھایا جائے، اسی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے میاں بیوی نے رات گزاری، صبح ہوئی تو جان میں جان آئی، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! پوری رات نہ تو میرا پلک جھپکا اور نہ ام ایوب کی آنکھ بند ہوئی، رحمت عالم نے

پوچھا: ”وَمِمَّا ذَلِكِ يَا أَبَا أَيُّوبَ“ اے ابویوب! ایسا کیوں ہوا کہ تم دونوں ایک لمحہ بھی نہ سو سکے؟ حضور کے سوال پر حضرت ابویوب نے حال دل بتانا شروع کیا: یا رسول اللہ! یہ خیال ہمارے لیے سوہان روح تھا، کیا ہم اس گھر کی چھت پر چڑھے ہوئے ہیں جس کے نیچے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں؟ ہم چھت پر چلیں گے ہمارے چلنے پھرنے سے غبار اڑے گا جو حضور کے جسم ناز تک پہنچے گا اور اس سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تکلیف ہوگی اور یہ کہ ہم کہیں نزول وحی اور صاحب وحی کے بیچ میں حائل تو نہیں ہو گئے ہیں، بس انہیں خیالات نے پلک جھپکنے دیا نہ آنکھ لگنے دی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابویوب! ان خیالات کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہلکا کرلو، میرے لیے مکان کی پہلی منزل میں رہنا دوسری منزل کی بنسبت آسان ہے کیونکہ میرے پاس ملنے جلنے والوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے لہذا پختی منزل میں قیام کرنا میرے لیے زیادہ مناسب ہے۔ (صومن حیاۃ الصحابہ، ص: ۶۹، دلائل النبوة للبیہقی، ج: ۲، ص: ۵۰۱، مسلم، حدیث: ۵۴۷۹، سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۴۹۸، السيرة الحلبية، ج: ۲، ص: ۲۷۶، الروض الانف، ج: ۲، ص: ۳۴۰، القول المبين في بيان منزله رسول رب العالمين، ص: ۱۴۱)

حضور کے آرام کے لیے ٹھنڈی رات برداشت: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اپنے دل کا اضطراب بیان کر چکے تھے کہ انہیں اس گھر کی چھت پر رہنا پسند نہیں، جس کے نیچے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں، مگر آقا نے فرما دیا کہ ابویوب! فکر نہ کرو اور تم اوپر ہی رہو کیونکہ میرے لیے لوگوں سے ملنے میں آسانی اسی میں ہے کہ میں مکان کی پختی منزل میں قیام کروں۔ ”الامر فوق الادب“ پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اہلیہ بالا خانہ میں رہنے لگے، اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے ایک عجیب معاملہ پیش آ گیا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی زوجہ کے ساتھ ایک سردرات میں بالا خانہ پر موجود تھے کہ وہاں پر رکھا ہوا پانی کا گھڑا اچانک ٹوٹ گیا، پانی کا گھڑا ٹوٹا تو پانی

بالا خانے میں بہہ گیا، چھت چکی ہونے کے سبب حضرت ابویوب اور ان کی اہلیہ کو بڑا صدمہ ہوا اور اس خطرے سے گھبرا گئے کہ کہیں پانی کی کوئی بوند حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوپر گرے جس سے حضور کے آرام میں خلل واقع ہو جائے، میاں بیوی نے پانی کو جذب کرنے کی ترکیب پر غور کیا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ محمل کا وہ ٹکڑا جسے دونوں نے لحاف بنا کر اوڑھ رکھا تھا، اسی میں پانی جذب کر کے چھت کو سکھایا جائے بغیر ایک لمحے کی دیر کیے ہوئے اپنے اسی لحاف سے پانی خشک کرنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیابی عطا فرمائی، پانی خشک ہو گیا لیکن لحاف بھیگ گیا، لحاف بھیگ جانے کی وجہ سے اوڑھنے کے کام کا نہ رہا، چنانچہ پوری رات ٹھنڈ میں ٹھٹھرتے ہوئے گزار دی لیکن حضور کے آرام میں خلل نہ پیدا ہونے دیا۔ تعظیم رسول، ادب رسول، احترام رسول اور محبت رسول کے یہ نمونے تاریخ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے سوا اور کہاں؟ اس بار حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درخواست قبول فرمائی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی قیام گاہ کے طور پر بالا خانے کو پسند فرمایا لہذا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گھر کی بالائی منزل میں قیام پذیر ہو گئے، جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بالا خانے میں رہائش پذیر ہو گئے تب جا کر حضرت ابویوب اور ان کی زوجہ ام ایوب کے بے چین دل کو قرار آیا۔ (صوژن حیاة الصحابة، ص: ۶۹، سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۴۹۸، الروض الالنف، ج: ۲، ص: ۳۴۰، السیرة الخلیفہ، ج: ۲، ص: ۲۷۱)

حضرت ابویوب انصاری کے بعد وہ مکان جہاں حضور ٹھہرے: حضرت

ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نزول اجلال فرمایا اور آپ کی سکونت کی وجہ سے وہ رشک عرش و عریشاں بن گیا، وہ مکان حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت ارفع کے قبضے میں آیا تو پھر ارفع سے اس مبارک مکان کو حضرت مغیرہ بن عبد الرحمن بن حارث نے ایک ہزار دینار کے بدلے خرید لیا اور اس کی دیواریں وغیرہ جو قابل مرمت ہو چکی تھیں اس

کی آپ نے مرمت کرائی لیکن چھت میں کوئی بدلاؤ نہ کیا پھر اسے مدینہ منورہ کے ضرورت مندوں کے لیے ہبہ کر دیا۔ (السیرۃ النبویہ علی ضوء القرآن والسنة، ج: ۲، ص: ۲۷، امتاع الاسماع، ج: ۹، ص: ۲۰۰، الروض الانف، ج: ۲، ص: ۲۷۹)

الروض الانف کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ مکان تبع اول نے حضور کے لیے بنایا تھا پھر اس میں لوگوں کی ملکیت تبدیل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس کو ملک مظفر شہاب الدین غازی نے خرید لیا، پھر سلطان نے اس جگہ پر ایسا مدرسہ قائم کیا جس میں چاروں مذاہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ (حاشیہ الروض الانف)

موجودہ وقت کی اگر بات کریں تو مدینہ طیبہ کے زائرین اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کی توسیع بہت زیادہ کر دی گئی ہے لہذا اب اس مبارک جگہ کو مسجد نبوی شریف میں شامل کر لیا گیا ہے۔

برکت کے حصول کیلئے وہیں سے کھاتے جہاں سے حضور نے کھایا ہوتا:
حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا میزبان ہونا لکھ دیا تھا، لہذا جہاں ان کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ حضور نے ان کے گھر کو رونق بخشی اور ایک مدت تک اس میں جلوہ بار رہے، کیا کہنا اس گھر کی قسمت کا جہاں جان عالمیاں محبوب رب العالمین جلوہ بار ہوں، آپ جدھر چل دیتے ہیں ادھر ہی منشی رحمت کے قلم دان کا رخ ہو جاتا ہے۔

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا

ساتھ ہی منشی رحمت کا قلم دان گیا

حضور جب وہاں جلوہ فرما رہے ہوں گے تو وہاں ملائکہ کے ورود، رحمت کی بارش اور قرآن کے نزول کی کیف آگیں لمحات کو کون بیان کر سکتا ہے؟ اب حضرت ابویوب کی قسمت کا دوسرا رخ اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت و محبت اور عشق کی وارفستگی کا رنگ بھی ملاحظہ فرمائیے:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ کے گھر تشریف فرما تھے، اس لیے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کثرت کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ضیافت کا موقع میسر آتا تھا، گو دیگر صحابہ کرام بھی حضور کے لیے کھانا پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے تھے، اس سلسلے میں حضرت سعد بن عبادہ اور اسعد بن زرارہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

(سیرۃ الحلبيہ، ج: ۲، ص: ۲۷۷)

اب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عشق کی جولانیت امام احمد بن حنبل اور امام مسلم کی روایت کردہ حدیث کی زبانی سنیں:

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کرتے اور حضور کو پیش کرتے تھے جب سرکار کا پس خوردہ (بچا ہوا) کھانا واپس آتا اور حضرت ابویوب کے پاس لایا جاتا تو وہ پوچھتے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کس جانب سے کھایا تھا اور کس جگہ آپ کی انگلیاں لگی تھیں؟ پھر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھانے کو اسی جگہ سے کھاتے جہاں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی انگلیاں لگی تھیں۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۷۵۱۷، صحیح المسلم، حدیث: ۷۹۵۲، کتاب الاشربة، باب اباحتہ اکل الثوم)

حضور کی انگلیوں کے نشان کی تلاش کیوں؟ علامہ سہیلی نے امام ابن اسحاق کی سند سے الروض الانف میں روایت بیان فرمائی، جس میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود وجہ بھی بتائی کہ وہ اور ان کی اہلیہ کھانے میں حضور کی انگلیوں کے نشانات کیوں تلاش کیا کرتے تھے؟ روایت ملاحظہ ہو:

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کرتے، پھر کھانا حضور کی بارگاہ میں حاضر کرتے، جب حضور کا ماہیہ کھانا ہمارے پاس آتا تو میں اور میری اہلیہ ام ایوب اس جگہ کو تلاش کرتے جہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہاتھ لگا ہوتا، پھر ہم اسی جگہ سے کھاتے ”نبتغی بذالك البركة“ ہمارا مقصود اس سے برکت حاصل کرنا ہوتا تھا۔ (الروض الانف، ج: ۲، ص: ۳۴۰)

یہ خود صحابی رسول کا بیان ہے کسی عالم نے ان کی بات کا مطلب اپنی طرف سے بیان نہیں فرمایا۔

نجدی حکومت کی رسول دشمنی: اس سے سعودیہ کی نجدی حکومت، حکومت کے کارندے اور اس کے زر خرید غلام مولویوں کو سبق لینا چاہیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے جسم کو سراپا برکت بنا دیا ہے جس چیز کو یہ جسم بابرکت مس ہو جاتا ہے (لگ جاتا ہے) اسے بھی بابرکت بنا دیتا ہے، لیکن برا ہو نجدیہ کی رسول دشمنی کا کہ مدینہ طیبہ میں اگر کوئی زائر، ان مقامات مبارکہ کو چوم لے جنہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی نہ کسی مرحلے میں کوئی نسبت رہی ہے تو نجدی ”البرکۃ فی الکعبۃ“ جیسے جملوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے زائر مدینہ، عاشق رسول پر شرک و بدعت کے فتوؤں کی برسات کر دیتے ہیں:

خدا جب دین لیتا ہے تو عقلیں چھین لیتا ہے

ان کٹھنوں کو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کریم معراج کے بیان میں مسجد اقصیٰ کے تعلق سے فرمایا ہے ”إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ“ مسجد اقصیٰ کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے۔

خلیفہ اعلیٰ حضرت علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: (مسجد اقصیٰ کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے) دینی بھی اور دنیوی بھی کہ وہ سر زمین پاک وحی کی جائے نزول اور انبیاء کی عبادت گاہ اور ان کی جائے قیام و قبلہ عبادت ہے، اور کثرت انہار و اشجار سے وہ زمین سرسبز و شاداب، میوؤں اور پھلوں کی کثرت سے بہترین عیش و راحت کا مقام ہے۔

قارئین غور فرمائیں! خدا کی قدرت سے مسجد اقصیٰ کے ارد گرد کا خطہ تو بابرکت بن سکتا ہے بلکہ بن گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں بیان فرمایا، لیکن نجدی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم سراپا بابرکت کو برکت والا ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں، اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب

فرمائے۔ ہاں عشاق رسول ضرور اس سرزمین کوگ ہوا رہ رحمت و برکت یقین کرتے ہیں اور سو جان سے اس پر نثار ہوتے ہیں۔ عاشق مدینہ امام عشق و محبت مجدد دین و ملت امام اہلسنت اس خاک کی برکتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہشت خلد آئیں وہاں کسبِ لطافت کو رضا چاردن برسے جہاں ابر بہاران عرب
بزرگوں کے آثار سے تبرک حاصل کرنا: علامہ غلام رسول سعیدی مسلم
شریف کی مذکورہ حدیث (انگلیوں کے نشانات کی تلاش) کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم کا پس خوردہ لایا جاتا تو وہ پوچھتے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی انگلیاں کس جگہ لگیں
تھیں؟ اس سے حضرت ابویوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کمال محبت ظاہر ہوتی ہے اور اس میں
نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کا بھی ثبوت ہے۔

اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابویوب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس
ادب سے نچلی منزل میں آگئے اور حضور سے درخواست کی کہ آپ اوپر کی منزل میں
آجائیں، اس سے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کمال ادب ظاہر ہوتا ہے،
اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مشائخ اور بزرگان دین کو اوپر کی منزل میں ٹھہرا کر خود نچلی
منزل میں رہنا ادب کا تقاضا ہے۔ (شرح صحیح مسلم، ج: ۶، ص: ۳۱۲)

پسند اور ناپسند کا معیار: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کی طبیعتوں اور
چاہتوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے محبوب کی طبیعت و چاہت کے تابع کر دیا تھا، انہیں ان امور
کو بجالانے میں بڑی فرحت محسوس ہوتی تھی جنہیں رحمت عالمیاں نے انجام دیا ہو، جس
چیز کے متعلق کوئی خبر مل جاتی تھی کہ یہ شے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ناپسند ہے تو خبر ملتے
ہی وہ شے ان کی نظر میں بھی ناپسند ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ پہلے اس کو پسند کرتے ہوں، اسی
طرح اس کے خلاف بھی ہوتا تھا کہ اگر کوئی چیز انہیں پہلے پسند نہ تھی لیکن جب انہیں اس کے
بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پسند ہے بس حضور کی پسند کی

خبر ملتے ہی یہ شے اب صحابہ کرام کے لیے بھی محبوب ہو جاتی تھی، اس دعوے کو دو حدیثوں کے ذریعے ثابت کریں گے، پہلی حدیث کا تعلق حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات سے اور دوسری حدیث اگرچہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات سے متعلق نہیں مگر اس کا ذکر ہمارے دعوے کو ثابت کرنے والا ہے، اس لیے اس کو بھی یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جو آپ کو ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند: امام مسلم روایت فرماتے ہیں کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کرتے تھے، جب سرکار کا بچا ہوا کھانا ان کے پاس لایا جاتا تو وہ پوچھتے کہ حضور نے کس جانب سے کھایا تھا اور کس جگہ آپ کی انگلیاں لگیں تھیں؟ پھر وہ آپ کی انگلیوں کے لگنے کی جگہ سے کھاتے، ایک دن انہوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے کھانا تیار کیا، جس میں کچا لہسن پڑا ہوا تھا، جب وہ کھانا حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لوٹا یا گیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی انگلیاں کہاں لگی تھیں؟ تب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا گیا کہ اس میں سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کھانا تناول نہیں فرمایا، یہ سن کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا گئے اور اوپر جا کر حضور سے عرض کیا: کیا یہ (لہسن) حرام ہے؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواب دیا: (نہیں) لیکن میں اس کو ناپسند کرتا ہوں، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلا توقف عرض کیا کہ حضور میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے ہیں، اس حدیث کو کثیر محدثین نے روایت کیا ہے۔

(مسلم: ۵۴-۷۹، مسند احمد، حدیث: ۲۳-۵۱۷)

اس حدیث کا لطف حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول میں محسوس کریں کہ جو حضور کو ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند ہے۔ قارئین غور فرمائیں! لہسن حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند تھا اسی لیے تو اسے کھانے میں ڈالا گیا تھا

اور حضور کی بارگاہ میں پیش کیا گیا تھا لیکن جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ کچا لہسن حضور کو ناپسند ہے تو بغیر کچھ سوچے ہوئے پکار اٹھے ”جو حضور کو ناپسند ہے وہ مجھے بھی ناپسند ہے“ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی طبیعت کو حضور کی طبیعت پر قربان کر دیا اور لہسن کے ناپسند ہونے کا اعلان کر دیا۔

جو حضور کو پسند ہے وہ مجھے بھی پسند ہے: اب آپ دوسری حدیث ملاحظہ فرمائیں کہ

امام بخاری حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں: ایک درزی نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت پیش کی، میں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ گیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں روٹی اور ایسا شوربہ پیش کیا گیا جس میں کدو اور خشک کیا ہوا نمکین گوشت پڑا ہوا تھا، کھانے کے درمیان میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پیالے کے کناروں سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر رہے ہیں۔ حضرت انس فرماتے ہیں: ”فلما ازل احب الدباء من يومئذ“ پس اسی دن سے میں بھی کدو سے محبت کرنے لگا۔ (بخاری، کتاب الاطعمہ باب من تتبع حوالی القصص)

اس حدیث کا آخری جملہ بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے حضرت انس کو کدو پسند نہ تھا لیکن جب آج اپنی آنکھوں سے حضور کی محبت کدو کے ساتھ ملاحظہ کر لی بس بات ختم ہو گئی اور کدو ہمیشہ کے لیے حضرت انس کی پسند بن گیا۔ بے شک ہر عاشق رسول کا یہی حال ہوتا ہے۔

اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے جب تک حضور نہ کھا لیتے: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر میں حد درجہ مبالغہ فرماتے، انہیں یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے کھانا کھا لیں، وہ کھانا تیار کر کر حضور کی بارگاہ میں بھیج دیتے، حضور تناول فرما کر واپس بھیجتے، تب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کی انگلیوں کے نشانات دیکھ دیکھ کر وہیں سے کھانا کھاتے۔ (السيرة النبوية على ضوء القرآن والسنة، ج: ۲، ص: ۲۶)

ابوالیوب کے گھر قیام کی مدت: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وقت تک حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کو اپنے قیام سے زینت بخشی، جب تک مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی شریف اور اس کے ساتھ بعض حجرے تعمیر نہ ہو گئے، البتہ اس مدت کی تعیین میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ مدت کتنے ماہ کی تھی۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قیام کی مدت سات ماہ بیان فرمائی ہے۔

(ج: ۲، ص: ۱۵۴)

علامہ ابن حجر نے بھی اس قول کو فتح الباری میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک قول اور ذکر فرمایا ہے، جس سے حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں آپ کے قیام کی مدت نو ماہ ہونا معلوم ہوتی ہے۔ (ج: ۲، ص: ۴۱۰)

علامہ حلبی نے السیرۃ الحلبيہ میں تحریر فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ربیع الاول شریف سے لے کر صفر المظفر تک حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر رونق افروز رہے اور یہ کل بارہ ماہ ہوتے ہیں، سات ماہ والے قول کو علامہ نے ضعف کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ (السیرۃ الحلبيہ، ج: ۲، ص: ۲۵۱)

غزوات میں شرکت: حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جاں باز مجاہد تھے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا، اس لیے غزوات میں آپ کی شرکت مشہور و معروف ہے۔ اکثر مؤرخین نے اجمالی طور پر غزوات میں آپ کی شرکت کا بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: آپ بدر واحد اور تمام غزوات میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۱، الاصابہ، ج: ۲، ص: ۹۰)

اس عبارت کا مطلب یہی ہے کہ آپ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ہر غزوے میں شریک رہے، خواہ وہ بدر ہو یا احد، خیبر ہو کہ خندق، بیعت رضوان ہو یا صلح حدیبیہ، فتح مکہ کی حسین یادیں ہوں یا حنین کی سخت ترین ساعتیں، سب میں حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور جان عالمیاں کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر خالد نے آپ کے

غزوات کے سلسلے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے، ہم اس کا خلاصہ نظر قارئین کر رہے ہیں:

ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں: قریش نے جس وقت سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حملوں کا آغاز کیا، مدینہ طیبہ کو جنگ و جدال کا ہدف بنایا اور شمع اسلام کو گل کرنے کی ناپاک کوشش کی، اس وقت سے ہی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو ایک عظیم مجاہد کے قالب میں ڈھال لیا، بدر ہوا یا احد یا خندق یا اس کے ماسوا غزوات ہر غزوے میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس شان کے ساتھ حاضر ہوئے کہ انہوں نے اپنی جان و مال کا سودا اللہ تبارک و تعالیٰ سے پہلے ہی کر دیا ہے، آپ کی یہ حالت صرف زمانہ رسالت تک محدود نہ تھی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی وہ کسی بھی ایسے معرکے میں پیچھے نہ رہے جو مسلمانوں کے حق میں مقدر ہو چکا ہے، چاہے اس معرکے تک پہنچنے کے لیے بعد مسافت کے طویل سلسلے طے کرنے پڑے ہوں یا تکلیف و مشقت کے عظیم مراحل عبور کرنا پڑے ہوں۔ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں ان کا ایک شعار تھا جسے وہ ہمیشہ تازہ کیے رہتے، شعار ایک عظیم نعرہ تھا جسے وہ دن رات بلند کرتے رہتے، وہ اس نعرے کو علانیہ بھی لگاتے اور اپنی تنہائیوں میں بھی گنگناتے تھے، ان کا یہ نعرہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا ایک ٹکڑا تھا ”انفرو خفافا وثقالا“ اس نعرے کے ذریعے وہ لوگوں سے کہنا چاہتے تھے ”تم اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی راہ میں بڑھے چلو اور جہاد کے لیے نکلو چاہے تمہارے لیے آسانی ہو یا پریشانی، اہل و عیال کی کمی ہو یا زیادتی، اسلحہ کم ہوں یا زیادہ، سواریاں ہوں یا پیدل، کمزور ہو یا طاقتور، جوان ہو یا بوڑھے، مالدار ہو یا فقیر، کاموں سے فارغ ہو یا مصروف، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا بس چلے چلو اور بڑھے چلو اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کی کوشش میں لگے رہو“۔ ڈاکٹر خالد کے مطابق زندگی میں صرف ایک موقع ایسا آیا جس میں وہ لشکر اسلام کے ساتھ شریک نہ رہ سکے۔

ہوا کچھ یوں کے خلیفہ وقت نے ایک نوجوان کو امیر لشکر متعین کر دیا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس امارت سے مطمئن نہ تھے، لہذا وہ اس مرتبہ لشکر اسلام کے ساتھ نہ

رہے لیکن اپنے اس فیصلے پر ہمیشہ پشیمان رہے، اس واقعے پر افسوس کرتے ہوئے کہا کرتے تھے ”ما علی من استعملہ علی“ جو بھی امیر متعین کیا جائے اس سے مجھ پر کیا فرق پڑتا ہے؟ مجھے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے، یہ واقعہ ان کی زندگی کا پہلا اور آخری واقعہ تھا، اس کے سوا وہ کبھی بھی کسی غزوے میں غیر حاضر نہ رہے۔ (رجال حول الرسول، ص: ۲۹۹، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۰۴)

جنگ خیبر اور ابویوب انصاری: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جاں نثاری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اور یہ کہ وہ حضور کی ذات مقدس کو لے کر بہت فکر مند رہتے تھے، اگر ان کی دوراندیشی کو ادنیٰ سا خطرہ بھی نظر آتا تو اس کے دفاع کے لیے دل و جاں سے کوشاں ہو جاتے۔ اس سلسلے میں ہم غزوہ خیبر سے واپسی کا ایک واقعہ نذر قارئین کر رہے ہیں:

جنگ خیبر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عظیم کامیابی نصیب فرمائی، پیر کرم شاہ ازہری لکھتے ہیں: سارے اسیران جنگ مرد و زن کو ایک جگہ جمع کیا گیا، ان میں صفیہ بھی تھیں جو اپنے صوری اور معنوی محاسن کے اعتبار سے سب سے ممتاز تھیں، یہ کنانہ بن ابی الحقیق کی زوجہ تھیں جو یہودیوں کا حکمران تھا، نیز یہودیوں کے ایک دوسرے رئیس اعظم جی بن اخطب کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس عالی مرتبت خاتون کو اپنے لیے منتخب فرما لیا پھر حضور نے انہیں اختیار دیا کہ اگر ان کی مرضی ہو تو حضور ان کو آزاد کر دیں اور وہ باقی ماندہ اپنے رشتے داروں کے پاس واپس چلی جائیں یا اسلام قبول کر لیں اور رحمت عالم انہیں اپنی زوجیت کا اعزاز عطا فرمائیں، حضرت صفیہ نے عرض کیا ”اختار اللہ ورسولہ“ میں اللہ اور اس کے رسول کو پسند کرتی ہوں اور اپنے خاندان کے لوگوں کے پاس جانے کو تیار نہیں۔ (حضرت صفیہ کا پہلا نام زینب تھا رحمت عالم نے ان کا نام بدل کر صفیہ رکھا)۔

(تاریخ الخلفاء، ج: ۲، ص: ۵۷، بحوالہ سیرت الرسول، ج: ۴، ص: ۲۴۵)

ابویوب انصاری کی پاسبانی اور حضور کی خوشی: جس رات حضرت صفیہ

بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئیں اس رات حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری رات تلوار ہاتھ میں لیے حضور کے خیمے کے باہر پہرا دیتے رہے۔ صبح تڑکے جب حضور خیمے سے باہر تشریف لائے اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر حضور کے رخ زیبا پر پڑی آپ نے زور سے ”اللہ اکبر“ کہا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پوچھا: اے ابویوب! کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا: حضور! میں پوری رات سونہ سکا، رحمت عالم نے پوچھا: ابویوب! ایسا کیوں ہوا؟ غلام وفادار نے عرض کیا: حضور! آپ کی دہن حضرت صفیہ نو مسلم ہیں، ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئی ہیں اور اس جنگ میں مسلمانوں نے ان کے باپ بھائی شوہر کئی اقارب کو تہ تیغ کیا ہے، خدا کی قسم! مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خاتون کوئی ناگوار حرکت نہ کر بیٹھے؟ رحمت عالم جاں نثار کا جواب سن کر مسکرائے، بہت خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا، بارگاہ مولیٰ میں عرض کیا: ”اللہم احفظ ابایوب کما بات یحفظنی“ اے اللہ! ابویوب کو اپنی حفاظت نصیب فرما جیسے اس نے پوری رات میری حفاظت کی ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۴۶، الروض الانف، ج: ۷، ص: ۱۱۳، السیرۃ الخلیفہ، ج: ۳، ص: ۶۵، تاریخ الخلفاء، ج: ۲، ص: ۵۷، دلائل النبوة للبیہقی، ج: ۴، ص: ۲۳۳)

حجۃ الوداع میں حضور کے ساتھ: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دس ہجری میں اپنا پہلا اور آخری حج ادا فرمایا اور عالم اسلام کو اس کی اطلاع بھی بھیج دی کہ اس سال رحمت عالم حج ادا فرمائیں گے، اس موقع پر تقریباً ایک لاکھ صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا، ان میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے اعزاز میں غدیر خم پر جو جملہ ارشاد فرمایا تھا: ”من کنت مولاً ہ فعلی مولاً“ میں جس کا مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی کے سفر میں ارشاد فرمایا تھا اور یہ جملہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود سنا تھا، پس ثابت ہو گیا کہ حضرت ابو

ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مبارک سفر میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اب آپ وہ روایت ملاحظہ کر لیں جس میں ذکر ہے کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جملہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سماعت کیا ہے۔ (شرح مشکل الآثار، ج: ۴، ص: ۲۱۴، باب بیان مشکل مروی عن الرسول من قولہ یوم غدیر خم، سیرت الرسول، ج: ۴، ص: ۷۸۱)

(۱) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک جماعت نے ملاقات کی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان الفاظ کے ساتھ سلام کیا ”السلام علیک یا مولانا“ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ میں تمہارا مولیٰ کیوں کر ہوں؟ جب کہ تم عرب ہو، تو اس جماعت نے جواب دیا: ہم نے غدیر خم کے موقع پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”من کنت مولاً فعلی مولاً“ راوی حدیث حضرت ریح کہتے ہیں کہ میں نے اس جماعت کے بارے میں پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ جماعت حضرات انصار کی ہے اور اس میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔

(مسند احمد، حدیث: ۲۳۶۰۹)

(۲) الریاض النضرہ میں درج روایت اس سے بھی زیادہ واضح اور صریح ہے۔ اس روایت کو صاحب کتاب نے امام بغوی کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے، اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی اپنی معجم میں ذکر فرمایا ہے، حضرت ریح ابن حارث فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا: ”السلام علیک یا مولای“ پوچھا گیا: یہ کون صاحب ہیں؟ جو ان الفاظ کے ساتھ سلام کر رہے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ صحابی رسول حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں سے فرمایا: ان کے لیے جگہ کشادہ کرو فوراً لوگوں نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے جگہ چھوڑ دی، اب حضرت ابویوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: جس کا میں مولانا ہوں اس کے علی مولانا ہیں۔ (الریاض النضرہ، ج: ۱، ص: ۲۵۰، المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۴۰۵۲)

زمانہ اختلاف میں حضرت علی کے ساتھ: جس زمانے میں امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان اختلافات اپنے شباب پر تھا اور دونوں گروہ آپس میں برسر پیکار تھے، حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ساتھ نہ صرف مضبوطی کے ساتھ کھڑے تھے بلکہ وہ حضرت علی کی جانب سے تمام جنگوں میں شرکت بھی فرماتے تھے۔

(اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۲، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۹۷، رجال حول الرسول، ص: ۳۰۰)
صلح کے بعد حضرت امیر معاویہ کے ساتھ: حضرت امام حسن سے صلح ہو جانے کے بعد جب حضرت امیر معاویہ کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیا گیا، اس وقت بھی آپ کا جذبہ جہاد مردہ ہوا تھا نہ پڑ مردہ بلکہ آپ نے اس وقت بھی حضرت امیر معاویہ کے لشکر میں شامل ہو کر اعداء اسلام سے جہاد جاری رکھا خواہ حضرت امیر معاویہ کی جانب سے کسی کو بھی امیر لشکر متعین کیا گیا ہو۔ (الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۹۷)

فتح مصر اور خوارج کے خلاف جنگ میں شرکت: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس لشکر میں بھی شریک تھے جس نے مصر کو فتح کیا اور حضرت علی کے اس لشکر میں بھی آپ شریک رہے جس نے دشمنان اسلام خوارج کو نہروان کے میدان میں دھول چٹائی۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۴۲)

حضرت ابویوب کا شوق جہاد: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبہ جہاد کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے جو ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر ۸۰ سال سے بھی متجاوز ہو چکی تھی، اچانک ان کے کانوں میں آواز آئی کہ کوئی نداء کرنے والا کہہ رہا ہے کہ اے مسلمانو! چلو اور قسطنطنیہ کو فتح کرو۔ (جدید نام استامبل) پھر کیا تھا حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، تلوار گلے میں لٹکائی اور نعرہ لگایا، لوگوں چلو

اللہ کی راہ میں نکلو ہمارا رب فرماتا ہے: ”انفرو خفافاً وثقالاً“ جس حال میں بھی ہو چلے چلو۔ (مشاہیر صحابہ، ج: ۱، ص: ۱۳۸، صور من حياة الصحابة، ص: ۷۴)

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں، کیا ۸۰ سال کی عمر بھی لڑنے کی عمر ہوتی ہے؟ لیکن حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ صرف اس عمر میں اٹھ کر کھڑے ہوئے بلکہ جہاد کے لیے نکلے اور قسطنطنیہ ہی میں آپ کا وصال اسی غزوے کے دوران ہوا۔ جیسا کہ ہم عنقریب اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۶۵)

مسجد نبوی کے امام: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت کتنی قد آور تھی اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں، جن دنوں مدینۃ المنورہ کے حالات ناسازگار تھے، بلوائیوں نے مدینۃ طیبہ میں ایک بڑا فتنہ برپا کر رکھا تھا، اس وقت کچھ دن تک مسجد نبوی میں مسلمانوں کو نماز پڑھانے کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے پر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ انجام دے رہے تھے۔ واضح رہے کہ اس فتنے کے وقت میں ایک دن حضرت سہل بن حنیف نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور کچھ دن حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کی امامت فرمائی، پھر حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا (ظاہر ہے ایسے بگڑے ہوئے حالات میں وہی شخص امامت کر سکتا تھا جو قوم کی نظر میں اپنا نمایاں مقام اور خاص وقار رکھتا ہو)۔ (تاریخ طبری، ج: ۲، ص: ۶۹۳)

مدینہ کے گورنر: بیان کیا جا چکا ہے کہ زمانہ اختلاف میں آپ مولائے کائنات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ رہے، اس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو مدینۃ طیبہ کا گورنر متعین فرمایا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینۃ طیبہ پر سب سے پہلے حضرت سہل بن حنیف کو والی مقرر فرمایا، پھر انہیں اپنے پاس کوفہ بلا لیا اور ان کی جگہ حضرت تمام بن عباس کو مدینۃ طیبہ کا والی بنایا، پھر حضرت تمام کو معزول کر کے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مدینۃ طیبہ کا گورنر متعین فرمایا۔ (اسد الغابہ، ج: ۱)

۱، ص: ۲۵، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۲۱۰، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۲)

زمانہ علی اور وظیفہ میں زیادتی: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خاص پذیرائی حاصل تھی، لہذا جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ خلافت آیا تو آپ کے اعزاز میں بڑا اضافہ ہوا، چنانچہ آپ کے وظیفے میں خصوصی بڑھوتری کر دی گئی۔ اس سے پہلے دربار خلافت سے آپ کا وظیفہ چار ہزار روپے تھا۔ آپ کے زمانے میں اسے آٹھ گنا بڑھا دیا گیا، لہذا آپ کے لیے بیس ہزار روپے وظیفہ کے طور پر جاری کیے گئے، پہلے آپ کو بیت المال کی طرف سے آٹھ خادم حاصل ہوتے تھے، اب زمانہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں غلاموں کی تعداد آٹھ سے بڑھا کر چالیس کر دی گئی۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۲۲، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۵)

حضور ابویوب کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے: تعمیر مسجد نبوی کے بعد حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مسجد نبوی کے پاس بنے حجروں میں منتقل ہو گئے اور حضرت ابویوب کے گھر سکونت ترک فرمادی، اس کے بعد بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حضرت کے ابویوب کے گھر تشریف لانا بدستور جاری رہا، کیونکہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور پر اپنا دل، جان اور مال سب کچھ قربان کیے ہوئے تھے، اس کے نتیجے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی حضرت ابویوب انصاری سے خصوصی محبت فرماتے، جانین سے پیدا شدہ محبت کے ماحول نے تکلفات کے حجابات کو کافی حد تک زائل کر دیا تھا، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ (صور من حیاة الصحابة، ص: ۷۰)

بھوک کی شدت میں مسجد نبوی سے ابویوب کے گھر: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن بھوک کی شدت میں مسجد نبوی میں حاضر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر اس وقت میں مسجد تشریف لائے ہیں تو پوچھا: اے ابوبکر! اس وقت کیسے تشریف لانا

ہوا؟ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: مجھے بھوک کی شدت نے مسجد آنے پر مجبور کر دیا ہے، یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: خدا کی قسم! میں بھی بھوک کی وجہ سے ہی حاضر ہوا ہوں، دونوں حضرات میں یہ بات چل ہی رہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے آئے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت کیسے آنا ہوا؟ تو دونوں نے بیک زبان عرض کیا: حضور! پیٹ میں لگی بھوک کی آگ ہمیں یہاں لے آئی ہے، حضور نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، مجھے بھی یہاں بھوک کی شدت لے کر آئی ہے، حضور نے فرمایا: میرے ساتھ آؤ، پھر تینوں حضرات حضرت ابویوب کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

حضور کے ساتھ ابوبکر و عمر: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھوک کے عالم میں اپنے دو بھوکے غلاموں کے ساتھ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے پر جا پہنچے۔ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول یہ تھا کہ وہ روزانہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ضیافت کی نیت سے اپنے گھر پر کھانا یا دودھ رکھا کرتے تھے اور جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم متوقع وقت پر تشریف نہ لاتے تو وہ اس کھانے کو اپنے اہل خانہ کو کھلا دیتے، آج بھی یہی معاملہ پیش آیا کہ جب حضور وقت مخصوص پر تشریف نہ لائے تو کھانا اہل خانہ کو کھلا دیا گیا اور حضرت ابویوب اپنے باغ میں کام کرنے کے لیے گھر سے چلے گئے، باغ گھر کے پاس ہی تھا، ابویوب کے معزز مہمانوں نے گھر پر دستک دی، تو حضرت ابویوب کی اہلیہ دروازے پر حاضر ہوئیں اور عرض کیا: حضور اور حضور کے ساتھیوں کا آنا مبارک ہو۔ حضور نے پوچھا: ابویوب کہا ہیں؟ عرض کیا: حضور وہ ابھی آتے ہیں، حضرت ابویوب کو گھر میں نہ پا کر حضور واپس پلٹنا چاہتے تھے مگر چونکہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے پاس کے باغ ہی میں تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آواز کو سن لیا تھا، بھاگے ہوئے حضور کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، آتے ہی عرض کیا: حضور اور حضور کے ساتھیوں کو مرحبا (صدمرحبا) پھر عرض کیا: (غلام اس لیے گھر

میں نہ مل سکا) اس وقت حضور تشریف نہ لاتے تھے، حضور نے فرمایا: ہاں! ابویوب تم صحیح کہہ رہے ہو یہ وقت میرے آنے کا وقت نہیں ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے معزز مہمانوں کو پوری تعظیم کے ساتھ ٹھہرایا اور خود باغ کی جانب روانہ ہو گئے، جلد ہی ایک خوشہ لے کر آئے جس میں کچھ ادھ پکی کھجوریں، کچھ چھوڑے اور کچھ تازہ کھجوریں تھیں، یہ خوشہ اپنے مہمانوں کی بارگاہ میں پیش کیا پھر ایک بکری ذبح کرنے کی اجازت چاہی، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر بکری ذبح کرنے کا ارادہ ہے تو یاد رکھو دودھ دیتی بکری ذبح نہ کرنا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بکری ذبح کی اور ام ایوب اپنی بیوی سے فرمایا: تم آٹا گوندھو اور روٹی پکاؤ، کیونکہ تم روٹی اچھی بناتی ہو (اور میں سالن تیار کرتا ہوں) پھر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آدھی بکری کا سالن بنا لیا اور آدھی بکری کو بھون لیا (کباب بنا لیے) کھانا تیار ہو گیا اور حضرت ابویوب نے کھانا اپنے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بارگاہ میں پیش کیا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گوشت کا ایک ٹکڑا روٹی پر رکھا اور حضرت ابو ایوب سے فرمایا: جاؤ یہ کھانا میری نور نظر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دے آؤ، اس نے بھی کئی دن سے ایسا کھانا نہیں کھایا ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلدی سے گئے اور یہ کھانا اپنی آقا زادی کے یہاں دے کر حاضر بارگاہ ہو گئے، جب معزز مہمان کھاپی کر سیر ہو گئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: آج ہم نے گوشت، روٹی، کچی کھجور، پکی کھجور اور تازہ کھجوریں اتنی نعمتیں کھائی ہیں۔ یہ الفاظ حضور کی زبان پر جاری تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، قیامت کے دن تم سے ان نعمتوں کا سوال ضرور کیا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”ثُمَّ لَنَسْأَلَنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ“ پھر آپ نے اپنے اصحاب کو تسکین دینے کے لیے ارشاد فرمایا: جب تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاؤ تو بسم اللہ پڑھ کر ان نعمتوں کو ہاتھ لگاؤ اور جب تم کھاپی کر سیر ہو جاؤ تو پڑھا کرو: ”الحمد لله

الذی ہوا شبعنا وانعم علینا فافضل“ تمام تعریفیں اس خدا کے لیے جس نے ہمیں سیرابی عطا فرمائی اور اس نے ہم پر انعام فرمایا تو افضل ترین نعمتیں عطا فرمائیں، حضور نے فرمایا: یہ دعا ان نعمتوں کے شکریہ کا ایک طریقہ ہے، پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اٹھے اور حضرت ابویوب سے فرمایا: کل ہمارے پاس آنا، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہ تھی کہ جب بھی کوئی انسان حضور کے ساتھ حسن سلوک کرتا تو حضور اس کی بہتر جزا عطا فرماتے، حضور کے اس حکم کو ”کل ہمارے پاس آنا“ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سن نہ سکے، جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محسوس کر لیا، لہذا آپ نے فرمایا: اے ابویوب! آپ نے سنا نہیں، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو کل اپنی بارگاہ میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور کا فرمان یکجہتم و سرمنظور ہے۔

حضور نے تحفہ دیا: حکم پر عمل کرتے ہوئے دوسرے دن حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں تحفے میں ایک خادمہ عطا فرمائی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: اے ابویوب! اس کا خیال رکھنا، میں تمہیں اس کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں، جب سے یہ خادمہ ہمارے پاس ہے ہم نے اس کی ذات میں خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عطا کردہ تحفے کو لے کر شاداں و فرحاں گھر تشریف لائے، اہلیہ نے پوچھا: میرے سر تاج یہ کیا ہے؟ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یہ ہمارے آقا نے ہمیں تحفہ دیا ہے، اہلیہ نے عرض کیا: کیا ہی عمدہ تحفہ اور کیا ہی شاندار عطیہ ہے، پھر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا: ہمیں حضور نے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس پر اہلیہ نے کہا: پھر آپ نے حسن سلوک کرنے کے بارے میں کیا تدبیر سوچی ہے؟ تاکہ حضور کے حکم پر عمل ہو سکے۔

وصیت پر عمل کرنے کے لیے باندی آزاد کر دی: حضرت ابویوب انصاری

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بیگم! مجھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نظر نہیں آتی کہ اس کو آزاد کر دیا جائے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب سن کر بیوی نے کہا: اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ کی رائے بالکل درست ہے، بس پھر کیا تھا حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ (صحیح ابن حبان، حدیث: ۱۶۵۲، باب آداب الاکل بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب، المعجم الصغیر للطبرانی، حدیث: ۱۸۵، بل الہدیٰ والرشاد، ج: ۱، ص: ۱۲۴، صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۷۳)

اس حدیث پاک کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب الاشرہ میں اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مذکورہ بالا طویل حدیث کے ذریعے جہاں طرفین سے محبت کی ہمہ گیری اور میزبانی کی عالی قدروں کا پتہ چلتا ہے، وہیں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ ام ایوب کے حسن اخلاق کی نشان دہی ہوتی ہے اور یہ کہ وہ اپنے شوہر کے تئیں کتنی وفادار تھیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کرانے کے لیے اپنے شوہر کا نہ صرف یہ کہ ساتھ دے رہی ہیں بلکہ بڑے پیارے انداز میں ترغیب بھی دلا رہی ہیں، بے شک ایسی خدا ترس محب رسول اور وفا شعار بیوی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔

حضرت ابن عباس نے اپنا گھر نذر کر دیا: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کی آل اطہار و ابرار پر جان چھڑکتے ہی تھے، ساتھ ہی اہل بیت رسول بھی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شدید محبت کرتے تھے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہل بیت سے محبت تو آپ دیکھ چکے کہ وہ پورے زمانہ علی مرتضیٰ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ رہے، یہ تعلق خاندان نبوت ہی تھا کہ انہوں نے مولائے کائنات کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہ کا ساتھ نہ دیا اور تمام جنگوں میں وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے مصروف جہاد رہے۔ اب آپ اہل بیت کو دیکھیے کہ یہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ

تعالیٰ عنہ سے کس درجہ محبت فرماتے ہیں، خاندان نبوت کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ ایثار و محبت اچھی طرح یاد تھی جو انہوں نے رحمت عالمیوں کے ساتھ انجام دی تھی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم دونوں کے سگے چچا زاد ہیں، ان کی محبت و ایثار کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت علی کی جانب سے بصرہ کے حاکم تھے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے ملاقات کرنے بصرہ تشریف لائے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد پر غایت درجہ خوشی حاصل ہوئی (حضرت ابن عباس کی نظر میں رسول اللہ پر حضرت ابوایوب کی جاں نثاری کے جو مناظر روز روشن کی طرح واضح تھے اس کی حسن مکافات میں آپ نے ایک نئی تاریخ رقم کر دی) چنانچہ جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات حضرت ابن عباس سے ہوئی تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: جس طرح آپ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد پر اپنا گھر حضور کے لیے خالی کر دیا تھا، میری دلی خواہش ہے کہ میں بھی آپ کے لیے اپنا گھر مع ساز و سامان آپ کے لیے خالی کر دوں، یہ الفاظ کہتے ہوئے ساز و سامان سے بھرا پورا گھر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نذر کر دیا، پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے وظیفے میں وہ اضافہ فرمایا جس کا ذکر آپ ماقبل میں پڑھ آئے ہیں۔ (اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۲، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۵، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۱۰، المستدرک الحاکم، حدیث: ۵۹۳۱، المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۳۷۸۱، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۲۵۲، سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۱۱، ص: ۱۱۸، معرفۃ الصحابہ لابن نعیم، ج: ۲، ص: ۹۳۶)

حضرت ابوایوب کی اُم المؤمنین سے عقیدت: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عقیدت و محبت کا ثبوت وہ جواب بھی ہے جو انہوں نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے متعلق

اس وقت دیا تھا جب ہلاکت میں پڑنے والے ہلاکت میں پڑ رہے تھے، حضرت ابوایوب کی اہلیہ محترمہ نے حضرت ابوایوب سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا تھا: اے میرے سرتاج! کیا آپ نے وہ باتیں سنی ہیں جو لوگ ام المومنین کے بارے میں بیان کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں نے وہ جھوٹ سنا ہے پھر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اہلیہ سے پوچھا: ام ایوب! کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟ تو حضرت ام ایوب نے کہا: خدا کی قسم! میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتی، اس پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: پھر حضور کی حرم محترم ایسا کیسے کر سکتیں ہیں؟ ام ایوب! وہ تو تم سے بہتر ہیں، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اہلیہ کے اس جواب میں ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اہلیہ نے ام المومنین سے متعلق وہی جواب دیا جو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی زبان سے سننا پسند فرماتا تھا۔ قرآن کی آیت نازل ہوئی اور اس میں مسلمانوں سے فرمایا گیا: ”لَوْ لَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا ۖ وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ“ (سورہ نور، آیت: ۱۲)

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بہتان سنا تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اپنے لوگوں پر نیک گمان کرتے اور کہتے: یہ کھلا ہوا بہتان ہے، سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے جو حکم مسلمانوں کو اس آیت کریمہ میں دیا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اہلیہ خدا کی توفیق سے آیت کریمہ کے نازل ہونے سے پہلے ہی اس پر عمل کر چکے تھے۔ (الروض الانف، ج: ۴، ص: ۲۷، سیرت ابن ہشام، ج: ۲، ص: ۳۰۳، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۲۵۲، تاریخ الطبری، ج: ۲، ص: ۱۱۴، فتح الباری، ج: ۱۳، ص: ۲۶۰)

حق گوئی و بے باکی: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر

صحابی تھے، حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت کا ایک طویل زمانہ پایا تھا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تربیت نے فکر و عمل میں اعتدال پسندی راسخ فرمادی تھی، امور شریعت کی ادائیگی کو حتی الامکان طریقہ سنت کے موافق دیکھنا چاہتے تھے، اگر کسی سے اس

کے خلاف دیکھتے تو اس پر سخت نکیر فرماتے اور حسن تدبیر سے اصلاح کی کوشش فرماتے، وہ اس سلسلے میں حاکم وقت کی بھی پرواہ نہ فرماتے تھے چہ جائے کہ عام انسان۔ ہم اس سلسلے میں چند شواہد پیش کر رہے ہیں:

حاکم وقت کے سامنے حق گوئی: (۱) حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک غزوے کے سلسلے میں مصر تشریف لائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصر پر حضرت امیر معاویہ کی جانب سے صحابی رسول حضرت عقبہ بن عامر جہنی گورنر مقرر تھے۔ ہوا یہ کہ مصر کے گورنر نے نماز مغرب میں تاخیر کر دی اور دیر سے نماز پڑھا لی، حضرت عقبہ بن عامر نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے بات کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اے عقبہ بن عامر! کیا آپ نے اس طرح (دیر سے) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز پڑھتے دیکھا ہے؟ کیا آپ نے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ فرمان نہیں سنا؟ ”میری امت ہمیشہ خیر پر قائم رہے گی جب تک وہ مغرب کی نماز کو اتنا مؤخر نہ کریں گے کہ ستارے ظاہر ہونے لگیں؟“ یہ سن کر حضرت عقبہ بن عامر نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: بے شک آپ کی بات صحیح ہے، جب حضرت ابویوب، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اپنی بات کی تصدیق کرا چکے، تب فرمایا: پھر اس کے ہوتے ہوئے آپ نے نماز میں تاخیر کیسے کر دی؟ حضرت عقبہ بن عامر نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا: کسی کام کی مصروفیت کی بنا پر تاخیر ہو گئی، اس پر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑی عمدہ تنبیہ فرمائی، آپ نے فرمایا: عقبہ بن عامر! آپ یہ بات نہ بھولیں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی ہیں (آپ کا قول و عمل لوگوں کی نظر میں دلیل ہے) خدا کی قسم! میرا گمان ہے کہ جب تمہیں لوگ کچھ کرتا ہوا دیکھیں گے (اور جیسا کرتا ہوا دیکھیں گے) تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ (مسند احمد،

قارئین کرام غور فرمائیں! سنت کی مخالفت ہونے پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابی رسول حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کس عمدہ انداز میں گفتگو فرمائی؟ اور حق بیان کرنے میں ان کی گورنری کا ذرہ برابر بھی خیال نہ فرمایا۔

حاکم مدینہ کو کھرا جواب: (۲) حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایسا ہی ایک معاملہ حاکم مدینہ مروان بن حکم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مروان بن حکم نے اپنی سستی کی بنیاد پر نمازوں کی ادائیگی میں کچھ بے اعتدالیاں برتیں، اس پر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مروان کی مخالفت کی، یہ بات مروان کو معلوم ہو گئی کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں، اس نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: آپ میری مخالفت کرتے ہیں؟ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلا خوف فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، اگر آپ کا عمل حضور کے عمل کے مطابق ہوگا تو ہم آپ کی موافقت کریں گے اور اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طریقے کی مخالفت کریں گے تو ہم آپ کی مخالفت کریں گے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۰۹)

امیر لشکر کے سامنے حق بیانی: (۳) ایک مرتبہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر میں شریک تھے، غزوہ بدر رومیوں کے خلاف حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں پیش آیا تھا، اس غزوے کے امیر صحابی رسول حضرت عبداللہ بن قیس فزاری تھے، راوی کہتے ہیں کہ ہم سمندر میں تھے (کشتی میں سوار تھے جس میں رومی قیدیوں کو بھی رکھا گیا تھا) ہمارے ساتھ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، اچانک حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر جہاز میں اس جگہ سے ہوا جہاں امیر کے متعین کردہ ایک افسر نے رومی قیدیوں کو ٹھہرایا ہوا تھا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر ایک عورت پر پڑی جو زار و قطار رو رہی تھی، آپ نے اس کے رونے کی وجہ معلوم کی تو لوگوں نے بتایا کہ اس عورت کے بچے کو اس سے جدا کر دیا گیا ہے، چنانچہ عورت

کو یہاں رکھا گیا ہے اور بچے کو دوسری جگہ، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جگہ پہنچے جہاں اس کا بچہ موجود تھا، بچے کو اپنے ساتھ لیا اور لا کر اس عورت کی گود میں تھما دیا، یہ بات قیدیوں کے افسر کو ناگوار گزری، اس نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت امیر لشکر حضرت عبداللہ بن قیس کے سامنے پیش کر دی، عبداللہ بن قیس نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر پوچھا: آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے امیر لشکر کو جواب دیا: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ”جس نے ماں کو اس کے بچے سے جدا کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس جدا کرنے والے اور اس کے عزیزوں کے درمیان تفریق کر دے گا۔“ (لہذا میں اس فرمان رسول کے ہوتے ہوئے اس چیز کو کیسے برداشت کر لیتا) ظاہر ہے کہ امیر لشکر کے پاس خاموشی کے سوا اور کیا جواب ہو سکتا تھا؟ (مسند احمد: حدیث: ۵۴۶۲۳، تاریخ دمشق، ج: ۳۲، ص: ۱۱۹)

ایسے تو جانوروں کی بھی نہیں مارتے: (۴) سرزمین روم پر ہی ایک اور واقعہ پیش آیا، جس میں امیر لشکر حضرت عبدالرحمن بن خالد بن ولید نے دشمن کے چار قیدیوں کو ہاتھ پر ہاتھ باندھ کر تیروں کے ذریعے قتل کر دیا، یہ بات حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بہت گراں ثابت ہوئی، آپ نے فرمایا: یہ تو سفاکی ہے، آپ نے امیر لشکر سے ملاقات کی، اور فرمایا: آپ نے قتل کرنے میں اس طریقے کا استعمال کیا ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو جانوروں کے ساتھ بھی ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے، میں تو ایک مرغی کو بھی اس طرح قتل کرنا پسند نہیں کرتا، اگرچہ مجھے اس کے بدلے میں یہ اور یہ (مال و دولت) دے دیا جائے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات کا امیر لشکر پر بڑا اثر ہوا اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، چنانچہ اس غلطی کے کفارے کے طور پر انہوں نے اپنے چار غلاموں کو آزاد کر دیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج: ۵، ص: ۵۵، حدیث: ۲۷۹۳۳، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۱۸۰۶۰)

حسن اخلاق کی ایک مثال: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کی تربیت اس ذات گرامی نے فرمائی تھی جس کے فیض نظر سے نہ جانے کتنے سنگریزے ایسے چمکتے ہیرے بن گئے کہ جن کی آب و تاب نے ایک جہان روشن کر دیا، حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تو نبوت کی خصوصی نظر تھی ”وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿۵﴾“ کی مصداق ذات عالی تبار نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خاص تربیت فرمائی تھی، جس کے ثمرات ان کی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہیں، ہم یہاں ان کے حسن اخلاق کی ایک مثال پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے قارئین جانتے ہیں کہ کسی کے معاشرتی اخلاق کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو صاحب اخلاق کے بیشتر اوقات کا ساتھی ہو، گا ہے بگا ہے کی ملاقات میں تو بد اخلاق بھی اپنے آپ کو صاحب اخلاق ثابت کر دیتا ہے، اب ہم یہاں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک غلام کا طرز عمل آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں، امید ہے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اخلاق کی خوشبو قارئین کے مشام جاں کو معطر کر دے گی۔

حضرت امام محمد بن سیرین بیان فرماتے ہیں: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک غلام تھا، جس کو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چالیس ہزار رقم کے عوض مکاتب بنادیا (چالیس ہزار ادا کرو اور آزاد ہو جاؤ) لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے غلام افرح کو مکاتب بنادیا ہے، تو لوگ افرح کو مبارکباد پیش کرنے لگے کہ تمہیں آزادی مبارک ہو، لیکن بعد میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے اس فیصلے پر افسردگی ہوئی اور آپ نے افرح سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ ختم کر دیا جائے اور تم جیسے پہلے میرے غلام تھے ویسے ہی رہو، اس بات کی اطلاع جب افرح کے اہل و عیال کو ہوئی کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکاتبت والے ایگریمنٹ کو رد کرنا چاہتے ہیں تو ان سب نے افرح کو مشورہ دیا: تم اس پر رضامند مت ہونا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزادی دے دی ہے، اب واپس غلامی کی طرف مت پلٹنا، اس پر حضرت افرح نے اپنے گھر والوں کو جواب دیا: خدا کی قسم! حضرت ابویوب

انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے جو کہیں گے میں اس پر عمل کروں گا، پھر ^{فلح} وہ معاہدہ لے کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں پہنچے جو ان کی آزادی کے لیے لکھا گیا تھا، انہیں دکھایا اور پھاڑ دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا ^{فلح} اسی حالت پر رہے، ایک دن حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ^{فلح} کو بلایا اور فرمایا: ^{فلح} آج سے تم آزاد ہو اور جو کچھ مال تمہارے پاس ہے وہ بھی تمہارا ہے۔

(بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب، ذکر من اسمہ ^{فلح})

قارئین اندازہ کریں کہ ^{فلح} کے دل و دماغ میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اخلاق و کردار نے کیسی جگہ بنائی تھی کہ ^{فلح} نے گھر والوں کے مشورے کے خلاف جا کر آزادی پر غلامی کو ترجیح دی لیکن ایسے خوش خصال آقا کی حکم عدولی منظور نہ کی، اس واقعے کا دوسرا پہلو بھی ناظرین دیکھتے چلیں کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے غلام پر مزید نوازشات کی برسات فرمادی، پہلے تو ^{فلح} کو بدل کتابت کے طور پر چالیس ہزار گراں قدر رقم ادا کرنی تھی لیکن بعد میں تو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بغیر کسی عوض کے آزاد کر دیا پھر آپ نے اس آزادی کو مزید پر لطف اس وقت بنا دیا، جب ^{فلح} کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ اس کے پاس جو کچھ مال ہے وہ اسی کا ہو گیا حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس میں سے کچھ نہ لیں گے۔

حکم رسول پر شدت سے عمل: بہت مشہور مسئلہ ہے یہاں تک کہ عوام بھی اس حکم سے آشنا ہیں کہ قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے پاخانہ کرنا صحیح ہے نہ پیشاب۔ کیوں کہ حضور نے اس سے منع فرمایا ہے، اس حدیث پاک کو مشہور کرنے میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کردار کا بڑا دخل ہے، چنانچہ جب آپ مصر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں کے پاخانے اس طور پر بنے ہوئے ہیں کہ جہاں حضور کے فرمان مذکور پر عمل کرنا دشوار ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسا بھی نہیں کر سکتے تھے کہ پاخانہ یا پیشاب کے لیے بیٹھتے وقت فرمان رسول کو بھول جاتے اور پاخانے کے قد چوں کو بدل بھی

نہیں سکتے تھے، یہ بات حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل و دماغ پر بار بنی ہوئی تھی، اس لیے آپ لوگوں سے پریشانی کو بیان بھی کرتے تھے جیسا کہ حضرت رافع بن اسحاق بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا ”سمجھ نہیں آتا کہ ان پاخانے کے قد چجوں کے ساتھ کیا کیا جائے حالانکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ پاخانہ پیشاب کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کرو نہ پشت۔ (مسند احمد، حدیث: ۵۱۵۲۳)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہنمائی فرمائی اور اپنی قدرت کاملہ سے ایک تدبیر سجھادی کہ جس میں قد چجوں کو بدلے بغیر حضور کے حکم پر عمل ممکن ہو سکے، جس کے بارے میں وہ خود ہی فرماتے ہیں: جب ہم نے پاخانے کی سیٹوں کو قبلہ رخ دیکھا (تو ہم سیٹ تو نہیں بدل سکتے تھے) البتہ خود اس طرح گھوم کر پاخانہ پیشاب کرنے بیٹھتے تھے کہ قبلہ کی طرف منہ ہونہ پشت، ساتھ ہی ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کیا کرتے تھے۔ (مسند احمد، حدیث: ۵۳۶۲۳)

قارئین غور فرمائیے! وقت طلب مراحل میں بھی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کس انداز میں فرمان رسول پر عمل کر کے دکھایا؟ آپ استغفار اس لیے کرتے تھے کہ منحرف ہونے میں کہیں کوئی کمی واقع ہوگئی ہو، یہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم شریعت پر جذبہ عملی اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج یہ مسئلہ زبان زد عام خاص ہو گیا۔

ناراض ہوئے کھانا نہ کھایا: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کے معاملات اور رہن سہن کو اسی کیفیت پر دیکھنا چاہتے تھے جیسے کہ لوگ زمانہ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تھے، اس کے خلاف پر برہم ہو جاتے اور سختی سے پیش آتے، ملاحظہ فرمائیں!

حضرت سالم بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میرے ولیمہ کے موقع پر والد محترم نے لوگوں کو دعوت دی، مدعو حضرات میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل

تھے، آپ جب ہمارے گھر تشریف لائے تو دیوار پر پڑے پردوں کو دیکھ کر سر جھکا لیا، میرے والد کو بلایا اور فرمایا: اے عبداللہ! آپ دیواروں کو پردوں سے ڈھاکتے ہیں؟ یہ سن کر میرے والد کو احساس ندامت ہوا، اور عرض کیا: عورتیں ہم پر غالب آگئیں، آپ نے فرمایا: میں نہیں سمجھتا کہ تم پر بھی عورتیں غالب آسکتی ہیں؟ میں تمہارے گھر میں داخل ہوں گا نہ کھانا کھاؤں گا پھر آپ واپس تشریف لے گئے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۰، شرح صحیح البخاری للحوینی، ج: ۴، ص: ۸)

علمی مقام: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معلم کائنات سے اکتساب فیض کیا تھا، حضور کی صحبتوں سے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے سینے کو علم شریعت کا خزانہ بنادیا۔

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا علمی مقام اور تفقہ فی الدین لوگوں میں یہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے درمیان بھی مشہور و معروف تھا، چنانچہ جب صحابہ کرام کے درمیان کسی فقہی مسئلے میں اختلاف ہو جاتا تو صحابہ کرام حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسئلہ حل کرایا کرتے، اس حیثیت سے دیکھا جائے تو آپ کی ذات مرجع صحابہ و مرجع انام تھی۔

پہلی شہادت: امام بخاری اپنی صحیح میں روایت فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن حنین فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت مسور بن مخرمہ کا مقام ابواء میں اختلاف ہو گیا، حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: محرم اپنا سر دھل سکتا ہے جبکہ حضرت مسور بن مخرمہ کا کہنا تھا کہ محرم (احرام والا) اپنا سر نہیں دھل سکتا، عبداللہ بن حنین کہتے ہیں: مجھے عبداللہ بن عباس نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں بھیجا، میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ کنویں کی دو لکڑیوں کے درمیان نہا رہے ہیں اور انہوں نے ایک کپڑے سے پردہ کیا ہوا ہے، میں نے ان کو سلام کیا، انہوں نے پوچھا: کون ہے؟ میں نے کہا: میں عبداللہ بن حنین ہوں، مجھے آپ کے

پاس حضرت عبداللہ بن عباس نے بھیجا ہے، میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حالت احرام میں ہوتے تھے تو اپنا سر کس طرح دھوتے تھے؟ یہ سن کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھ سے پردہ اتنا نیچے کر دیا کہ مجھے ان کا سر دکھائی دینے لگا، پھر اس شخص سے فرمایا: جو ان پر پانی ڈال رہا تھا کہ پانی ڈالو! اس نے آپ کے سر پر پانی ڈالا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو ہلایا پھر دونوں ہاتھوں کو آگے لے گئے اور پیچھے لائے، پھر فرمایا: میں نے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (صحیح البخاری، باب الاغتسال للمحرم، حدیث: ۱۸۴۰، سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۰۱۸، سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۹۳۴)

حدیث سے ثابت ہوا کہ جب دو صحابہ میں اختلاف ہوا تو مسئلہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب سے حضرت عبداللہ بن عباس کے قول کی تائید ہوئی کہ محرم حالت احرام میں اپنا سر دھو سکتا ہے یہی ہم احناف کا مذہب بھی ہے۔

دوسری شہادت: حضرت ابواسحاق مولا بنی ہاشم فرماتے ہیں کہ ایک دن لوگوں میں اس بات کو لے کر اختلاف ہو گیا کہ القرع نامی برتن میں نبیذ (ایک مشروب) بنائی جا سکتی ہے یا نہیں، یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر وہاں سے ہوا، لوگوں نے موقع غنیمت جانا اور ایک آدمی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے بھیجا تا کہ وہ اس بارے میں آپ سے معلوم کرے، چنانچہ اس نے آپ سے سوال کیا: القرع نامی برتن میں نبیذ بنائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ”مزفت“ نامی برتن میں نبیذ بنانے سے منع فرماتے ہوئے سنا، پوچھنے والے نے پھر قرع کے بارے میں پوچھا: آپ نے دوبارہ وہی پہلے والا جواب دہرا دیا۔ (مسند احمد، حدیث: ۲۳۵۱۲، المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۴۰۰۰)

مطلب یہ ہے کہ جس برتن میں حضور نے منع فرمایا ہے، اس میں نبیذ بنانا ممنوع ہے

اور وہ برتن ہے مزفت (تار کول لگا ہوا ایک برتن) اس کے سوا دوسرے برتنوں میں نبیذ بنانا ممنوع نہ ہوگا۔

دیگر صحابہ کے ہوتے ہوئے آپ سے مسئلہ پوچھا جاتا: حضرت عاصم بن سفیان ثقفی غزوہ سلاسل میں شرکت کے لیے نکلے لیکن شرکت نہیں ہو سکی (جنگ بند ہو گئی) انہیں جہاد میں شرکت نہ کرنے کا بڑا ملال ہوا، سیدھے حضرت امیر معاویہ کے پاس پہنچے، اتفاق سے اس وقت حضرت امیر معاویہ کے پاس حضرت ابویوب انصاری اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود تھے۔ (حضرت عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسئلہ پوچھنا تھا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا نہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بلکہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے) اور سوال کرتے ہوئے کہا: اے حضرت ابویوب! ہم غزوے میں تو شریک نہ ہو سکے لیکن ہمیں یہ حدیث سنائی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے چار مسجدوں (مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ، مسجد قباء) میں سے کسی ایک میں نماز پڑھ لی، اس کے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے، جواب دیتے ہوئے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! میں تجھے اس سے بھی آسان بات سنائے دیتا ہوں، میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جس نے اس طرح وضو کیا جیسا اسے حکم دیا گیا ہے اور اسی طرح نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ اس کے ماقبل کے گناہ مٹا دیتا ہے“ یہ حدیث بیان فرما کر آپ نے حضرت عقبہ بن عامر سے فرمایا: اے عقبہ! یہی بات ہے؟ تو حضرت عقبہ بن عامر نے آپ کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: جی ہاں۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث: ۹۶۱۳، سنن الکبریٰ، حدیث: ۱۳۹، مسند احمد، حدیث: ۵۹۵۲۳)

قارئین نے اندازہ کیا ہوگا کہ پوچھنے والے نے دو جلیل القدر صحابہ کو چھوڑ کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسئلہ معلوم کیا، مسئلہ بیان کرنے کے بعد آپ نے حضرت عقبہ بن عامر سے اپنی تائید کرائی، اس سے آپ کی عاجزی اور انکساری کا ظہور

ہوتا ہے۔

سماعت حدیث کا شوق: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود زبان رسالت سے احادیث سنی تھیں اور خوب سنی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں حضور کی احادیث سماعت کرنے کا خاص ذوق بخشا تھا، جس کی وجہ سے وہ دیگر صحابہ کرام سے بھی احادیث کی سماعت کرتے تھے بلکہ اس کے لیے ایک مرتبہ تو انہوں نے مدینہ طیبہ سے مصر کا طویل سفر اختیار کیا اور وہ بھی بڑھاپے کے عالم میں، اس سفر میں ان کے پیش نظر رسول اللہ کی حدیث کی سماعت کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ تھا، جیسا کہ آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔ روایات بتاتی ہیں کہ یہ حدیث جس کے لیے اتنا طویل سفر کیا تھا خود حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور سے سماعت کر رکھی تھی، صرف حدیث کی تصدیق کرنے کے لیے مصر گئے تھے۔ حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے لیکن وہاں اختصار ہے، ہم یہاں مسند حمیدی والی تفصیلی روایت ذکر کر رہے ہیں:

حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گھر سے مصر کا سفر کیا، عقبہ بن عامر سے ملاقات کرنے کے لیے آپ سیدھے امیر مصر مسلمہ بن مخلد کے مکان پر پہنچے، امیر مصر کو جب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو فوراً باہر تشریف لائے اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معافہ کیا، پھر پوچھا: کیسے تشریف لانا ہوا؟ آپ نے فرمایا: میں ایک حدیث کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں، جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے، آج روئے زمین پر میرے اور عقبہ بن عامر کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہے جس نے اس حدیث کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہو، لہذا آپ میرے ساتھ کسی کو بھیج دیں تاکہ وہ مجھے عقبہ بن عامر کے گھر لے جائے، امیر مصر نے فوراً ایک شخص کو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ روانہ کیا، اس نے آپ کو حضرت عقبہ بن عامر کے گھر پہنچا دیا، اطلاع ملتے ہی حضرت عقبہ بن عامر باہر تشریف لائے اور حضرت ابویوب

انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ معافہ کیا اور پوچھا: جناب آنے کی زحمت کیوں گوارہ فرمائی؟ اس پر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے ایک حدیث مومن کی عیب پوشی سے متعلق حضور سے سماعت کی ہے، آج اس حدیث کو حضور سے سماعت کرنے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت عقبہ نے فرمایا: جی ہاں! آپ صحیح فرما رہے ہیں، میں نے حضور کو فرماتے ہوئے سنا ہے ”جس نے مومن کا کوئی عیب جو اسے دنیا میں رسوا کرنے والا تھا چھپا لیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے (عیوب) کا ستر فرمائے گا“ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: عقبہ تم نے سچ کہا، پھر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ (مسند حمیدی، حدیث: ۳۸۸، مسند احمد، حدیث: ۳۹۱۷)

روایت حدیث: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے احادیث روایت فرمائی ہیں، صحابہ میں آپ نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابو ہریرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے جس میں سے چند یہ ہیں: حضرت جابر بن سمرہ، حضرت مقداد بن معدی کرب، حضرت عبداللہ بن یزید حظمی، حضرت زید بن خالد، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس، حضرت ابن عمر، حضرت براء بن عازب، حضرت ابورہم، حضرت جبیر بن نفیر، حضرت عطاء بن یزید لیسوی وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۳۳، الاصابہ، ج: ۲، ص: ۸۹، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۲)

علامہ ذہبی کے بیان کے مطابق آپ نے ایک سو پچپن احادیث روایت فرمائی ہیں، جن میں سے سات احادیث پر امام بخاری و مسلم متفق ہیں، ایک حدیث میں حضرت امام بخاری منفرد ہیں اور پانچ احادیث میں امام مسلم منفرد ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۰۳)

وقت وصال اشاعت حدیث کا خیال: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگوں کو احادیث کی تعلیم دینے کا بڑا شوق تھا، اگر کسی کو خلاف سنت کرتا دیکھتے

توفوراً حدیث سنا کر اس کو غلطی پر تنبیہ فرماتے، جیسا کہ ماقبل میں کئی واقعات گزر چکے ہیں۔ اب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جذبہ اشاعت حدیث ملاحظہ کیجیے، احادیث جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سماعت کی تھیں، وہ تمام حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوسرے حضرات کو پہنچادی تھیں، لیکن ایک حدیث انہوں نے ابھی تک کسی کو نہ سنائی تھی، اس حدیث کو انہوں نے لوگوں سے چھپا رکھا، آج اس حدیث کو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بستر مرگ پر لوگوں کو سنارہے تھے، حدیث کی روایت آپ نے ابھی تک کیوں نہ فرمائی اس کو ہم بعد میں بیان کریں گے، پہلے آپ ان کی بیان کردہ آخری حدیث سماعت کریں۔ امام مسلم روایت فرماتے ہیں:

ابو صرمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ایک حدیث تم سے چھپا رکھی تھی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کر دیتا“۔ (صحیح المسلم، کتاب التوبہ باب فضیلة الاستغفار)

حدیث کیوں چھپالی: علامہ غلام رسول سعیدی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں، قاضی عیاض نے کہا: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث کو اس خوف سے چھپا لیا تھا کہ لوگ اس پر اعتماد کر کے عمل کو ترک کر دیں گے اور ان پر مغفرت کی امید غالب آجائے گی اور وہ دلیری سے گناہ کرنے لگیں گے، اس طرح واعظ پر واجب ہے کہ وہ اس قسم کی احادیث کو بکثرت بیان نہ کریں تاکہ لوگ گناہوں میں نہ ڈوب جائیں اور وعظ و نصیحت میں گناہوں سے ڈرانے کی احادیث کو زیادہ تر بیان کیا جائے لیکن اس طرح نہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں اور جب انسان پر موت کا وقت آئے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کی وسعت سے متعلق آیات و احادیث سنائی چاہیے تاکہ مرتے وقت بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن قائم رہے۔ (اکمال اکمال المعلم، ج: ۷، ص: ۱۵۵)

علامہ سعیدی مزید لکھتے ہیں: اس حدیث کا منشا یہ نہیں کہ لوگ گناہ کریں اور پھر مغفرت چاہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ لوگ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں، عبادت گزار اور نیکو کار بھی اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتے رہیں، کیونکہ انسان کتنی بھی عبادت کیوں نہ کر لے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی غیر متناہی نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتا، اس لیے ہر وقت اپنی عبادت کی کمی پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہنا چاہیے یا اس کا منشا یہ ہے کہ اگر انسان سے گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ اور استغفار کرے اور توبہ سے غافل نہ ہو۔ (شرح صحیح مسلم، ج: ۷، ص: ۵۱۲)

حضور کی دعا ابوالیوب کے لیے: ایک مرتبہ حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک میں کوئی تکلیف دہ چیز دیکھی تو فوراً سے نکال دیا، حضرت ابوالیوب کی اس محبت بھری ادا کو جب حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا تو دعاؤں سے نوازتے ہوئے کہا: ”لا یصیبک السوء یا ابا ایوب“ اے ابوالیوب! تمہیں کبھی تکلیف نہ پہنچے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۷۷، الاصابہ، ج: ۲، ص: ۹۰، المستدرک علی الصحیحین، حدیث: ۵۹۶۳)

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے انہیں دعاؤں کا اثر تھا کہ آپ پوری زندگی آفات و بلیات سے محفوظ رہے اور بعد وصال آپ کی قبر دشمن کے شہر میں ہونے کے باوجود بھی محفوظ رہی، جیسا کہ ہم عنقریب اس کو بیان کریں گے۔

ابوالیوب نے انداز دعا سکھایا: ابوزید اور نوف بکالی حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عیادت کرنے حاضر ہوئے تو حضرت نوف نے دعا کی کہ ”اے اللہ! حضرت ابوالیوب کو عافیت اور شفا عطا فرما“ اس پر حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یہ نہیں بلکہ اس طرح دعا کرو: اے اللہ! اگر ابوالیوب کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو انہیں بخش دے اور ان پر رحمت نازل فرما اور اگر موت قریب نہیں ہے تو انہیں

عافیت، شفا اور اجر عطا فرما۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۲)

”اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو“ کا مطلب: رومیوں سے جنگ کے موقع پر لوگوں نے ایک مجاہد کا جوش جہاد دیکھا، اس مجاہد نے جب رومیوں کو صف بستہ دیکھا تو تنہا رومیوں کی صفوں میں گھس کر ان پر حملہ کر دیا، تو کچھ لوگوں نے بلند آواز سے کہا: سبحان اللہ! یہ شخص اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں ڈال رہا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ یہ سن کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! تم اس آیت کا جو معنی سمجھ رہے ہو وہ معنی اس آیت کا نہیں ہے (تم سمجھ رہے ہو کہ جس طرح اس شخص نے کیا ہے اس طرح جانی، مالی نقصان اٹھانا یہ خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے) سنو! یہ آیت ہم گروہ انصار کے حق میں نازل ہوئی ہے، ہوا یوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمادیا اور اسلام کے جاں نثار بڑھ گئے تو ہم لوگوں میں سے بعض نے رازدارانہ طور پر یہ بات کہی جنگوں میں ہمارے بہت مال خرچ ہو چکے ہیں اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمادیا، اب ہم اپنے مالوں کو بچا کر رکھیں تو یہ ضائع ہونے سے بچ جائیں گے، تب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہم پر رد کرتے ہوئے مذکورہ آیت نازل فرمائی، اور فرمایا: ہلاکت راہ خدا میں (جان و) مال قربان کرنے میں نہیں بلکہ جہاد چھوڑ کر اپنے مالوں کی اصلاح کرتے رہنے میں ہلاکت ہے۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۷، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۱۷۷۰۴، سنن ابی داؤد، حدیث: ۲۵۱۴)

ازواج: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دو بیویاں تھیں ایک کا نام ام ایوب بنت قیس

بن سعد ہے، اور دوسری کا نام ام حسن بنت زید ہے۔

تفصیل ملاحظہ ہو: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ازواج و اولاد سے متعلق مؤرخین نے زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا ہے اور اگر لکھا ہے تو ہم اس پر واقف نہیں ہو سکتے تاہم تلاش بسیار کے بعد جو حاصل ہوا ہے وہ قلم بند کیا جا رہا ہے۔

علامہ ابن سعد نے طبقات میں فرمایا: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا

ایک بیٹا تھا جس کا نام عبدالرحمن تھا، عبدالرحمن کی ماں ام حسن بنت زید ہیں۔ عبدالرحمن کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا لیکن وہ بچپن میں ہی انتقال کر گیا، اس کے سوا حضرت ابویوب کے تذکرے میں امام ابن سعد نے نہ کسی دوسری بیوی کا ذکر کیا ہے اور نہ بیٹا بیٹی کا۔ طبقات ابن خیاط، طبقات خلیفہ میں بھی حضرت عبدالرحمن کا ذکر ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۴۹، طبقات ابن خیاط، ج: ۱، ص: ۲۵۱، طبقات خلیفہ، ج: ۱، ص: ۴۳۸)

دیگر مؤرخین نے حضرت ام ایوب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ام ایوب انصاریہ خزرجیہ صحابیہ تھیں جو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ تھیں اور یہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماموں کی بیٹی تھیں، ام ایوب کے والد کا نام قیس بن سعد تھا (ام ایوب ہی آپ کی وہ زوجہ ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کرنے میں حضرت ابویوب کے شریک کار رہتی تھیں، حضور کے لیے کھانے وغیرہ بنانے کا اہتمام بھی یہی فرماتی تھیں) (تقریب التہذیب، ج: ۲، ص: ۷۵۵، تہذیب التہذیب، ج: ۷، ص: ۴۷۷، ۶۶، تہذیب الکمال، ج: ۳۵، ص: ۳۳۱)

ام ایوب اور ام حسن دونوں الگ الگ ہیں کیونکہ دونوں کے نسب نامے الگ الگ ہیں۔ ام حسن کے والد کا نام زید ہے، جبکہ ام ایوب کے والد کا نام قیس ہے۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ حضرت ابویوب کی دو بیویاں تھیں۔

اولاد: ہماری تلاش کے مطابق آپ کے دو بیٹے ایک کا نام ایوب دوسرے کا نام عبدالرحمن تھا، ایک بیٹی جس کا نام عمرہ تھا۔

تفصیل ملاحظہ ہو: حضرت ابویوب کی ازواج کے تذکرے میں ایک بیٹی عبد الرحمن کے بارے میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے بیٹے کا نام ایوب ہے، جس کے نام پر آپ کی کنیت ابویوب اور آپ کی زوجہ کی کنیت ام ایوب مشہور ہوئی، ایوب کا تذکرہ علامہ ابن نقطہ نے اپنی کتاب اکمال الاکمال میں محمد بن عبد اللہ ابوبکر کا نسب نامہ بیان کرتے ہوئے لکھا

ہے: ایوب بن ابی ایوب خالد بن زید بن کلیب۔ (اکمال الاکمال، ج: ۲، ص: ۷۱۹)

علامہ ابن سعد نے طبقات میں صحابیات کے ذکر میں ایک نام حضرت عمرہ کا شمار کرایا ہے، ان کا نسب نامہ اس طور پر لکھا ہے: عمرہ بنت ابویوب خالد بن زید بن کلیب، انہیں حضور سے بیعت کرنے کا شرف حاصل ہے، ان کی ماں ام ایوب بنت قیس ہیں، ان کا نکاح صفوان بن اوس کے ساتھ ہوا، ان کے بطن سے ایک بیٹا خالد بن صفوان پیدا ہوا، اس بیان سے معلوم ہوا کہ یہ حضرت ابویوب کی شہزادی ہیں۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۱۰، ص: ۴۱۷، البحر، ج: ۱، ص: ۴۳۱)

(اردو کے بعض سوانح نگاروں نے بغیر کسی حوالے کے آپ کے دو بیٹے خالد اور محمد مزید شمار کرائے ہیں، لیکن ہم تلاش بسیار کے بعد بھی اس پر مطلع نہ ہو سکے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

روح اطہر کے لیے آیا ہوں پتھر کے پاس نہیں: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوری زندگی حضور کے عشق سے پر بہار رہی، بارگاہ نبوی میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیشہ نذرانہ دل لٹایا اور انگنت مرتبہ شرف باریابی پایا، بلکہ ایک مدت تک میزبان رسول بننا انہیں کا مقدر ٹھہرا، حضور کی دیوانگی میں پوری رات جاگ کر کاٹ دی، ظاہر ہے کہ وصال کے بعد کے لمحات ان پر کتنے شاق گزرے ہوں گے؟ دل مضطرب کو سکون پہنچانے کے لیے ایک مرتبہ حضور کی قبر اطہر پر حاضر ہوئے، حاکم وقت مروان بن حکم کا اتفاقاً ادھر سے گزر ہوا، اس نے دیکھا کہ قبر رسول کے پاس کوئی شخص بیٹھا ہوا ہے اور اپنے رخسار کو قبر منور کی خاک اکرم جو حقیقت میں رشک ارم ہے سے مس کر رہا ہے، مروان نے بغیر پہچانے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات والا صفات پر اعتراض کر دیا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مروان کو ایسا دندان شکن جواب دیا کہ مروان بن حکم خاموش ہو گیا۔ پورا بیان حضرات محدثین کرام سے سنتے ہیں وہ فرماتے ہیں: ”مروان نے ایک دن ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے چہرے کو حضور کی قبر اطہر پر رکھے ہوئے ہے، اس نے آنے والے شخص کی گردن پکڑ کر

کہا: آپ کو معلوم ہے آپ کیا کر رہے ہیں؟ اب جو مروان نے دیکھا تو وہ شخص صحابی رسول حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مروان کو جواب دیا: میں حضور کے پاس آیا ہوں اینٹ، پتھر کے پاس نہیں آیا ہوں، میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: دین پر نہ روؤ جب تک دیندار شخص دین کا والی ہو، ہاں اس وقت روؤ جب نااہل شخص والی ہو۔ (المستدرک علی الصحیحین، حدیث: ۸۵۷۱، مسند احمد، حدیث: ۲۳۵۸۵، سبل الہدیٰ والرشاد، ج: ۱۲، ص: ۳۹۸، خلاصۃ الوفاء

باخبار المصطفیٰ، ج: ۱، ص: ۴۵۷، تاریخ ابن ابی خبیشہ، ج: ۲، ص: ۷۶، تاریخ دمشق، ج: ۵۷، ص: ۲۵۰)

ہمیں حضرت ابویوب مبارک اور وہابیہ کو مروان: اعلیٰ حضرت امام اہلسنت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ تعظیم روح اور تعظیم قبر کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: تعظیم روح اور تعظیم قبر میں فرق نہ کرنا سخت جہالت ہے۔ عارف نابلسی کا ارشاد گزرا اور امام سمہودی فرماتے ہیں: خاص زمین قبر کی تعظیم مقصود نہیں بلکہ اس کی تعظیم مقصود ہے جو اس میں فروکش ہے (پھر مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں) یہ صحابی سیدنا ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے تو تعظیم قبر و روح مطہر میں فرق نہ کرنا مروان کی جہالت اور اسی کے تر کے سے وہابیہ کو پہنچی اور تعظیم قبر سے جدا ہو کر تعظیم روح کی برکت لینا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سنت ہے اور اہل سنت کو انہیں کی میراث ملی۔ واللہ الحمد۔

(فتاویٰ رضویہ، ج: ۹، ص: ۵۲۱)

معرکہ قسطنطنیہ اور مرض وصال: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نے اپنی پوری زندگی خدمت اسلام کے لیے وقف کر دی، اعدائے اسلام کے خلاف جہاد کرنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ رہا، پوری زندگی ایک شیر دل مجاہد کی صورت میں گزاری، اللہ تعالیٰ نے ان کے مجاہدانہ کردار اور مخلصانہ خدمات کو قبول فرمایا، ان کی زندگی میں جب وہ دن آیا جو ہر ایک کے لیے آتا ہے تو وہ اہل وعیال و عزیز واقارب کی مجلس اور یاران خوش مزاج و بہی خوان دل نواز کی محفل خوش رنگ میں نہ تھے بلکہ رزم حق و باطل میں صف آرا

تھے، مرض وصال کے لمحات شروع ہو گئے، حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری زندگی اعدائے اسلام سے برسرِ پیکار رہے یہاں تک کہ حضرت امیر معاویہ کا زمانہ آ پہنچا، آپ کا آخری غزوہ جہاں سے آپ کے سفر آخرت کی ابتدا ہوتی ہے، وہ تھا جس کی منصوبہ بندی حضرت امیر معاویہ نے فرمائی تھی، حضرت امیر معاویہ نے لشکر اسلام کو رومیوں کے خلاف فتح قسطنطنیہ کے لیے روانہ فرمایا تھا، اس لشکر کی قیادت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے یزید (جو بعد میں پلید اور اسلام کے دامن پر بد نما داغ ثابت ہوا) کو سونپی تھی، قیادت کی وسعت خواہ جو بھی رہی ہو (جیسا کہ حضور شراح بخاری لکھتے ہیں: یزید پلید جس لشکر میں شریک ہوا، خواہ وہ سپہ سالار کی حیثیت سے رہا ہو، خواہ کسی ٹولی کے سردار کی حیثیت سے۔ مقالات، ج: ۲، ص: ۴۰۲) بہر حال حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس لشکر میں اسی سال کی عمر میں ایک مجاہد کی حیثیت سے شریک رہے، مجاہدین اسلام کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دشمن کی سرزمین پر پہنچے مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔

وصال: محاصرے کے دوران حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے

بیمار ہوئے، جسم میں قتال کی قوت باقی نہ رہی، اور آپ بستر مرگ پر استراحت کے لیے مجبور ہو گئے، امیر لشکر آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوا اور آپ سے پوچھا: آپ کی کوئی خواہش ہو تو فرمائیں! آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: لشکر مسلمین سے میرا سلام کہنا اور پھر انہیں میرا پیغام دینا کہ ابوالیوب انصاری کی آخری خواہش یہ ہے کہ مسلمان دشمن کی زمین میں چلتے چلے جائیں، جہاں تک ممکن ہو رومیوں کی زمین میں گھس جائیں، ابوالیوب کے جنازے کو اپنے ساتھ لے جائیں اور فصیل قسطنطنیہ کے سائے میں مجھے دفن کر دیں، آپ نے یہ باتیں کہیں اور کچھ ہی دیر میں آپ کی روح قفسِ عمری سے پرواز کر گئی ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ (صور من حياة الصحابة، ص: ۷۴، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۹، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۳، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۹۷)

فصیل قسطنطنیہ کے پاس دفن کی خواہش: ممکن ہے کہ ہمارے قارئین

کے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہو کہ آخر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیوار قسطنطنیہ کے پاس دفن ہونے کی خواہش ظاہر کیوں کی؟ لہذا ہم اس کا جواب دیتے چلیں، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی اس خواہش کا داعیہ بھی حدیث رسول ہے، اس کو علامہ شہاب الدین احمد بن محمد المعروف بابن عبد ربہ اندلسی نے اپنی کتاب العقد الفرید میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے، آپ لکھتے ہیں:

امیر لشکر نے آپ سے پوچھا: آپ کی کوئی خاص حاجت ہو تو بیان فرمائیں؟ آپ نے فرمایا: تمہاری دنیا سے تو مجھے کوئی حاجت نہیں (لیکن آخرت سے متعلق میری یہ خواہش ہے) کہ تم سے جتنا ہو سکے دشمن کی سرحد میں مجھے اتنا اندر دفن کرنا، کیوں کہ میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ”قسطنطنیہ کی دیوار کے پاس ایک صالح شخص کو دفن کیا جائے گا“ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے وہی شخص بنا دے۔ بس یہی سبب تھا کہ آپ نے وہ خواہش ظاہر کی جو آپ نے پڑھا۔ (العقد الفرید، ج: ۵، ص: ۱۱۶)

بعض مؤرخین نے اس وصیت میں ایک اور نکتہ بیان فرمایا ہے جو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شوق جہاد کا غماز ہے، ڈاکٹر صلابی لکھتے ہیں: وصیت کے پیچھے ایک راز یہ بھی تھا کہ آپ ہر قیمت پر دشمن کی سرحد میں گھس جانا چاہتے تھے، اگر یہ زندگی میں ممکن نہ ہو تو بعد ممات ہی سہی۔ وہ دشمن کی سرزمین پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، لہذا جو کچھ زندگی میں نہ ہو سکا وہ اس کو بعد مرگ کرنا چاہتے تھے۔ (عمر بن عبد العزیز علی محمد الصلابی، ج: ۲، ص: ۳۷)

نماز جنازہ اور تدفین: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آخری خواہش کا مسلمانوں نے لیک کہتے ہوئے استقبال کیا اور اس کو پورا کرنا اپنا فرض منصبی جانا، چنانچہ جنازہ تیار کیا گیا، یزید نے نماز جنازہ پڑھائی (خیال رہے اس وقت تک یزید کی پلیدی اور کالے کرتوت لوگوں کے سامنے نہ آئے تھے، ابھی تک لوگ اسے حضرت امیر معاویہ صحابی رسول کا بیٹا سمجھتے تھے اور بس، اس کی کارستانی خلیفہ بن جانے کے بعد ظاہر ہوئیں) پھر مجاہدین اسلام نے پے در پے رومیوں پر حملے کیے، یہاں تک کہ مسلمان

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازے کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے رومیوں پر حملہ کرتے ہوئے فصیل قسطنطنیہ تک جا پہنچے، دیوار قسطنطنیہ کی بنیاد کے پاس حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کھودی گئی اور وہیں آپ کو دفن کر دیا گیا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۵۰، تاریخ الخلفاء، ج: ۲، ص: ۲۹۴، الوافی بالوفیات، ج: ۴، ص: ۳۴۴، مشاہیر الصحابة، ج: ۱، ص: ۱۲۹، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۲۵۲، صور من حیاة الصحابة، ص: ۷۴، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۱۲)

وفات کا سال: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس سنہ میں واصل حق ہوئے اس سلسلے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ سنہ وفات کے طور پر کتابوں میں پچاس، اکیاون، باون اور پچپن ہجری کے اقوال درج ہیں لیکن زیادہ تر مؤرخین نے باون ہجری کو آپ کا سنہ وفات بیان فرمایا ہے۔ وقت وفات آپ کی عمر تقریباً اسی سال تھی۔ (تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۶۲، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۱۲، طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۵۰، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۳، الاستیعاب، ج: ۱، ص: ۱۹۷)

وصال سے پہلے حدیث سنائی: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے وصال سے پہلے چند وہ احادیث بھی سنائیں جو انہوں نے مصلحتاً ابھی تک کسی کو نہ سنائی تھیں (ایک حدیث کا بیان ہم ماقبل میں کر چکے ہیں) آپ نے فرمایا: میں اگر اس حالت کو نہ پہنچ گیا ہوتا (موت کے قریب) تو میں تمہیں یہ حدیث نہ سناتا، پھر آپ نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے ”من مات لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنة“ جو اس حال میں مرا کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتا (مومن مرا) تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۲۵۳، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۵۸)

رومیوں نے آپ کی قبر کی حفاظت کی: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کورات کے وقت رومیوں کی سرزمین، قسطنطنیہ میں دفن کیا گیا تھا، صحابی رسول کی تدفین میں مسلمانوں نے جو اہتمام کیا تھا، رات میں رومیوں نے اسے ملاحظہ کیا تھا، صبح کو

رومیوں نے مسلمانوں سے معلوم کیا: رات کیا معاملہ تھا؟ جس کا آپ لوگ اہتمام کر رہے تھے، مجاہدین اسلام نے جواب دیا: رات ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک عظیم صحابی کا انتقال ہو گیا تھا، ہم حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تدفین میں مصروف تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ قیصر نے قتال کے وقت ایک تخت دیکھا تھا، جسے لوگ کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھے، قیصر نے مسلمانوں کی طرف قاصد بھیج کر اس کا مقصد معلوم کیا تو مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک برگزیدہ صحابی کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے انہیں تمہاری سرزمین میں دفن کر رہے تھے، قیصر نے کہا: تم بڑے عجیب لوگ ہو، آپ نے اپنے نبی کے صحابی کو ہماری مملکت میں دفن کر دیا، تم ادھر جاؤ گے ہم ادھر ان کی لاش کو نکال کر کتوں کے حوالے کر دیں گے۔ (العیاذ باللہ) مسلمانوں نے قیصر کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: ہم صرف اپنے نبی کے صحابی کے جسم کو تمہاری زمین میں ودیعت نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ جملے بھی تمہارے کانوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رہے ہیں اگر تم نے صحابی رسول کے ساتھ ادنیٰ سی گستاخی کی تو مملکت اسلامیہ میں کوئی نصرانی زندہ بچے گا نہ کوئی گرجہ باقی رہے گا، قیصر نے کہا: میں مسیح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں، ہم خود تمہارے نبی کے صحابی کی قبر کی حفاظت کریں گے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۶۲، العقد الفرید، ج: ۵، ص: ۱۱۷)

مؤرخین کی بڑی تعداد نے یہ بات خاص طور پر ذکر کی ہے کہ رومیوں نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی پوری ذمہ داری کے ساتھ حفاظت کی۔ (طبقات

ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۵۰، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۱۲، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۶۲)

رومیوں نے آپ کا مزار بنایا: رومیوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا وعدہ نبھایا، حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار بنایا، اس کی حفاظت کی اور حسب ضرورت اس کی مرمت بھی کرتے رہے، مزار پر سفید رنگ کا گنبد تعمیر کیا گیا تھا جس میں قذیلیں روشن کی جاتی تھیں۔ حضرت ابوسعید فرماتے ہیں: میں سوہجری میں آپ کے مزار

پر حاضر ہوا تو میں نے وہاں قندیلیں روشن دیکھیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ رومیوں نے آپ کی قبر پر عمارت بنائی اور چار قندیلیں روشن کیں۔ (معرفۃ الصحابہ لابی نعیم، ج: ۲، ص: ۹۳۳، بغیۃ الطلب، ج: ۳، ص: ۲۱۶، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۶۲) قارئین کرام غور فرمائیں! مجاہدین اسلام نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجنبی سرزمین میں سپرد خاک کر دیا لیکن رومیوں کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ حضرت ابو یوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک جسم کو کوئی نقصان پہنچاتے، یہ ان دعاؤں کا اثر تھا جو حضور نے ان کے لیے گاہے بگاہے کی تھیں، ان کا بیان کیا جا چکا ہے۔

(سمط المن جوہر العوالی، ج: ۱، ص: ۲۳۴)

بارگاہ رب میں حضرت ابویوب کا وسیلہ: رومیوں نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار کے طور پر ایک بڑی نعمت حاصل کر لی تھی، شاید انہیں آپ کی قبر انور کی برکتوں کا اندازہ ہو گیا تھا، اسی لیے انہوں نے آپ کی قبر انور کے ساتھ اتنا اہتمام کیا، اس پر قبہ بنایا، قندیلیں روشن کیں، اس کی مرمت کراتے رہے اور مکمل دیکھ بھال بھی کرتے رہے۔ اب آپ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی ایک خصوصی برکت ملاحظہ کریں۔ خیال رہے کہ قبر کی برکت سے مراد صاحب قبر کی برکات ہوتیں ہیں جیسا کہ اس بات کو ہم امام اہل سنت اعلیٰ حضرت کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں۔

جب رومیوں پر قحط سالی آ جاتی اور پانی برسنا بند ہو جاتا تو رومی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر آتے، قبر (کے پردے) کو کھولتے اور بارش طلب کرتے تو اللہ تعالیٰ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وسیلے سے رومیوں پر بارش نازل فرما دیتا۔ اس حقیقت کو ایک دو نے نہیں بلکہ مؤرخین کی غالب اکثریت نے اپنی اپنی کتابوں میں بیان فرمایا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر خالد نے تو یہاں تک لکھا ”وانک لتعجب اذتری جمیع المؤرخین الذین یسجلون تلك الوقائع یقولون وکان الروم یتعاهدون قبرہ ویزورونہ ویسقون بہ اذا قحطوا“ ترجمہ: آپ کو تعجب ہوگا جب آپ دیکھیں گے

کہ تمام مؤرخین نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ رومی آپ کی قبر کی حفاظت و زیارت کرتے اور جب قحط پڑتا تو قبر پر حاضر ہو کر بارش طلب کرتے۔ ہم صرف چند حوالوں پر اکتفا کریں گے۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۵۰، الاستیاب، ج: ۱، ص: ۷۳، اسد الغابہ، ج: ۲، ص: ۱۲۳، سمط النجوم العوالی، ج: ۱، ص: ۲۳۴، تاریخ دمشق، ج: ۱۶، ص: ۶۱، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۴۱۲، بغیۃ الطلب فی تاریخ الحلب، ج: ۳، ص: ۲۱۷، معرفۃ الصحابہ لابی نعیم، ج: ۲، ص: ۹۳۳، تاریخ الخمیس، ج: ۲، ص: ۲۹۴، تاریخ الاسلام، ج: ۴، ص: ۳۳۱، رجال حول الرسول، ج: ۱، ص: ۳۰۰، السیرۃ الحلبیہ، ج: ۲، ص: ۷۹، الوافی بالوفیات، ج: ۴، ص: ۳۴۴)

قسطنطنیہ کا جدید نام استنبول ہے، جب قسطنطنیہ کو ترکوں نے فتح کیا تو آپ کے مزار پر انوار اور آپ کے نام پر بنی ہوئی مسجد کو تاریخی حیثیت سے پہچانا گیا، وہاں پر آج بھی اسلامی شوکت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ (الدولۃ الامویہ، ج: ۱، ص: ۳۵۱)

مزار زمین میں مستور: زمانے کا امتداد بھی ایک عجیب حقیقت ہے، زمانہ جس قدر لمبا کھینچتا جاتا ہے اسی قدر بہت سی چیزیں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ آبادیاں ویرانوں میں اور ویرانے آبادیوں سے بدل جاتے ہیں، کتنے ندی، نالے، جنگلات، مکانات اور عمارات زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں بلکہ معدوم و موجود ہوتے رہتے ہیں۔ امتدادِ زمانے کا اثر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر انور پر بھی ہوا اور قبر انور زمین میں مستور ہو گئی، یہ واقعہ کتنے سال بعد ہوا؟ یہ بیان کر پانا ہمارے لیے تقریباً ناممکن ہے لیکن اتنا طے ہے کہ پہلی صدی ہجری مکمل ہونے تک یہ معاملہ پیش نہیں آیا تھا، جیسا کہ ہم حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول بیان کر چکے ہیں۔ کہ وہ سو ہجری میں حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے تھے۔ البتہ بعد کے زمانے میں کسی وقت یہ معاملہ پیش آیا اور حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر مستور ہو گئی، لیکن ۸۵۷ ہجری میں جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کو دوبارہ تلاش کر لیا گیا۔

مزار کی بازیافت: حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کو کس طور پر تلاش کیا گیا یہ پورا واقعہ ایک ترکی النسل مصنف کی زبانی سنئے (خیال رہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار بھی ترکی کے شہر استنبول میں ہی ہے)

علامہ احمد بن مصطفیٰ بن خلیل لکھتے ہیں: جس وقت سلطان محمد خان فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تو سلطان نے وقت کے بہت بڑے شیخ حضرت شمس الدین آقا (نام محمد بن حمزہ ہے) کی بارگاہ میں اپنے قاصد احمد پاشا بن ولی الدین کو بھیج کر فتح کے لیے خصوصی دعا کرائی، آقا شمس الدین نے سلطان کے لیے دعائیں فرمائیں اور یہ بشارت بھی عطا فرمائی کہ مسلمان قسطنطنیہ کے قلع میں فلاں دن فلاں جگہ سے داخل ہو جائیں گے اور اے سلطان کے فرستادہ شخص! تم اس دن سلطان کے ساتھ رہو گے، اس مبارک موقع پر شیخ خود بھی سلطان کے لشکر کے ساتھ موجود رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمادی، فتح کے بعد جب سلطان محمد قلعے میں داخل ہوا تو وہاں پر احمد پاشا ابن ولی الدین سے سلطان کی ملاقات ہوئی، احمد پاشا نے کہا: یہ شیخ کی دعا کا اثر ہے، جو شیخ نے کہا تھا ہم اسے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ سن کر سلطان محمد خان نے ایک تاریخی جملہ فرمایا: مجھے قسطنطنیہ کے فتح ہو جانے کی اتنی خوشی نہیں ہے، جتنی خوشی مجھے اس بات پر ہے کہ شیخ کی شخصیت میرے زمانے میں موجود ہے، سلطان نے شیخ کے ساتھ خلوت نشینی کی درخواست پیش کی، لیکن شیخ نے سلطان کے اصرار کے باوجود بھی قبول نہ فرمایا، شیخ نے سلطان سے فرمایا: اگر تمہیں خلوت نشینی کی لذت میسر آگئی تو تم سلطانی سے کنارہ کش ہو جاؤ گے جو کہ مسلمانوں کے لیے بڑا خسارہ ہوگا، پھر چند نصیحتیں فرما کر سلطان کو واپس فرمادیا، سلطان جب شیخ کی بارگاہ میں داخل ہوا تب بھی شیخ اس کے استقبال کے لیے کھڑے نہ ہوئے اور وداع کرتے وقت بھی جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے، شیخ کے اس انداز کے بارے میں سلطان نے احمد پاشا بن ولی الدین سے پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا: شیخ ایک مربی ہیں اور ان کا مقصد خلقِ خدا کی تربیت ہے، تم فتح قسطنطنیہ پر کہیں اترانے نہ لگ

جاؤ اس لیے تمہیں غرور سے باز رکھنے کے لیے شیخ نے یہ رویہ اختیار فرمایا، پھر ایک دن بعد سلطان نے شیخ کی بارگاہ میں عرضی لگائی کہ وہ صحابی رسول حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کا پتہ لگانے میں سلطان کی مدد فرمائیں، کیونکہ یہ تو مشہور تھا کہ حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے پاس ہے (لیکن اتنا علاقے کی کھدائی کرنا آسان نہ تھا) سلطان کی عرض پر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کا سراغ پانے کے لیے شیخ ایک جگہ تشریف لائے اور فرمایا: میں اس جگہ ایک نور دیکھ رہا ہوں، شاید میزبان رسول حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر یہی ہو، پھر اسی جگہ آپ نے مراقبہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: صحابی رسول کی روح میری روح کی طرف متوجہ ہوئی، اس فتح پر مبارک باد پیش فرمائی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کوششوں کو قبول فرمائے، تم لوگوں نے مجھے کفرستان کی ظلمتوں سے نجات بخشی، پھر یہ خبر سلطان کو سنائی گئی، سلطان اس جگہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: حضور! آپ جو فرما رہے ہیں، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں لیکن آپ کی بارگاہ میں میری اتنی درخواست ہے کہ مجھے کوئی نشانی دکھادیں تاکہ میرا دل مکمل مطمئن ہو جائے، شیخ نے کچھ دیر اور مراقبہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: اس جگہ قبر کے سرہانے کی جانب سے تقریباً دو گز زمین کھودو! ان شاء اللہ ایک پتھر نکلے گا جس پر عبرانی زبان میں سب کچھ لکھا ہوگا، شیخ کے حکم کے مطابق کھدائی کی گئی، تقریباً دو گز کھدائی ہو جانے کے بعد وہ تختی برآمد ہو گئی جس کے بارے میں شیخ نے خبر دی تھی۔ عبرانی زبان جاننے والے ایک شخص نے جب اس کو پڑھا تو سب کچھ وہی تھا جو شیخ نے فرمایا تھا، سلطان یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی، قریب تھا کہ سلطان بے خود ہو کر گر جائے اگر اس کو سنبھالا نہ جاتا، پھر سلطان نے صحابی رسول حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر ایک عظیم الشان قبہ (گنبد) بنانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ایک جامع مسجد بھی بنائی۔ (اشھاق النعمانی فی علماء الدولة العثمانیہ، ج: ۱، ص: ۱۴۱)

اس واقعے کو قاضی شوکانی نے بھی پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب البدر الطالع

بجاسن من بعد القرن السابع میں تحریر کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کا ایک بیٹا تھا جو مجذوب تھا، پھر اس کی کرامت بھی بیان کی ہے۔ (البدراطلاع، ج: ۲، ص: ۱۶۸)

یادر ہے قاضی شوکانی مسلک اہل حدیث کے بڑے سوراؤں میں سے ایک ہیں۔ اس واقعے کا تذکرہ مختصر اکتی مصنفین نے فرمایا کہ حضرت آقا شمس الدین ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے تربت حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نشاندہی فرمائی ہے۔ (الدولۃ العثمانیۃ للصلابی، ج: ۱، ص: ۱۱۵، فاتح القسطنطنیہ للصلابی، ج: ۱، ص: ۱۱۷، الموسوعۃ الموزونۃ فی التاريخ الاسلامی، ج: ۱۰، ص: ۹۷۴)

مزار کی موجودہ حالت: فتح محمد شیفہ رٹائرڈ ڈپٹی چیف کنٹرولر امپورٹ ایکسپورٹ حکومت پاکستان نے اپنے سفر نامے میں حضرت ابوالیوب انصاری کے مزار کا آنکھوں دیکھا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

قسطنطنیہ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے، گوترکی کا دارالحکومت یہاں سے انقرہ منتقل ہو چکا ہے لیکن حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ابدی آرام گاہ ہونے کی وجہ سے اس شہر کو شہریت عام اور بقائے دوام کا جو درجہ مل چکا ہے، اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، قسطنطنیہ کا خوشنما اور عظیم الشان گھاٹ (گولڈن ہارن یا شاخ زریں) جس خلیج کے دہانے پر واقع ہے وہ بھی خلیج ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے موسوم ہے، قسطنطنیہ کے جس محلے میں حضرت ابوالیوب کا مزار ہے وہ گولڈن ہارن کے بائیں کنارہ پر واقع ہے، مزار مبارک کی عمارت نہایت رفیع الشان ہے، درگاہ میں ہزاروں کبوتر ادھر ادھر اڑتے نظر آتے ہیں، قبر کا تعویذ زمین کی سطح سے کم و بیش چھ فٹ اونچا ہے، اس کے ارد گرد نہایت خوبصورت جالی لگی ہوئی ہے، مزار کی پوری عمارت منقش ہے، اعلیٰ درجے کی تزئین، دیدہ زیب پھول اور دلفریب گلکاری، مزار پر نہایت بیش قیمت اور نفیس چادر پڑی رہتی ہے اور چاروں طرف بھی بیسیوں کتبے لٹکے ہوئے ہیں، ان کتبوں کا خط اتنا پاکیزہ ہے کہ دیکھ کر آنکھوں میں نور آتا ہے اور ترکی کے چابک دست خوش نویسیوں کی مہارت فن کی داد دینی پڑتی ہے۔

مزار مبارک پر ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے، احاطہ مزار کے ایک گوشے میں ایک کنواں تھا لوگ تبرکاً اس کا پانی گھر لے جاتے تھے، مزار مبارک کے قریب ایک قبرستان ہے جو گورستان ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے مشہور ہے، اس گورستان میں دفن ہونا بڑی سعادت کا باعث سمجھا جاتا ہے، ترکی کے کئی اکابر اور مشاہیر علماء و مشائخ اس قبرستان میں دفن ہیں، روضہ مبارک کے قریب ہی سلطان محمد فاتح کی تعمیر کردہ عظیم الشان جامع مسجد آج بھی فتح قسطنطنیہ کی یاد دلا رہی ہے، جامع ابویوب کی عمارت اور صحن بہت وسیع ہے، نماز کے اوقات میں یہاں بہت رونق ہوتی ہے، خاص طور پر جمعہ کے دن تو کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی، جامع کے ایک کمرے میں سبز چادر میں لپٹا ہوا ایک علم بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ وہ تاریخی علم ہے جسے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ لڑائیوں میں علمبردار کی حیثیت سے اٹھاتے تھے، سلاطین ترکی کے زمانے میں مزار سے متعلق ایک مدرسہ بھی تھا جہاں دینی تعلیم دی جاتی تھی، یہ مدرسہ بھی حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسم گرامی سے منسوب تھا، افسوس کہ یہ مدرسہ بند ہو چکا ہے تاہم تجدید پسندی کے اس دور میں بھی ترک حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک اور جامع ابویوب کی بے حد تعظیم کرتے ہیں۔

قسطنطنیہ جسے میزبان رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دفن ہونے کا شرف حاصل ہے، شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال اس کی عظمت کے بارے میں یوں نغمہ پیرا ہوئے ہیں۔

نگہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ابوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلمان ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کے کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

(بحوالہ سیرت حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ص: ۲۰۰)

یہ تھیں میزبان رسول حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات کی

جھلکیاں جو قوم مسلم میں عشق رسول کی روح پھونکنے اور جذبہ جاں نثاری پیدا کرنے کے لیے ایک مکمل تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میدان کارزار میں اسلام کے اسی سالہ بطل عظیم کا اسلام کو آفاق کی وسعتوں تک لے جانے کا عزم محکم آخری لمحات اور اپنے جنازے سے متعلق کی گئی وصیت وغیرہ واقعات اسلامی نوجوانوں میں جوش، جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں، لاکھوں سلام ہوں نبی رحمت پر ان کی آل و اصحاب پر خاص کر حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جو پوری زندگی خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے رب کے محبوب پر جان چھڑکتے رہے، اسلام کے لیے کوششیں کرتے رہے یہاں تک کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر بستر مرگ تک جا پہنچے، اللہ کی رحمت ہو حضرت ابویوب انصاری پر اور قیامت تک ان سے سچی محبت کرنے والوں پر

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود
ان کے اصحاب و عنترت پہ لاکھوں سلام
جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ وہ ہے جو رات و دن کی گردشوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے، انسانوں کے قلوب و اذہان کو جدھر چاہتا ہے ادھر گھماتا ہے، اسی نے اپنے محبوب کو داعی حق اور سراج منیر بنا کر مکہ میں مبعوث فرمایا، داعی حق نے مکہ والوں کو ذات باری کی توحید اور اپنی نبوت کو تسلیم کرنے کی دعوت دی، لوگ نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوئے، ایک، ایک، دو، دو لوگ رحمت عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت پناہ میں آنے لگے اور آخر میں فوج در فوج کی صورت میں اختیار کر گئے، عقل کو جب تک تائید باری حاصل نہ ہو وہ درستی کی راہ حاصل نہیں کر سکتی، اس لیے عقل و خرد کے کئی تا جورا سلام لانے میں پیچھے رہے اور کئی وہ جنہیں خرد مندوں اور دور اندیشوں کی فہرست میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہ تھا، سابقین اولین کی صف میں شامل ہو گئے۔ لیکن ”كَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى“ نے متاخرین کو بھی شرف صحابیت حاصل کرا کر منصب منیع اور مقام رفیع عطا فرمادیا، موجودہ صفحات میں ایک ایسے صحابی کا ذکر ہے جو سابقین اولین میں شامل تو نہیں لیکن اسلام لانے کے بعد اسلام کی وفاداری اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت گذاری نے انہیں کئی تمغات عطا فرمائے، وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کاتبین میں شامل، جس نے کتاب اللہ اور عام خطوط دونوں کی کتابت کا ذمہ سنبھالا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خوش کر کے ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًا“ جیسے معزز الفاظ کے ساتھ دعا حاصل کی، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمرانی کی بشارت عطا فرمائی، جو ملک رانی کا ماہر، فقہ و اجتہاد میں جس کو دسترس حاصل، جس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نسبتی بھائی

(سالہ) ہونے کا منصب حاصل کر کے تمام مومنین کا ماموں بننے کا شرف پایا، امام حسن مجتبیٰ نے صلح فرما کر خلافت ان کے حوالے فرمائی، جو تقریباً چالیس سال تک مسلمانوں کا امیر رہا، جس نے اپنی خلافت میں مملکت اسلامیہ کے حدود کو خوب وسیع فرمایا، اس ذات کا نام معاویہ بن ابی سفیان ہے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔

نام و نسب: آپ کا نسب اس طرح ہے: معاویہ بن ابوسفیان (ابوسفیان کا نام صخر ہے) بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف قرشی اموی۔
آپ کی ماں کا نام: ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد ابوسفیان اور والدہ ہند کا نسب نامہ عبد شمس پر جا کر ایک ہو جاتا ہے۔
کنیت: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ابو عبد الرحمن تھی۔

(اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۲۰۱)

پیدائش: بعثت نبوی سے پانچ سال یا سات سال پہلے پیدا ہوئے، بعض حضرات نے تیرہ سال پہلے پیدا ہونے کا قول بھی ذکر کیا ہے لیکن پانچ سال والا قول زیادہ مشہور ہے۔ (الاصابہ، ج: ۶، ص: ۱۱۲)

حلیہ: حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ بہت حسین و جمیل شخص تھے، قد دراز اور رنگ گورا تھا، داڑھی میں سرخ رنگ ملا ہوا خضاب لگاتے تھے، انتہائی بردبار، فیاض و عادل تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۳۹۷)

خاندانی وجاہت: حضرت امیر معاویہ کا خاندان ایام جاہلیت میں غیر معمولی اہمیت و اقتدار کا حامل تھا، آپ کے جد اعلیٰ امیہ بن عبد شمس رؤسائے قریش میں سے تھے خلفائے بنی امیہ، امیہ بن عبد شمس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اموی کہلائے، ابوسفیان بن حرب جنہوں نے قبول اسلام سے پہلے تمام غزوات میں رئیس قریش کی حیثیت سے لشکر قریش کی قیادت کی، اموی تھے۔ (یہ حضرت امیر معاویہ کے والد ہیں) غرض یہ کہ حضرت امیر معاویہ کا خاندان شرافت، ریاست اور غزوات کے اعتبار سے عرب میں

نہایت ممتاز تھا اور بنو ہاشم کے بعد کوئی اور خاندان شرافت و سیادت میں آپ کے خاندان کا ہم پایہ نہ تھا۔ (مقالات سعیدی، ص: ۱۹۳، معارف صحابہ، ج: ۱، ص: ۲۵۷)

یہ تعارف حضرت علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلے میں لکھا ہے۔ حضرت عثمان غنی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، لہذا یہی تعارف حضرت امیر معاویہ کے خاندان کا بھی رہے گا۔

قبل اسلام: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لانے سے پہلے ایک سخت دل کا فرابوسفیان کے بیٹے تھے (ابوسفیان بعد میں مسلمان ہو کر صحابی ہوئے) ابو سفیان غزوہ بدر کے بعد قریش کے سردار مطلق ہو گئے تھے اور فتح مکہ تک انہوں نے ہر جنگ میں اسلام کے خلاف کفر کی قیادت کی تھی، معاویہ ان کے بیٹے تھے لیکن تاریخ سے واقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ جنگ بدر سے لے کر آخر تک کسی بھی جنگ میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام کفار کے فوجیوں کی لسٹ میں شامل نہیں حالانکہ وہ اس وقت نوجوان تھے اور سالار اعظم کے بیٹے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا سے ہی وہ اسلام کے متعلق اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔

شیخ محمد صقر لکھتے ہیں: حضرت امیر معاویہ اسلام لانے سے پہلے ان کے ہاتھ یا زبان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچی ہو اس سے تاریخ نا آشنا ہے۔

(معاویہ ابن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۶۴)

قبول اسلام: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کس وقت اسلام قبول کیا؟ اس بات کو لے کر مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا، جب کہ بعض کا خیال ہے کہ حدیبیہ کے بعد آپ اسلام لے کر آئے لیکن فتح مکہ تک اپنے اسلام کو چھپائے رہے اور فتح مکہ کے وقت اپنے اسلام کا اعلان فرمایا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: امام واقدی نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیبیہ کے بعد ایمان لائے اور اپنے ایمان کو چھپائے رکھا، فتح مکہ کے وقت اپنے اسلام کو ظاہر فرمایا، جس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمرہ قضا ادا فرمایا تھا، اس وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان تھے۔

ایک اعتراض: صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تمتع (عمرہ قضا) کے بارے میں پوچھا گیا تو حضرت سعد نے جواب دیا: ہم تمتع کیا کرتے تھے اور یہ (امیر معاویہ) اس وقت مکہ کے مکانوں میں حالت کفر میں تھے۔ (مسلم، کتاب الحج، باب جواز التمتع)

جواب: علامہ ابن حجر نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت امیر معاویہ حدیبیہ کے بعد ایمان لائے ہیں تو حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا مطلب ہو گا یہ انہوں نے اس لیے کہا کہ حضرت امیر معاویہ کے فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے کی اطلاع حضرت سعد کو نہیں پہنچی اور انہوں نے وہ بات کہی جو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جانتے تھے اب سوال یہ ہے کہ حضرت سعد کو ان کے ایمان لانے کی اطلاع کیوں نہیں پہنچی؟ اس کا جواب نہایت آسان ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایمان کا اعلان فتح مکہ کے وقت ہی کیا تھا پہلے سے وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ (الاصابہ، ج: ۶، ص: ۱۱۲)

علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمرہ قضا کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لائے اس وقت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصدیق کر چکا تھا (ایمان لا چکا تھا) پھر جب سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاتح مکہ کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو میں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ جس وقت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد ابوسفیان کو معلوم ہوا کہ معاویہ اسلام لا چکے ہیں لیکن اپنے والد سے اسلام کو چھپائے رکھا ہے، تب

ابوسفیان نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طعنہ مارا ”تم سے اچھا تو تمہارا ابھائی یزید بن ابوسفیان ہے کہ وہ اپنی قوم کے دین پر قائم ہے“۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۳۹۶)

مفتی احمد یار خان صاحب علیہ الرحمہ کی تحقیق: حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کی تاریخ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صحیح یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاص صلح حدیبیہ کے دن ۶ھ میں اسلام لائے مگر مکہ والوں کے خوف سے اپنا اسلام چھپائے رہے، پھر فتح مکہ کے دن اپنا اسلام ظاہر فرمایا، جن لوگوں نے کہا ہے کہ وہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے انہوں نے ظہور ایمان کے لحاظ سے کہا ہے۔ جیسے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ در پردہ جنگ بدر کے دن ہی ایمان لا چکے تھے مگر احتیاطاً اپنا ایمان چھپائے رہے اور فتح مکہ میں ظاہر فرمایا تو لوگوں نے انہیں بھی فتح مکہ کے مومنوں میں شمار کر دیا، حالاں کہ آپ قدیم الاسلام تھے، بلکہ بدر میں بھی کفار مکہ کے ساتھ مجبوراً تشریف لائے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان عباس کو قتل نہ کرے وہ مجبوراً لائے گئے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حدیبیہ میں ایمان لانے کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمد نے امام باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت فرمائی ہے کہ امام باقر سے عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ ان سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احرام سے فارغ ہوتے وقت حضور کے سر شریف کے بال مروہ پہاڑ کے پاس کاٹے۔

نیز وہ حدیث بھی دلیل ہے جو بخاری شریف نے بروایت طاؤس عبد اللہ بن عباس سے روایت فرمائی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ حجامت کرنے والے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حجامت عمرہ قضا میں واقع ہوئی جو صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد ۷ھ میں ہوا کیوں کہ حجۃ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کیا

تھا اور قارن مروہ پر حجامت نہیں کراتے بلکہ منی میں دسویں ذی الحجہ کو کراتے ہیں۔ نیز حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حج و داع میں بال نہ کٹوائے تھے بلکہ سر منڈایا تھا، ابو طلحہ نے حجامت کی تھی تو لامحالہ امیر معاویہ کا یہ حضور کے سر شریف کے بال تراشنا عمرہ قضا میں فتح مکہ سے پہلے ہوا۔ معلوم ہوا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتح مکہ سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ (امیر معاویہ پر ایک نظر، ص: ۳۷)

مواخات: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اسلام لانے کو ظاہر فرمادیا، اس کے بعد آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ منورہ منتقل ہو گئے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کی مواخات حنات بن یزید مجاشعی کے ساتھ قائم فرمائی۔ (الروض الانف، ج: ۷، ص: ۴۴۵، الکامل فی التاریخ، ج: ۳، ص: ۳۲۴، السیرۃ الخلیفہ، ج: ۲، ص: ۱۲۸، الاصابہ، ج: ۲، ص: ۲۶)

ہوازن کا مال غنیمت: فتح مکہ جس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اسلام کا اعلان فرمایا اور آپ کے والد ابوسفیان اور آپ کے بڑے بھائی یزید بن ابوسفیان نے اسلام قبول فرمایا، اس کے بعد فوراً غزوہ حنین پیش آیا جس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اپنے بڑے بھائی اور والد محترم کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شریک کار رہے، اس غزوے میں مسلمانوں کو مال غنیمت کے طور پر قبیلہ ہوازن کا مال کثیر ہاتھ آیا تھا، اس مال سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سواونٹ اور چالیس اوقیہ سونا عطا فرمایا تھا اور اسی قدر مال حضرت ابوسفیان اور ان کے بڑے بیٹے یزید کو بھی دیا تھا، یہ سونا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھ سے تول کر دیا تھا۔

جب رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس قدر مال حضرت ابوسفیان اور ان کے دونوں بیٹوں کو عطا فرمایا تو ابوسفیان کہہ اٹھے: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ بے شک بڑے کریم ہیں، زمانہ جنگ میں بھی آپ بہتر لڑنے والے

تھے اور آج جب میں اسلام لے آیا اور آپ کے دست کرم پر صلح کر لی تو آپ کیا ہی سلامتی کی خیرات بانٹنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بہتر جزا عطا فرمائے۔

(طبقات ابن سعد، ج: ۶، ص: ۱۰، ۱۳، ۱۶)

امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان حضرات پر سخت اعتراض کیا ہے جنہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قدیم الاسلام مانتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تالیف قلبی کرتے ہوئے انہیں مال کثیر عطا فرمایا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں: ایک طرف تو یہ (امام واقدی) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قدیم الاسلام مانتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی تالیف فرمائی۔ جب کہ وہ قدیم الاسلام ہیں تو تالیف قلب کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۲۲)

امام واقدی کی طرف سے یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان اور یزید بن ابوسفیان کو جو مال عطا فرمایا تھا وہ تالیف قلب کے لیے تھا لیکن جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد اور بڑے بھائی کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کثیر عطا فرمایا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اس شرف سے محروم نہیں چھوڑا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مال تالیف قلب کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ تبرعاً و احساناً دیا گیا مگر تالیف قلبی والوں کے ساتھ دیا گیا، اس لیے مال کی اس مد میں حضرت امیر معاویہ کا نام بھی شمار کر لیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

امیر معاویہ کا تب و جی: فتح مکہ میں اپنے اسلام کا اعلان کرنے کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکمل طور پر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آگئے اور حضور کو لازم پکڑ لیا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر اعتماد فرماتے ہوئے ایک عظیم اعزاز سے سرفراز فرمایا، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں اس جماعت میں شامل فرمایا جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دربار میں منصب کتابت پر فائز تھی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس وحی کی کتابت فرماتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی اور ان خطوط کو بھی رقم فرماتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گہر بار سے فرما روایان وقت کو جاری ہوتے یا جو فرامین مخصوص علاقوں میں بھیجے جاتے۔ بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف خطوط کی کتابت فرماتے تھے، حالاں کہ یہ اعزاز بھی کیا کم ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی کو اپنے خطوط تحریر فرمانے کے لیے منتخب فرمائیں، کیوں کہ کسی بھی انسان کے خطوط ایک قسم کا راز ہوا کرتے ہیں لہذا امیر معاویہ کا خطوط نبوی لکھنے پر مامور ہونا اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا راز داں بنالیا تھا۔

اتنی نسبت مجھے کیا کم ہے تو سمجھا کیا ہے
لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خطوط بھی تحریر فرماتے تھے اور نازل شدہ وحی کی کتابت بھی فرماتے تھے، علامہ زرقانی لکھتے ہیں: ”وہو مشہور بکتابۃ الوحی“ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وحی کی کتابت کرنے میں مشہور ہیں۔ پہلے علامہ زرقانی نے کاتبین وحی میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام شمار فرمایا پھر جملہ مذکورہ لکھا ہے۔ (شرح الزرقانی علی مواہب اللدنیہ، ج: ۴، ص: ۵۵۳)
علامہ حسین بن محمد نے بھی اپنی کتاب تاریخ خمیس میں یہی جملہ لکھا ہے
”وہو مشہور بکتابۃ الوحی“ (ج: ۲، ص: ۱۸۲)

علامہ حلبی لکھتے ہیں: ”کان معاویۃ وزید بن ثابت ملازمین للکتابۃ بین یدی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی الوحی وغیرہ لا عمل لہما غیر ذالک“
حضرت امیر معاویہ اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہما دربار رسالت کی کتابت کے لیے لازم تھے اور ان کو کتابت کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ دونوں وحی اور غیر وحی دونوں کی کتابت فرماتے تھے۔ (السیرۃ الخلیفہ، ج: ۳، ص: ۴۵۸)

علامہ احمد بن علی نے لکھا ہے کہ کتابت وحی کے لیے اگر حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت موجود نہ ہوتے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وغیرہ وحی کی کتابت فرماتے۔ (امتناع الاسماع، ج: ۹، ص: ۳۳۴)

علامہ ذہبی لکھتے ہیں: حضرت ابن عباس سے صحیح روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: معاویہ کو بلا کر لاؤ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وحی لکھتے تھے۔ (تاریخ اسلام، ج: ۴، ص: ۳۰۹)

علامہ ابن کثیر نے بھی حضرت امیر معاویہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

”ابو عبد الرحمن خال المؤمنین وکاتب وحی رسول رب العالمین“

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے ماموں ہیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کاتب وحی ہیں۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۱۶۴)

علامہ ابن حجر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: معاویہ ابن ابی سفیان جو صحابی رسول ہیں، فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے اور کاتب وحی بھی رہے۔ (تقریب التہذیب، ج: ۱، ص: ۵۳۷)

علامہ عبد العزیز بن احمد لکھتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے۔

مفتی حریمین احمد بن عبد اللہ طبری نے خلاصۃ الیسر میں لکھا ہے: حضور کے تیرہ کاتب تھے (سب کے نام شمار کرائے ہیں) ان میں سے ایک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، حضرت امیر معاویہ اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کاتبین میں سب سے زیادہ خاص اور لازم بارگاہ تھے اور یہ بات مردود ہے کہ آپ کاتب وحی نہ تھے، حضرت امام احمد بن محمد قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا ہے، ان کے لفظ یہ ہیں: ”ومعاویۃ بن ابی سفیان صخر ولد حرب کاتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم“ (الناہیۃ عن طعن امیر المؤمنین معاویہ، ص: ۴۲، ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ خیرا)

علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں: حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تب وحی تھے، فتح والے سال ایمان لائے، ۷۸ سال کی عمر پائی، مناقب کثیرہ والے صحابی ہیں۔ (عمدة القاری، کتاب العلم، باب من یرد اللہ خیرا، مغانی الاخیار، ج: ۳، ص: ۵۵۵) مذکورہ حوالوں سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ وہ علما ہیں جن پر پوری امت کا اعتماد قائم ہے اور جن کی بات بطور دلیل پیش کی جاتی ہے، ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تب وحی تھے۔ اب جو نہ مانے وہ اس کی فہم کا قصور ہے۔ دلائل کی الحمد للہ کمی نہیں۔ ناماننے والا منکر، ہٹ دھرم اور متعصب ہو تو اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

کتابت وحی میں امیر معاویہ کا خاص مقام: ابھی ہم پیچھے لکھ آئے ہیں کہ کسی کے خطوط کی کتابت کرنا گویا کہ اس کے راز پر مطلع ہونا ہے تو کتابت خطوط کے لیے بھی وہی شخص چاہیے جس کی ذہانت و امانت پر اعتماد حاصل ہو، ہر کس و ناکس کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی جاسکتی لیکن کتابت وحی کے لیے تو اس سے زیادہ ذہانت و امانت درکار ہے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ دونوں منصب حاصل تھے، لہذا امانت پڑے گا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کامل اعتماد رکھتے تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس اعتماد کو ہمیشہ بحال رکھا، کبھی پامال نہ ہونے دیا، اپنی حسن کارکردگی اور وفا شعاری کی وجہ سے حضرت معاویہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر میں خوب بھاگتے تھے۔ نتیجتاً حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں کئی مواقع پر اپنی خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

امیر معاویہ کو حضور کی دعا: حضرت امام ترمذی اپنی سنن میں روایت کرتے ہیں: حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیر کے ساتھ یاد کرو کیوں کہ میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: اے اللہ! معاویہ کے ذریعے (لوگوں کو) ہدایت نصیب فرما۔ (سنن ترمذی، کتاب

المناقب، باب مناقب معاویہ)

اس حدیث پاک کو البانی جیسے متعصب ناقد حدیث نے حسن لغیرہ کہا ہے۔
حضرت عبدالرحمن بن ابی عمیرہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے دعا فرمائی: اے اللہ! معاویہ کو ہدایت دینے
والا، ہدایت پانے والا بنادے اور ان کے ذریعے ہدایت عطا فرما۔

(مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۱۷۹۲۶)

حضرت عرباض بن ساریہ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کو فرماتے ہوئے سنا: اے اللہ! معاویہ کو کتاب سکھا، حساب کا علم عطا فرما اور عذاب سے
محفوظ فرما۔ (ایضاً، حدیث نمبر: ۱۷۱۵۲)

حضرت مسلمہ بن مخلد سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت
امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے دعا کی: اے اللہ! معاویہ کو کتاب و حساب سکھا دے
اور شہروں میں اس کے لیے ٹھکانہ بنادے۔ (مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حدیث نمبر: ۱۵۹۱۸)

امارت کی بشارت: ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے
رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وضو کرایا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اٹھا کر دیکھا اور فرمایا: اے معاویہ! اگر تمہیں
والی بنایا جائے تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور انصاف کرنا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: جس دن سے میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ سنا مجھے خیال
ہونے لگا کہ مجھے اس کام میں آزمایا جائے گا یہاں تک کہ مجھے والی بنادیا گیا۔

(مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۱۶۹۳۳)

منصب کتابت کی طلب: حضرت ابن عباس سے روایت ہے: حضرت
ابوسفیان نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! تین باتیں قبول فرمائیں
آپ نے فرمایا: اچھا۔ انہوں نے کہا: ام حبیبہ بنت ابوسفیان عرب کی سب سے حسین و جمیل

لڑکی ہیں آپ کا اس سے نکاح کرتا ہوں، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا۔ پھر انہوں نے کہا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ اپنا کاتب بنا لیجیے۔ پھر عرض کیا: آپ مجھے لشکر کا امیر بنادیجیے تاکہ میں کفار سے جنگ کروں جس طرح میں (زمانہ کفر میں) مسلمانوں سے جنگ کرتا تھا، آپ نے کہا: اچھا۔ راوی حدیث ابو زمیل فرماتے ہیں: اگر ابوسفیان نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ چیزیں نہ مانگی ہوتیں تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انہیں عطا نہ فرماتے لیکن آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ یہ تھی کہ آپ کسی سائل کا سوال رد نہیں فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ابی سفیان)

علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ علامہ نووی لکھتے ہیں: اس حدیث پر یہ اشکال ہے کہ حضرت ابوسفیان ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور حضرت ام حبیبہ کا آپ سے چھ یا سات ہجری میں نکاح ہوا۔ (پھر حدیث میں یہ جملہ کیوں ہے کہ میں اپنی بیٹی ام حبیبہ کا آپ سے نکاح کرتا ہوں) اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہیں عکرمہ بن عمار وہ ضعیف ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے حضرت ابوسفیان نے تجدید نکاح کی درخواست کی ہو۔ (شرح مسلم للنووی، ج: ۸، ص: ۲۷۱، شرح صحیح مسلم للسعیدی، ج: ۶، ص: ۱۱۸۳)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے: حقیقت میں ابوسفیان اپنی دوسری بیٹی عذہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح کرنا چاہتے تھے، عذہ بنت ابوسفیان حضرت ام المومنین ام حبیبہ کی بہن تھیں تاکہ وہ ام حبیبہ کا سہارا بن سکیں، اس پر سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں جواب دیا وہ میرے لیے حلال نہیں ہیں۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: اس کی تحقیق کے لیے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔

(البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۰۱)

رہی بات یہ کہ حضرت ابوسفیان نے اپنی دو بیٹیوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نکاح میں جمع کرنے کا سوال کیوں کیا؟ اس کے ائمہ نے کئی جواب دیے ہیں: ایک جواب

یہ ہے کہ ابوسفیان قدیم الاسلام نہ تھے اس لیے انہیں یہ مسئلہ معلوم نہ تھا۔

قرآن میں فضیلت معاویہ: سورہ توبہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر تمہاری مدد فرمائی اور حنین کے دن جب تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے تو وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اتنی وسیع ہو کر تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ دے کر پھر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین اتاری اپنے رسول اور مسلمانوں پر۔ (سورہ توبہ، آیت نمبر: ۲۵)

اس آیت کریمہ میں یہ ذکر ہے کہ جو جنگ حنین میں شامل تھے ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے ساتھ سکینہ نازل فرمائی اور یہ ثابت شدہ امر ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ حنین میں شامل تھے، لہذا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اللہ تعالیٰ کی تسکین حاصل ہوئی۔

سورہ حدید میں ہے: تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ اور جہاد کیا وہ مرتبہ میں ان سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد فتح کے خرچ اور جہاد کیا، اللہ تعالیٰ ان سب سے جنت کا وعدہ فرما چکا۔ (آیت نمبر: ۱۰)

اس آیت کریمہ میں صحابہ کی دو قسمیں کی گئی ہیں، ایک فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے صحابی اور دوسرے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے صحابی اور دونوں سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے (جیسا علامہ عینی اور حافظ ابن حجر جیسے کثیر محققین کی یہی رائے ہے) یا پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے، اگر بعد میں بھی ایمان لائے تب بھی، ایمان لانے کے بعد آپ نے انفاق فی سبیل اللہ کیا اور حنین و طائف میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ قتال بھی کیا۔ بہر حال وہ یا تو فتح مکہ سے پہلی فضیلت کے مستحق ہیں یا فتح مکہ کے بعد والی فضیلت کے، اور قرآن پاک نے یہ بات بالکل صاف فرمادی کہ فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کے درجات اپنی جگہ لیکن جنت

کا وعدہ صحابہ کے دونوں گروہ سے ہو چکا ہے اور ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ“ لہذا ثابت ہوا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنتی ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ آیت کریمہ میں تو جنت کا لفظ استعمال نہیں ہوا پھر ان کو جنتی کیوں کہا جا رہا ہے۔ لہذا خلجان کو دور کر لیجیے۔ آیت کریمہ میں لفظ حسنی کا استعمال ہوا ہے اور حسنی جنت ہی ہے جیسے کہ دوسری آیت کریمہ میں فرمایا گیا: ”إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۖ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۚ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ ۖ“ (الانبیاء، آیت نمبر: ۱۰۱، ۱۰۲) اس آیت کریمہ میں حسنی سے مراد جنت ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

سورہ توبہ میں ہے: اللہ تعالیٰ کی رحمتیں متوجہ ہوئیں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان انصار و مہاجرین پر جنہوں نے مشکل کی گھڑی میں ان کا ساتھ دیا بعد اس کے قریب تھا کہ ان میں کچھ لوگوں کے دل پھر جائیں پھر ان پر رحمت سے متوجہ ہوا۔ (سورہ توبہ، آیت نمبر: ۱۱۷) اس میں مشکل کی گھڑی سے مراد غزوہ تبوک ہے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس میں حاضر تھے تو رحمت رب ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہ چند آیتیں بطور تبرک لکھ دی ہیں ورنہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی صحابہ کرام کے فضائل وارد ہیں ان میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخل ہیں۔ یہی معاملہ احادیث طیبہ کا بھی ہے جو مخصوص احادیث حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں بھی وارد ہوئیں، ان میں سے ہم نے چند یہاں ذکر کی ہیں۔ رہیں وہ احادیث جو من جملہ صحابہ کرام کے فضائل میں وارد ہوئیں وہ فضائل بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تعلق سے طعن و تشنیع میں زبان درازی کرنے سے بچنے کے لیے معارف صحابہ جلد اول میں تقدیم کا مطالعہ کریں۔

مسلمانوں کے ماموں: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ آپ تمام مسلمانوں کے ماموں ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ بیان فرماتے ہیں:

ابن عدی، بیہقی، اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آیت کریمہ ”عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوْدَّةً“ (اے مسلمانوں! امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان کے درمیان جو تمہارے دشمن ہیں محبت قائم فرمادے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ محبت حضرت ام المومنین بنت ابوسفیان کے ذریعے قائم فرمائی کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کے بعد تمام مومنوں کی ماں بن گئیں اور ان کے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ایمان لانے کے بعد) تمام مسلمانوں کے ماموں بن گئے۔ (الخصائص الکبریٰ، ج: ۱، ص: ۲۳۱) حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: قیامت کے دن ہر سبب و نسب منقطع ہو جائے گا سوائے میرے سبب و نسب کے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم الحدیث: ۱۳۱۷۲) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سالے ہیں۔ لہذا ان کی رشتہ داری حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قیامت تک قائم رہے گی۔

غزوات میں شرکت: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حنین و طائف اور تبوک میں شریک رہے، دور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں مرتدین کے خلاف لڑی جانے والی جنگ یمامہ میں شریک رہے اور مرتدین سے جہاد کیا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لشکر کی ایک ٹکڑی کو شام کی طرف بھیجا، ان پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر متعین فرمایا، اس ٹکڑی کو یزید بن ابی سفیان کے ساتھ لاحق ہونے کا حکم تھا اور یہی وہ اسلام کا پہلا دستہ ہے جس کی قیادت کرنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیب ہوا۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بھائی یزید بن ابی سفیان کے ساتھ رہے جو شام کے والی تھے، اس دوران جنگ یرموک میں شرکت کی اور یزید بن ابی سفیان کے جھنڈے تلے دمشق کو فتح کیا۔ (معاویہ بن ابی سفیان ل محمد بن صقر، ج: ۱، ص: ۱۴، معاویہ بن ابی سفیان للصلابی، ص: ۴۱)

امیر معاویہ کے عروج کا تعارف: زمانہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یزید بن ابی سفیان نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لشکر دے کر بلاد شام کے ساحلی علاقوں کی طرف بھیجا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس لشکر میں بھی شامل تھے جس نے بیت المقدس کو فتح کیا تھا، مسجد اقصیٰ میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ داخل ہونے کا اعزاز بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہوا، جو مشہور زمانہ معاہدہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے باشندگان قدس سے کیا گیا تھا اس کے چار گواہوں میں سے ایک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

زمانہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۹ھ میں فتح قیساریہ کے قائد بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تھے، قیساریہ کا معرکہ رومیوں کے ساتھ فیصلہ کن معرکوں میں سے ایک ہے، یہ شہر رومیوں کے اعلیٰ فوجی عہدے داروں کا خاص مسکن تھا۔ اس شہر کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طویل مدت تک اپنے محاصرے میں لیے رکھا اور سخت تکالیف سے دوچار ہوئے بالآخر اللہ تعالیٰ نے فتح سے ہم کنار فرمایا۔

(معاویہ بن ابی سفیان لحمد بن صقر، ج: ۱، ص: ۱۴)

اصل میں قیساریہ کو فتح کرنے کا ذمہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خط کے ذریعے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپا تھا، اس خط میں آپ نے لکھا تھا کہ میں تمہیں قیساریہ کا والی بنا رہا ہوں لہذا تم ان کی طرف نظر شروع کرو، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہو اور کثرت کے ساتھ یہ وظیفہ پڑھو: ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ، اللہ ربنا وثقتنا، ورجائنا ومولانا، نعم المولیٰ ونعم النصیر“ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی طاقت و قوت نہیں، اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، وہی ہمارا بھروسہ ہے، وہی ہماری امید ہے، وہی مولیٰ ہے، اور وہ کیا ہی بہترین مولیٰ اور مددگار ہے)

جب اس فتح کی خبر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو فاروق اعظم نے ایک مجمع جمع کر کے اس فتح کی لوگوں کو خبر دی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی۔ (تاریخ طبری، ج: ۳، ص: ۶۰۴)

در اصل حضرت عمر کی جانب سے قیساریہ کا معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپا جانا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے ایک امتحان سے کم نہ تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اللہ تعالیٰ کا کرم رہا کہ اس امتحان میں نہ صرف یہ کہ کامیاب رہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں گھر کر گئے اور ان کے محبوب نظر بن گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی حسن کارکردگی اور ملک رانی کی صلاحیتوں کو تاڑ لیا تھا اور وقت آنے پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس پورے علاقے کا والی بنا دیا جو ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کے زیر فرمان تھا۔

(معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۴۵)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

امیر معاویہ والی شام: ۱۸ھ میں یزید بن ابی سفیان کا انتقال ہوا، یہ خبر دربار خلافت میں پہنچی تو فوراً ہی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قاصد کو شام کی طرف روانہ فرمایا، آپ نے یزید بن ابی سفیان کی جگہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کا والی مقرر فرمایا، اس طرح آپ باقاعدہ شام کے فرماں روا بن گئے، پھر امیر المومنین نے ابوسفیان کی تعزیت کی، اپنے بیٹے یزید بن ابی سفیان کے انتقال فرما جانے کی وجہ سے اس وقت حضرت ابوسفیان نے امیر المومنین سے دریافت کیا: آپ نے ان کی جگہ کس کو شام کا والی متعین فرمایا ہے؟ امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ان کے بھائی معاویہ کو ان کا قائم مقام کیا ہے، یہ سن کر حضرت ابوسفیان نے کہا: اے امیر المومنین! آپ نے بڑی عمدہ صلہ رحمی فرمائی ہے۔

والدین کا خط معاویہ کے نام: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت امیر المومنین فاروق اعظم کی طرف سے شام کے والی مقرر ہو گئے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد اور والدہ دونوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ انہیں جو ذمہ داری سونپی گئی ہے وہ بہت اہم ہے، لہذا پوری ایمان

داری کے ساتھ اس کو نبھائیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ماں نے اپنے خط میں لکھا تھا: اے میرے بیٹے! اللہ کی قسم! شاید ہی کسی ماں نے تم جیسا بیٹا جنا ہو، امیر المومنین نے جس اہم کام کی ذمہ داری سونپی ہے تم اس معاملے میں ان کی مکمل اطاعت کرنا خواہ وہ کام تمہیں پسند ہو یا نہ ہو۔

ان کے والد حضرت ابوسفیان کے خط کا مضمون کچھ یوں تھا: اے میرے بیٹے! مہاجرین دین کے معاملے میں ہم پر سبقت لے گئے، ان کے سبقت لے جانے نے ان کو آگے کر دیا اور ہماری تاخیر نے ہمیں پیچھے کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قائد بن گئے، ہم ان کے پیروکار ہو گئے، اب حضرت عمرؓ نے تمہیں ذمہ داری دی ہے، اس میں قابل ذکر کام انجام دے سکتے ہو اگر تم ایسا کر سکتے تو تمہارے کارنامے اور تمہارا ذکر زندہ رہے گا۔ اس طرح زمانہ فاروق اعظم میں آپ شام کے والی بنے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پورے زمانہ خلافت میں شام کے والی رہے، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں بھی آپ شام کی گورنری پر مقرر رہے اور اس دوران ۲۷ھ میں آپ نے جزیرہ قبرص کو فتح فرمایا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۳۹۹)

حضرت ابوبکر اور حضرت معاویہ: ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی لکھتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی حضرت یزید بن ابوسفیان ان چار سالاروں میں سے ایک ہیں جنہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یزید بن ابی سفیان کو خود امیر المومنین نے اپنے ہاتھوں سے جنگی علم عطا فرمایا تھا اور ان کے لشکر کو الوداع کہنے کے لیے امیر المومنین خود پیدل چل کر شہر سے باہر تشریف لے گئے۔ پھر کچھ خاص وصیتیں فرمائیں، یہ صرف ان کے دینی و ایمانی، شرف و کمال کی وجہ سے تھا۔ یہ تو ڈاکٹر صاحب نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی کا تعارف علامہ ذہبی کے حوالے سے کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب تاریخ طبری سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: پھر امیر المومنین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جہاد

کا شوق رکھنے والے ایک دستے کو حضرت یزید بن ابی سفیان کے لشکر میں شامل فرمایا، اس دستے کا امیر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۴۱، تاریخ طبری، ج: ۳، ص: ۳۹۱)

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ صرف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند فرماتے تھے بلکہ ان کو والی شام بنانے کی راہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہموار فرمائی۔

حضرت عمر اور حضرت معاویہ: حضرت یزید بن ابی سفیان کا جب وقت وصال قریب آیا تو انہوں نے اپنا قائم مقام اپنے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنا دیا اور بعد میں ان کے اس انتخاب کو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پسند کرتے ہوئے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کو شام کا والی بنا دیا۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۱، ص: ۳۳۰)

آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اچھے طریقے سے جانتے ہیں کہ وہ کسی کو عامل بنانے سے پہلے کتنی احتیاط فرماتے تھے اور پھر اپنے عاملین کی کس درجہ نگرانی کیا کرتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہیں بھی فاروقی جانچ کا سامنا کرنا پڑا (معارف صحابہ ج: ۱، ص: ۵۱۰) انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عامل متعین فرمایا۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ علاقہ شام پر حضرت عمر کی جانب سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان گورنر متعین تھے جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کا والی متعین فرمایا اور پھر اپنی پوری زندگی ان کو کبھی بھی معزول نہیں کیا۔

(الہدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۳۹۹)

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر میں کتنے معتمد اور ثقہ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کا والی بنایا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ امیر المومنین نے نو عمر انسان کو والی بنا دیا، یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا: تم ایک ایسے شخص کے بارے میں مجھے ملامت کر رہے ہو جس کے بارے میں میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے اے اللہ! اسے ہادی بنا اور ان کے ذریعے لوگوں کو ہدایت عطا فرما۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۰۹)

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: امیر معاویہ وہ ہیں جو غصے کے وقت ہنستے ہیں، ان سے کسی چیز کو بغیر ان کی رضا کے حاصل نہیں کیا جاسکتا، ان سے کچھ حاصل کرنے کے لیے جھکنا پڑے گا۔ (ایضاً: ۴۱۵)

مطلب یہ ہے کہ وہ نہایت ہی حلیم بردبار، زبان کو قبضے میں رکھنے والے ہیں، عقل کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ انہیں دھوکا نہیں دیا جاسکتا، وہ بے باک اور بہادر ہیں۔
حضرت فاروق اعظم فرمایا کرتے تھے: تم قیصر و کسریٰ اور ان کی عقلمندی و ہوشیاری کا ذکر کرتے ہو حالانکہ تمہارے درمیان معاویہ جیسی زیرک و ذہین شخصیت موجود ہے۔

(الکامل فی التاريخ، ج: ۳، ص: ۳۷۳)

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! میرے بعد گروپ بندی سے بچتے رہنا اور اگر تم نے ایسا کیا تو یاد رکھو امیر معاویہ شام میں موجود ہیں۔

(البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۲۲)

حضرت عثمان اور حضرت معاویہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت

امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پورا اعتماد فرمایا اور پورے زمانہ خلافت میں انہیں شام کی امارت پر مقرر رکھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضرت امیر معاویہ حضرت فاروق اعظم کے زمانے ہی میں پورے ملک شام کے والی مقرر ہو گئے تھے، جب کہ دیگر مورخین کے نزدیک حضرت عمر کے زمانے میں شام کا کچھ حصہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

امارت سے خالی تھا، جس پر دوسرے لوگوں کو والی بنایا گیا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفہ متعین ہوئے تو آپ نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پورا بھروسہ کیا، جس طرح آپ خلافت عمر میں شام کے والی تھے اسی طرح حضرت عثمان غنی کے زمانہ خلافت میں بھی شام کے امیر بنے رہے، حضرت عثمان نے نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنے عہدے پر بحال رکھا بلکہ بچا کچا علاقہ شام بھی آپ کی تحویل میں دے دیا، لوگوں نے اسی دوسرے قول کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ ”والصحيح ان الذي جمع لمعاوية الشام كلها عثمان بن عفان“ صحیح بات یہ ہے کہ جس خلیفہ نے پورا ملک شام آپ کے حوالے کر دیا، اس خلیفہ کا نام عثمان بن عفان ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۱۵)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کی گورنری پر قائم تھے کہ ۳۵ھ میں خلیفہ سوم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بڑی مظلومیت کے ساتھ شہید کر دیا گیا اور مولائے کائنات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ بیعت نہ کرنے کے علل و اسباب ہم معارف صحابہ جلد اول میں لکھ چکے ہیں، لہذا یہاں تحریر کرنے کی ضرورت نہیں تاہم واقعے کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے اجمالاً کچھ بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت معاویہ خلیفۃ المسلمین: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے بھائی کے انتقال کے بعد شام کا حاکم بنادیا تھا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اس عہدے پر برقرار بھی رکھا اور دوسرے مزید علاقے ان کی گورنری میں دے دیے۔ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۃ المسلمین مقرر ہوئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کی گورنری سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ سہل بن حنیف کو شام کا والی متعین کیا لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہدے سے برطرف نہیں ہوئے، انہوں نے حسب سابق ہی شام پر تسلط برقرار رکھا۔ اور یہ کہتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرنے سے انکار

کر دیا کہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلین کو میرے سپرد نہ کر دیں کیوں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مظلوم شہید کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ”وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيٍّهُ سُلْطٰنًا“ اور جس کو مظلوم قتل کیا جائے اس کے وارث کو ہم نے قابو دیا ہے۔ (الاسراء: ۳۳)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کریمہ سے اپنے موقف پر دلیل قائم کی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اختلاف دین ہی پر مبنی تھا، ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا۔ اہل سنت و جماعت کا مذہب یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر تھے، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجتہد تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجتہاد میں خطا لاحق ہوئی، ان کا حضرت علی سے جنگ کرنا اپنے اجتہاد کی وجہ سے تھا، اگر مجتہد سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تب بھی اسے ایک اجر ملتا ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام برحق تھے ان کا اجتہاد صحیح و صواب تھا لہذا انہیں ان شاء اللہ دوا جریلیں گے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنگ کی کیونکہ اس وقت کی صورت حال سے وہ اپنے اجتہاد کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ان حالات میں حضرت علی سے جنگ کرنا لازم ہے (اگرچہ ان کا یہ اجتہاد درست نہ تھا) ورنہ تو انہیں خود اس بات کا اعتراف تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے مقابلے میں افضل و اعلیٰ بھی ہیں اور خلافت کے زیادہ مستحق بھی، آنے والے اقتباس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جائے گی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف بھی واضح ہو جائے گا۔

(نعمۃ الباری، شرح بخاری، ج: ۲، ص: ۲۲۳ تا ۲۲۶)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ کئی سندوں کے ساتھ یہ بات ہم تک پہنچی ہے کہ حضرت ابو مسلم خولانی نے ایک جماعت کے ساتھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات

کی اور ان سے پوچھا کہ تم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امر خلافت میں منازعت کر رہے ہو کیا، یہ سمجھتے ہو کہ تم ان سے بہتر ہو؟ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: خدا کی قسم! میں جانتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے زیادہ بہتر اور افضل ہیں اور خلافت کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں، لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مظلوم شہید کیا گیا ہے میں ان کا چچا زاد بھائی ہوں، میں ان کے قصاص کی طلب کر رہا ہوں اور معاملہ میرے ہی سپرد ہے، آپ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہیں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلین کو مجھے سونپ دیں، میں خلافت ان کے حوالے کر دوں گا، لیکن کسی قاتل کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے نہ کیا جاسکا (عذر کی بنیاد پر) تو اہل شام نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنگ کا پختہ ارادہ کر لیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۲۵)

اب ہم آپ کے سامنے ایک خط پیش کرتے ہیں یہ خط ان دنوں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قیصر روم کو لکھا تھا جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے درمیان اختلاف کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ قیصر روم ہمارے آپسی اختلافات کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور وہ سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو آپ نے اس کو لکھا:

”اے قیصر روم! اگر تو اپنے اس خبیث ارادے سے باز نہ آیا تو میں اپنے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مصالحت کر لوں گا اور تجھ سے تیرا پورا ملک چھین کر تجھے ملک بدر کر دوں گا، زمین کو اس کی کشادگی کے باوجود تجھ پر تنگ کر دوں گا“

اس خط سے قیصر خائف ہوا، اپنے ارادے سے باز آ گیا اور آپ کے پاس مصالحت کا پیغام بھیج دیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۶۰۰)

اس خط سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کا اختلاف نفس پرستی پر مبنی نہ تھا بلکہ ہر فریق اپنے موقف کی تائید میں قرآن و حدیث ہی سے استدلال کرتا تھا مگر حضرت علی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا استدلال درست تھا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غیر درست لیکن وہ ایک مجتہد تھے اور مجتہد کی خطا پر اس کو لعن طعن نہیں کیا جاتا۔

تنبیہات: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب سے لوگوں کو آگاہ کرنے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعنہ زنی کرنے والوں کی زبان بند کرنے کے لیے فقیہ ملت مفتی جلال الدین علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب خطبات محرم میں ”انتباہ“ نامی سرخی لگا کر بڑی کارآمد اور مفید بحثیں درج فرمائی ہیں، ہم ان بحثوں کو حضرت ہی کے حوالہ جات کے ساتھ درج کر رہے ہیں:

انتباہ: (۱) عوام میں جو مشہور ہے کہ ”حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیکھا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یزید کو کندھے پر لیے جا رہے ہیں تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جنتی جہنمی کو لیے جا رہے ہیں“ یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ یزید حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال فرمانے کے تقریباً ۱۵ سال بعد ۲۵ھ میں پیدا ہوا۔ (سوانح کربلا)

(۲) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی رہے اور کاتب خطوط بھی۔ امام مفتی حرین احمد بن عبد اللہ بن محمد طبری خلاصۃ السیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیرہ کاتب تھے۔ خلفائے اربعہ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم)، ۵/ حضرت عامر بن فہیرہ، ۶/ حضرت عبد اللہ بن ارقم، ۷/ حضرت ابی بن کعب، ۸/ حضرت ثابت بن قیس بن شماس، ۹/ حضرت خالد بن سعید بن العاص، ۱۰/ حضرت حنظلہ بن ربیع اسلمی، ۱۱/ حضرت زید بن ثابت، ۱۲/ حضرت شریح بن حبیل بن حسنہ اور ۱۳/ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ لیکن ان لوگوں میں حضرت امیر معاویہ اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس خدمت کو زیادہ انجام دیتے تھے۔ علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بخاری شریف کی شرح میں فرمایا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کاتب وحی رہے۔ (الناہیہ، ص: ۱۶)

(۳) حضرت ملا علی قاری شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مخصوص شاگردوں میں سے ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما؟ تو حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے موقع پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار داخل ہوا وہ ایسے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ (الناہیہ، ص: ۱۶)

قارئین! حضرت عمر بن عبدالعزیز وہ ہیں جن کو امام الہدیٰ کہا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین میں پانچویں خلیفہ کی حیثیت سے ان کو شمار کیا جاتا ہے اور جن کی زیارت کے لیے حضرت خضر علیہ السلام آیا کرتے تھے، مگر حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے امام وقت جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھوڑے کی ناک کے غبار کو بھی ان سے افضل بتاتے ہیں تو پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت و رفعت کا کیا کہنا۔ مگر افسوس کہ آج کل وہ لوگ جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل بنتے ہیں بلکہ ان کی ذات پر سب و شتم اور لعن و طعن بھی کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ حضرت علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں کہ علامہ معانی بن عمران علیہ الرحمۃ والرضوان سے ایک شخص نے کہا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ہیں۔ یہ سنتے ہی علامہ ابن عمران غضبناک ہو گئے اور فرمایا: ”نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ پر کسی کو قیاس نہیں کیا جائے گا“ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی، ان کے سالے، ان کے کاتب اور خدائے عز و جل کی وحی پر نبی کریم کے امین ہیں“۔ (الناہیہ، ص: ۱۷)

(۴) حضرت علامہ شہاب الدین خفاجی نسیم الریاض شرح شفاء امام قاضی عیاض میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرے وہ جہنمی کتوں سے ایک کتا ہے۔ (احکام شریعت، ج: ۱، ص: ۱۰۳)

(۵) صحابہ کرام، محدثین عظام اور علمائے اسلام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہیں، باوجود یہ کہ وہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے فضائل و مناقب سے خوب واقف تھے اور ان کے مابین جو واقعات رونما ہوئے انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کسی شخص نے کہا کہ امیر المؤمنین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ جبکہ فلاں مسئلے میں انہوں نے یوں کیا، تو آپ نے فرمایا: ”انہوں نے ٹھیک کیا بیشک وہ فقیہ ہیں“۔ (مشکوٰۃ ص: ۱۱۲)

قارئین! دیکھیے رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو اجلہ صحابہ میں سے ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے ایسے خاص ہیں کہ ان کے دشمن پر بہت سخت ہیں، وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف کرتے ہیں اور ان کو فقیہ و مجتہد مانتے ہیں۔ تو کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو جلیل القدر صحابی رسول کے نقش قدم کو چھوڑ کر شیطان کی اتباع کرتے ہیں یعنی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں بیجا کلمات بولتے ہیں اور ان کی توہین و تنقیص کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ اور حضرت علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بخاری شریف کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں: ”حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے مناقب اور بڑی خوبیوں والے ہیں“۔

(الناہیہ، ص: ۱۷)

اور حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اعدل فضلا اور بہترین صحابہ میں سے ہیں“۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ج: ۲، ص: ۵۱۷)

اسی لیے تمام محدثین کرام حضرت امیر معاویہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے، جس طرح دوسرے صحابہ کے ناموں کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھتے ہیں اسی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کے ساتھ بھی رضی

اللہ تعالیٰ عنہ تحریر فرماتے ہیں۔

(۶) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ متقی، عادل اور ثقہ ہیں، اسی لیے حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سائب بن یزید، حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جیسے فقیہ و مجتہدین صحابہ نے آپ سے حدیثیں روایت کیں۔ اسی طرح حضرت جبیر، حضرت ابودریس خولانی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت خالد بن معدان، حضرت ابوصالح سمان، حضرت ہمام بن عتبہ اور حضرت قیس بن ابوحازم علیہم الرحمہ جیسے جلیل القدر تابعین فقہاء اور علما نے آپ سے حدیثوں کی روایتیں لیں۔ اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں مکرو فریب اور فسق و فجور ہوتا جیسا کہ آج کل بعض جاہلوں نے سمجھ رکھا ہے تو یہ بڑے بڑے صحابہ و تابعین حضرات ان سے حدیثوں کی روایتیں ہرگز قبول نہ کرتے۔

(۷) بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، بیہقی اور طبرانی وغیرہ محدثین کرام نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیثوں کو قبول کیا اور اپنی کتابوں میں درج کیا۔ ان میں خاص کر امام بخاری اور امام مسلم ایسی محتاط ہستیاں ہیں کہ اگر کسی راوی میں ذرا بھی عیب پایا تو اس کی روایت لینے سے انکار کر دیا۔ تو ان بزرگوں کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایتوں کا قبول کر لینا بے انگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ ان سب کے نزدیک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ متقی، عادل اور ثقہ قابل روایت ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے اختلاف کے سبب مرتبہ عدالت سے ساقط نہیں ہیں ورنہ یہ حضرات ان کی روایتیں ہرگز قبول نہ فرماتے۔

(۸) حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دمشق کا حاکم مقرر کیا اور معزول نہ فرمایا جبکہ آپ حاکموں کے حالات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور ذرا سی لغزش پر معزول فرما دیتے تھے جیسے کہ معمولی شکایت پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی بزرگ ہستی کو معزول فرما دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جیسے سخت گیر آدمی کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دمشق کا حاکم مقرر فرمانا اور اپنی ظاہری حیات کے آخری لمحات تک اس اہم عہدے پر انہیں برقرار رکھنا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت و رفعت اور ان کی امانت و دیانت کا کھلم کھلا اقرار و اعلان ہے۔

(۹) حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۶ ماہ امور خلافت انجام دینے کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد کردی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی پھر ان کے سالانہ وظیفے اور نذرانے قبول فرمائے، قسم ہے وحدہ لا شریک کی! اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ باطل پرست ہوتے تو حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکٹا دیتے مگر ان کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیتے۔ اس لیے کہ

مرد حق باطل سے ہرگز خوف کھا سکتا نہیں

سرکٹا سکتا ہے لیکن سر جھکا سکتا نہیں

اور پھر رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فعل مبارک کی (بطور بشارت) ان الفاظ میں تعریف فرمائی ”میرا بیٹا یہ سردار ہے، امید کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرا دے گا“۔ (بخاری، ج: ۱، ص: ۵۳۰)

اب اگر کوئی بد بخت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نااہل قرار دے تو حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر الزام آجائے گا کہ آپ نے نااہل کو خلافت کیوں سپرد کی اور امت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں کیوں دی؟ جب کہ یہ سپردگی قلت و ذلت کی وجہ سے نہیں تھی، اس لیے کہ چالیس ہزار سپاہی جان قربان کرنے کی بیعت آپ کے ہاتھ پر کر چکے تھے۔ (حاشیہ بخاری، ج: ۱، ص: ۵۳۰، بحوالہ خطبات محرم، ص: ۳۱۰-۳۰۵)

حدیث بخاری اور حضرت امیر معاویہ: بخاری شریف کی ایک حدیث کو لے کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کچھ لوگ زبان درازی کرتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اس حدیث کی وضاحت کریں اور صحابی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اعتراض کو دفع کریں۔ پہلے حدیث پاک ملاحظہ ہو: ”حضرت ابوسعید خدری رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عکرمہ اور حضرت ابن عباس کے بیٹے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک حدیث سنائی فرماتے ہیں: مسجد کی تعمیر کے وقت ہم ایک ایک اینٹ اٹھا کر لا رہے تھے اور حضرت عمار دو، دو اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے تو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں اس حال میں دیکھ لیا، آپ نے ان سے مٹی جھاڑی اور فرمایا: عمار پر افسوس ہے اس کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی، یہ ان کو جنت کی طرف بلائے گا اور وہ اس کو دوزخ کی طرف بلائیں گے حضرت ابوسعید نے کہا: حضرت عمار کہتے تھے کہ میں فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب التعاون فی بناء المسجد)

اس حدیث پر دو طریقے سے بحث کی گئی ہے اولاً تو یہ کہ یہ جملہ ”تقتله الفئة الباغية“ (اس کو باغی جماعت قتل کرے گی) حدیث بخاری میں موجود ہی نہیں ہے اور ہمارے یہاں جو مطبوعہ بخاری ہے، اس میں چھاپنے والوں کی غلطی سے جملہ چھپ گیا ہے۔ جیسا کہ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

”حافظ ابن حجر اور علامہ عینی نے کہا کہ امام بخاری نے ”و یج عمار تقتله الفئة الباغية“ کا جملہ روایت نہیں کیا، اس پر یہ اشکال ہے کہ ہماری مطبوعہ ”صحیح بخاری“ میں تو یہ جملہ موجود ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس دور کے چھاپنے والوں کی غلطی ہے۔ کیونکہ امام ابن اثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ نے ”جامع الاصول“ رقم الحدیث: ۸۷۱۶ میں امام بخاری کے حوالے سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس میں ”تقتله الفئة الباغية“ والا جملہ نہیں ہے۔ (جامع الاصول، ج: ۱۱، ص: ۱۹۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۸ھ، بحوالہ حاشیہ مقالات سعیدی، ص: ۲۲۶)

اب علامہ غلام رسول کے قلم سے حافظ ابن حجر اور علامہ عینی کی تحقیق ملاحظہ کیجئے کہ یہ جملہ بخاری شریف میں نہیں ہے۔

صحیح بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں یہ حدیث اسی طرح درج ہے، لیکن امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا

ہے: عمار لوگوں کو جنت کی طرف دعوت دیں گے اور وہ انہیں دوزخ کی طرف بلائیں گے۔ اس روایت میں ”ویح عمار تقتله الفئة الباغية“ افسوس اے عمار! تم کو باغی جماعت قتل کرے گی، کے الفاظ نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی بزار کی سند کے ساتھ جو ”صحیح مسلم“ کی شرط پر ہے ذکر کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعتراف کیا ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ الفاظ نہیں سنے، اسی لیے امام بخاری نے اپنی صحیح سند میں یہ الفاظ درج نہیں کیے۔ اس تحقیق کے پیش نظر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: جن احادیث میں ”تقتلک الفئة الباغية“ تم کو باغی گروہ قتل کرے گا، کی زیادتی ہے، وہ مدرج ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہیں، بلکہ راویوں نے اپنی طرف سے یہ زیادتی، حدیث میں ملا دی ہے۔ (فتح الباری ج: ۲، ص: ۱۱۲، عمدۃ القاری ج: ۴، ص: ۳۰۸) جب یہ ثابت ہو گیا کہ اصل حدیث یوں ہے: ”عمار لوگوں کو جنت کی دعوت دیں گے اور وہ ان کو دوزخ کی“ تو اس کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف متوجہ کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ مشرکین کی طرف متوجہ ہے یعنی حضرت عمار مشرکین کو جنت کی دعوت دیں گے اور وہ انہیں دوزخ کی طرف بلائیں گے۔ (مقالات سعیدی، ص: ۲۲۶)

دوسرا جواب: اگر کسی کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ جملہ بخاری میں ہے ایسے شخص کے لیے آنے والی بحث کارآمد بلکہ ان شاء اللہ کافی و شافی ہوگی۔

علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں: اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں مذکور ہے: عمار پر افسوس ہے اس کو باغی جماعت قتل کرے گی، وہ ان کو جنت کی طرف بلائے گا اور وہ اس کو دوزخ کی طرف بلائیں گے اور حضرت عمار کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گروہ نے قتل کیا تھا اور ان کو اس حدیث میں باغی اور دوزخ کی طرف بلانے والا فرمایا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان پر باغی اور دوزخ کی طرف بلانے والے کا اطلاق باعتبار ظاہر ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے، کیونکہ حقیقت میں ان کے گمان کے اعتبار سے ان کا اقدام برحق تھا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصاص کے طالب تھے

حالانکہ واقع میں ان کا یہ اجتہاد مبنی برخطا تھا کیونکہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جنگ کر رہے تھے اور وہ امیر برحق اور خلیفہ مسلمین تھے اور امیر برحق کے ساتھ جنگ کرنا بغاوت ہے اور دوزخ میں دخول کا سبب ہے اس لیے ظاہر کے اعتبار سے وہ باغی تھے اور دوزخ کی طرف بلانے والے، لیکن حقیقت میں باغی نہیں تھے کیونکہ ان کا یہ اقدام اپنے اجتہاد کی وجہ سے تھا۔ اس حدیث کی نظیر قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ”وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ“ اور آدم نے اپنے رب کی معصیت کی پس وہ بے راہ ہوئے۔ (سورہ طہ: ۱۲۱)

اس آیت میں شجرہ ممنوعہ سے کھانے پر حضرت آدم علیہ السلام پر معصیت اور غواہیت کا اطلاق بہ اعتبار ظاہر ہے، حقیقت میں وہ نبی معصوم ہیں اور ان کا شجرہ ممنوعہ سے کھانا معصیت نہ تھا، ان کے اجتہاد سے تھا، انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے تنزیہاً منع فرمایا ہے اور وہ یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے تحریماً منع فرمایا ہے اور معصیت تب ہوتی جب وہ قصداً ممنوع کام کا ارتکاب کرتے اور انہوں نے بھولے سے یہ کام کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”فَنَسِیَ وَلَمْ يَجِدْ لَهُ عَزْمًا“ پس آدم بھول گئے اور ہم نے (ان کی معصیت کا) کوئی عزم نہ پایا۔ (سورہ طہ: ۱۱۵)

لہذا قرآن مجید میں حضرت آدم کے فعل پر معصیت کا اطلاق ظاہر اور صورت کے اعتبار سے ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ معصیت نہیں ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گروہ پر باغی ہونے اور دوزخ کی طرف بلانے والے ہونے کا اطلاق ظاہر اور صورت کے اعتبار سے ہے، حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے لشکر کے متعلق بہت دعائیں کی ہیں اور ان کی فضیلت میں بہت احادیث وارد ہیں:

حضرت علی کے امیر معاویہ کے متعلق دعائیہ کلمات واحادیث:

حارث بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صفین سے واپس آئے تو آپ نے ایسی باتیں فرمائیں جو اس سے پہلے نہیں فرماتے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے لوگو!

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت کو ناپسند مت کرو، اللہ کی قسم! اگر تم نے ان کو گم کر دیا تو تمہارے کندھوں سے تمہارے سر حنظل کے پھل کی طرح گرنے لگیں گے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۸۴۳، کنز العمال، حدیث: ۳۱۷۰۴، تاریخ دمشق، ج: ۶۲، ص: ۱۰۵ تا ۱۰۶)

عبداللہ بن عروہ نے کہا: مجھے اس شخص نے خبر دی جو جنگ صفین میں حاضر تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی رات باہر نکلے، آپ نے اہل شام کی طرف دیکھ کر یہ دعا کی: اے اللہ! میری مغفرت فرما اور ان کی مغفرت فرما، پھر حضرت عمار لائے گئے تو آپ نے ان کے لیے بھی یہی دعا کی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۳۷۸۵۴)

یزید بن اصم بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنگ صفین کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ہمارے مقتول اور ان کے مقتول جنت میں ہیں اور یہ معاملہ میرے اور معاویہ کی طرف سوئپ دیا جائے گا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۳۷۸۶۹، کنز العمال، حدیث: ۳۱۷۰۰، تاریخ دمشق الکبیر، ج: ۶۲، ص: ۹۷، بیروت)

نعیم بن ابی ہند اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں، میں صفین میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھا تو نماز کا وقت آ گیا تو ہم نے بھی اذان دی اور اہل شام نے بھی اذان دی، ہم نے بھی اقامت کہی اور انہوں نے بھی اقامت کہی، پھر ہم نے نماز پڑھی اور انہوں نے بھی نماز پڑھی، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مڑ کر دیکھا تو ہمارے درمیان بھی مقتولین تھے اور ان کے درمیان بھی مقتولین تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز سے فارغ ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا: آپ ہمارے مقتولین اور ان کے مقتولین کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو ہم میں سے اور ان میں سے اللہ کی رضا اور آخرت کے لیے لڑتا ہوا قتل کیا گیا وہ جنت میں ہے۔ (سنن سعید بن منصور، حدیث: ۲۹۶۸، ج: ۲، ص: ۳۴۵، دارالکتب العلمیہ، بیروت، کنز العمال، حدیث: ۳۱۷۰۷)

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن بن عسا کر متوفی ۵۷۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت عائشہ اور حضرت اسماء حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت

کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ہاتھ بلند کر کے دعا کر رہے تھے: اے اللہ! معاویہ کے بدن کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دے، اے اللہ! دوزخ کی آگ کو معاویہ پر حرام کر دے۔ (تاریخ دمشق الکبیر، حدیث: ۳۴۸۴، ج: ۶۲ ص: ۶۵-۶۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی تمہارے سامنے اہل جنت سے ایک شخص آئے گا، پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے۔ (تاریخ دمشق، حدیث: ۱۳۴۹۹، ج: ۶۲، ص: ۷۰)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی اور برادر نسبتی (سالے) ہیں اور جی کے کاتب اور اس پر امین ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میرے لیے میرے اصحاب اور میرے سسرال والوں کو چھوڑ دو (ان کو برا نہ کہو) پس جس نے ان کو برا کہا، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی۔ (تاریخ دمشق الکبیر، حدیث: ۱۳۵۳۷، ج: ۶۲، ص: ۱۴۳)

حضرت رویم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مجھ سے کشتی لڑیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: میں تم سے کشتی لڑوں گا، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: معاویہ ہرگز کبھی مغلوب نہیں ہوگا، پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اعرابی کو پچھاڑ دیا، جنگ صفین کے دن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اگر مجھ سے اس حدیث کا پہلے ذکر کیا جاتا تو میں معاویہ سے جنگ نہ کرتا۔ (تاریخ دمشق، حدیث: ۱۳۴۶۵، ج: ۶۲، ص: ۶۱)

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس حدیث میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے جو دعا فرمائی اسی کا اثر تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسد اللہ الغالب ہونے کے باوجود حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مغلوب نہ کر سکے۔

حضرت علی کے قصاص عثمان نہ لینے کی وجوہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیں اور حضرت علیؓ خیر وقت تک قاتلین عثمان سے قصاص نہیں لے سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قصاص اسی وقت واجب ہوتا ہے جب اس کا شرعی ثبوت ہو اور شرعی ثبوت یہ ہے کہ کوئی شخص حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کا اعتراف کرتا یا اس پر دو گواہ قائم ہوتے کہ فلاں شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت تک یہ ثبوت مہیا نہیں ہو سکا، پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیسے قصاص لیتے؟ اول تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل مجہول اور نامعلوم تھے، ثانیاً: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے: مجھے سانس تو لینے دو، فتنے ختم ہو جائیں اور امن و امان قائم ہو جائے پھر میں تفتیش اور تحقیق کروں کہ قاتل فی الواقع کون ہے؟ کیونکہ اندھا قصاص تو نہیں لیا جاسکتا اور فی الفور قصاص لینا واجب نہیں ہے اور قصاص لینے میں تاخیر جائز ہے، لیکن ان پر پے در پے ایسی جنگیں مسلط کر دی گئیں کہ ان کو امن اور سکون کے ساتھ تفتیش اور تحقیق کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

حضرت امیر معاویہ کے باغی نہ ہونے پر مزید دلائل: اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جماعت صراحۃً باغی ہوتی تو وہ ان سے جنگ موقوف نہ کرتے اور کبھی تحکیم کو قبول نہ کرتے۔

حافظ اسماعیل بن عمرو بن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۷ھ روایت کرتے ہیں: سفیان بن اللیل بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کوفہ سے مدینہ آئے تو میں نے ان سے کہا: اے مؤمنین کو ذلیل کرنے والے! حضرت حسن نے فرمایا: اس طرح مت کہو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: دن اور رات کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا حتیٰ کہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حکمران بن جائیں گے، پس میں نے جان لیا کہ اللہ کا حکم نافذ ہونے والا ہے، پس میں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ میرے اور ان کے درمیان مسلمانوں کا خون بہایا جائے۔ (تاریخ دمشق الکبیر: ۱۳۵۰۲، ج: ۶۲،

ص: ۷۱، البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۶۳۴، کنز العمال، حدیث: ۳۱۷۰۸)

حافظ ابن کثیر امام بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں: صفوان بن عمرو نے بیان کیا ہے کہ اہل شام کا لشکر ساٹھ ہزار تھا، ان میں سے بیس ہزار قتل کیے گئے اور اہل عراق کا لشکر ایک لاکھ بیس ہزار تھا، ان میں سے چالیس ہزار شہید کیے گئے، اور امام بیہقی نے اس واقعے کو ”صحیح بخاری“ اور ”صحیح مسلم“ کی اس حدیث پر منطبق کیا ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دو عظیم جماعتیں باہم عظیم جنگ نہیں کریں گی، حالانکہ ان دونوں جماعتوں کا دین واحد ہوگا۔ (صحیح البخاری: ۱۲۱، صحیح المسلم: ۱۵۷) امام بیہقی نے کہا ہے کہ وہ جماعتیں اسلام کا دعویٰ کریں گی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی جنگ صفین پر منطبق ہوتی ہے۔ (دلائل النبوة، ج: ۶، ص: ۴۱۸ تا ۴۱۹، البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۶۷۳ تا ۶۷۷)

نیز حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے دو گروہ ہوں گے، ایک گروہ ان دونوں سے خارج ہو جائے گا (یعنی خوارج) اور دونوں گروہوں میں سے جو گروہ حق کے زیادہ قریب ہوگا، وہ ان خوارج کو قتل کرے گا۔

(مسند احمد، ج: ۳، ص: ۷۹، سنن سعید بن منصور: ۲۹۷۲)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: یہ حدیث نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے، کیونکہ جس طرح نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اسی طرح واقع ہوا، اور اس حدیث میں آپ نے اہل شام اور اہل عراق کے دونوں گروہوں کے اوپر اسلام کا حکم لگایا ہے۔ اس طرح نہیں جس طرح رافضی فرقہ کا زعم باطل ہے اور وہ اہل شام کو کافر قرار دیتے ہیں اور اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصحاب حق کے زیادہ قریب تھے اور یہی اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حق پر تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجتہد تھے اور ان کو اجتہاد میں خطا لاحق ہوئی اور ان کو بھی ان شاء اللہ اجر ملے گا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام برحق ہیں اور ان کو دواجر ملیں گے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

حضرت عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حاکم اجتہاد کرے اور اس کی رائے درست ہو تو اس کو دواجر ملتے ہیں اور جب اس کے اجتہاد میں خطا ہو تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔۔ (صحیح البخاری، حدیث: ۳۵۲، صحیح مسلم، حدیث: ۱۷۱۶، سنن ابوداؤد، حدیث: ۳۵۷۴، سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۳۱۲، البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۸۲، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۸ھ، بحوالہ: نعمۃ الباری، شرح بخاری، ج: ۲، ص: ۲۲۳ تا ۲۲۶)

اس اختلاف کے نتیجے میں معرکہ صفین اور فیصلہ تحکیم وغیرہ وجود میں آئے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا، دونوں جانب سے اختلافات اپنی جگہ پر قائم تھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت وجود پذیر ہوئی اور ابن ملجم نے آپ کو شہید کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد اہل عراق نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی اور شام والوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ المسلمین کی حیثیت سے قبول کر لیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کی دو جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں، ایک کی قیادت حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں میں تھی تو دوسری جماعت کی قیادت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کر رہے تھے، عین اس وقت جب دونوں جماعتیں لڑنے کے لیے مقابلے پر تھیں، بعض حضرات کی صلح کی کوششیں رنگ لائیں اور جنگ ٹل گئی، مسلمان آپس میں لڑنے اور شہید ہونے سے بچ گئے اور حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو دست بردار کرتے ہوئے خلافت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپ دی۔ اس طرح ربیع الاول ۴۱ھ میں صلح کے بعد پورے عالم اسلام کے خلیفہ تسلیم کر لیے گئے، شرق و غرب، قرب و بعد سب ان کے تابع

فرمان ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ پہنچے، بیعت لینے کے بعد آپ نے لوگوں کے سامنے ایک بڑی ہی فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ لوگوں نے اس سال کو عام الجماعة (اتحاد کا سال) کے نام سے موسوم کیا، کیوں کہ اختلاف انتشار کے بعد اس سال لوگ ایک امیر کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۱۴۸)

بحری فوج کی اجازت نہیں ملی: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوش

جہاد سے سرشار تھے، چاہتے تھے کہ اسلامی مملکت کو آفاق کے کناروں تک پھیلا دیا جائے، اسی لیے نئے نئے پروگرام بناتے رہتے تھے اور کوشش میں کوئی کمی نہیں کرتے، ان کا ایک دیرینہ خواب تھا کہ روم پر سمندری راستہ سے حملہ کر کے اسے فتح کیا جائے۔

علامہ طبری لکھتے ہیں: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہت اصرار کیا کہ انہیں سمندری راستے سے جنگ کی اجازت دی جائے۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ روم شہر حمص سے بہت قریب ہے، اتنا قریب ہے کہ حمص کے ایک بستی کے لوگ روم کے کتوں کے بھونکنے کی آواز اور مرغیوں کی بانگ سن لیتے ہیں۔ اس بات سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ متاثر ہوئے اور انہوں نے حضرت عمرو بن عاص کو لکھا کہ وہ سمندری سفر کے خدوخال اور مسافروں کا حال لکھ کر بھیجیں، کیوں کہ میں اس معاملے میں الجھن محسوس کر رہا ہوں، امیر المومنین کا حکم پا کر حضرت عمرو بن عاص نے سمندر، سمندری مسافر اور سمندری سواری کے حالات کچھ اس طور پر لکھ بھیجے:

میں نے دیکھا ہے کہ ایک بڑی مخلوق پر چھوٹی مخلوق سوار ہوئی ہے (کشتی پر انسان سوار ہوئے ہیں) اگر یہ ٹیڑھی ہو جائے تو دلوں کو پھاڑ کر رکھ دیتی ہے اور اگر ہلکورے لینے لگے تو عقلیں زائل کر دیتی ہے، اس حالت میں یقین گھٹتا رہتا ہے اور شک بڑھتا ہے، اس سفر میں لوگ ایسے ہی ہیں جیسے لکڑی پر کیڑا اگر تھوڑی ادھر ادھر ہو جائے تو یہ ڈوب جائے اور نجات پا جائے تو چمکنے لگے۔ تفصیلات معلوم ہو جانے کے بعد حضرت عمر فاروق اعظم رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا۔ نہیں ہرگز نہیں، میں کسی بھی مسلمان کو اس سفر پر نہیں بھیج سکتا۔ خدا کی قسم! مجھے ایک مسلمان کی جان روم کے تمام خزانوں سے زیادہ محبوب ہے، اب اس سلسلے میں مجھ سے دوبارہ سوال مت کرنا۔

(تاریخ طبری، ج: ۴، ص: ۲۵۸ تا ۲۵۹)

حضرت عثمان نے اجازت دی: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان بحری طاقت سے لیس ہو کر روم پر حملہ کریں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحری فوج کو وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے تھے، لیکن چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں سختی کے ساتھ منع کر دیا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلے کے آگے مجبور ہو کر رہ گئے لیکن جب حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارمانوں نے پھر کروٹ بدلی اور دربار خلافت میں عریضہ بھیجا۔

علامہ طبری لکھتے ہیں: حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلسل اجازت لینے میں لگے رہے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشروط اجازت عطا فرمائی۔ آپ نے فرمایا: میں تمہیں اجازت دیتا ہوں لیکن آپ کسی کو بحری فوج میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کریں گے اور نہ ہی قرعہ اندازی کر کے فوجیوں کا انتخاب کریں گے بلکہ معاملہ پورے طریقے سے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دینا جو خوش و خرم اس میں شامل ہو جائے اس کے ساتھ پورا تعاون کرنا، اجازت مل جانے کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحری فوج بنائی اور اس کا امیر حضرت عبداللہ بن قیس جاسی کو متعین کیا، حضرت عبداللہ بن قیس نے شاتیہ اور صائفہ کے درمیان پچاس غزوے بحری راستہ سے لڑے اور آپ کا کوئی آدمی ڈوب کر ہلاک نہیں ہوا۔ (تاریخ طبری، ج: ۴، ص: ۲۶۰)

علامہ علی محمد الصلابی لکھتے ہیں: جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت

امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا: مجھے خوب معلوم ہے کہ تم نے حضرت عمر سے اجازت چاہی تھی انہوں نے منع فرمایا، میں تمہیں کیسے اجازت دے دوں؟ پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوبارہ دربار خلافت کو خط لکھا اور بحری راستے سے: قبرص، پر جہاد کرنے کو کافی ہلکا کر کے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش کیا۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں اس شرط پر اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے ساتھ اپنی بیوی کو بھی اس پر سوار کرنا، اور کسی کو مجبور مت کرنا، لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دینا جو چاہے اس میں شریک ہو اور نہ چاہے نہ ہو۔ اجازت ملتے ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت تیزی کے ساتھ قبرص فتح کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ساحلی علاقے والوں کو لکھا کہ وہ بحری سوار یوں کو تیار کریں اور انہیں عکہ کے ساحل پر پہنچائیں۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۵۴)

قاضی محمد عبداللہ ابوبکر بن عربی مالکی کی کتاب ”العواصم من القواصم“ کے محشی محب الدین خطیب کتاب کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اسلامی بحری جہازوں کا بیڑا بنانے کے بارے میں سب سے پہلے جس نے سوچا وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ بحری جنگی بیڑا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں بنایا گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کے والی تھے۔ اس بحری بیڑے کا استعمال قبرص کو فتح کرنے کے لیے کیا گیا، مسلمانوں نے قبرص پر حملہ کیا اور اہل شہر جزیرہ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ (حاشیہ العواصم من القواصم، ص: ۱۱۷)

حضرت معاویہ کی عظیم فضیلت: اسلامی تاریخ میں پہلا بحری بیڑا بنانا جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیاسی بصیرت، دور بینی، جہاں بانی، ملک گیری و ملک رانی کے جوہر کو واضح کرتا ہے، وہیں ان کے دامن میں ایک عظیم فضیلت کو بھی جمع کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف کی یہ حدیث پاک:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت ام حرام بنت ملحان کے پاس جایا کرتے تھے (وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضاعی خالہ تھیں۔ نعمۃ الباری، ج: ۵، ص: ۶۵۲) وہ آپ کو طعام پیش کرتی تھیں اور حضرت ام حرام حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، پس ایک دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے پاس گئے تو انہوں نے آپ کو کھانا کھلایا اور وہ آپ کے سر سے جوئیں دیکھنے لگیں، پس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سو گئے پھر آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے حضرت ام حرام بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو کیا بات ہنسارہی ہے؟ آپ نے فرمایا: میری امت کے کچھ لوگ مجھ پر پیش کیے گئے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس طرح جہاد کر رہے تھے کہ وہ سمندر کے وسط میں تختوں پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جس طرح بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوتے ہیں یا ان کی مثال ان بادشاہوں کی طرح تھی جو تختوں پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں اسحاق کو شک ہے، حضرت ام حرام نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مجاہدین میں سے کر دے، پس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا کی، پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا سر رکھ دیا (اور سو گئے)، پھر آپ (دوبارہ) ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میری امت کے کچھ لوگ میرے سامنے اس طرح پیش کیے گئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں، جس طرح آپ نے پہلی بار فرمایا تھا، حضرت ام حرام بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مجاہدین میں سے کر دے، آپ نے فرمایا: تم پہلے مجاہدین میں سے ہو، پس وہ حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں سمندری سفر پر روانہ ہوئیں، پھر جب (واپسی میں) وہ سمندر سے باہر آئیں تو ان کی سواری نے ان کو نیچے گرا دیا، پس وہ جاں بحق ہو گئیں۔ (صحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للرجال والنساء)

حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ المہلب لکھتے ہیں:

اس حدیث سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں سمندری راستے سے پہلا جہاد کیا تھا، جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں بشارت دی تھی اور جن لوگوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پرچم تلے جہاد کیا تھا، ان کو رسول اللہ نے اولین قرار دیا۔ اہل سیرت نے لکھا ہے کہ یہ مجاہدین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تھے۔ الزمیر بن ابی بکر نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے قبرص کی طرف جہاد کیا تھا اور ان کے ساتھ حضرت ام حرام تھیں، جو حضرت عبادہ بن الصامت کی زوجہ تھیں، جب وہ سمندری سفر سے واپسی میں بحری جہاز سے اتریں تو خنجر پر سوار ہوئیں اور اس سے گر کر شہید ہو گئیں۔ ابن الکلبی نے بیان کیا ہے کہ یہ غزوہ اٹھائیس ہجری میں ہوا تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے راستے میں مرنا شہادت ہے، کیونکہ امام ابن ابی شیبہ نے ابوالجفاء سلمیٰ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ (سیدنا) محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا گیا یا مر گیا تو وہ جنت میں ہوگا۔ (شرح ابن بطل، ج: ۵، ص: ۱۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ، بحوالہ: نعمۃ الباری، ج: ۵، ص: ۶۵۳، ۶۵۴)

اعتراف اسلاف: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدائے تعالیٰ نے جو عظمت شان بخشی تھی اس کا اعتراف اصحاب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کھلے دل کے ساتھ کیا کرتے تھے، ہم اپنے دعوے کو مبرہن کرنے کے لیے ذیل میں چند جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے اقوال پیش کر رہے ہیں۔

حضرت علی کا فرمان: جس وقت امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ صفین سے واپسی کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: لوگو! معاویہ کی امارت کو

نا پسند نہ کرو جس دن معاویہ دنیا سے چلے جائیں گے تم دیکھو گے کہ سرکاندھوں سے حنظل پھل کی طرح بڑی تیزی سے گر رہے ہوں گے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۰)

حضرت عمیر کا فرمان: ایک موقع پر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حمص کے امیر عمیر بن سعد کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منتخب فرمایا، اس پر لوگوں نے (بطور طعن) کہا کہ حضرت عمر نے عمیر کو معزول کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو والی بنایا ہے، یہ سن کر حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: معاویہ کا ذکر جب بھی کرو تو خیر کے ساتھ کیا کرو کیوں کہ میں نے خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے ”اللہم اھد بہ“ اے اللہ! معاویہ کے ذریعے ہدایت نصیب فرما۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۴۳، کتاب المناقب، باب مناقب معاویہ)

حضرت ابن عمر کا نظریہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑا کوئی دوسرا سردار نہیں دیکھا۔ یہ سن کر حضرت جبلہ نے پوچھا: کیا آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی ان جیسا نہیں پایا؟ حضرت ابن عمر نے جواب دیا ”حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر تھے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے بڑے سردار تھے۔ دوسری روایت میں ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد معاویہ سے بڑا سردار نہیں دیکھا۔ کہا گیا: حضرت ابوبکر کو بھی نہیں دیکھا؟ آپ نے جواب دیا: ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم معاویہ سے بہتر تھے لیکن سرداری میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے بڑھ کر تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۸)

حضرت ابن عباس کا نظریہ: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر کسی کو بادشاہت کے لائق نہیں دیکھا۔ (ایضاً: ۴۳۹)

بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے عرض کیا گیا کہ آپ امیر المومنین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں کہ وہ و تر ایک

رکعت پڑھتے ہیں، آپ نے جواب دیا وہ جو کر رہے ہیں درست ہے کیوں کہ وہ فقیہ ہیں۔
(حدیث نمبر: ۳۷۶۵، کتاب المناقب باب ذکر معاویہ)

حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تعزیتی کلمات ارشاد فرمائے، جس میں آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو غم سے بچائے، امام حسن سے متعلق آپ کے غم کو دور فرمائے اور تمہیں بے یار و مددگار نہ چھوڑے۔ اس پر حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب تک میرے لیے امیر المومنین (حضرت معاویہ) کو زندہ رکھے گا تب تک اللہ تعالیٰ مجھے ہر غم و فکر اور پریشانی سے محفوظ رکھے گا۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج: ۲۵، ص: ۶۸)

حکومت کے کاموں میں مشغولیت: آپ پڑھ چکے ہیں، ۴۱ھ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری سلطنت اسلامیہ کے امیر و خلیفہ تسلیم کر لیے گئے، اب ان کے سامنے صرف اور صرف اسلامی مملکت کو وسعت و استحکام دینا، مسلمانوں کے دینی اور دنیوی حقوق کی سلامتی فراہم کرنا اور امن و امان قائم کرنا تھا اس مقصود کے حصول کے لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن و رات کوشاں رہتے تھے۔ ڈاکٹر صلابی آپ کے نظام حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی داخلی سیاست جن بنیادوں میں قائم تھی ان میں سے خاص طور پر حکومتی امور کو بنفس نفیس خود ملاحظہ فرمانا تھا۔ وہ ہر چھوٹی بڑی چیز پر خود نگاہ رکھنا چاہتے تھے، اگرچہ ان کے پاس حکومتی امور کے ماہر افراد کی ٹیم موجود تھی مگر پھر بھی وہ اسی پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ از خود انہوں نے اپنا پورا وقت اور تمام تر کوششیں حکومت کے استحکام اور رعایا کی مصلحتوں کی نگرانی کے لیے وقف کر دی تھیں۔

(معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۴۴)

حضرت امیر معاویہ کا دربار: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دن و رات میں پانچ مرتبہ الگ الگ مقاصد کے لیے لوگوں کے سامنے تشریف لاتے تھے، نماز فجر کے

فوراً بعد، وہ ان لوگوں سے ملاقات کرتے جو ان کو واقعات، حکایات، اور قصص سناتے، جب اس کام سے فارغ ہو جاتے تو اندر تشریف لے جاتے قرآن شریف پیش کیا جاتا تو قرآن کریم کے ایک حصے کی تلاوت فرماتے پھر اپنے گھر تشریف لے جاتے گھر والوں کو امر و نہی کرتے اور چار کعت نماز ادا کرتے اور دوبارہ اپنی مجلس میں تشریف فرما ہو جاتے، یہ خاص لوگوں کا اجلاس ہوتا، اس میں اپنے خاص مصاحبین سے گفتگو فرماتے، اسی درمیان ان کے وزرا بھی تشریف لاتے اور پورے دن کے کام کاج کے سلسلے میں گفتگو کرتے۔ پھر بطور ناشتہ ان کے لیے رات کا بچا ہوا کھانا پیش کیا جاتا، اسے تناول فرماتے اور کافی دیر تک محو گفتگو رہتے پھر کچھ دیر کے لیے گھر چلے جاتے جب باہر نکلتے تو کرسی لگانے کا حکم دیتے اور اس پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور پہرے دار آفس کے پاس کھڑے رہتے۔ اب آپ کے پاس فریادی اپنی اپنی فریاد لے کر حاضر ہوتے، ان میں کمزور، ضعیف، عورتیں، بچے اور اعرابی ہوتے، جس پر ظلم ہوتا اس سے ظلم دفع کرنے کا حکم دیتے، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے اور فریادی لوگوں کی فریاد کو پہنچتے اور ان کی غم خواری کرتے، جب کوئی فریادی باقی نہ رہتا تو آپ اپنے تخت پر بیٹھ جاتے اور حکم فرماتے: لوگوں کو ان کے مراتب کے اعتبار سے میرے پاس آنے دو، جب یہ قدر و منزلت والے حضرات داخل ہوتے تو آپ اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی کے سلام کا جواب باقی نہ رہ جائے۔ جب خیر و عافیت کے تبادلے کرتے ہوئے لوگ بیٹھ جاتے تو آپ ان سے فرماتے: تمہیں اشراف (قدر و منزلت والے خاص لوگ) اس لیے کہا جاتا کہ تمہاری خاص مجلس کے ذریعے عزت افزائی کی گئی، ہر انسان کو اس میں شریک نہیں کیا جاتا۔ لہذا تمہارا فرض منصبی ہے کہ ہر اس انسان کی حاجت و فریاد مجھ تک پہنچاؤ جو از خود مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر یہ اشراف لوگوں کی حاجتیں اور خبریں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور پیش کرتے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو پورا فرماتے۔ اس کے بعد دو پہر کا کھانا لگایا جاتا آپ دسترخوان پر بیٹھ جاتے، اس دوران فریادی اپنی فریاد سناتے رہتے، فریادی جب تک آپ

سے بات کرتے آپ ان کو ساتھ میں کھانا بھی کھلاتے، کھانا کھاتے کبھی کبھی آپ کی ملاقات کا سلسلہ چالیس لوگوں تک دراز ہو جاتا۔ آپ دسترخوان سے اٹھتے دربار برخواست ہو جاتا لوگ وہاں سے چلے جاتے اور حضرت خود بھی گھر تشریف لے جاتے پھر ظہر تک کوئی ملاقاتی آپ کے پاس حاضر نہیں ہوتا۔

ظہر کی اذان ہوتی آپ نماز کے لیے تشریف لاتے بعد نماز ظہر انخاص الخواص حضرات سے ملاقات فرماتے اور موسم کے مطابق اشیائے خوردنی سے ان کی ضیافت فرماتے، اس دوران وزراء مملکت بھی حاضر ہوتے رہتے اور اپنے اپنے کاموں کو سمجھتے رہتے، یہ سلسلہ عصر تک جاری رہتا، عصر کی نماز سے فارغ ہو کر آپ گھر تشریف لے جاتے پھر کوئی آپ سے ملاقات نہیں کرتا یہاں تک کہ عصر کا آخری وقت آ جاتا اور آپ گھر سے باہر تشریف لاتے اور اپنے تخت پر تشریف فرما ہو جاتے پھر آپ لوگوں سے حسب مراتب ملاقات فرماتے اور مغرب سے پہلے ہی کھانا کھا لیتے، کھانا کھا کر مغرب کی نماز ادا کرتے پھر چار رکعت نفل ادا کرتے، جس میں آپ پچاس آیتوں کی تلاوت فرماتے اس میں کبھی کبھی آپ جہر سے بھی قرأت کرتے اس سے فارغ ہو کر آپ گھر تشریف لے جاتے پھر عشا تک آپ سے کوئی ملنے نہیں آتا، عشا کی نماز کے لیے باہر تشریف لاتے، نماز سے فراغت پا کر خاص لوگوں سے ملتے، انخاص الخواص سے بھی ملتے، اور وزیروں و حاشیہ برداروں سے بھی ملاقات کرتے۔ خاص کروڑاں آپ سے اپنے رات کے کاموں کے متعلق مشورہ کرتے پھر تنہائی رات تک اخبار عالم پر گفتگو ہوتی، جس میں عرب و عجم کی حالیہ اور ماضیہ سیاست پر گفتگو ہوتی، بادشاہوں کے انداز حکومت پر تبصرہ ہوتا، اقوام عالم کی سیرت و کردار اور جنگ و جدال کا تذکرہ ہوتا، بادشاہان عالم کا ان کی رعایا کے ساتھ سلوک زیر بحث لایا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اہل خانہ کی طرف سے خورد و نوش کے لیے کچھ پیش کیا جاتا اس سے فارغ ہو کر آپ گھر تشریف لے جاتے اور سو جاتے جب تین حصہ رات گزر جاتی تو آپ بیدار ہوتے (ضروری چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد) تاریخی دفاتر آپ کے سامنے

پیش کیے جاتے۔ آپ کے وہ خدام جنہیں آپ نے اس خدمت کے لیے رکھ چھوڑا تھا کہ وہ اس کو حفظ کریں اور سنائیں، وہ اپنی ذمہ داری کو نبھاتے اور آپ کو تاریخ پڑھ کر سناتے، یہ سلسلہ فجر تک چلتا رہتا پھر حسب معمول سابق نئے دن کی شروعات ہوتی۔

(معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۴۵)

قیام امن کے لیے وسائل کا انتخاب: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس بات کے دل سے خواہاں تھے کہ ان کی حکومت کی بنیادیں امن و امان پر قائم ہوں، اسلامی مملکت کا کوئی گوشہ امن و امان سے خالی نہ ہو اس کے لیے انہوں نے بہت سارے وسائل کا استعمال فرمایا، جن میں سے ہم چند کو یہاں ذکر کر رہے ہیں:

پہرے داری کا انتظام: رعایا بھی سلامت رہ سکتی ہے جب ان کا خلیفہ سلامت رہے، اس لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی حفاظت کے لیے خاص حاجب متعین کیے تھے، اس طریقے پر حاجبین کا انتخاب کرنے والے آپ اسلام کے پہلے خلیفہ ہیں، مخالفین کی سرکشی سے بچنے کے لیے آپ کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ خارجی آپ کی تاک میں تھے، یہ خارجی آپ سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر چکے تھے چوں کہ آپ کا دار السلطنت ملک شام، روم سے قریب ہی تھا لہذا رومیوں سے حفاظت بھی آپ کے لیے سخت ضروری تھی، اس لیے آپ نے مقصورات (ایک خاص قسم کی عمارت) تعمیر کرائے، رات کی پہرے داری کا بھی انتظام کیا اور پولس کا خاص انتظام فرمایا، جب آپ نماز ادا کرتے تو پولس آپ کی پہرے داری کرتی۔

پولس کا عمدہ انتظام: امن و امان کو عمدہ طور پر قائم کرنے، نظام حکومت کو بہتر طریقے پر چلانے، چوروں، مجرموں اور مفسدین کی دھڑ پکڑ کے لیے آپ نے محکمہ پولس کو مضبوط کیا، خلیفہ کی حفاظت بھی محکمہ پولس کا ایک مقصد تھا لیکن خارجی حملہ کو روکنا پولس کی ذمہ داری میں شامل نہ تھا۔ پہلے پہل تو اس محکمہ کو شام میں منظم کیا گیا پھر اس کو وسعت دی گئی اور اس کی ذمہ داریاں دار الخلافہ کے ساتھ ساتھ دیگر بلاد مسلمین تک پھیل گئیں، پولس

حاکم شہر کے ماتحت کام کرتی تھی اور یہی لوگ پولس کی بھرتی کے لیے لوگوں کا انتخاب بھی کرتے تھے، پولس کا خاص استعمال سرکشوں سے نپٹنے، شورشوں کو کچلنے اور بدامنی کو دور کرنے کے لیے کیا جاتا تھا، اس حیثیت سے یہ شعبہ معاشرے کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ اس کے ذریعے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی تھی اور جرائم پیشہ لوگوں کی زیادتیوں سے لوگ محفوظ ہو جاتے تھے، پولس کے بعض افسران کو کچھ داخلی و خارجی اہم ذمہ داریاں بھی سونپی جاتی تھیں۔

حسن انتخاب: رب تبارک و تعالیٰ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خوبی بھی بخشی تھی کہ وہ لوگوں کو پہچاننے میں دھوکا نہیں کھاتے تھے بلکہ وہ معاشرے کے قابل، بھروسہ مند، تجربہ کار، ملک رانی کے ماہر اور عقل و فہم میں ممتاز لوگوں کی خاص شناخت رکھتے تھے، اسی خوبی کی وجہ ان کے پاس وقت کے چیدہ چیدہ اور کار آزمودہ افراد کا اجتماع ہو گیا تھا، حضرت عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ جیسے حضرات اس کی بہترین مثال ہیں۔

نرمی اور سختی کا امتزاج: ان کی خلافت کی پائیداری کی ایک بڑی وجہ نرمی اور سختی کا سنگم تھا، نہ تو وہ ہر وقت سختی پر اڑے رہتے اور نہ لوگوں کو اتنی چھوٹ دیتے کہ مطلق العنان ہو جائیں، انہوں نے اپنے ایک حاکم کو لکھا تھا کہ ہم اور تم لوگوں کو ایک ڈنڈے سے نہیں ہانک سکتے بلکہ طریقہ کار یہ رکھنا ہوگا کہ اگر میں سختی برتوں تو تم نرمی سے کام لو اور اگر تم نرمی اپناؤ تو میں سخت ہو جاؤں، آپ کا یہی نظریہ ان اقوال میں نظر آتا ہے جن کا قائل آپ کو بتایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کہتے تھے کہ جب تک زبان سے کام چلتا ہے میں کوڑے کا استعمال نہیں کرتا اور جب کوڑے سے معاملہ سنبھل جائے تو تلوار کا استعمال نہیں کرتا اور جہاں تلوار ہی ضرورت ہو تو تلوار کا استعمال ضروری ہے۔

محکمہ سراغ رسانی: محکمہ سراغ رسانی کی اہمیت ہر زمانے میں مسلم رہی ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا خاص اہتمام فرمایا، وہ اس شعبے کو خود اپنی نگرانی میں رکھتے تھے اس لیے یہ شعبہ بہت مضبوط ہو گیا اور ایک ایسا خفیہ نظام قائم ہو گیا تھا

کہ رعایا اور حکمران دونوں پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر بنی رہتی تھی، قرب و بعد میں کوئی بھی عامل ہو یا فوج کا ذمہ دار افسر ہر ایک ان کے جاسوس کی زد میں تھا بلکہ اس نظام نے دشمنوں کے شہروں پر اپنی پکڑ بنا رکھی تھی، اس نظام کی مضبوطی کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے دشمن بازنطینیوں نے جب اپنے ملک میں بادشاہ روم کے سامنے ایک مسلمان قیدی کو تھپڑ مارا، اس وقت قیدی نے پکارا تھا: آہ اسلام! اے معاویہ! تم کہاں ہو؟ یہ پورا واقعہ ہو بہو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچ چلا گیا۔ اس کا ذکر ہم ان شاء اللہ آگے کریں گے۔

مشتبہ لوگوں کی سخت نگرانی: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ہی ہوشیار حکمران تھے، وہ کبھی بھی اپنی حکومت سے غافل نہیں ہوتے تھے، اگر کوئی ایسا انسان ان کی نظر میں آتا جو ان کی نظر میں حکومت کی پائیداری کو نقصان پہنچا سکتا تھا تو وہ اس پر کڑی نظر رکھتے تھے، جیسے کہ زیاد نامی ایک شخص حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا، ان کی خلافت سے بچنے کے لیے اس نے ملک فارس کو اپنی پناہ گاہ بنالیا تھا، اس کو پہلے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اطمینان دلا کہ اسلامی ملک میں واپسی پر راضی کیا پھر اس کی طلب پر کوفہ رہنے کی اجازت بھی دے دی، لیکن کبھی بھی اس کو لے کر آپ غافل نہیں ہوئے بلکہ اس سلسلے میں آپ نے والی کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کو احتیاطی فرمان جاری کر رکھا تھا۔

اسلامی لشکر کا قیام: آپ نے شام کی گورنری سنبھالنے کے بعد ایک مضبوط اسلامی لشکر کی تشکیل کا کام بھی شروع کر دیا (اس میں ان کی بحری فوج خاص طور پر قابل ذکر ہے) اس لشکر سے اسلام کو خوب فائدہ پہنچا اور اسلامی سرحدوں کو وسیع کرنے میں اس لشکر نے نمایاں اور بے مثال خدمات انجام دیں۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۵۶)

معاویہ اور رائے کی آزادی: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نظام حکومت نہایت عادلانہ اور منصفانہ تھا انہوں نے طاقت کا بے جا استعمال کر کے لوگوں کے منہ پر مہر نہیں

لگائی تھی بلکہ ان کے دربار میں لوگوں کو اپنی بات رکھنے کی پوری اجازت ہوتی تھی بعض دفعہ بولنے والے اپنے لہجے اور الفاظ میں شدت اختیار کرتے تب بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی بات پورے تحمل کے ساتھ سنتے، نہ یہ کہ ان کو کوڑے لگوا کر دربار سے نکلوا دیتے۔

ابو مسلم خولانی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے اور سلام کیا، مگر سلام میں جن الفاظ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خطاب کیا، وہ عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ قابل غضب بھی تھے آپ نے کہا: ”السلام علیک ایہا الاجیر“ جو لوگ اس وقت مجلس میں موجود تھے انہوں نے کہا: اجیر مت کیسے امیر کیسے، یہ اجیر نہیں بلکہ امیر ہیں، دوبارہ پھر ابو مسلم نے انہیں الفاظ کے ساتھ سلام کیا (پہلی مرتبہ خطا قرار دی جاسکتی تھی لیکن اب تو اس کی کوئی گنجائش نہ بچی تھی) پھر لوگوں نے وہی بات دہرائی، اس پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ابو مسلم جو کہہ رہے ہیں انہیں کہنے دو، اس لیے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے اچھے طریقے سے سمجھ بھی رہے ہیں۔ ابو مسلم نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ آپ کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کو کسی نے مزدوری پر اپنے گھرنو کر رکھا اور اس کے حوالے اپنے جانور کر دیئے لیکن یہ شرط لگا دی کہ اگر وہ اچھے طریقے سے ان کی نگہداشت کرے گا اور بہتر طریقے پر انہیں چرائے گا تو اسے اس کا معاوضہ دیا جائے گا، اب اگر وہ شخص اس شرط کو پورا کرتا ہے، اچھی چرائی سے جانوروں کے گوشت اور دودھ میں اضافہ کرتا ہے، کمزوروں کو فربہ کر دیتا ہے تو اس کا مالک اس کی مزدوری اسے دیتا ہے اور کچھ اپنی طرف سے بطور انعام بھی دیتا ہے اور اگر یہ مزدور محنت نہیں کرتا، جانوروں کو اچھے طریقے سے نہیں چراتا، دودھ سکھا دیتا ہے، گوشت گھٹا دیتا ہے اور کمزوروں کو ہلاک کر دیتا ہے تو مالک بجائے اجر کے اس کو سزا دیتا ہے، یہ سن کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ماشاء اللہ۔

(تاریخ مدینہ دمشق، ج: ۲، ص: ۲۲۳، سیر اعلام النبلاء، ج: ۴، ص: ۱۳)

قارئین غور کر سکتے ہیں کہ بھرے دربار میں ابو مسلم خولانی نے کس طرح حضرت

امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نظام حکومت بہتر ڈھنگ سے چلانے کی تاکید کی، عدل و انصاف پر ابھارا، انہیں اپنی حکومت سے متعلق مکمل جواب دار بنایا، حکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضری کے وقت ثواب و عتاب کو بیان فرمایا، ان کو کھلے الفاظ میں اجیر اور نوکر گردانا لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لب پر حرف شکایت لائے بغیر ان کو سنتے بھی رہے اور ماشاء اللہ کہہ کر ان کی نہ صرف تائید کی بلکہ تحسین فرمائی، یہ رعایات وہی دیتے ہیں جو لوگوں کی زبان پر تالے نہیں لگاتے بلکہ انہیں حق بولنے کی مکمل آزادی عطا کرتے ہیں۔

لوگوں کی ضروریات کا خیال: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہر وقت اپنے دل میں بسائے رکھتے تھے وہ والی مملکت ہونے کی ذمہ داری سے کما حقہ آگاہ تھے اس لیے لوگوں کی ضروریات کا خاص اہتمام فرماتے، لوگوں کی ملاقات سے اپنے آپ کو پردے میں نہیں رکھتے تھے، خاص کر جب آپ کو اس حدیث کا علم ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس شخص کو لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری سونپی گئی پھر اس شخص نے لوگوں سے ملنے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے درمیان آڑ بنالی تو اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اس کی ضرورتوں کے بیچ پردہ حائل فرما دے گا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باضابطہ لوگوں کی ضرورتیں ان تک پہنچانے کے لیے ایک شخص کو متعین کر رکھا تھا تا کہ ضرورت مند کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، مدینہ شریف کا عامل آپ کے پاس جب ڈاک بھجواتا تو پہلے مدینہ طیبہ میں ندا کرتا کہ اگر کسی کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کوئی پیغام پہنچانا ہو تو لکھ کر دے۔ (معاویہ بن ابوسفیان، ج: ۱، ص: ۲۶۱)

مساجد اور چشموں کا انتظام: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی مملکت میں مساجد کو عمدہ بنانے، اچھا انتظام کرنے اور ان کی توسیع کرنے کی طرف خاص توجہ فرمائی، آپ کے حکام نے آپ کے حکم سے مختلف دیار و امصار میں ضرورت کے مطابق مساجد کی تزئین کی، نمازیوں کو سہولیات فراہم کیں اور قدیم عمارات میں توسیعات کو انجام دیا، خاص کر مسجد حرام میں آپ کے حکم سے توسیع کی گئی، بیت المال کے خرچ پر مسجد

حرام میں بہترین قندیلیں لگائی گئیں، طواف کرنے والوں کے لیے روشنی کا عمدہ انتظام بھی کیا گیا، مسجد اقصیٰ پر بھی آپ نے خاص توجہ صرف کی، کوفہ کی جامع مسجد کی توسیع عمل میں لائی گئی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں رفاہی کام بھی خوب انجام دیے، مدینہ طیبہ میں پینے کے پانی کی فراوانی کی گئی، مکہ شریف میں پانی کے چشمے جاری کروائے گئے۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۶۲)

حجاج کرام اور روزہ داروں کے لیے کھانے کا انتظام: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ شریف میں باضابطہ مطبخ کا قیام فرمایا، یہ مطبخ اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ قائم کیا گیا تھا، مطبخ میں بنا ہوا کھانا حجاج کرام اور ماہ رمضان کے صائمین کے لیے وقف تھا۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۶۲)

علمی خدمات: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تہذیبی ثقافتی ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے، اس کے لیے آپ نے حکام وقت، علمائے کرام اور امت کے جلیل القدر افراد کی خوب حوصلہ افزائی فرمائی، ان کا زمانہ علوم اسلامیہ جیسے علوم قرآن، تفسیر، فقہ، عقیدہ وغیرہ کی ترقی پر خود ایک بہترین گواہ ہے، ان کے زمانے میں متعدد ایسے علماء پیدا ہوئے جن کے علوم، اجتہادات اور ان کے زریں اقوال سے آج تک اہل اسلام استفادہ کر رہے ہیں، علوم قرآن، سنت نبویہ، فقہ اور لغت تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے مرکز توجہ تھے ہی لیکن ان کے سوا علوم کا بھی آپ کے زمانے میں بہتر اہتمام کیا گیا۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۶۳)

علم تاریخ: عربی زبان میں سب سے پہلے تاریخ مدون کرنے کا سہرا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر بندھا ہے، آپ اسلام کے سب سے پہلے سپوت ہیں، جنہوں نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا، خیال رہے کہ یہاں تاریخ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات یا انبیائے سابقین کے واقعات مراد نہیں اور نہ ہی ایام عرب اور انساب مراد ہیں بلکہ یہاں تاریخ سے مراد گزشتہ امتوں کی تاریخ گزرے ہوئے بادشاہوں کی سیرت

اور جنگی داستانیں ہیں۔ (معاویہ بن ابوسفیان، ج: ۱، ص: ۲۶۳)

حضرت امیر معاویہ کی اہم صفات: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبت پائی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کتابت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، اس منصب پر رہنا اس بات کی دلیل کافی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کے حاضر باش تھے، اس حاضری نے آپ کو فضائل و مناقب میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔ شارحین حدیث نے آپ کا تعارف کراتے وقت صاحب فضائل جمہ (کثیر فضائل والے) جیسے الفاظ کا استعمال فرمایا ہے۔

علامہ عبدالعزیز بن احمد لکھتے ہیں: امام قسطلانی نے شرح بخاری میں آپ کو ذوالمناقب الجمہ لکھا، شرح مسلم میں آپ کو عادلین فاضلین اور چندہ صحابہ میں شمار فرمایا۔ امام یافعی نے فرمایا: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حلیم، کریم، ملک رانی کے ماہر، عقلمند، ہوشیار اور بردباری میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے، انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا خدائے تعالیٰ نے انہیں خلافت ہی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ (الناہیۃ، عن طعن امیر المؤمنین معاویہ، ص: ۴۳)

آپ مجتہد تھے: بخاری شریف میں حضرت ابن ابی ملیکہ سے روایت ہے، حضرت ابن عباس سے عرض کیا گیا: آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ وہ صرف ایک رکعت نماز وتر پڑھتے ہیں، حضرت ابن عباس نے جواب دیا: ”أصاب انه فقیہ“ معاویہ درستی پر ہیں کیونکہ وہ فقیہ ہیں۔ شارحین حدیث نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجتہد ہیں۔ بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی طرح کے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”دفعانہ“ صحب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ ان سے متعلق کچھ نہ کہو کیونکہ وہ حضور کے صحابی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے، علمی وسعت کی وجہ سے حضرت ابن عباس کو بحر، جبر اور ترجمان قرآن جیسے معظم القاب سے یاد

کیا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ شان ہے کہ ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ”اے اللہ انہیں علم و حکمت اور تاویل عطا فرما“ بے شک حضور کی دعا قبول ہوئی (اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہر دعا قبول ہی ہوتی ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بڑے معتمد اور خاص تھے، ان کے دشمنوں پر بڑے سخت تھے، حضرت علی نے خارجیوں سے مناظرہ کرنے کے لیے حضرت ابن عباس ہی کو بھیجا تھا اور حضرت ابن عباس نے انہیں لا جواب کر دیا تھا، یہ حیدر امت اور ترجمان قرآن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم و فضل کی گواہی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ مجتہد ہیں تو ماوشما کی کیا حیثیت۔ (الناہیہ، ص: ۴۱)

آپ کے اجتہاد پر اعتماد: دور صحابہ میں آپ کو فقیہ تسلیم کیا گیا اور بعد کے ادوار میں بھی فقہاء آپ کے اجتہاد پر اعتماد کرتے رہے، اور اس کو کتابوں میں لکھتے رہے۔ صاحب الناہیۃ لکھتے ہیں: ”فقہاء آپ کے اجتہاد پر اعتماد کیا کرتے ہیں اور اپنی کتابوں میں ان کے اجتہاد کو ذکر بھی کرتے ہیں جیسے کہ فقہاء میراث کا ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”وذهب معاذ بن جبل و معاویۃ و سعید بن المسیب الی ان المسلم یرث الکافر“ حضرت معاذ بن جبل حضرت امیر معاویہ اور حضرت سعید بن مسیب کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان کافر کی میراث پائے گا، اس میں صحابی رسول حضرت معاذ کے ساتھ ساتھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا نام اور ان کا مذہب بھی ذکر کیا گیا۔ (الناہیہ، ص: ۵۷)

روایت حدیث: امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے احادیث روایت فرمائی ہیں، ساتھ ہی اپنی بہن ام المومنین ام حبیبہ سے بھی روایت کی ہے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی آپ روایت فرماتے ہیں۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۲۰)

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ۱۶۳ احادیث روایت کی ہیں، چار پر امام بخاری و مسلم کا اتفاق ہے،

امام بخاری آٹھ اور امام مسلم پانچ میں منفرد ہیں۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے حافظ صفی الدین احمد بن عبد اللہ خزرجی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک سو تیس احادیث مروی ہیں، جن میں سے چار حدیثوں پر امام بخاری اور امام مسلم متفق ہیں، امام بخاری چار حدیثوں کے ساتھ منفرد ہیں، امام مسلم پانچ حدیثوں کے ساتھ منفرد ہیں۔ (خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال، ج: ۳، ص: ۱۱۰، بحوالہ نعمۃ الباری، ج: ۶، ص: ۸۹۴)

ڈاکٹر علی محمد محمد الصلابی نے آپ کی مرویات ۱۶۳ تحریر کی ہیں اور یہی تعداد علامہ ذہبی نے بھی سیر اعلام النبلاء میں درج فرمائی ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۶۲، معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۳۱)

تبلیغ کا جذبہ: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بہت مشہور فرمان ہے ”فلیبلغ الشاہد منکم الغائب“ جو میری مجلس میں موجود ہے وہ میری باتیں اس تک پہنچا دے جو مجلس میں موجود نہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پر کس شان کے ساتھ عمل کرتے تھے؟ بخاری شریف کی حدیث پاک سے ملاحظہ کریں:

حضرت سہل بن حنیف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منبر پر بیٹھے ہوئے دیکھا کہ مؤذن نے اذان دی، مؤذن نے

”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کہا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی جواب دیتے ہوئے ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کہا، جب مؤذن نے ”اشہد ان لا الہ الا اللہ“ کہا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ”اشہد ان لا الہ الا اللہ“ کہا، مؤذن نے ”اشہد ان محمداً رسول اللہ“ کہا تو آپ نے اس کا بھی جواب دیا، جب مؤذن نے اذان مکمل کر لی تو آپ نے فرمایا: ”اے لوگو! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اذان پڑھی گئی تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جگہ میں بھی پڑھتے ہوئے دیکھا ہے جو تم نے

مجھ سے سنا ہے۔ (صحیح البخاری کتاب الجمعہ، باب یحبیب الامام علی المنبر اذا سمع النداء)

آپ کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی تھی کہ لوگوں کو خیر کی طرف راغب کیا جائے اور دین کی سمجھ کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس کی ایک مثال بخاری شریف کی آنے والی یہ حدیث ہے:

حمید بن عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ فرما رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تبارک و تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرمادیتا ہے، بے شک میں تقسیم کرنے والا ہوں اور خدا عطا فرماتا ہے، بے شک یہ امت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم رہے گی، امت کے مخالفین امت کو ضرر نہ دے سکیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے۔ (صحیح البخاری کتاب العلم باب من یرد اللہ بہ خیرا)

سنت سیکھنے کا جذبہ: ایک طرف آپ خود صحابی ہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بالمشافہ احادیث سماعت کی ہیں پھر بھی طلب سنت، شوق علم اور تعلم حدیث نبوی کا جذبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ صحابہ سے احادیث سننے پر بڑے حریص تھے بلکہ خط و کتابت کے ذریعے اپنے ماتحت حکمرانوں سے بھی احادیث سیکھا کرتے تھے، اپنے اس دعوے کی سند بھی ہم بخاری شریف سے پیش کر رہے ہیں:

حضرت وراذ مولیٰ مغیرہ بن شعبہ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو خط لکھا کہ مجھے یہ لکھ کر بھیجیں کہ تم نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نماز کے بعد کیا پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت وراذ (جو والی کوفہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے کاتب تھے) کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے مجھ سے لکھوا کر بھیجا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے ”لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ المملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر اللھم لا مانع لہا اعطیت ولا معطى لہا منعت ولا ینفع ذا الجند منک الجند۔“ (صحیح البخاری، کتاب القدر، باب لا مانع لہا اعطى اللہ)

اتباع سنت کا جذبہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بھی تبع سنت

تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق زندگی گزاریں۔ اس بات کو بھی ہم بخاری شریف کی حدیث سے مبرہن کر رہے ہیں:

حضرت حمید بن عبد الرحمن نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے حج کے سال (مسجد نبوی) کے منبر شریف پر دیکھا، وہ لوگوں سے فرما رہے ہیں: اے اہل مدینہ! تمہارے علما کہاں ہیں؟ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: یہ عاشورہ کا دن ہے اس دن کا روزہ اللہ تعالیٰ نے فرض نہیں کیا ہے، میں خود روزہ دار ہوں، تم میں سے جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ نہ رکھے۔ (بخاری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء) علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: اس حدیث پاک کے سیاق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل مدینہ میں صوم یوم عاشورہ کے اہتمام سے متعلق کمی محسوس کیا تو آپ نے علما سے متعلق یہ پوچھا (کیونکہ علما حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں) (فتح الباری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء)

علامہ ابن حجر کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ اگر آپ لوگوں میں اتباع سنت کے جذبے کی کمی پاتے تو فوراً اس پر تنبیہ فرماتے۔ ایک اور روایت جس کو علامہ ابن حجر عسقلانی نے ذکر کیا ہے، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع پر بڑے حریص تھے۔ روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: (جب حضرت امیر معاویہ مکہ شریف آئے تھے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جگہ نماز پڑھی؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جواب دیا: اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس جگہ نماز پڑھیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تو اپنے اور دیوار کعبہ کے بیچ میں تقریباً تین ذراع کا فاصلہ چھوڑ دیں۔ (فتح الباری، کتاب الحج باب اغلاق البیت و بصلی)

نماز میں حضور سے مشابہت: اتباع سنت کے اسی جذبے نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بہت مشابہ بنا دیا تھا۔

صحابی رسول حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: ”میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہ نماز پڑھتے ہوئے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔“ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۳۵)

احترام نسبت: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان تبرکات کو اکٹھا کرنے پر بڑے حریص تھے جنہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی بھی طور پر نسبت تھی، ان تبرکات کو جمع کرنے کے لیے انہیں جو مشقت برداشت کرنا پڑے یا جو کچھ خرچ کرنا پڑے، وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے بلکہ بڑی فراخ دلی سے وہ سب کچھ انجام دیتے تھے، جو ان کے مطلوب کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے فرط شوق اور جذبات کے تلاطم کو جاننے کے لیے آنے والا واقعہ ملاحظہ ہو۔

در بار رسالت کے مشہور شاعر حضرت کعب بن زہیر کے نام سے آپ واقف ہوں گے، حضرت کعب بن زہیر ایک زمانے تک کفر کی نجاستوں سے آلود رہے، کفر کا رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، شاعر تو تھے ہی رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی با عظمت بارگاہ میں بھی زبان طعن دراز کر ڈالی (العیاذ باللہ) بارگاہ رسالت میں لوگوں نے ان کے اس برے فعل کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں مباح الدم قرار دے دیا۔ حضرت کعب کے بھائی داخل اسلام ہو چکے تھے، انہوں نے اپنے بھائی کو خط لکھا کہ ابھی وقت ہے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تائب ہو کر اسلام لانے والے کی خطائیں معاف فرما دیتے ہیں، یہ خبر سنی تو بھیس بدل کر سہمے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچے، کلمہ شہادت پڑھا اور پھر عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ! امان بخشی جائے، میں آپ کی بارگاہ میں پناہ کا امیدوار ہوں، مجھے پناہ دیکر ممنون کرم کیا جائے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت ابو بکر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: انہوں نے کیا کہا تھا؟ حضرت ابو بکر نے ان کے پہلے والے اشعار سنائے، اس پر حضرت کعب نے عرض کیا: حضور! میں نے یہ نہیں کہا تھا، کچھ الفاظ بدل کر شعر پڑھا اور عرض کیا: میں نے اس طور پر کہا تھا، حضور کی بارگاہ میں اتنا

احساس ندامت کافی تھا، حضرت کعب کی معذرت قبول کر لی گئی اور رحمت عالمیاں نے انہیں امان بخش دی۔ بارگاہ رسالت سے امان مل جانے کے بعد حضرت کعب بن زہیر نے ایک طویل قصیدہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا جسے قصیدہ ”بانت سعاد“ کہا جاتا ہے۔ (آپ کا یہ قصیدہ عشق رسول کی حرارت کے ساتھ صنف ادب کی اعلیٰ اقدار پر مشتمل ہے اور تشبیہات و تلمیحات کا بیش بہا خزینہ) جب حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے قصیدے کا یہ شعر پڑھا:

ان الرسول لنور يستضاء

بہمہند من سیوف اللہ مسلول

بے شک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسے نور ہیں جن سے ضیاء حاصل کی جاتی ہے (کفر کے خلاف) اللہ تبارک و تعالیٰ کی کھلی ہوئی تلوار ہیں۔

تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اتنے خوش ہوئے کہ جو چادر مبارک اوڑھے ہوئے تھے وہ حضرت کعب بن زہیر کو اوڑھادی۔ یہی وہ چادر ہے جس کی بات ہم کرنا چاہتے ہیں، اس چادر مبارک کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خاص نسبت تھی لہذا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس چادر کے بڑے متمنی تھے، آپ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس چادر کو بڑا نذرانہ دیکر حاصل کرنا چاہا لیکن حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ کہتے ہوئے چادر دینے سے انکار کر دیا ”میں وہ کپڑا کسی قیمت پر نہیں دے سکتا جو مجھے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عطا فرمایا ہے“ لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھک ہار کر بیٹھنے والے کہاں تھے؟ کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ جب حضرت کعب کا وصال ہو گیا تو یہ چادر آپ نے ان کے وارثین سے بیس ہزار درہم نذرانہ دیکر حاصل کر لی، اس چادر کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سنبھال کر رکھا، یہاں تک کہ بعد کے خلفاء کے پاس بھی محفوظ رہی، یہ سلاطین اس کو عید کے موقع پر استعمال کیا کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ بعد میں تاتاری فتنہ کے وقت وہ چادر گم ہو گئی۔ (الوفاء بضریف فضائل المصطفیٰ، ج: ۱، ص: ۳۲۸،

سیدنا محمد رسول اللہ، ج: ۱، ص: ۴۸۸، الکامل فی التاریخ، ج: ۲، ص: ۱۴۶)

سخاوت: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مال پر بخالت نہیں کرتے تھے بلکہ کھلے دل کے ساتھ خرچ کرتے، خاص کر قابل قدر اور لائق احترام ہستیوں کے قدموں میں مال کا ڈھیر لگا دیتے تھے، جو ہر شناس تھے، فضل والوں کی فضیلت بہت اچھے طریقے سے جانتے تھے اور ان پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے، آپ کا وصف سخاوت خلفاء کے درمیان ممتاز رہا اور تاریخ نے آپ کو ایک عظیم فیاض کے طور پر یاد رکھا۔ اب ہم آپ کے سامنے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سخاوت اور داد و دہش کے چند نمونے پیش کر رہے ہیں۔

ام المؤمنین کا قرض ادا کیا: ایک وقت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اٹھارہ ہزار دینار قرض چڑھ گیا تھا، جب یہ خبر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو ام المؤمنین کا پورا قرض حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادا فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام المؤمنین کی بارگاہ میں ایک لاکھ کی نذر بھیجی، ام المؤمنین نے وہ پوری رقم اسی دن مستحقین میں تقسیم فرمادی، اپنے پاس ایک درہم بھی باقی نہیں چھوڑا، آپ کی خادمہ نے عرض کیا: کاش! آپ نے ایک آدھ درہم بچا لیا ہوتا جس سے ہم گوشت خرید لاتے؟ ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: اگر تم نے پہلے یاد دلایا ہوتا تو میں ایسا کر لیتی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام المؤمنین کی بارگاہ میں ایک عمدہ ہار بھیجا جس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وہ ہار قبول فرمالیا۔

حسنین کریمین کی بارگاہ میں نذرانہ: ایک بار حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: آج میں آپ کی بارگاہ میں اتنی نذر پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا کہ اتنی بڑی نذر آج تک کسی کو نہیں دی گئی۔ پھر آپ نے چار لاکھ درہم حضرت امام حسن کی بارگاہ میں پیش فرمائے۔ (البدایہ والنہایہ میں اربع مائۃ الف الف کے الفاظ ہیں یہاں پر دوسرا الف زائد

ہے جیسے کے دوسرے مصادر سے ظاہر ہے)

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دونوں نواسے حضرات حسنین کریمین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لائے آپ نے دونوں شہزادوں کی خدمت میں دو لاکھ کی نذر پیش کی اور فرمایا: اتنی بڑی نذر کسی کو پیش نہیں کی گئی، اس پر حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آپ نے ہم سے افضل کو کبھی نذر پیش بھی نہیں کی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے پاس حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا: ”اے شہزادہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! آپ کا آنا مبارک ہو“ پھر خدمت اقدس میں تین لاکھ نذرانہ پیش فرمایا۔ پھر آپ حضرت عبداللہ بن زبیر سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: ”اے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پھوپھی کے شہزادے! آپ کا آنا بھی مبارک ہو، ان کو بھی ایک لاکھ روپیہ نذرانہ پیش فرمایا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۴۴، تاریخ دمشق (ذکر من اسامہ معاویہ) ج: ۵۹، ص: ۱۹۲، سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۵۴)

اس کے سوا بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی داد و دہش کے بہت سے واقعات کتب سیر و تاریخ میں درج ہیں، جنہیں ہم اختصار کے پیش نظر ذکر نہیں کر رہے ہیں۔
نہی عن المنکر کا جذبہ: اتباع سنت اور امر بالمعروف ہی کی طرح حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہی عن المنکر کے جذبے سے بھی سرشار تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ایک بات خلاف شرع محسوس کی تو مسجد نبوی کے منبر پر علی الاعلان اس کے خلاف شرع ہونے کو ظاہر فرمایا، ساتھ ہی علمائے مدینہ کو تعریضاً تنبیہ فرمائی۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بالوں کا ایک گچھا ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا: اے اہل مدینہ! تمہارے علما کہاں ہیں؟ میں نے حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کو اس جیسی چیزوں (عورت اپنے بالوں کے ساتھ دوسری عورت کے بالوں کا استعمال کرے) سے منع فرماتے ہوئے سنا ہے۔ بنو اسرائیل ہلاک ہو گئے جب ان کی عورتوں نے ایسی (حرام) چیزوں کا استعمال شروع کر دیا۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ حکمران حضرات کو بدعات و منکرات کا ازالہ کرنا چاہیے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بات پر بھی تنبیہ فرمائی کہ علما کو اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے، ذمہ داری سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ (بخاری، عمدۃ القاری، کتاب الانبیاء، باب حدیث الغار سے متصل)

معترضین کو مطمئن کرنا: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شرف صحابیت سے متصف ہوئے، زمانہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بڑے قریب سے دیکھا، فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں عہدہ دار ہو گئے، عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں عزت میں چار چاند لگے، مولائے کائنات کرم اللہ وجہہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں خلافت سونپ کر پوری سلطنت اسلامیہ کا خلیفہ بنا دیا۔ اس طور پر ایک عظیم زمانہ انہوں نے ایسے حضرات کے ساتھ گزارا جو قرآن و سنت، دین و شریعت، عدل و انصاف کو لازم پکڑنے والے و امارت، حکومت اور سیاست کو مرضی مولیٰ کے مطابق انجام دینے والے تھے، ان کے سینے اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت سے لبریز تھے، ان صحبتوں اور حکمرانی کے لمبے تجربے نے انہیں حکمرانوں کی صف میں ممتاز کر دیا تھا، وہ معاملہ فہمی اور گتھیوں کو سلجھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، مسلمانوں کو مطمئن کرنے اور دشمنوں کو نپٹانے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ اگر جماعت مسلمین کا کوئی فرد ان کا بدگو ہوتا تو سزا کے بجائے جزا سے اس کا منہ سل دیتے تھے ”وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ“ پر عمل پیرا تھے، ہم اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ایک عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں:

حضرت عروہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت مسور بن مخرمہ (حضرت مسور بن مخرمہ کو

چھوٹی عمر میں شرف صحابیت حاصل ہوا ہے) نے اپنا وہ واقعہ بتایا جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا (یاد رہے کہ حضرت مسور بن مخرمہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اعتراضات کی جھڑی لگاتے رہتے تھے) حضرت مسور کہتے ہیں کہ ”میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوا، جس ضرورت کے لیے حاضر ہوا تھا وہ ضرورت پوری فرمانے کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے تنہائی میں بلایا، کہنے لگے: مسور! یہ بتاؤ تم حکام پر جو طعن و تشنیع کیا کرتے تھے اس کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا: امیر المؤمنین اس کو چھوڑیے، جو ہوا اس کو جانے دیجئے اور ہمارے ساتھ احسان کا معاملہ کیجئے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ہرگز نہیں، خدا کی قسم! آج تمہیں میرے سامنے اپنی زبان سے وہ سب کچھ بیان کرنا ہوگا جو میرے عیوب کے طور پر تم لوگوں کے سامنے بیان کیا کرتے تھے۔

حضرت مسور کہتے ہیں کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے مجبور کر دیا تو میں نے ہر وہ الزام ان کے سامنے رکھ دیا جو میں ان پر لگایا کرتا تھا، میری زبان سے سب کچھ سن لینے کے بعد آپ نے فرمایا: مسور! میں اپنے آپ کو معصوم نہیں سمجھتا لیکن کیا تم میرے وہ اصلاحی کارنامے شمار کر سکتے ہو جو میں رعایا کے فائدے کے لیے انجام دیتا ہوں، تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی کی جزا اللہ تعالیٰ کم سے کم دس گنا عطا فرماتا ہے، اے مسور! تم صرف خطائیں شمار کرتے ہو اور اچھائیوں کو فراموش کر دیتے ہو، حضرت مسور نے کہا: جی ہمیں صرف برائیاں ہی یاد رہ سکیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ہم اپنے رحیم و کریم مولیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے تم سے پوچھتے ہیں: کیا تم نے کبھی کوئی ایسا گناہ کیا ہے؟ جس پر تم خوف کھاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اگر تمہیں معاف نہ فرمائے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے، حضرت مسور نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا: ہاں اے امیر المؤمنین! حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تو پھر اب وہ چیز بتاؤ جس کی وجہ سے امید کرتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مغفرت کے مجھ سے زیادہ

مستحق ہو۔ خدا کی قسم! میری اصلاحی خدمات تم سے زیادہ ہیں، جسے تم اچھے طریقے سے جانتے ہو، میں رعایا کے لیے اصلاحی کام انجام دیتا ہوں، حدود قائم کرتا ہوں، لوگوں کے درمیان عدل و انصاف پر مبنی فیصلے کرتا ہوں، جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ انجام دیتا ہوں اور وہ بڑے بڑے کام جس کا تم شمار و حساب نہیں کر سکتے، ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ یاد رکھو جب بھی میرے سامنے دو معاملے پیش آئے تو میں نے اللہ کی رضا کے لیے اس چیز کو اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، میں دین اسلام کا پیروکار ہوں جس میں نیک اعمال کو قبول کیا جاتا ہے، حسنات کی جزا دی جاتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمائے تو برائیوں پر سزا، (ہر مومن کو اس سے معافی کی امید ہے کیونکہ وہ تواب اور غفور و رحیم ہے) حضرت مسور کہتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ عروہ کہتے ہیں کہ ”اس کے بعد جب بھی حضرت مسور رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر کیا تو خیر کے ساتھ کیا اور ان کے لیے رحم و مغفرت کی دعا کی۔“ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۶، سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۵۱، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج: ۱، ص: ۶۷۱، طبقات ابن سعد، ج: ۶، ص: ۲۱، تاریخ دمشق، ج: ۵۹، ص: ۱۶۱)

حسن تدبیر سے معاملے کو نبٹانا: اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ حضرت ثابت بن قیس کا ہے، ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شرف صحابیت حاصل ہے، جنگ احد اور اس کے بعد کے غزوات میں حضور کے ساتھ رہے، غزوہ احد میں ان کو بارہ زخم لگے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں وصال فرمایا۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج: ۵، ص: ۳۳۸)

ثابت بن قیس حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے بڑے قریبی تھے اور ان کی طرف سے مدائن کے عامل رہے۔ ایک دن حضرت ثابت اپنے گھر کی طرف پلٹ رہے تھے کہ آپ نے دیکھا حضرات انصار رضی اللہ عنہم اجمعین مسجد بنی ظفر میں اکٹھا ہیں، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سب لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھنا چاہتے ہیں، آپ نے فرمایا: سب لوگوں کے نام سے خط نہ لکھو بلکہ کسی ایک کے نام سے لکھو، تاکہ اگر

کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ صرف ایک کو پیش آئے، ایک آدمی کا حادثے کا شکار ہو جانا سب لوگوں کے شکار ہونے سے بہتر ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یہ قربانی کون دے گا؟ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اس کے لیے میں تیار ہوں، سب کا اتفاق اسی بات پر ہو گیا اور حضرت ثابت نے اپنے نام سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھ دیا، خط کی ابتدا میں خود سے متعلق کافی کچھ لکھا، حضور کی صحبت و نصرت کا بھی ذکر کیا پھر شکایت لکھی: آپ نے ہمارے حقوق کو روک رکھا ہے ”اعتدیت و ظلمتنا“ (آپ نے سرکشی اور ظلم کیا ہے) جیسے سخت جملے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے لکھے، مزید طنز کرتے ہوئے لکھا کہ ہمارا قصور صرف یہی ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار ہیں۔

جب یہ خط حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو موصول ہوا تو پڑھ کر رباب حل و عقد سے مشورہ فرمایا، سب نے اپنے اپنے مشورے دیے لیکن کوئی بھی مشیر حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل سے کم پر راضی نہیں تھا، آپ نے اپنے مصاحبین سے مزید پوچھا: اور کوئی مشورہ ہے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا: نہیں، پھر آپ نے اپنے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے حضرت ثابت کو جوابی خط لکھا، جس میں تحریر فرمایا: ”میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں، آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ میرے رویے سے تنگ دل ہوئے ہیں، اب میں صرف تین دن کی مہلت چاہتا ہوں“ یہ خط حضرت ثابت کو ملا آپ نے پڑھ کر اپنی قوم کو سنایا اور جو خط میں لکھا تھا اس کے عین مطابق چوتھے دن حضرات انصار کے ہاتھوں میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی داد و دہش کے نذرانے پہنچ چکے تھے۔

(تاریخ مدینہ دمشق، ج: ۱۱، ص: ۱۳۸)

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اگر یہ حکمت و مصلحت پر مبنی فیصلہ نہ لیا ہوتا اور مصاحبین کی بات مان لی ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ شاندار مدبر تھے، حکمت و دانائی میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے نیز امور مملکت میں دوسروں پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔

عفو و درگزر: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت نہایت ہی پر وقار اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کی آئینہ دار تھی، آپ کی بردباری، حلم، عفو و درگزر اور لوگوں کی سخت باتوں کو برداشت کر لینا، ضرب المثل تھا۔ آپ اپنے خلاف کی جانے والی طعنہ کشی بلکہ آپ کے ساتھ کی جانے والی بدکلامی اور ترش روئی کو بھی نہایت حکیمانہ انداز میں ٹال دیتے یا معمولی سی سمجھائش پر ختم کر دیتے، انہیں تمام خوبیوں کی وجہ سے آپ اپنے دور خلافت میں مقبول انا م ہو گئے تھے، آپ سے مزاحمت کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ آپ کے حکیمانہ کردار کے چند شواہد ہم قارئین کی نظر کر رہے ہیں:

حضرت قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر کسی کو بردبار نہیں دیکھا، نہ ہی ان سے بڑا سردار میری نظر سے گزرا، وہ تکبر سے دور اور نرمی پسند تھے۔ بعض حضرات کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ سخت کلامی کی (لیکن آپ نے اس کو کچھ نہ کہا) آپ سے عرض کیا گیا: کاش! آپ اس پر سختی کرتے، آپ نے جواب دیا: مجھے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میرا حلم میری رعایا کے کسی فرد پر تنگ ہو جائے۔ حضرت ثوری سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: مجھے اس بات پر شرم آتی ہے کہ کسی شخص کا جرم میرے حلم سے بڑا ہو جائے یا کسی کی جہالت میری بردباری سے آگے نکل جائے یا میرے صبر کا دامن اتنا تنگ ہو جائے کہ میں اس کی ناپسند بات کو اپنے دامن صبر میں چھپانہ سکوں۔

شعبی اور اصمعی کا بیان ہے کہ ابو جہم اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان گفت و شنید ہو گئی، ابو جہم نے ایسی بات کہہ دی جس سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رنجیدہ ہو گئے، آپ نے سر جھکا لیا پھر سر اٹھا کر فرمایا: ”اے ابو جہم! سلطان کے غضب سے بچا کرو، بادشاہ کو بچوں کی طرح غصہ آتا ہے اور پھر شیر کی طرح لوگوں کو پھاڑ دیتا ہے، بادشاہ کا تھوڑا سا غصہ بھی بہت سارے لوگوں کے غصے پر بھاری ہوتا ہے“ پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو جہم کو کچھ مال دے کر اپنے پاس سے

رخصت کیا، اس گفتگو اور طرز عمل نے ابو جہم کو اتنا متاثر کیا کہ وہ آپ کا مدح گو ہو گیا اور آپ کی شان میں تعریفی شعر پڑھنے لگا۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۴۰)

ذہانت و تدبیر: ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ معاملات سے نپٹنے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ید طولیٰ حاصل تھا، ان کی حسن تدبیر، حیلہ گری، اور اپنی رعایا کی دستگیری دیکھنا ہو تو آنے والے واقعے کو ملاحظہ کیجیے:

آپ کا ایک سپاہی جنگ کے موقع پر شاہ روم کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، اس قیدی کو شاہ روم کے دربار میں اس وقت پیش کیا گیا جب اس کے سامنے بعض مصاحبین سلطنت اور کچھ مذہبی لوگ موجود تھے، شاہ روم نے مسلمان قیدی کے ساتھ کچھ بات چیت کی، یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک پادری نے مسلمان قیدی کے منہ پر شاہ روم کی نظروں کے سامنے زوردار طمانچہ رسید کیا، قیدی چونکہ مسلمان تھا اسلامی غیرت کے ساتھ قریشی عزت و وقار کا غازہ بھی اس کے چہرے کی چمک تھا (کیونکہ وہ قرشی تھا) سردر بار وہ اپنی توہین کو برداشت نہ کر سکا، وہیں کھڑے کھڑے پکاراٹھا ”وا اسلاما“ معاویہ تم کہاں ہو؟ تم نے ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا، سرحدوں کو پامال کر دیا، ہماری عزتیں دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئیں، یہ خبر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سراغ رساں ایجنسی نے ہو بہو ان تک پہنچادی، خبر ملتے ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شدت غم سے نڈھال ہو گئے، اپنے اوپر ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرنے لگے، اس حادثے سے اس درجہ افسردہ خاطر ہوئے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا لیکن آپ نے کسی کو بھی اس بات کی خبر نہ دی، لوگوں سے ملاقاتیں ایک حد تک ترک کر دیں، اپنے آپ کو قوت لا یموت تک محدود کر لیا پھر حیلہ گری سے ان تمام قیدیوں کو فدیہ دے کر رومیوں سے آزاد کرالیا۔

اس قیدی کو اپنے پاس تنہائی میں بلایا خوب خاطر و مدارات کی، اس کے دل کو خوش کیا پھر فرمایا: نہ تو ہم نے تم کو ضائع کیا ہے نہ ہم بھولے ہیں نہ تمہاری عزت و نفس کا مالک کسی اور کو بنایا ہے، یہ سب کرنے کے بعد بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پر

مطمئن نہیں تھے، یہ تو ان کے سفر کی ایک منزل تھی مقصد تو اس سے بھی کہیں آگے جانا تھا، وہ اصلی انتقام کے تانے بانے بننے رہے اور مسلسل اس بات پر غور و فکر کرتے رہے آخر مسلمان قیدی کی بے عزتی کا حقیقی بدلہ کیسے لیا جائے؟ سوچتے سوچتے وہ ایک نتیجے پر پہنچے اور پھر انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا، انہوں نے ساحل دمشق سے ایک تجربہ کار سمندری فوجی کو بلایا، اسے اپنا پورا منصوبہ بتایا اور منصوبے کے مطابق عمل کرنے کی سخت ہدایات دیں، اتفاق رائے سے یہ بات طے پائی کی وہ بیش قیمتی تحائف لے کر روم جائے اور کسی بھی طریقے سے شاہ روم کے دربار میں پذیرائی حاصل کرے، یہ شخص منصوبے کے مطابق شہر قبرص پہنچا، وہاں کے رئیس سے رابطہ کر کے شاہ روم اور اس کے مصاحبین سے تجارت کے سلسلے میں گفتگو کرنے کی اجازت حاصل کر لی، شاہ روم سے ملاقات کے وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس نے دربار میں موجود پادریوں کو بیش قیمت تحفے پیش کئے مگر یہ پادری جس نے قریشی مسلمان کو تھپڑ مارا تھا اسے کچھ نہ دیا۔

اب جب کہ یہ شخص ملک شام واپس آنے لگا تو روم کے پادریوں نے اس شخص کے ذریعے شام سے کچھ خاص چیزیں خریدنے کی درخواست کی، شام آنے پر خفیہ طور پر اس شخص کی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی، اپنی کارکردگی کی ساری رپورٹ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں پیش کی اور بتایا کہ پادریوں کی طلب کیا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پادریوں کی خواہش کے مطابق تمام چیزیں اپنے اس فوجی کو مہیا کر دیں، فوجی کو دوبارہ روانہ کرتے ہوئے خاص طور پر یہ نصیحت فرمائی کہ اس بار اگر وہ پادری تجھے ملے اور تیری سردمہری کی شکایت کرے تو اس سے معذرت کرنا، خوش کلامی سے پیش آنا اور تحائف دے کر اسے موم کر لینا پھر اپنے تمام امور کا اسے نکراں بنا لینا، جب تم یہ سب کر چکو اور پادری کو اپنی باتوں سے پوری طرح مطمئن کر کے اپنی طرف متوجہ کر لو پھر اس کی خواہشات بھی جان لو کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ اس کے

بعد ہماری طرف پلٹ کر آؤ تا کہ ہم اپنا پورا پروگرام نافذ کر سکیں۔

اس نصیحت کے ساتھ وہ شخص قسطنطنیہ پہنچتا ہے، اس کے ساتھ وہ تمام ساز و سامان بھی تھے جو رومیوں نے منگوائے تھے، مزید بہت سے تحائف اس کے سوا تھے، اس عظیم خلوص کی وجہ سے روم کے پادریوں اور شاہی حاشیہ نشینوں کی نظر میں اس شامی کا مرتبہ بلند ہو گیا تھا، دربار میں اس کو خاص رسائی حاصل ہو گئی، ایک دن یہ شامی شاہ روم کی مجلس میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس پادری نے اس کو روکتے ہوئے کہا: بھائی میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ دوسرے کس وجہ سے آپ کے حسن سلوک کے مستحق ٹھہرے، مجھے کس وجہ سے ان سب سے الگ کر دیا گیا ہے؟ شامی نے جواب دیا: جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے انہوں نے خود کسی نہ کسی طریقے سے میرے ساتھ تعلقات کی ابتدا کی ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں ایک اجنبی انسان ہوں، ایک مسافر کے طور پر ادھر ادھر گھومتا رہتا ہوں اگر مسلمانوں کے جاسوسوں نے کوئی خبر مجھ سے متعلق دارالاسلام میں دے دی تو میرا کام تمام ہو جائے گا لیکن آج میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں، اب میری نظر میں آپ اس بات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ میرے تمام معاملات کی نگرانی آپ کریں، اب میرا جو معاملہ ہوگا خواہ بادشاہ کی بارگاہ میں ہو یا اس کے سوا، وہ آپ کی نگرانی میں ہی سرانجام پائے گا، آپ کو جو بھی ضرورت ہو اس کا مجھے حکم دیں، ملک شام کی اشیاء سے متعلق میں آپ کی ہر ضرورت پوری کرتا رہوں گا، پھر اس شامی نے ہیرے، موتی، عمدہ قسم کی خوشبو اور کپڑوں وغیرہ کے شاندار تحفے اس پادری کو پیش کیے۔

معاملہ یوں ہی چلتا رہا، شامی شخص کے روم سے شام اور شام سے روم کے مابین چکر لگتے رہے، ہر بار ہدایا و تحائف پیش ہوتے رہے، شاہ روم اور اس کے مصاحبین شامی شخص سے اپنی ضرورتوں کے ساز و سامان منگواتے رہے۔ ایک بار جب شامی اپنے ملک جانے لگا تو اس پادری نے خاص قسم کی مہنگی قالینیں اور تکیے منگوائے، پلان کے مطابق اس پادری کو ملک شام گرفتار کر کے لے جانا تھا جو آسان کام تو نہ تھا لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کی ہوشیاری نے اسے کافی حد تک آسان بنا دیا تھا، شامی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبردار کیا کہ پادری کی قسطنطنیہ کے قریب ایک بڑی زمین، پارک اور شاندار محل ہے، جس کا ایک کنارہ اس خلیج سے ملتا ہے جو بحر روم سے ملی ہوئی ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موقع کو غنیمت جان کر فوری طور پر شاندار قالینوں اور تکیوں کا انتظام کیا، پورا منصوبہ سمجھا کر شامی کو واپس کر دیا۔

شامی فوجی اپنی سمندری سواری (کشتی) لے کر بحر روم کے ذریعے قسطنطنیہ کے قریب پہنچا اور اس نے دوسری کشتی والوں کے ذریعے پتہ لگا لیا کہ اس وقت پادری اپنی اسی زمین پر آیا ہوا ہے، بڑی تیزی کے ساتھ شامی کی سواری قسطنطنیہ کی خلیج میں داخل ہو گئی، پادری اس وقت شراب و کباب میں مست تھا، جب اسے خبر ملی کہ شامی شخص واپس آ گیا ہے تو مارے خوشی کے محل سے نیچے اتر آیا اور شامی فوجی کی کشتی کے قریب تک چلا گیا، اس کشتی کو شامی نے پہلے ہی بڑے سلیقے سے قالین اور تکیوں سے سجا رکھا تھا، کشتی کے نچلے حصے میں چند ماہر افراد بیٹھے تھے جو کسی بھی خطرے سے کشتی کو نکلانے کی ہمت رکھتے تھے، پادری نے قریب آ کر جب کشتی کے اندر کا جائزہ لیا تو قالین اور تکیوں کے حسن پر فریفتہ ہو کر رہ گیا، بے خودی میں کشتی کے اندر داخل ہو گیا پھر کیا تھا شامی نے اپنا طے شدہ مخصوص اشارہ نیچے بیٹھے افراد کو کیا اور سواری شام کا سفر طے کرنے لگی۔

مختصر یہ کہ تیرہویں دن یہ پادری حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ایک قیدی کی حیثیت سے حاضر کر دیا گیا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، آپ نے حکم دیا کہ اس قریشی کو میرے سامنے لایا جائے جس کو پادری نے مارا تھا، دربار لگایا گیا خاصان مملکت، حکام وقت سب مجلس میں تشریف فرما ہوئے، جب مجلس مکمل بھر گئی تو آپ نے قریشی سے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ اور اپنا بدلہ اس پادری سے لے لو! ہم نے آپ کو ضائع کیا ہے نہ تمہارے خون سے کھیلنے کی کسی کو اجازت دی ہے اور نہ تمہاری عزتوں کو حلال کیا ہے۔ قریشی کھڑا ہوا پادری کے قریب گیا تو

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اتنی ہی پٹائی کرنا جتنا اس نے تمہیں مارا تھا، اس پر ظلم مت کرنا، قریشی نے چند تماچے اور ایک مکہ لگا کر اپنا بدلہ لیا، بدلہ لیتے ہی وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جھک گیا، انہیں بوسے دینے لگا، زبان سے کہتا جاتا تھا جس نے تمہیں سردار بنایا، اس نے کسی کو ضائع نہیں کیا، معاویہ! تم بے مثال ہو، اپنی چراگاہ کی حفاظت کرنا جانتے ہو اور اپنی رعایا کو بچانا جانتے ہو، اس وقت قریشی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بڑی تعریف کی اور خوب دعاؤں سے نوازا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پادری قیدی کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا، ایک تو اسے رہا کر دیا پھر چند تحائف دے کر اس کے وطن واپس کر دیا، واپس کرتے وقت اس سے فرمایا: جاؤ اپنے بادشاہ سے کہنا کہ میں نے مسلمانوں کا ایسا بادشاہ دیکھا ہے جو تیری سلطنت سے مجرم کو پکڑ کر اپنی رعایا کے لیے انصاف کرنا اور بدلہ لینا جانتا ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شامی فوجی کو حکم دیا: جاؤ پادری کو اس جگہ چھوڑ آؤ جس جگہ سے لے کر آئے تھے، پادری کے ساتھ بد قسمتی سے جو غلام کشتی میں داخل ہو گئے تھے وہ سب بھی قیدی تھے، انہیں بھی پادری کے ساتھ ہی واپس کر دیا گیا۔ (معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۱۹۱)

عاجزی و انکساری: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بایں جلالت شان کہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد پوری سلطنت اسلامیہ کے تنہا والی تھے، آخری دور میں تو کوئی ان سے اختلاف کرنے والا موجود ہی نہ تھا پھر بھی اپنے خطبات وغیرہ میں بڑے عاجزانہ اسلوب کے ساتھ خطاب فرماتے، اہل فضل و کمال کو ان کا منصب عطا فرماتے، اپنے آپ کو ان سے کمتر جانتے۔

ایک خطبے میں آپ نے فرمایا: ”میں حضرت ابوبکر کی برابری کر سکتا ہوں نہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی، نہ میرے کام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کارناموں کے مماثل ہو سکتے ہیں اور صحیح یہ ہے کہ اب ان کے بعد کوئی ان کا ہمسر ہو ہی نہیں سکتا اگرچہ میں تمہیں لوگوں میں مرتبے کے اعتبار سے سب سے بہتر نظر نہ آؤں لیکن پھر بھی میں تمہارے حق کے

لیے بہتر ہوں۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۲، سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۴۸)

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: ”اے لوگو! میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں بلکہ تمہارے درمیان مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو وغیرہ! فاضلین صحابہ لیکن مجھے امید ہے کہ میں تمہارے لیے بحیثیت حاکم زیادہ فائدے مند رہوں گا، تمہارے دشمن کو زیادہ نقصان پہنچانے والا اور تمہارے لیے زیادہ فائدہ جمع کرنے والا۔“

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۵۰، طبقات ابن سعد، ج: ۶، ص: ۱۹، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۶)

رہن سہن میں بھی آپ کافی سادگی پسند تھے۔ آپ کو دمشق کے بازاروں میں پیوند لگا ہوا کپڑا پہنے دیکھا گیا، اس حال میں کہ آپ بازار کا دورہ کر رہے تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۸، سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۵۲)

وقت ضرورت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خسروانہ شان بھی ظاہر کرتے تھے لیکن یہ ان کی عادت نہ تھی بلکہ وہ کسی مقصد کے حصول کے لیے تکلفا ایسا کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس بات پر مواخذہ فرمایا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً عرض کیا تھا: اے امیر المؤمنین! ہم ایسی سرزمین پر رہتے ہیں جہاں دشمن کے جاسوس کثرت کے ساتھ موجود ہیں، ہمیں ان کے دلوں میں اپنا خوف اور دبدبہ قائم کرنے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے، آپ چاہیں تو میں اپنے اس عمل کو جاری رکھوں اور آپ کی مرضی نہ ہو تو میں اسے ترک کر دوں؟ اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں، اس وقت حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: اے امیر المؤمنین! امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کتنے عمدہ طریقے سے اپنا دفاع کیا ہے؟ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اسی لیے تو ہم نے ان کو یہ عظیم ذمہ داری سونپ رکھی ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۳، ص: ۴۱۶)

اطاعت رسول: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کے فرمان پر عمل کرنا ہر حال میں لازم سمجھتے تھے، چاہے وہ جنگ کی حالت ہو یا امن کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کر کے اپنے بلکہ اسلام کے دشمنوں کو بھی زیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آنے والی حدیث سے ان کی سیرت کا یہ پہلو خوب خوب واضح ہوتا ہے، اس حدیث کو کثیر محدثین نے ذکر کیا ہے:

سليم بن عامر سے روایت ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل روم کے درمیان ایک معین مدت تک صلح کا معاہدہ طے پایا تھا، معاہدے کا وقت پورا ہونے سے پہلے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کی فوجوں) نے دشمن کے ملک کی طرف خفیہ سفر شروع کر دیا، تاکہ جیسے ہی معاہدے کی مدت پوری ہو اہل روم پر حملہ کیا جاسکے، جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی طرف بڑھ رہے تھے عین اس وقت ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر اللہ اکبر کہتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے ”وفاء لا غدر“ لوگوں نے اس شخص کو دیکھا تو وہ صحابی رسول عمرو بن عبسہ تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ جواب دیا: میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ”جس کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو جب تک اس قوم کو آگاہ نہ کر دیا جائے نہ کوئی گانٹھ باندھی جاسکتی ہے اور نہ کھولی جاسکتی ہے“ (اس کے علاقے کی طرف پیش رفت نہیں کی جاسکتی)۔ حضور کا فرمان سنتے ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی فوج کے ساتھ واپس ہو گئے۔ (سنن ترمذی، کتاب السیر، باب ما جاء فی الغدر، ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۷۱، شعب الایمان،

حدیث نمبر: ۴۳۵۹، مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۰۱۵، مسند الصحابہ، مرقاة المفاتیح، کتاب الجہاد باب الامان)

قارئین کرام! اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس کتنا عمدہ موقع تھا، دشمن بے خبر تھا، فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں، مدت ختم ہوتی اور حملہ ہو جاتا، دشمن کو زیر کر دیا جاتا، لیکن جب فرمان رسول سامنے آ گیا تو ساری تدابیر بالائے طاق رکھ دی گئیں اور فرمان رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر عمل کرنا ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باعث فوز و فلاح سمجھا۔

حضور کے فرمان کا احترام: ہم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خاندانی وجاہت شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ ان کا خاندان عرب کے ممتاز ترین خاندانوں میں سے ایک تھا لیکن جب انہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کوئی حکم ملتا تو وہ اپنے آپ کو ایک خادم سمجھتے، اس کے سوا ان کے ذہن میں اور کوئی بات پیدا نہیں ہوتی، ہم اپنے دعوے کی تائید میں ایک واقعہ پیش کر رہے ہیں جسے کثیر محدثین ومؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے:

”حضرت وائل بن حجر ایک جلیل القدر صحابی ہیں، یہ حضرموت کے بادشاہ کے بیٹے تھے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر آئے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے مدینہ منورہ پہنچنے سے تین دن قبل ہی اپنے صحابہ کو خوشخبری عطا فرمائی کہ حضرموت کا شہزادہ اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر خدمت ہونے والا ہے، جب یہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑی شفقت فرمائی، اپنے پاس بٹھایا بلکہ اپنی چادر مبارک ان کے لیے بچھا دی، سرکارِ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور انہیں بھی سرکار نے منبر پر بلا لیا، یہ اباً حضور کے نیچے کھڑے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان فرمائی، انبیاء کرام علیہم السلام پر درود بھیجا پھر فرمایا: یہ وائل بن حجر ہیں تمہارے پاس حضرموت سے آئے ہیں، بغیر کسی دباؤ کے مطیع ہو کر آئے ہیں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اس کے دین کی محبت میں حاضر ہوئے ہیں، شہزادوں میں ان کا شمار ہوتا ہے پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے اور ان کی اولاد کے لیے دعائے برکت فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب وائل بن حجر کو رخصت فرمایا تو حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ان کے ساتھ کر دیا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ فلاں زمین ان کے حوالے کر دو۔ سخت گرمی میں سفر شروع ہوا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدل چل رہے تھے اور وائل بن حجر اپنے اونٹ پر سوار تھے،

گرمی کی شدت نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیروں کو زخمی کر دیا، وائل بن حجر ایمان تو لے آئے تھے لیکن خوئے شہزادگی ابھی باقی تھی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: مجھے بھی آپ کے پیچھے سوار کر لیں، بجائے اس کے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھالیتے، ایک سخت جواب دیا: میں سواری پر کن جوس تو نہیں ہوں لیکن تم شہزادوں کے ساتھ بیٹھنے کے لائق نہیں ہو، یہ سن کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: تو پھر آپ کے جوتے مجھے دے دیجیے تاکہ میں انہیں پہن کر گرمی سے بچ سکوں اور راہ چل سکوں، پھر بڑا کڑوا جواب دیا، کہا: میں جوتوں کو لے کر بخیل نہیں لیکن تم شہزادوں کے لباس پہننے کے اہل نہیں، اگر تمہیں تکلیف ہو رہی ہے تو تم میری سواری کے سائے میں چلتے رہو، تمہیں شرف پانے کے لیے میری سواری کے سائے میں چلنا کافی ہے۔ (التاریخ الکبیر، ج: ۸، ص: ۱۷۶، الثقات لابن حبان باب الواو، ج: ۳، ص: ۴۲۵، تہذیب التہذیب حرف الواو، ج: ۳۵، ص: ۱۰، مشاہیر علماء الامصار، ج: ۱، ص: ۴۴، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۵۷۴، تاریخ ابن خلدون، ج: ۲، ص: ۴۷۷)

آپ نے دیکھا کہ حضرت وائل بن حجر نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیسے سخت جوابات دیے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت ہی تحمل سے انہیں برداشت کر لیا، نہ تو حضرت وائل بن حجر کو پلٹ کر کچھ سخت و سست کہا اور نہ ہی انہیں راستے میں چھوڑ کر واپس ہوئے، کیونکہ ان کی نظر کے سامنے فرمان رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تھا، جس پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمل کرنے کے لیے کوئی بھی قیمت چکانے کے لیے تیار تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کام پورا کر کے واپس لوٹے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور پورا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، سرکار نے سن کر ارشاد فرمایا: ”بے شک ان میں جاہلیت کے عیبوں میں سے یہ عیب ابھی تک باقی ہے۔“ (تاریخ مدینہ دمشق، ج: ۶۲، ص: ۳۸۹)

اب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزید حلم دیکھیے، بڑوں کی باتیں بڑی اور

عادتیں اچھی ہوتی ہیں، ایک وقت وہ آیا جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری مملکت اسلامیہ کے خلیفہ تسلیم کر لیے گئے تو یہی وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو پہچان لیا، پر تپاک استقبال کیا، اپنے پاس اپنے تخت پر بٹھایا پھر وہ گزرا ہوا واقعہ یاد دلایا، حضرت وائل بن حجر نے واقعہ سن کر کہا: کاش! میں نے آپ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا ہوتا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس وقت انہیں شاندار تحفہ دینا چاہا لیکن حضرت وائل بن حجر نے کہا: یہ تحفہ آپ اسے دے دیں جسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہو۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۷، ص: ۳۳۱)

قارئین غور کر سکتے ہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اخلاقی قد کس قدر بلند ہے کہ جس شخص نے انہیں اپنے پیچھے بٹھایا نہ اپنا جوتا دیا، بلکہ دھوپ میں ننگے پاؤں چلا کر زخمی کر دیا اس کے ساتھ بھی کتنی فراخ دلی اور محبتوں کے ساتھ ملاقات فرمائی۔

خشیت الہی سے رونا: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے سینے میں ایسا دل رکھتے تھے جو خوف خدا اور خشیت ربانی سے معمور تھا، ہم اپنے دعوے کی تائید میں سنن ترمذی شریف کی ایک طویل حدیث ذکر کر رہے ہیں اگرچہ حدیث کا ابتدائی حصہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا تاہم فوائد کثیرہ پر مشتمل ہے، اس لیے ہم مکمل حدیث ذکر کریں گے:

”ولید بن ابی ولید ابو عثمان مدائنی سے مروی ہے، ان سے عقبہ بن مسلم شفی اصبی نے نقل کیا کہ وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا، ایک آدمی کے گرد کچھ لوگ جمع ہیں، انہوں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا: یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، فرماتے ہیں: میں ان کے قریب ہو گیا، یہاں تک کہ ان کے بالکل سامنے بیٹھ گیا، آپ لوگوں سے حدیث بیان کر رہے تھے، جب خاموش ہوئے اور تنہا رہ گئے تو میں نے عرض کیا: میں آپ سے بحق فلاں و فلاں عرض کرتا ہوں کہ مجھے کوئی حدیث سنائیں، جسے آپ نے

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا سمجھا اور جانا ہو، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اچھا میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا، سمجھا اور جانا ہے۔ پھر آپ سسکیاں لینے لگے یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے، ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر آپ کو افاقہ ہوا تو فرمایا: میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں جسے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس مقام پر مجھ سے بیان فرمایا، ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا آدمی یہاں نہ تھا پھر آپ سسکیاں لینے لگے یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا تو منہ پونچھا اور فرمایا: میں تم سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں جسے حضور نے مجھ سے اس مقام پر بیان فرمایا، یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سسکیاں لینے لگے، یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر منہ کے بل جھک گئے۔

میں نے کافی دیر تک آپ کو سہارا دیا پھر جب ہوش آیا تو فرمایا: مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: ”جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ بندوں کی طرف نظر فرمائے گا تاکہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے، تمام امتیں گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوں گی، سب سے پہلے تین آدمیوں کو بلا یا جائے گا:

(۱) جس نے قرآن یاد کیا ہوگا۔

(۲) جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیا گیا ہوگا۔

(۳) زیادہ مالدار شخص۔ اللہ تعالیٰ اس قاری سے فرمائے گا: کیا میں نے

تمہیں وہ کلام نہ سکھایا جسے میں نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اتارا؟ عرض کرے گا: ہاں یا رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے اپنے علم کے مطابق کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا میں رات دن اس کی تلاوت کرتا رہا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا، فرشتے بھی کہیں گے: تو جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو چاہتا تھا کہ کہا جائے فلاں قاری ہے پس تجھے کہا گیا۔ دولت مند کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے میں نے مال میں اتنی وسعت نہ دی کہ تجھے کسی کا محتاج نہ رکھا؟ وہ عرض کرے گا: ہاں، یا رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میری دی ہوئی

دولت سے کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے قرابت داروں سے صلہ رحمی کی، خیرات کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے تو جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید فرمائے گا: تو چاہتا تھا کہ کہا جائے فلاں بڑا سخی ہے سو ایسا کہا جا چکا۔ پھر شہید کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو کس لیے قتل ہوا، وہ کہے گا: تو نے اپنے راستے میں جہاد کا حکم دیا، پس میں نے لڑائی کی یہاں تک کہ شہید ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: تو جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری نیت یہ تھی کہ لوگ کہیں بڑا بہادر ہے۔ پس یہ بات کہی گئی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میرے زانو پر مارتے ہوئے فرمایا ”اے ابو ہریرہ! اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے پہلے انہیں تین آدمیوں سے جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔

ولید بن ابوعثمان مدائنی کہتے ہیں: مجھے عقبہ نے بتایا کہ یہی شفی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور انہیں حدیث سنائی، ابوعثمان کہتے ہیں: مجھے علاء بن حکیم نے بتایا کہ یہ شفی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جلاد تھے، کہتے ہیں: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے خبردار کیا، سن کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ان تینوں کا یہ حشر ہے تو باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ پھر آپ بہت روئے، یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا شاید جان دے دیں گے اور ہم نے کہا: یہ آدمی ہمارے پاس شتر لے کر آیا ہے پھر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہوش آیا تو آپ نے چہرہ پوچھا اور کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا: ”مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَتْهَا نُوفٍ إِلَيْهِمْ أَحْمَأَلَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۚ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝“ (سورہ ہود، آیت: ۱۵) جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں ان کے اعمال کا بدلہ ہم دنیا ہی میں پورا دے دیتے ہیں اور اس میں ہم کچھ کمی نہیں کرتے ان لوگوں کا آخرت میں کوئی

حصہ نہیں انہوں نے جو کچھ دنیا میں کیا ضائع ہو گیا اور ان کے اعمال باطل ہو گئے۔

(سنن الترمذی، کتاب الزہد باب الریا والسمعة)

حدیث کے آخری حصے سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابی رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک خدا ترس، نرم دل اور عذاب الہی کو یاد کر کے رونے والے انسان تھے۔

عشق رسول اور نسبتوں کا احترام: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی رسول ہونے کے ساتھ ساتھ کاتب وحی بھی رہی رہے تھے، کاتب وحی ہونے کی وجہ سے حضور کی صحبت سے خوب فیض پایا، عشق رسالت اور محبت رسول سے دل کا گلشن خوب برگ و بار لا کر لہلہایا، جس کے ثمرات حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی سے ظاہر ہوتے رہے، اس سلسلے میں ہم چند تاریخی شواہد نظر قارئین کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں ام علقمہ کے ذریعے درخواست پیش کی کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی انجانیہ چادر پاک اور موئے مبارک انہیں عطا فرمائیں، ام المؤمنین نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درخواست قبول کرتے ہوئے دونوں تبرکات حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ام علقمہ کے ذریعے بھیجوا دیے، ام علقمہ فرماتی ہیں: میں جب یہ دونوں تحفے لے کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچی تو چادر مبارک کو مجھ سے لے کر اوڑھ لیا اور حضور کے موئے مبارک کو پانی میں ڈال کر دھویا پھر وہ پانی پیا اور اپنے بدن پر ڈال لیا۔ (طبقات ابن سعد، ج: ۶، ص: ۱۸، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۳۱، سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۲۸)

شوق دیدار: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں بصرہ میں کابلس بن ربیعہ نامی ایک شخص تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ وہ شکل و صورت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بہت مشابہت رکھتے ہیں، یہ سنتے ہی

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اپنے پاس بلایا اور جب تک وہ نہیں آئے آپ ان کے لیے بے قرار رہے، آخر وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں تشریف لائے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیدار سے شاد کام ہوئے، ان کی دونوں آنکھوں کے بیچ بوسہ دیا اور بیش قیمت تحائف عطا فرمائے، یہ وہی کابس بن ربیعہ ہیں جن کو دیکھ کر حضرت انس رو پڑے تھے (حضور کی یاد تازہ ہو جانے کی وجہ سے) اور فرمایا تھا: یہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔

(تاریخ دمشق، ج: ۵۰، ص: ۴، المؤلف والمختلف للدارقطنی، ج: ۲، ص: ۱۲۶)

محبوب کی خواہش: حضرت جبکہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا، یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ خلیفہ تھے، میں نے دیکھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گلے میں ایک رسی پڑی ہوئی ہے اور ایک بچہ انہیں کھینچ رہا تھا، میں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ اور یہ کام؟ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے بے وقوف! خاموش رہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس کے پاس بچہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ بھی بچکانا پن کر لیا کرے۔ (تاریخ الخلفاء، ص: ۱۶۱)

آخری ایام اور ولی عہد کا انتخاب: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خود اور آپ کے مصاحبین کو آپ کی بڑھتی عمر کا احساس ہو گیا تو بعض مصاحبین نے آپ کو مشورہ دیا کہ امت کو خون خرابے سے بچانے کے لیے آپ اپنے بیٹے یزید (پلید) کو اپنا ولی عہد بنادیں کیوں کہ ہم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد بہت کچھ دیکھ چکے ہیں، اس تجویز کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منظور فرمالیا اور یزید پلید کو اپنا ولی عہد منتخب فرما دیا۔ (سمط النجوم العوالی فی انباء الاولاد والاولیاء، ج: ۲، ص: ۶۵؛ الکامل فی تاریخ، ج: ۳، ص: ۳۴۹)

بعض ذہنوں میں یہ خیال گزرتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

یزید جیسے بد بخت کو اپنا ولی عہد کیوں بنا دیا؟ اس کا جواب صحابہ کرام کے مقام کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کے کرتوتوں کا علم نہیں تھا ورنہ وہ ہرگز اس کو اپنا جانشین نہیں بناتے، جیسا کہ آنے والی تاریخی روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آکر شکایت کی کہ آپ نے یزید کو ولی عہد بنا دیا حالانکہ میں اس سے افضل ہوں اپنی ذات کے اعتبار سے اپنے باپ اور اپنی ماں کے اعتبار سے، اس پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا بے شک تمہارے باپ مجھ سے افضل ہیں اور تمہاری ماں یزید کی ماں سے افضل ہے، اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں لیکن تمہارا یہ کہنا کہ تم یزید سے افضل ہو تو مجھے یہ بات منظور نہیں، خدا کی قسم! اگر مقام غوطہ تم جیسے افراد سے بھر جائے پھر بھی یزید ان سب سے بہتر اور میری نظر میں سب سے محبوب ہے۔ (تاریخ طبری، ج: ۳، ص: ۳۰۵، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۳۰۶)

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر میں یزید بدکردار نہیں تھا، ورنہ آپ وہ جملے نہ کہتے جو آپ نے کہے اور یہ بھی کہ انہوں نے جو یزید کو حضرت سعید سے افضل بتایا وہ خاندان کی حیثیت سے نہیں بلکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر میں وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے حضرت سعید سے بڑھ کر تھا، یہ الگ بات ہے کہ یزید سے متعلق آپ کی یہ معلومات صحیح نہیں تھیں۔

ایک اور روایت جو آپ کے خطبے کا اقتباس ہے، اس سے بھی صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ نے یزید کو اپنا جانشین اپنے علم کے مطابق اس کی لیاقت اور قابلیت کے اعتبار سے بنایا تھا، آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا: ”اللہم ان کنت عہدت لی یزید لہا رایت فی فضلہ فبلغہ ما املت واعنہ وان کنت انما حملنی حب الوالد لولدہ وانہ لیس لہا صنعت بہ اہلا فاقبضہ قبل ان یبلغ ذالک“۔ (تاریخ الاسلام للذہبی، ج: ۴، ص: ۱۶۹، سبط النجوم العوالی فی انباء الاول والاولی، ج: ۲، ص: ۷۲، تاریخ الخلفاء، ج: ۱، ص: ۱۶۴)

”اے اللہ! میں نے یزید کو اپنا ولی عہد اس کی قابلیت و فضیلت کی وجہ سے بنایا ہے، اے اللہ! جو میں نے اس سے امید لگائی ہے تو اسے پورا فرما دے اور اس کی مدد فرما اور اگر یہ میرا فیصلہ صرف باپ سے بیٹے کی محبت کی حد تک ہے اور یہ حقیقت میں اس منصب کا اہل نہیں تو اس کو خلیفہ بننے سے پہلے موت عطا فرما۔“

دوسرے خطبے کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں: ”اللہم ان کنت تعلم انی ولیتہ لانہ فیما اراد اہل لذلک فاتمہ لہ ما ولیتہ وان کنت ولیتہ لانی احبہ فلا تتمم لہ ما ولیتہ“ اے اللہ! اگر میں نے اسے اس لیے ولی عہد بنایا ہے کہ یہ اس کا اہل ہے تو تو اس کی ولی عہدی کو پورا فرما دے اور اگر میں نے اسے اس لیے ولی عہد بنایا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو تو اس کی ولی عہدی کو پورا نہ فرما۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۳۰۸)

یہ تاریخی حقائق ہمیں یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے علم کے مطابق یزید کو خلافت کا اہل جانتے تھے، لہذا فتنہ و فساد اور خوں ریزی سے امت کو بچانے کے لیے انہوں نے یزید کو اپنا ولی عہد منتخب کر دیا اور انسان اسی کا مکلف ہے جسے وہ جانتا ہے، اگرچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ توقعات پوری نہ ہو سکیں جو آپ نے یزید سے وابستہ کی تھیں، یزید اپنے آباء و اجداد کے لیے باعث ننگ و عار ٹھہرا اور نواسہ رسول جگر گوشہ بتول فرزند مولائے کائنات حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خون سے اس نے اپنے ہاتھوں کو رنگین کیا اور اس کے سوا کیا کیا قیامت امت پر ڈھائی؟ جس کا بیان الفاظ کے احاطے سے باہر ہے لیکن اس کے جرم کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر باندھنا علم شریعت سے جہالت، دین سے دوری اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بلند مقام سے ناواقفی کی دلیل ہے جو انسان کو بد مذہبیت کے غار عمیق میں دھکیل دیتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو کفر کی سرحدوں میں داخل کر دیتی ہے۔ العیاذ باللہ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وصیت: ہشام کہتے ہیں کہ عوانہ نے کہا: ہم نے آخری بات یہ سنی کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کا وقت

جب قریب آیا اور یہ ۶۰ ہجری کی بات ہے، اس وقت یزید دمشق میں موجود نہ تھا بلکہ وہ وہاں سے غائب تھا، آپ نے اپنی پولیس کے سب سے اعلیٰ افسر ضحاک بن قیس فہری مسلم بن عقبہ مری کو بلایا اور ان دونوں کو یزید کے لیے وصیت کی اور حکم دیا کہ میری یہ وصیتیں یزید کو پہنچا دینا:

- (۱) اہل جاز کا خیال رکھنا کیونکہ وہ تیری اصل ہیں، ان میں سے جو بھی تیرے پاس آئے اس کا اکرام بجالانا اور جو نہ آ سکے اس کی بھی نگہداشت کرنا۔
- (۲) اہل عراق کا خیال رکھنا، اگر وہ تجھ سے روزانہ اپنے حاکم کو بدلنے کا مطالبہ کریں تو تو ان کے مطالبے کو پورا کرنا کیونکہ میرے نزدیک عامل کو معزول کر دینا اس سے بہتر ہے کہ تیرے خلاف ایک لاکھ تلواریں میان سے باہر ہو جائیں۔
- (۳) اہل شام کے حال پر نظر رکھنا، ان کو اپنا ہم راز بنائے رکھنا، کبھی دشمن سے مقابلہ درپیش ہو تو ان سے مدد حاصل کرنا جب معرکہ سر ہو جائے تو انہیں شام واپس بلا لینا کیونکہ اگر شامی لوگ دوسرے دیار میں ٹھہریں گے تو اسی اخلاق کے عادی بن جائیں گے پھر دیگر حضرات سے متعلق نام بنام آپ نے وصیتیں کیں حضرت امام عالی مقام امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ایک خاص وصیت کی، اگر اہل عراق حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تیرے مقابلے پر لے آئیں تو یاد رکھنا ان کا بہت بڑا حق ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انہیں بہت قربت حاصل ہے اگر تو ان پر قادر ہو جائے تو عفو و درگزر سے کام لینا اگر میرا معاملہ ان کے ساتھ ہوتا تو میں معاملے کو درگزر کرتا۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۲۳)

حضرت امیر معاویہ کا آخری خطبہ: عبیدہ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا: میں وہ کھیتی ہوں جس کو کاٹ دیا گیا ہے، میری امارت لمبی ہوئی، تمہارا دل مجھ سے بھر گیا اور میں تم سے اکتا گیا ہوں، اب مجھ سے بہتر تمہارے پاس کوئی امیر نہیں آنے والا، جیسا کہ جو مجھ سے پہلے خلفاء ہوئے وہ مجھ سے بہتر

تھے، اے اللہ! میں نے تیری ملاقات کو پسند کیا ہے تو میری ملاقات کو قبول فرمالے۔

(سیر اعلام النبلاء، ج: ۳، ص: ۱۵۹)

مرض وصال: جب آپ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے وصیت فرمائی: میرا آدھا مال بیت المال کو واپس کر دیا جائے انہوں نے اپنے اس فعل سے اپنے مال کو طیب کرنے کا ارادہ فرمایا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمال کو اس کی قسم دے رکھی تھی۔ آپ کو آخری عمر میں سردی بہت لگنے لگی تھی، اس کو دفع کرنے کے لیے کئی تدبیریں اختیار کی گئیں لیکن عارضہ دور نہ ہو سکا، جب آپ کا مرض شدید ہو گیا تو آپ نے فرمایا: افسوس ہے اس دنیا پر، اے دنیا! تجھ پر چالیس سال تک میری حکمرانی رہی بیس سال بحیثیت امیر اور بیس سال بحیثیت خلیفہ پھر بھی میرا یہ حال اور انجام ہے، تباہی ہے دنیا اور اس کے عاشقوں کے لیے۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۵۵)

جب مرض نے شدت اختیار کی اور لوگ موت کی باتیں کرنے لگے تو آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا: میری آنکھوں میں سرمہ اور سر پر تیل لگاؤ، آپ کے حکم پر عمل کیا گیا اور چہرے کو بھی تیل لگا کر چکا دیا گیا، مجلس منعقد کی گئی، آپ ٹیک لگا کر بیٹھے، فرمایا: لوگوں کو اجازت دے دو کہ وہ کھڑے کھڑے سلام کرتے جائیں کوئی یہاں بیٹھے نہیں، لوگ سلام کرتے ہوئے گزرتے امیر المومنین کو سرمہ لگائے تیل ڈالے دیکھتے تو آپس میں تذکرہ کرتے: امیر المومنین تو تندرست ہیں، جب لوگ چلے گئے تو آپ نے دوشعر گنگنائے جن کا حاصل یہ تھا میں گردش زمانہ کے سامنے عاجزی کرنے والا نہیں اور موت سے کوئی چیز کسی کو نہیں بچا سکتی۔ (البدایہ والنہایہ، ج: ۱۱، ص: ۴۵۶)

وصیت میں عشق رسول: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا: ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، میں (وضو کرانے کے لیے) برتن لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آیا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (خوش ہو کر) مجھے اپنا وہ پیرہن عطا فرمایا جو آپ کے بدن پاک پر موجود تھا، میں نے اسے اسی دن کے لیے سنبھال کر رکھ لیا

تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ ناخن اور موئے مبارک بھی مجھے حاصل ہوئے، وہ بھی میں نے اسی دن کے لیے محفوظ رکھے تھے، جب میرا وصال ہو جائے تو اس قمیص کو میرا کفن اس طور پر بنانا کہ حضور کی پہنی ہوئی قمیص میرے بدن سے لگی رہے، یہ بال اور ناخن میرے منہ، آنکھ اور مواضع س جود پر رکھ دینا اگر کوئی چیز فائدہ دے گی تو یہی ہے۔ اللہ رب العالمین غفور ورحیم ہے۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج: ۱، ص: ۶۷۰)

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار پڑے اس وقت ان کا بیٹا یزید غائب تھا، ان کے پاس موجود نہ تھا، آپ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ نے وصیت فرمائی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قمیص میں کفن دینا جو حضور نے مجھے خود پہنائی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ناخن میرے پاس ہیں ان کو پاؤں بنا کر میری آنکھوں اور منہ پر لگا دینا پھر مجھے رحم الراحمین کے حوالے کر دینا۔ (اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۲۰۳)

وصال: موت سے کس کو رستگاری ہے۔ وہی امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس نے چالیس سال تک امیر اور خلیفہ ہو کر دنیا پر حکومت کی، اب اپنے آپ کو ملک الموت کے حوالے کرنے کی تیاری پوری کر چکے ہیں، امید زلیست منقطع ہو چکی ہے، آخری سانس گن چکے ہیں اور آخری الفاظ بول چکے ہیں۔ موت کے وقت آپ نے یہ بھی فرمایا: اے کاش! میں ذی طوی کا معمولی قریشی ہوتا، اے کاش! مجھے کسی معاملے کا والی نہ بنایا جاتا۔ (ایضاً)

اس کے بعد آپ پر غشی طاری ہو گئی پھر ہوش آیا تو آپ نے حاضرین سے فرمایا: ”اللہ عزوجل سے ڈرو، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بچا لیتا ہے اور جو اس سے نہیں ڈرتا اسے کوئی نہیں بچا سکتا“ اس کے بعد آپ کا وصال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۷۷)

جب آپ کا وصال ہو چکا تو ضحاک بن قیس نے کفن اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر منبر پر کھڑے ہو کر خطاب کیا: امیر المومنین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرب کی فصیل اور عربوں کی لاشی تھے، اللہ نے آپ کے ذریعے فتنے کو مٹایا، آپ کو حکومت عطا فرمائی،

آپ کے لشکروں کو بحر و بر کی سیر کرائی، بے شک معاویہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبولیت کا جامہ پہنایا، اب وہ دنیا چھوڑ کر اپنی موت سے ملاقات کر چکے ہیں، یہ دیکھئے ان کا کفن ہمارے ہاتھوں میں ہے، اب ہم ان کو قبر میں داخل کر کے ان کے عمل کے ساتھ تنہا چھوڑ دیں گے، اس کے بعد اب قیامت تک وہ عالم برزخ میں رہیں گے جو شخص ان کا دیدار کرنا چاہے وہ نماز کے وقت حاضر ہو جائے۔

(تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۲۸)

نماز جنازہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز جنازہ ضحاک بن قیس فہری نے پڑھائی کیونکہ یزید آپ کی وفات کے وقت وہاں موجود نہ تھا۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۲۷)

تاریخ وصال: اس بات پر سب متفق ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ماہ رجب ۶۰ ہجری میں ہوئی، البتہ تاریخ وفات کو لے کر اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام واقدی کے مطابق ۱۵ رجب، علی بن محمد کے مطابق بروز جمعرات ۲۲ رجب المرجب کو آپ کی وفات ہوئی۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۲۴)

وقت وصال آپ کی عمر: وقت وصال آپ کی عمر کتنی تھی؟ اس سلسلے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کی عمر کے سلسلے میں ۷۳ / ۷۵ / ۷۸ / اور ۸۰ سال کے اقوال تاریخ میں درج ہیں۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۲۵) واللہ اعلم بالصواب

مدت خلافت: جمادی الاولیٰ ۴۱ھ میں حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت سونپ کر آپ کی بیعت کی، جس کے بعد آپ پوری ملت اسلامیہ کے خلیفہ تسلیم کر لیے گئے۔ رجب ۶۰ ہجری میں آپ کا وصال ہوا، اس طرح ۱۹ سال تین ماہ آپ کی خلافت قائم رہی۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص: ۳۲۴)

امارت و خلافت کی کل مدت: آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں تقریباً چار سال دمشق کے والی رہے، ۱۲ سال حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں آپ کو اپنی طرف سے دمشق کا حاکم متعین کیا، بلکہ پورے شام پر

آپ کو حاکم بنادیا اور تقریباً چار سال حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں آپ دمشق کے (ازخود) حاکم بنے رہے اور چھ ماہ حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں بھی آپ (ازخود) حاکم بنے رہے، اس طرح آپ تقریباً بیس سال امت کے امیر رہے اور پھر بیس سال پوری امت کے خلیفہ رہے، کل آپ کا دور حکومت تقریباً ۴۰ سال کو محیط ہے۔ (اسد الغابہ، ج: ۵، ص: ۲۰۳)

علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور حکومت ۴۳ سال پر محیط ہے انہوں نے جتنے طویل عرصے تک جس قدر وسیع و عریض علاقے پر کامیاب حکومت کی، وہ ان کے کسی پیشرو خلیفہ کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کے ایام حکومت میں اسلامی فتوحات مشرق اور مغرب میں تیز و تند سیلاب کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں، خلیفہ منتخب ہونے کے بعد انہوں نے ۲۰ سال تک حکومت کی اور ۸۲ سال کی عمر گزار کر ۲۲ رجب ساٹھ ہجری کو جمعرات کے دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اس طرح انہوں نے ۱۷ ہجری سے لے کر ۶۰ ہجری تک مسلسل حکومت کی اور یہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔

(البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۹۵؛ ایضاً، ج: ۸، ص: ۱۴۳، بحوالہ مقالات سعیدی، ص: ۲۲۴)

ازواج و اولاد: تاریخ طبری اور الکامل فی التاریخ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی چار بیویوں کا ذکر ہے (۱) میسون بنت بحدل (۲) فاختہ بنت قرظہ (۳) کتوہ بنت قرظہ یہ فاختہ کی بہن تھی فاختہ کی طلاق کے بعد آپ نے اس سے نکاح فرمایا (۴) نائلہ بنت عمارہ۔ معاویہ بن ابی سفیان کے مصنف نے تیسری بیوی کتوہ کی جگہ کنود بنت قرظہ کا نام لکھا ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تین بیٹے تھے (۱) یزید (پلید) اس کی ماں میسون بنت بحدل ہے (۲) عبدالرحمن (۳) عبداللہ، آپ کا یہ تیسرا بیٹا عبداللہ بیوقوف اور جسمانی اعتبار سے کمزور تھا، جو کسی لائق نہ تھا اور عبدالرحمن کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا، یزید آپ کے بعد زندہ رہا، جو آپ کے بعد بادشاہ بنا۔ (اے کاش! یزید پلید بچپن ہی میں مر گیا ہوتا تو اہل بیت نبوت

بالخصوص اور پوری امت بالعموم اس کے ظلم و ستم اور عدوان و طغیان سے محفوظ ہو جاتی)۔
 آپ کی ایک بیٹی کا ذکر طبری میں ہے، اس کا نام امۃ رب المشارق تھا، جس کی ماں
 میسون بنت بحدل تھی۔ معاویہ بن ابی سفیان کے مصنف نے آپ کی ۵ اور بیٹیوں کا ذکر
 بھی کیا ہے: (۱) رملہ (۲) ہند (۳) عائشہ (۴) عاتکہ (۵) صفیہ۔ (تاریخ طبری، ج: ۵، ص:
 ۳۲۹، الکامل فی التاريخ، ج: ۳، ص: ۳۵۷، معاویہ بن ابی سفیان، ج: ۱، ص: ۲۷)

یہ تھی ایک ایسے خوش نصیب انسان کی سیرت جسے جلیل القدر صحابی ہونے کے ساتھ ساتھ
 کاتب وحی اور پہلے اسلامی بحری بیڑے کے موجد ہونے کا اعزاز حاصل ہے، زبان رسالت مآب
 سے متعدد مرتبہ دعائیں حاصل کرنا بھی آپ کی تقدیر کا عظیم حصہ ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ کی زندگی خدمت اسلام کا ایک عظیم باب ہے، آپ نے اپنی مجاہدانہ مساعی کے ذریعے
 اسلام کی سرحدوں کو خوب وسیع فرمایا اور تقریباً آدھی دنیا پر اسلام کی عظمتوں کا پرچم لہرایا، زمانے کو
 خدمت اسلام، خوف خدا، اتباع سنت اور عشق رسول کا عظیم درس دیا۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی خدمات کو
 قبول فرمائے اور ہمیں ان کی سیرت کے درخشندہ گوشوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود
 ان کے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام
 جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
 اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
 وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَحْمِيْدًا وَنُصْلًا عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلَىٰ آلِهِ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ

حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اجمالی تعارف: اللہ تبارک و تعالیٰ اس پوری کائنات کا تنہا خالق و مالک ہے، مومن، غیر مومن، عابد اور غیر عابد سب اسی کے بندے ہیں، وہ اہل ایمان سے راضی رہتا ہے، اہل کفر پر غضب فرماتا ہے، متقین مخلصین پر خصوصی کرم فرماتا ہے، کبھی کبھی اہل تقویٰ آزمائش و ابتلا کے ایسے نازک بھنور میں پھنس جاتے ہیں کہ ظاہر میں لوگ انہیں ہلاک شدہ سمجھ کر ان کی طرف سے نظر التفات پھیر لیتے ہیں، عین اسی حالت میں دست غیب سے ان کی یاری ہوتی ہے، رب کی رحمتیں ان کی غم خواری کرتے ہوئے نجات و سر بلندی کی نئی راہیں کشادہ فرماتی ہیں اور یہ حضرات فائز المرام ہو کر دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوتے ہیں پھر فلاح و بہبود اور تقویٰ و طہارت کی نئی تاریخ رقم کرتے ہیں۔

کتاب کی جلد اول میں آپ نے ایک صحابی کا تذکرہ پڑھا ہے جنہیں حضرت سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عبادت و ریاضت اور دنیا سے کنارہ کشی میں اپنی مثال آپ ہیں، جن کی پاک بازی اور دنیا سے بے رغبتی نے امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس بات پر برا بھینٹہ کیا تھا کہ وہ حضرت سعید کو حمص کا والی بنائیں۔ حضرت سعید کے ہزار انکار کے بعد بھی امیر المؤمنین نے ذمہ داری کا قلابہ ان کی گردن میں ڈال دیا تھا جس کو گلے سے نکالنے کی ہمت حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے پاس نہیں تھی۔ موجودہ صفحات میں ایک ایسے صحابی کا تذکرہ ہے جو تقویٰ و طہارت، قناعت پسندی اور زہد و پرہیز گاری میں حضرت سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جڑواں بھائی کی طرح ہے، جو صفائے نفس اور

بلند کرداری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، جن کے والد محترم جنگ بدر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شریک کار رہے، جو صحابہ میں ایک سچے عابد کے طور پر مشہور ہوا، تمام صحابہ میں ”نسیج وحدہ“ کا مبارک لقب صرف اسی صحابی کو حاصل ہوا۔ مدوح مذکور کا مبارک نام حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے۔

نوٹ: مطالعہ کے دوران ایک اردو میگزین میں ڈاکٹر عبدالرحمن کے قلم سے لکھا ہوا حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ نظر سے گزرا جو حوالوں سے بالکل خالی تھا، ڈاکٹر صاحب کون ہیں؟ ہم نہیں جانتے لیکن زبان اچھی تھی اس مضمون کے بعض اقتباسات وہیں سے لیے گئے ہیں۔

نام و نسب: حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نسب نامے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب الاصابۃ میں ان کے نسب کو اس طور پر بیان کیا ہے (۱) عمیر بن سعد بن عبید بن نعمان بن قیس بن عمرو بن عوف۔ یہ نسب نامہ علامہ واقدی نے بیان فرمایا ہے، علامہ ابن عبدالبر نے علامہ واقدی کی مطابقت کی ہے۔

(۲) ابن کلبی کے بیان کے مطابق آپ کا نسب اس طور پر ہے: عمیر بن سعد بن شہید بن عمرو بن زید بن امیہ بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس انصاری۔ (الاصابۃ، ج: ۵، ص: ۳۲)

رجال حول الرسول کے مصنف نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کا نام سعد القاری لکھا ہے اور شرکائے بدر میں ان کا شمار فرمایا، پھر اپنی کتاب کے اسی صفحہ پر مصنف مذکور نے حاشیہ لکھتے ہوئے وضاحت فرمائی ہے: ہمارا یہ بیان امام ابن سعد کے قول کے مطابق ہے جس کو امام ممدوح نے طبقات کبری، ج: ۴، ص: ۳۷ پر بیان کیا ہے۔ آپ مزید لکھتے ہیں: علامہ ابن ہشام نے سیرت ابن ہشام، ج: ۱، ص: ۵۱۹ پر حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کا نام سعد بتایا ہے لیکن یہ وہ سعد نہیں جو جنگ بدر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ (حاشیہ رجال حول الرسول، ص: ۲۸۰)

امام ابن نعیم نے بھی معرفۃ الصحابہ میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد سعد القاری ہیں، جو جنگ بدر میں شریک رہے، جنہوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع قرآن کی خدمت انجام دی۔ (ج: ۴، ص: ۲۰۸۶، تذکرہ نمبر: ۲۱۷۹)

والد کا انتقال: حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابھی بچے ہی تھے کہ ان

کے والد بزرگوار حضرت سعد اس دنیا کو خیر آباد کہہ کر جنان رحمن میں جا بسے، نو عمر حضرت عمیر کی زندگی یتیمی کے بھیانک اندھیروں کی چپیٹ میں آگئی، کسی بھی بچے کے لیے یتیمی اپنے آپ میں ایک بڑی مصیبت ہے، یہ مصیبت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب مرنے والے نے وارثین کے لیے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا ہو۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس طور پر یتیم ہوئے تھے کہ والد محترم نے ان کے لیے مال و دولت کے نام پر کچھ بھی نہ چھوڑا تھا۔ ہمارے قارئین پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ اہل عرب کی معاشرتی زندگی کئی معاملات میں ہندوستانیوں سے جدا تھی، ہمارے یہاں عموماً شوہر کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ دوسرا نکاح کرنا پسند نہیں کرتی لیکن عربوں میں اس کا خوب چلن تھا۔ زمانہ رسالت میں عام طور پر بیوہ عورتیں اپنی عدت گزارنے کے بعد کسی مسلمان سے شادی کر لیتیں اور بچی ہوئی زندگی اس کے ساتھ گزار لیتیں۔ شریعت مطہرہ نے ایسا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے بلکہ عزت و پارسائی کی حفاظت کی خاطر اگر کوئی بیوہ عورت عدت گزار کر دوسرا نکاح کرتی ہے تو وہ قابل تحسین ہے، قابل ملامت نہیں۔

چنانچہ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ نے بھی جلاس بن سوید نامی ایک شخص سے اپنا نکاح کر لیا۔ نتیجتاً! حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلاس کی سرپرستی اور کفالت میں آگئے۔ اگرچہ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پاس مال و دولت نہ تھا لیکن جلاس نے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورش خوب سے خوب تر کی تھی، جلاس کے الطاف کریمانہ کی وجہ سے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی جلاس سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگے تھے، جلاس کے احسانات کا حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دل سے اعتراف تھا اور ان احسانات نے حضرت

عمیر کی نظر میں جلاس کو سب سے زیادہ محبوب بنا دیا تھا۔ (السيرة الجلیلة، ج: ۲، ص: ۳۷۸)

جلاس نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیار و محبت کا وہ ماحول فراہم کیا تھا کہ یتیمی میں آنے والی تکالیف کو یکسر دور کر دیا اور حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے احساس یتیمی جاتا رہا، ادھر حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بچپن نشو و نما پا رہا تھا اور ادھر جلاس خوشیوں سے پھولے نہ سماتا تھا کیوں کہ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کا معنوی حسن بھی پروان چڑھ رہا تھا، اخلاقی خوبیاں ترقی پر تھیں، بچپن کے پیرہن میں ڈھکی دماغی و جسمانی صلاحیتوں میں نکھار آ رہا تھا، اس کے تمام اعمال و افعال سے ذہانت و فطانت، نجابت و شرافت، امانت و صداقت کی بھینی بھینی خوشبو پھیلنا شروع ہو گئی تھی جو اس کے روشن مستقبل کا پتہ دے رہی تھی۔ (صو من حیاة الصحابة، ص: ۲۴۱)

بالائے سرش زہوش مندی می تافت ستارہ بلندی (شیخ سعدی)

قبول اسلام: حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد سعد القاری ہیں جو حضور کے بدری صحابی ہیں ان کے گھر حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس گھر کا ماحول جنت نشاں ماحول رہا ہوگا، اسی ماحول میں حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنکھ کھولی، جتنے دن والد کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ایمان کی باد بہاری سے مست ہوتے رہے۔ مختصر یہ کہ ان کے والدین مسلمان تھے، یہ بھی شروع ہی سے مسلمان رہے ان کا دامن کفر سے داغدار نہ ہوا، شاید اسی وجہ سے متقدمین سیرت نگاروں نے (ہمارے مطالعہ کی حد تک) ان کے اسلام لانے سے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔

مشاہیر الصحابة کے مصنف نے لکھا ہے: ”عمیر بن سعد.. الذی بايع الرسول صلى الله تعالى عليه وسلم وهو ما زال غلاما وابوه هو الصحابي الجليل سعد القاري“ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہی ہیں جنہوں نے نوعمری ہی میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی، ان کے والد سعد القاری جلیل القدر صحابی تھے۔ (مشاہیر الصحابة، ج: ۱، ص: ۲۷۸)

جنگ تبوک اور ایثار صحابہ: ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کے لیے تبوک جانے کا اعلان فرمایا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے لیے تیاریاں مکمل کر لیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب آپ کسی غزوے کا ارادہ کرتے تو اسے صاف صاف بیان نہیں فرماتے تھے اور صحابہ کرام متعین طور پر نہ سمجھ پاتے تھے کہ کدھر اور کس سے جنگ ہوگی؟ مگر خلاف معمول غزوہ تبوک کے موقع پر آپ نے صراحت کے ساتھ یہ بات بتائی تھی کہ رومیوں سے جنگ کے لیے تبوک چلنا ہے کیوں کہ تبوک کی یہ مہم بعد مسافت، صعوبت سفر اور دشمن کی طاقت و قوت کے اعتبار سے بہت اہم تھی تاکہ مسلمان اس کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب حال مناسب اور اطمینان بخش تیاری کر لیں۔

اس وقت موسم گرما شروع ہو چکا تھا، دھوپ میں کافی شدت آگئی تھی، بانگوں میں پھل پک کر تیار تھے، سائے گھنے اور خوشگوار ہو گئے تھے اور اس وقت کسی جنگی مہم پر جانا اور ایسا طویل اور دشوار سفر کرنا آسان نہ تھا۔ مگر ان سب کے باوجود اسلام کے شیدائیوں نے نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس اعلان کا بہت خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ البتہ منافقین کی ایک ٹولی اس مہم کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتے جن سے مخلص مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائیں، حوصلے ٹوٹ جائیں اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں، وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر آوازے کستے اور اپنی نجی مجلسوں میں بے محابا ایسی باتیں اپنی زبانوں پر لاتے جو ان کے کفر کی واضح اور روشن دلیل ہوتیں۔

لشکر کی روانگی سے چند روز قبل کی بات ہے، ایک دن حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آئے، وہاں انہوں نے مسلمانوں کے ایثار و قربانی اور جذبہ انفاق فی سبیل اللہ کے جو حسین و دلکش مناظر دیکھے اور ایمان و یقین اور عزم و حوصلہ سے بھرپور جو باتیں سنیں ان سے ان کا پیمانہ دل جوش و مسرت سے لبریز ہو رہا تھا، اس نے

مہاجرین و انصار کی عورتوں کو دیکھا کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے آئیں اور اپنے زیورات اتار کر خدمت اقدس میں پیش کر دیتیں تاکہ آپ مجاہدین کے لیے سامان جہاد فراہم کر سکیں۔ اس نے آنکھوں سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا وہ چمڑے کی ایک تھیلی جس میں ایک ہزار دینار تھے لائے اور اسے بارگاہ نبوت میں پیش کر دیا، اس کی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کندھے پر دو سو اوقیہ سونا لادے چلے آ رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں اس نے تو یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص اپنا بستر فروخت کے لیے پیش کر رہا ہے تاکہ اس کی قیمت سے وہ اپنے لیے ایک تلوار خرید کر جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو سکے۔ (صومن حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۴۳، موارد الطمان، ج: ۶، ص: ۱۷۴)

شان رسالت میں جلاس کی گستاخی: ایک طرف یہ دلکش اور حیرت انگیز مناظرے کے بعد دیگرے اس کے پردہ ذہن پر مرتسم ہو رہے تھے اور دوسری طرف وہ اس افسوس ناک اور حیرت انگیز صورت حال کا سامنا کر رہا تھا کہ جلاس اپنی خوش حالی اور فراخی کے باوجود جنگ کی تیاریوں سے یکسر غافل ہے اور اس کے یہاں اس سلسلے میں کوئی حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ وہ جلاس کو اس کی طرف توجہ دلائے گا اور اس کی ہمت اور حمیت و مروت کو ابھارے گا۔ اس نے جلاس کے سامنے وہ ساری حوصلہ افزا اور ایمان افروز باتیں بیان کرنی شروع کیں جنہیں وہ سن کر آیا تھا اور ان تمام مناظر کی تصویر کشی کرنے لگا جنہیں اس کی آنکھیں دیکھ کر آئی تھیں۔ خاص کر اس نے ان مفلس مسلمانوں کے شوق جہاد کی روداد اسے سنائی جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے اور بڑی لجاجت کے ساتھ یہ درخواست بارگاہ رسالت میں پیش کی کہ انہیں بھی مجاہدین کی صف میں شامل کر لیا جائے، لیکن نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی درخواست اس وجہ سے رد کر دی کہ آپ کے پاس ان کے لیے سوار یوں کا انتظام نہ تھا اور وہ اپنی اس محرومیت پر آنسو بہاتے ہوئے واپس چلے گئے کہ ان کو وہ ساز و سامان میسر نہیں جن

کو لے کر وہ جہاد میں شریک ہوں اور اپنی آرزو پوری کریں۔ لیکن حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ باتیں سنتے ہی جلاس کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جس نے اس کم سن مومن کے ہوش اڑا دیے، اس نے کہا: اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پیش کر رہا ہے تو ہم سب لوگ گدھوں سے بھی بدتر ہیں، جلاس کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سن کر حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے، یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں نہ تھی کہ جلاس جیسے تجربہ کار جہاندیدہ اور صاحب فہم و شعور شخص کے منہ سے ایسی بات نکلے گی جو اسے یکا یک دائرۂ ایمان سے نکال کر حلقۂ کفر میں داخل کر دے گی۔ (صومن حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۴۲، موارد الطمان، ج: ۶، ص: ۱۷۵)

ولی نعمت: قرآن فرماتا ہے: ”هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ“ اچھائی کا بدلہ صرف اچھائی سے دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے محسن کے ساتھ اس سے بڑھ کر بھلائی کریں جو ان کے ساتھ کی گئی ہے۔

ابھی آپ باحوالہ پڑھ آئے ہیں کہ جلاس بن سوید جس نے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پرورش کی اور بڑی ہی عمدہ پرورش کی، جلاس نے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس وقت سہارا دیا جب وہ نوعمر تھے اور بے سہارا تھے، اس نے اپنی دولت و ثروت کو ان پر خرچ بھی کیا جس نے یتیمی کے وقت باپ بن کر حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنبھالا، پال پوس کر بڑا کیا، مشقت و مصیبت کے دنوں کو حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمیر کی والدہ پر آسان بنا دیا، ان حالات کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جلاس حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ولی نعمت اور محسن اعظم ہے جس کا حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعتراف بھی کیا اور بیاں دہل اعلان بھی فرمایا: ”اِنَّكَ لَاحِبُّ النَّاسِ اِلٰى وَاَحْسَنُھُمْ عِنْدِي“ ترجمہ: اے جلاس! آپ میری نظر میں لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب اور میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔ (درمنثور، سورہ توبہ، آیت: ۷۴)

اسی ولی نعمت، جلاس کے ساتھ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے شب

وروز عیش و آرام اور مسرت و شادمانی کے ساتھ گزر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر ابھی دس سال سے کچھ زیادہ تھی کہ وہ اسلام کے ٹھنڈے اور نرم سائے میں آگیا، ایمان اس کے سادہ پاک اور معصوم دل میں اچھی طرح جا گزریں ہو گیا اور اسلام کا بیج اس کے زرخیز وجود کو موافق اور سازگار پا کر خوب برگ و بار لایا، حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کم عمری کے باوجود ہر نماز رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے باجماعت ادا کرتا اور جب اس کی ماں کبھی اسے اکیلے اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مسجد جاتے اور مسجد سے واپس آتے دیکھتی تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے شب و روز اسی طرح عیش و آرام اور مسرت و شادمانی کے ساتھ گزر رہے تھے کہ خدائے تعالیٰ نے اسے ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا کہ شاید ہی اس عمر کا کوئی بچہ

اس سے دو چار ہوا ہو۔ (صورت حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۴۱، موارد الظمان، ج: ۶، ص: ۱۷۳)

حضرت عمیر کی استقامت: نوعمر اور کم سن حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس صورت حال سے سخت سراپیمہ و پریشان تھا وہ اس فکر میں سرگشتہ و حیران تھا کہ اس وقت وہ اپنی ذمہ داری کس طرح ادا کرے۔ اس نے سوچا کہ جلاس کی طرف سے خاموشی اختیار کر کے اس کی پردہ پوشی کرنا خدا اور رسول سے خیانت کے مترادف اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے ہم معنی ہے اور جو کچھ سنا ہے اسے ظاہر کر دینے میں ایک ایسے شخص کی احسان فراموشی ہے جس نے اسے باپ کا پیار دیا اور یتیمی و تنگ دستی کی حالت میں پناہ دی۔

نوخیز حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس دورا ہے پر تھوڑی دیر کے لیے حیران اور ششدر کھڑا رہا، مگر جلد ہی وہ ایک قطعی اور آخری فیصلے پر پہنچ گیا، وہ جلاس کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے بولا: خدا کی قسم! اے جلاس! محمد عربی کے بعد روئے زمین پر کوئی دوسرا شخص مجھے آپ سے زیادہ محبوب نہیں ہے مگر آپ نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ اگر میں اس کا ذکر کروں تو آپ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے اور اگر خاموشی اختیار کر لوں تو جرم خیانت

کا مجرم ٹھہروں اور اپنے دین و ایمان کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کر لوں۔ میں اس بات کا عزم کر چکا ہوں کہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کی کہی ہوئی بات سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو آگاہ کر دوں گا۔ آپ اپنے لیے بچاؤ کا جو طریقہ چاہیں سوچ لیں۔ (صومن حیاۃ الصحابہ، ص: ۲۴۵، موارد الظمان، ج: ۶، ص: ۱۷۵)

اللہ و رسول کے ساتھ وفاداری: اس کے بعد حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد پہنچ کر وہ سب کچھ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گوش گزار کر دیا جو اس نے جلاس سے سنا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا اور ایک صحابی کو بھیجا کہ وہ جلاس کو بلالائیں، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جلاس بارگاہ نبوت میں حاضر ہو گیا اور سلام کر کے آپ کے سامنے بیٹھ گیا، آپ نے اس سے پوچھا: جلاس! یہ کیسی بات ہے؟ جو عمیر نے تم سے سنی ہے، پھر آپ نے وہ بات اسے بتائی۔ اے اللہ کے رسول! اس نے سراسر کذب بیانی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے، میں نے یہ بات نہیں کہی ہے، جلاس نے ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا، یہ سن کر صحابہ کرام کی نظریں باری باری جلاس اور عمیر کے چہروں کا جائزہ لینے لگیں تاکہ وہ ان کے چہروں سے ان کے دلوں میں پوشیدہ باتوں کا اندازہ لگا سکیں اور وہ آپس میں چپکے چپکے سے باتیں کرنے لگے، ایک شخص جس کا دل نفاق کا مریض تھا وہ بولا: یہ لڑکا بڑا نافرمان اور احسان فراموش ہے، اپنے محسن کے ساتھ بدی کرنے پر تلا ہوا ہے، دوسرے نے کہا: نہیں! یہ ایک ہونہار اور سعادت مند بچہ ہے، اطاعت الہی کے زیر سایہ اس کی نشوونما ہوئی ہے، اس کے چہرے کے آثار اس کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف رخ کیا تو دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو کی دھاریں بہہ کر اس کے رخساروں اور سینوں کو تر کر رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے: اے اللہ! اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر میرے بیان کی تصدیق نازل فرما دے، اے اللہ! جلاس نے اپنے دفاع میں بولتے ہوئے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ

سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست اور حق ہے، آپ چاہیں تو ہم دونوں سے حلف لے لیں اور میں خدا کی قسم! کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے وہ بات نہیں کہی جو عمیر نے آپ سے بیان کی ہے۔ (صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۴۶، موارد الطمان، ج: ۶، ص: ۱۷۶)

قرآن نے حضرت عمیر کے حق میں گواہی دی: جیسے ہی وہ قسم سے فارغ ہوا اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹ کر حضرت عمیر بن سعد کی طرف منتقل ہوئیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نزول وحی کے آثار طاری ہو گئے۔ صحابہ کرام سمجھ گئے کہ آپ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی مبارک نازل ہو رہی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و صامت اور پرسکون ہو کر بیٹھ گئے اور ان کی نگاہیں حضور پر جم گئیں۔ اس وقت جلاس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلنے جا رہے تھے اور حضرت عمیر کے اوپر اطمینان اور انتظار کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر میں آپ کے اوپر سے نزول وحی کے آثار زائل ہو گئے اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمان الہی کی تلاوت فرمائی:

”يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا ۚ وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهُمْ يَحْمِلُونَ أِيمَانَهُمْ ۚ وَمَا تَقُولُوا إِلَّا أَنْ أَعْنِيَهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا ۚ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ“ (سورہ توبہ، آیت: ۷۴)

ترجمہ: یہ لوگ خدا کی قسم! کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی ہے حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے، وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے نہ کر سکے، ان کا یہ سارا غصہ اسی بات پر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے اب اگر یہ اپنی روش سے باز آجائیں تو انہیں کے لیے بہتر ہے اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ انہیں دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور آخرت میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو،۔

(صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۴۷، موارد الطمان، ج: ۶، ص: ۱۷۷)

جلاس کی توبہ: اس کو سنتے ہی جلاس خوف خدا سے کانپنے لگا اور اس کی زبان اس کے تالو سے چپک گئی پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور بڑی مشکل سے بولا "بل اتوب یا رسول اللہ بل اتوب، عمیر نے سچ کہا تھا اور میں جھوٹا تھا: یا رسول اللہ! میری جان آپ پر فدا ہو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ میری توبہ قبول فرمائے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف توجہ فرمائی تو دیکھا کہ مسرت کے آنسو اس کے ایمان سے منور چہرے کو تر کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دست مبارک بڑھا کر نرمی سے اس کا کان پکڑا اور ارشاد فرمایا: بچے! تیرے کانوں نے جو کچھ سنا صحیح سنا تیرے رب نے تیری بات کی تصدیق کر دی۔

اس کے بعد جلاس مکمل طور پر دائرہ اسلام میں واپس آ گئے اور زندگی بھر اس پر ثابت قدم رہے اور صحابہ نے بھی ان کے بہترین طرز عمل کو دیکھا کیوں کہ انہوں نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ سابقہ برتاؤ میں کوئی کمی نہیں کی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے۔ جب بھی ان کے سامنے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر چھڑتا تو کہتے کہ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر عطا فرمائے اس نے مجھے کفر سے نجات دلائی اور میری گردن کو جہنم کے عذاب سے چھڑالیا۔ (صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۴۸، موارد الظمآن، ج: ۶، ص: ۱۷۷)

حضرت عمیر حمص کے گورنر: یہ نوعمر صحابی حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بچپن کی تصویر ہے جو انتہائی حسین اور بے حد دل نواز ہے مگر ان کی جوانی کی تصویر اس سے کم خوش نما اور دل افروز نہیں ہے۔

حمص کے باشندے اپنے گورنروں کو پریشان اور ان کے خلاف شکایت کرنے میں مشہور تھے۔ جب بھی ان کے یہاں کوئی گورنر آتا اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈ نکالتے، اس کی شکایت دربار خلافت میں پہنچاتے اور خلیفہ سے مطالبہ کرتے کہ اس کی جگہ پر اس سے بہتر حاکم مقرر کیا جائے۔ یہ دیکھ کر امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طے کر لیا تھا کہ ان کے اوپر کسی ایسے شخص کو والی بناؤں گا جس کی سیرت

وکردار پر انہیں کسی طرح سے اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام قابل اعتماد افسروں پر نظر ڈالی۔ آخر کار ان کی نگاہ انتخاب حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جا کر ٹک گئی۔ ان کی نظر میں اس کے لیے ان سے زیادہ مناسب کوئی دوسرا شخص نہ تھا۔

اس کے باوجود کہ انہوں نے شام کے علاقہ الجزیرہ میں غازیان اسلام کے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بہت سے شہروں اور قلعوں پر فتح کے پرچم لہرا دیے تھے اور متعدد قبائل کو مطیع فرمان کر لیا تھا۔ امیر المؤمنین نے شام کے محاذ سے واپس بلا کر حمص کی گورنری کا عہدہ ان کے سپرد کیا اور وہاں جانے کا حکم دیا۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے بالمقابل کوئی چیز قابل ترجیح نہ تھی مگر انہوں نے امیر المؤمنین کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، جب وہ حمص پہنچے تو سب سے پہلے لوگوں کو مسجد میں نماز کے لیے جمع کیا، نماز ختم ہوئی تو تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد فرمایا: لوگو! اسلام ایک محفوظ قلعہ اور مضبوط دروازہ ہے، اسلام کا قلعہ عدل و انصاف اور اس کا دروازہ حق و صداقت ہے اگر قلعہ ٹوٹ جائے اور دروازہ اکھڑ جائے تو اس دین کی حرمت پامال ہو جائے گی۔ اقتدار جب تک مستحکم و مضبوط رہے گا اسلام محفوظ رہے گا اور اقتدار کی مضبوطی کوڑے سے پیٹنے اور تلوار سے قتل کرنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی مضبوطی اور استحکام کا راز حق کو اختیار کرنے اور عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے میں مضمر ہے۔ اس کے بعد وہ اس منصوبے پر عمل کرنے میں منہمک ہو گئے جس کا اعلان انہوں نے اپنی اس مختصر تقریر میں کیا تھا۔ (صور من حیۃ الصحابہ، ص: ۲۵۰، موارد الظمآن، ج: ۶، ص: ۱۷۸)

کل کائنات لے کر بارگاہ عمر میں حاضر: حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حمص میں مکمل ایک سال گزارا مگر اس مدت میں نہ تو انہوں نے دربار خلافت کو کوئی خط لکھا نہ مسلمانوں کے بیت المال کے لیے خراج وغیرہ کی کوئی رقم بھیجی تو خلیفہ کے دل

میں ان کے خلاف شکوک و شبہات نے سراٹھانا شروع کیا کیوں کہ وہ اپنے گورنروں کے تعلق سے امارت کے فتنے سے ہمیشہ چوکنے اور ہوشیار رہتے تھے، ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی معصوم نہیں تھا، انہوں نے اپنے کاتب کو بلا کر کہا کہ عمیر بن سعد کو لکھو کہ امیر المومنین کا خط پاتے ہی حمص کو چھوڑ دو، دربار خلافت کے لیے روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ خراج کی وہ پوری رقم لے آؤ جو تم نے اب تک جمع کی ہے۔ خط پڑھ کر انہوں نے زادراہ کی تھیلی اٹھائی کندھے پر پیالا اور پانی کا برتن رکھا، ہاتھ میں نیزہ تھاما اور حمص کو اپنے پیچھے چھوڑ کر پیدل ہی مدینہ پہنچے تو بھوک اور فاقہ کی وجہ سے ان کا رنگ بدل گیا تھا، جسم نحیف و لاغر ہو گیا تھا، سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے اور صعوبت سفر کے آثار ان کے اوپر پورے طور پر نمایاں تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اس حال میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے اور ان سے پوچھا: عمیر! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ امیر المومنین! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے، خدا کا شکر ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں، میں اپنے ساتھ اپنی پوری دنیا اٹھالایا ہوں، حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا۔

تمہارے ساتھ کیا ہے؟ (حضرت امیر المومنین نے سمجھا کہ بیت المال کے لیے خرچ کی رقم لے کر آئے ہیں) میرے ساتھ میں تھیلی ہے جس میں زادراہ رکھتا ہوں، میرا پیالا ہے جس میں کھاتا ہوں، جس سے اپنا سر اور کپڑا دھوتا ہوں۔ میرے ساتھ میرا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں۔ ایک لمحہ توقف کے بعد پھر بولے: امیر المومنین! میرے اس سامان کے علاوہ باقی دنیا میرے لیے بے ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی احتیاج نہیں۔“

امیر المومنین: کیا تم پیدل ہی آئے ہو؟

حضرت عمیر: ہاں اے امیر المومنین!

امیر المومنین: بیت المال سے سواری کے لیے تمہیں کوئی گھوڑا نہیں ملا؟

حضرت عمیر: نہ انہوں نے دیا اور نہ ہی میں نے مطالبہ کیا۔

امیر المومنین: تم بیت المال کے لیے جو رقم لائے ہو وہ کہاں ہے؟

حضرت عمیر: میں بیت المال کے لیے کچھ نہیں لایا ہوں۔

امیر المؤمنین: وہ کیوں؟

حضرت عمیر: حمص پہنچا تو میں نے وہاں کے صلحا کو جمع کر کے خراج کی وصولی اور اس کی فراہمی کی ذمہ داری ان کو سونپ دی تھی۔ وہ جو کچھ بھی وصول کر کے لاتے، میں ان کے مشورہ سے وہ پوری رقم مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتا تھا، حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے کاتب سے فرمایا: عمیر کے لیے حمص کی گورنری کا پروانہ تجدید تحریر کر دو۔ (صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۵۱، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۲۴۸، موارد الظمآن، ج: ۶، ص: ۱۷۹)

حضرت عمیر کی جانچ: نہیں امیر المؤمنین! میں اب یہ ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا، نہ آپ کے لیے نہ آپ کے بعد کسی دوسرے کے لیے۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اجازت لے کر مضافات مدینہ کی ایک بستی میں چلے گئے جہاں ان کے اہل و عیال مقیم تھے۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی بستی میں آئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ایک قابل اعتماد شخص حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر کہا کہ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں جاؤ اور وہاں بحیثیت مہمان قیام کرو۔ اگر تمہیں ان کے یہاں خوش حالی اور کشادگی کے آثار نظر آئیں تو فوراً واپس آ کر مجھے آگاہ کرنا اور اگر افلاس و تنگ دستی کے حالات دیکھو تو یہ سودیناران کے حوالے کر دینا، امیر المؤمنین نے دیناروں کی تھیلی ان کو تھماتے ہوئے کہا۔ حارث حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بستی میں آئے اور پتا پوچھتے ہوئے ان کے گھر پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو ان کو سلام کیا، حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟

مدینہ سے۔

مدینہ کے مسلمان کیسے ہیں؟

بخیر و عافیت۔

امیر المؤمنین کیسے ہیں؟

وہ بھی بخیر و عافیت ہیں۔

اے اللہ! عمر کی مدد فرما، وہ تجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں، انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ (سورن حیاة الصحابة، ص: ۲۵۳، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۲۳۹، موارد الطمان، ج: ۶، ص: ۱۸۰)

حضرت عمیر کے گھر کا حال: حارث حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں مہمان کی حیثیت سے تین رات مقیم رہے۔ وہ ہر رات ان کو جو کی ایک روٹی پیش کرتے، تیسرے دن ان کے قبیلے کے ایک شخص نے حارث سے کہا کہ تم نے حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے گھر والوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے، ان کے پاس ایک ہی روٹی ہوتی ہے، یہ لوگ خود بھوک اور فاقہ کے ہاتھوں پریشان ہونے کے باوجود تم کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگر مناسب سمجھو تو تم میرے یہاں منتقل ہو جاؤ۔ اس کے بعد حارث نے دیناروں کی تھیلی نکالی اور لے جا کر حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے رکھ دی، حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: یہ کیا ہے؟

اسے امیر المؤمنین نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔

اس کو واپس لے جاؤ اور ان کی خدمت میں میرا سلام پیش کرنے کے بعد کہنا کہ عمیر کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ سن کر ان کی اہلیہ بول پڑیں وہ اپنے شوہر اور مہمان کی گفتگو دروازے کی اوٹ سے سن رہی تھیں۔ عمیر! اسے لے لیجیے، آپ کو ضرورت ہو تو خرچ کیجیے ورنہ مستحقین میں تقسیم کر دیجیے۔ یہاں ضرورت مندوں اور محتاجوں کی کمی نہیں ہے۔ حارث دیناروں کی تھیلی حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑ گئے۔ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیناروں کو لیا اور انہیں بہت سی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں رکھ کر راتوں رات

ضرورت مندوں خصوصاً شہدا کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔

(صومن حیاة الصحابة، ص: ۲۵۴، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۲۴۹، موارد النظم، ج: ۶، ص: ۱۸۰)

دربار عمر میں دوبارہ طلب: ادھر حارث مدینہ پہنچے تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا: حارث تم نے کیا دیکھا؟

امیر المؤمنین! حضرت عمیر اور ان کے اہل و عیال بڑے سخت حالات سے دوچار ہیں۔

تم نے دینار ان کو دے دیے تھے؟۔ ہاں اے امیر المؤمنین!

انہوں نے کیا کیا؟

مجھے نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس میں سے ایک دینار بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے۔

تب حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ کو لکھا: ”میرا یہ خط تم کو ملے تو اسے اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے مدینہ کے لیے روانہ ہو جاؤ“۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ کا رخ کیا اور دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولے:

عمیر! تم نے ان دیناروں کا کیا کیا؟

امیر المؤمنین! جب وہ دینار آپ مجھے دے چکے ہیں تو اب آپ کو ان سے کیا غرض ہے؟

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے ان کو کہاں خرچ کیا؟

میں نے انہیں جمع کر دیا ہے تاکہ وہ اس روز میرے کام آئیں جس روز مال اور

اولاد کوئی چیز کام نہ آئے گی۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور انہوں نے بھرائی

ہوئی آواز میں کہا:

عمیر! میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو تنگ دستی کے باوجود اپنے

اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

پھر آپ نے انہیں ایک وسق غلہ اور دو کپڑے دینے کا حکم دیا۔

حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: امیر المؤمنین! مجھے غلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو صاع جو گھر پر چھوڑ آیا ہوں، جب تک ہم اسے کھائیں گے، خدائے تعالیٰ ہمارے لیے رزق کا بندوبست کر دے گا، البتہ کپڑے میں بیوی کے لیے رکھ لیتا ہوں، اس کے کپڑے بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔

اس ملاقات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے اپنے محبوب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات کا وقت آپہنچا۔ جن سے ملنے کا شوق انہیں شب و روز مضطرب اور بے قرار رکھتا تھا، وہ سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو اس شان سے کہ ان کے کاندھے پر دنیا کا کوئی بوجھ نہ تھا، ان کے اس سفر میں ان کے ساتھ اگر کوئی چیز تھی تو وہ ان کا نور ایمان و ہدایت اور ان کا زہد و تقویٰ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ان کے سانحہ ارتحال کی اطلاع پہنچی تو ان کا دل حزن و ملال سے بھر گیا اور چہرے پر رنج و الم کے آثار نمایاں ہو گئے جو ان کے اندرونی کرب کا پتہ دے رہے تھے، انہوں نے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا: کاش! میرے پاس عمیر بن سعد جیسے کچھ لوگ اور ہوتے جن سے میں مسلمانوں کے مسائل میں مدد لیتا، اللہ، صمیر بن سعد سے راضی ہو، وہ اس طرز کے یگانہ و بے مثال فرد تھے۔ (المنتظم فی تاریخ الملوک والامم، ج: ۴، ص: ۳۱۸، صور من حیاة الصحابة، ص: ۲۵۵، موارد الظمان، ج: ۶، ص: ۱۸۱)

بے مثال سیرت: حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اگرچہ یتیمی میں پرورش پائی تھی مگر پھر بھی ان کا کردار ایسا نہ تھا جیسا عام طور پر ان بچوں کا ہوا کرتا ہے جن کے والد کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ جاتا ہے اور وہ ایک آزادانہ زندگی گزار کر بے راہ رو ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی عمر کے بڑھنے کے

ساتھ ساتھ ان کی نیک نامی اور خوش خصالی کے چرچے بھی عام ہو چکے تھے، وقت بربادی کے سائے سے وہ کوسوں دور تھے، راہوں یا شاہ راہوں پر بیٹھے بیٹھے وقت کاٹ دینا، یا عبث کاموں میں مشغول ہو جانا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے ڈھونڈنے والے کو یا تو مسجد کی پہلی صف میں نظر آتے یا کسی ضرورت کے تحت گھر پر موجود ہوتے، اس کے سوانہ تو لوگ ان کی باتیں سن پاتے نہ دیکھ پاتے، مسجد کے سوا لوگوں کی ملاقات بھی ان سے کم ہی ہوا کرتی، خوف خدا ان کی رگ و پے میں بس گیا تھا، قلب نور عبادت سے مثل آئینہ صاف و شفاف تھا، صفات حسنہ کے مالک تھے، انہیں عادات و اطوار کی بنیاد پر وہ صحابہ کرام کے چہیتے تھے، صحابہ انہیں اپنے ساتھ بٹھانا پسند کرتے تھے۔

عبداللہ بن عمرؓ کی نظر میں: حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: صحابہ کرام (چھوٹی عمر والے) میں تمہارے باپ سے افضل کوئی مسلمان نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیضیاب ہوئے لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ کسی غزوے میں شرکت کا موقع نہ مل سکا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہت محبت فرماتے اور ”نسبیج وحدہ“ سے (بے مثال شخصیت) کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔

حضرت مفصل نے فرمایا: قبیلۃ انصار میں تین زاہد عظیم الشان پیدا ہوئے۔ حضرت ابودرداء، شداد بن اوس اور حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(مشاہیر الصحابہ، ج: ۱، ص: ۲۸، سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۱۰۵)

عمر اور ان کے ساتھیوں کی تمنا: حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کی خبر سن کر جنت البقیع کی طرف چلے، ساتھ میں کچھ احباب بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: آپ لوگ اپنی اپنی تمنا کا اظہار کرو۔ ایک صاحب بولے اے امیر المومنین! اگر میرے پاس غلام ہوتے تو میں انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آزاد کر دیتا۔ دوسرے صاحب بولے: اگر میرے پاس مال

ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی راہ میں خرچ کر دیتا۔ تیسرے صاحب نے اپنی تمنا ان الفاظ میں ظاہر کی اگر میرے پاس طاقت ہوتی تو زم زم شریف سے پانی کھینچ کھینچ کر حجاج کرام کو سیراب کرتا۔ ان حضرات کی خواہشات سننے کے بعد امیر المومنین نے فرمایا: اے کاش! مجھے عمیر بن سعد جیسے لوگ مل جائیں تو میں ان سے مسلمانوں کے معاملات میں مدد حاصل کروں۔ (حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۲۵۰)

وفات: حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال کب ہوا، اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق خلافت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں آپ کا وصال ہوا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ علامہ ابن اثیر کے مطابق آپ کا وصال ملک شام میں ہوا۔ علامہ ابن جوزی نے فرمایا کہ آپ کا وصال آپ کے گھر میں ہوا۔ گھر مدینہ طیبہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ (الاصابة، ج: ۵، ص: ۳۲، اسد الغابہ، ج: ۴، ص: ۲۸۱، المنتظم فی تاریخ الملوک، ج: ۴، ص: ۳۱۸، تاریخ دمشق، ج: ۴۶، ص: ۴۹۱، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۲۵۰)

اقوال زریں: ایک مرتبہ خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: اسلام ایک مضبوط دیوار ہے اور محفوظ دروازہ۔ اسلام کی دیوار عدل ہے اور اس کا دروازہ حق ہے۔ جب عدل وانصاف چھوڑا جائے گا اور حق سے منہ موڑا جائے گا تو اسلام کمزور ہو جائے گا۔ اسلام اس وقت تک محفوظ و مضبوط رہے گا جب تک سلطان وقت سختی کرتا رہے گا لیکن سلطان کی سختی کا معنی کوڑوں سے جسم کو زخمی کر دینا یا تلوار سے گردنیں اڑا دینا نہیں بلکہ سختی کا معنی ہے کہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا رہے اور عدل وانصاف کو لازم پکڑے رہے۔ (مشاہیر الصحابة، ج: ۱، ص: ۲۷۸)

فرمان رسول پر یقین: حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جو بات سنی تھی اس پر انہیں کامل یقین تھا، وہ مکمل وثوق کے ساتھ اس پر عمل کرتے تھے جیسا کہ آنے والے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے:

حضرت ابو طلحہ خولانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمیر بن سعد

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے فلسطین میں ان کے گھر پہنچے وہ اپنے گھر چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے، سامنے ہی پتھر کا بنا ہوا ایک حوض تھا۔ ہم نے دیکھا کہ آپ نے ایک لڑکے کو گھوڑوں کو پانی۔ پلانے کا حکم دیا، وہ گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے حوض پر لے آیا۔ گھوڑوں کو دیکھ کر آپ نے فرمایا: فلاں گھوڑی کہاں ہے؟ لڑکے نے جواب دیا: اس کو کھلی ہو گئی ہے اور جسم سے خون ٹپک رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس گھوڑی کو بھی پانی پلاؤ۔ لڑکے نے کہا: اگر اس گھوڑی کو ان کے ساتھ پانی پلاؤں گا تو سب گھوڑوں کو کھلی ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا: اس کو لے کر آؤ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا کیوں کہ میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ”لا عدوی ولا طيرة“ کوئی مرض متعدی نہیں ہوتا۔ (ایک کا مرض اڑ کر دوسرے کو نہیں لگتا) اور بدشگونی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے جنگل میں صحیح سالم جانور ہوتے ہیں پھر کھلی کے شکار ہو جاتے ہیں تو سب سے پہلے جانور کو کس کی کھلی اڑ کر لگی جب کہ وہاں کوئی کھلی والا جانور موجود ہی نہ تھا۔

علماء فرماتے ہیں کہ حضرت عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی ایک مرفوع حدیث حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج: ۲، ص: ۱۰۶، حلیۃ الاولیاء، ج: ۱، ص: ۲۵۰) یہ تھی حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نور بار حیات جو اپنے قارئین کو اللہ و رسول (جل مجدہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی وفاداری، احسان شناسی، زہد و پرہیزگاری، دیانت داری اور احساس ذمہ داری کا سبق پڑھاتی رہے گی۔

ان کے مولیٰ کی ان پر کروڑوں درود
ان کی اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام
جس مسلمان نے دیکھا انہیں اک نظر
اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

ماخذ ومراجع

- ★ قرآن مجيد
- ★ ابو ذر غفاري مترجم، عبد الحميد جوده
- ★ ارشاد الساري، علامه احمد بن محمد ابوبكر بن عبد الملك قسطلاني، متوفى: ٩٢٣ هـ
- ★ اسد الغاب، علامه ابوالحسن علي بن ابى الكرم الشيباني المعروف بابن الاثير، متوفى: ٦٣٠ هـ
- ★ اكمال اكمال المعلم، امام ابو عبد الله محمد بن خلفه، متوفى: ٨٢٨ هـ
- ★ اكمال الاكمال، امام محمد بن عبد الغني بن ابى بكر بن نقطه، متوفى: ٦٢٩ هـ
- ★ اكمال المعلم، ابو اسد المسلم، امام قاضي عياض بن موسى مالكي، متوفى: ٥٢٢ هـ
- ★ اكمال تهذيب الكمال، علامه علاء الدين مغلطاي، متوفى: ٦٢٠ هـ
- ★ الآحاد والمثاني، علامه ابن ابى عاصم، متوفى: ٢٨٤ هـ
- ★ الاخبار الطوال، علامه احمد بن داود دينوري، متوفى: ٢٨١ هـ
- ★ الاستيعاب، حافظ ابو عمر يوسف بن عبد الله بن عمر بن عبد البر، متوفى: ٤٦٣ هـ
- ★ الاصابه، حافظ شهاب الدين احمد بن علي بن حجر عسقلاني، متوفى: ٨٥٢ هـ
- ★ الاستذكار، امام ابو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد قرطبي، متوفى: ٤٦٣ هـ
- ★ الامن والعلي، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادري، متوفى: ١٣٢٠ هـ
- ★ البدايه والنهايه، حافظ عماد الدين ابوالفداء ابن كثير، متوفى: ٤٤٢ هـ
- ★ البدء والتاريخ، علامه مطهر بن طاهر مقدسي، متوفى: ٣٥٥ هـ
- ★ البدر الطالع، شيخ محمد بن علي بن محمد شوکاني، متوفى: ١٢٥٠ هـ
- ★ التاريخ الصغير للبخاري، امام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل بخاري، متوفى: ٢٥٦ هـ
- ★ التاريخ الكبير للبخاري، امام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل بخاري، متوفى: ٢٥٦ هـ
- ★ التعديل والتجريح، امام ابو الوليد سليمان بن خلف بن سعد، متوفى: ٤٧٤ هـ

- ★ التمهيد والبيان في مقتل الشهيد عثمان شيخ ابو عبد الله محمد بن يحيى، متوفى: ٤٢١هـ
- ★ التوضيح لشرح الجامع الصحيح، امام ابو حفص عمر بن علي المعروف بابن ملقن شافعي، متوفى: ٨٠٢هـ
- ★ الثقات لابن حبان، علامة محمد بن حبان، متوفى: ٣٥٢هـ
- ★ الجامع الصحيح للسنن والمسديد، شيخ صهيب عبد الجبار
- ★ الخصائص الكبرى، علامة جلال الدين سيوطي، متوفى ٩١١هـ
- ★ الدولة الاموية، على محمد الصلابي
- ★ الدولة العثمانية للصلابي، على محمد الصلابي
- ★ الرياض النضرة، علامة امام احمد بن عبد الله بن محمد الطبري، متوفى: ٦٩٢هـ
- ★ الروض الانف، امام ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد الله سبيلي، متوفى: ٥٨١هـ
- ★ الروض المطار في خبر الاقطار، امام محمد بن عبد الله بن منعم حميري، متوفى: ٩٠٠هـ
- ★ الزهد، امام احمد بن حنبل، متوفى: ٢٤١هـ
- ★ السنن الكبرى، امام ابو بكر احمد حسين بنهقي، متوفى ٢٥٨هـ
- ★ السنن الكبرى للنسائي، امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعيب نسائي، متوفى: ٣٠٣هـ
- ★ السيرة الحلبية، شيخ امام علي بن ابراهيم بن احمد، متوفى: ١٠٢٢هـ
- ★ السيرة النبوية عرض وقائع وتحليل احداث، شيخ على محمد الصلابي
- ★ السيرة النبوية، علامة احمد بن زيني دحلان
- ★ السيرة النبوية على ضوء القرآن والسنة، شيخ محمد بن محمد، متوفى: ١٢٠٣هـ
- ★ السيرة النبوية لابن اسحاق، امام محمد بن اسحاق بن يسار، متوفى: ١٥١هـ
- ★ السيرة النبوية لابن كثير، حافظ عماد الدين ابو الفداء ابن كثير، متوفى ٤٤٢هـ
- ★ السيرة النبوية لابن هشام، علامة عبد الملك بن هشام، متوفى: ٢١٣هـ
- ★ الشفا بغير حق المصطفى، امام قاضي ابو الفضل عياض، متوفى: ٥٢٢هـ
- ★ الشفا بق العثمانية في علماء الدولة العثمانية، علامة احمد بن مصطفى بن خليل، متوفى: ٩٦٨هـ
- ★ العقد الفريد، امام ابو عمر شهاب الدين احمد بن محمد بن عبد رب اندلسي، متوفى: ٣٢٨هـ
- ★ الفجر الساطع على الصحيح الجامع، شيخ محمد فضيل شيبه

- ★ القول المبين في بيان منزله رسول رب العالمين، شيخ ابو يوسف خليل بن ابراهيم عراقي
- ★ الكامل في التاريخ، علامه ابوالحسن علي بن ابى الكرم الشيباني المعروف بابن الاثير، متوفى: ٦٣٠ هـ
- ★ الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة، امام شمس الدين ابو عبد الله محمد بن احمد بن ذهبي، متوفى: ٤٨٨ هـ
- ★ الكشف والبيان (تفسير ثعلبي) علامه احمد بن محمد بن محمد بن ابراهيم، متوفى: ٨٢٤ هـ
- ★ اللباب في علوم القرآن، امام ابو حفص سراج الدين عمر بن علي، متوفى: ٤٤٥ هـ
- ★ اللؤلؤ والياقوت (ترجمة حلية الاولياء) امام ابويعيم احمد بن عبد الله اصفهاني، متوفى: ٨٣٠ هـ
- ★ المحبر، علامه محمد بن حبيب بن امية بغدادى، متوفى: ٢٢٥ هـ
- ★ المختصر في اخبار البشر، علامه ابوالفداء عماد الدين اسماعيل بن علي، متوفى: ٤٣٢ هـ
- ★ المستدرک علی الصحیحین، امام محمد بن عبد الله ابو عبد الله الحاكم النيشاپورى، متوفى ٨٠٥ هـ
- ★ المعالم الاثرية في السنة والسير، شيخ محمد بن محمد حسن
- ★ المعجم الاوسط، امام سليمان بن احمد الطبراني، متوفى: ٣٦٠ هـ
- ★ المعجم الصغير، امام سليمان بن احمد الطبراني، متوفى: ٣٦٠ هـ
- ★ المعجم الكبير للطبراني، امام سليمان بن احمد، متوفى ٣٦٠ هـ
- ★ المعرفة والتاريخ، علامه يعقوب بن سفيان، متوفى: ٢٤٤ هـ
- ★ المفصل في تاريخ العرب، دكتور جواد علي، متوفى: ١٢٠٨ هـ
- ★ المفهم، علامه ابوالعباس احمد بن عمر، متوفى: ٦٥٦ هـ
- ★ المقتفى في سيرة المصطفى، علامه حسن بن عمر بن حلبى، متوفى: ٤٤٩ هـ
- ★ المنتظم، علامه جمال الدين ابوالفرج ابن جوزى، متوفى ٥٩٤ هـ
- ★ المؤتلف والمختلف للدارقطني، امام علي بن عمر دارقطني، متوفى: ٢٨٥ هـ
- ★ المواهب اللدنية، علامه احمد بن محمد بن ابوبكر قسطلاني، متوفى: ٩٢٣ هـ
- ★ النباهية عن طعن امير المؤمنين معاوية، علامه عبدالعزيز بن احمد پر بهارى، متوفى: ١٢٣٩ هـ
- ★ الوافي بالوفيات، علامه صلاح الدين خليل بن ابيك صفدى، متوفى: ٦٣٠ هـ
- ★ الوفا بغير فضائل المصطفى، امام عبد الرحمن بن علي بن جوزى، متوفى: ٥٩٤ هـ

- ★ امتاع الاسماع، علامہ احمد بن علی بن عبد القادر مقریزی، متوفی: ۸۴۵ھ
- ★ انارة الدجی فی مغازی خیر الوری، علامہ حسن بن محمد مالکی، متوفی: ۱۳۹۹ھ
- ★ انساب الاشراف، علامہ احمد بن یحییٰ بن جابر المعروف ببلاذری، متوفی: ۲۷۹ھ
- ★ ایضاح الاشکال، علامہ ابوالفضل محمد بن طاہر بن علی، متوفی: ۵۰۷ھ
- ★ بغیة الطلب فی تاریخ حلب، علامہ عمر بن احمد بن عقیلی، متوفی: ۶۶۰ھ
- ★ تاریخ ابن خلدون، علامہ عبد الرحمن ابن خلدون، متوفی: ۸۰۸ھ
- ★ تاریخ ابی الفداء، الدكتور اسماعیل بن ابی الفداء
- ★ تاریخ اسلام للذہبی، علامہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی، متوفی: ۷۴۸ھ
- ★ تاریخ الخلفاء، علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی: ۹۱۱ھ
- ★ تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری) علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی: ۳۱۰ھ
- ★ تاریخ المدینہ، امام ابو بکر احمد بن علی خطیب بغدادی، متوفی: ۴۶۳ھ
- ★ تاریخ ابن ابی خيثمه، علامہ ابو بکر احمد بن ابی خيثمه، متوفی: ۲۷۹ھ
- ★ تاریخ الخلفاء، علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی: ۹۱۱ھ
- ★ تاریخ الخفیس، علامہ حسین بن محمد بن حسن دیارکبری، متوفی: ۹۶۶ھ
- ★ تاریخ مدینہ دمشق، امام ابوالقاسم علی بن حسن ابن عساکر، متوفی: ۵۷۱ھ
- ★ تاریخ یعقوبی، شیخ احمد بن ابی یعقوب، متوفی: ۲۸۷ھ
- ★ تفسیر خازن، علامہ علاء الدین علی بن محمد، متوفی: ۷۴۱ھ
- ★ تفسیر ابن ابی حاتم، امام ابو محمد عبد الرحمن بن محمد، متوفی: ۳۲۷ھ
- ★ تفسیر ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر، متوفی: ۷۷۴ھ
- ★ تفسیر احکام القرآن امام احمد بن علی ابوبکر المعروف بالبحصاص، متوفی: ۳۷۰ھ
- ★ تفسیر الجواهر الحسان فی تفسیر القرآن (تفسیر الثعالبی) امام ابو زید عبد الرحمن بن محمد ثعالبی، متوفی: ۸۷۵ھ
- ★ تفسیر بغوی، امام ابو محمد حسین بن مسعود بغوی، متوفی: ۵۱۰ھ
- ★ تفسیر بیضاوی، امام ابو سعید عبد اللہ بن عمر بیضاوی، متوفی: ۶۸۵ھ

- ★ تفسیر خازن، علامہ علی بن محمد خازن، شافعی، متوفی: ۷۲۵ھ
- ★ تفسیر روح البیان، علامہ اسماعیل حقی حنفی، متوفی ۱۱۳۷ھ
- ★ تفسیر سراج المنیر، علامہ شمس الدین محمد بن احمد خطیب شربینی شافعی، متوفی: ۹۷۷ھ
- ★ تفسیر صاوی علی الجلالین، علامہ احمد بن محمد صاوی، متوفی: ۱۲۴۱ھ
- ★ تفسیر صراط الجنان، مفتی محمد قاسم عطاری
- ★ تفسیر طبری، علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی: ۳۱۰ھ
- ★ تفسیر عبد الرزاق، امام ابو بکر عبد الرزاق بن ہمام، متوفی: ۲۱۱ھ
- ★ تفسیر قرطبی، علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ
- ★ تفسیر کبیر، امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین بن عمر رازی، متوفی ۶۰۶ھ
- ★ تفسیر مقاتل بن سلیمان، امام مقاتل بن سلیمان، متوفی: ۱۵۰ھ
- ★ تفسیر العز بن عبد السلام، امام ابو محمد عز الدین عبد العزیز بن عبد السلام، متوفی: ۶۶۰ھ
- ★ تفسیر التکت والعیون، امام ابو الحسن علی بن محمد شافعی، متوفی: ۴۵۰ھ
- ★ تفسیر تبیان القرآن، علامہ غلام رسول سعیدی، متوفی: ۱۴۳۷ھ
- ★ تفسیر تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس (مرویات حضرت ابن عباس) مجد الدین ابوطاہر، متوفی: ۸۱۷ھ
- ★ تفسیر جامع البیان، علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی: ۳۱۰ھ
- ★ تفسیر خزائن العرفان، صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، متوفی ۱۳۶۷ھ
- ★ تفسیر درمنثور، علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی: ۹۱۱ھ
- ★ تفسیر غرائب القرآن، علامہ نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری، متوفی: ۸۵۰ھ
- ★ تقریب التہذیب، علامہ احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی: ۸۵۲ھ
- ★ تقویۃ الایمان، مولوی اسماعیل دہلوی، متوفی ۱۲۴۶ھ
- ★ تلخیص الحییر، علامہ احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی: ۸۵۲ھ
- ★ تہذیب الاسماء واللغات، علامہ تکی بن شرف نووی، متوفی: ۶۷۷ھ
- ★ تہذیب التہذیب، علامہ احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی: ۸۵۲ھ
- ★ تہذیب الکمال، علامہ جمال الدین ابو یوسف المزنی، متوفی ۷۳۲ھ

- ★ جامع الاحادیث، علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ
- ★ جامع الاصول، علامہ مجد الدین مبارک بن محمد شیبانی المعروف بابن اثیر جزری، متوفی: ۶۰۶ھ
- ★ جامع الترمذی، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی: ۲۷۹ھ
- ★ جمال بلال، علامہ محمد علی رضا قادری
- ★ جوامع السیرہ، شیخ علی بن احمد بن سعید بن اندلسی، متوفی: ۴۵۶ھ
- ★ حجة الله على العالمين، شیخ یوسف نبھانی، متوفی: ۱۳۵۰ھ
- ★ حدائق بخشش، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۴۰ھ
- ★ حسن المحاضرہ فی تاریخ مصر والقاہرہ، امام عبدالرحمن بن ابی بکر جلال الدین سیوطی، متوفی: ۹۱۱ھ
- ★ حفظ الایمان، مولوی اشرف علی تھانوی، متوفی: ۱۳۶۲ھ
- ★ حلیۃ الاولیاء، علامہ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصفہانی، متوفی: ۴۳۰ھ
- ★ خاتم النبیین، علامہ محمد بن احمد مصطفیٰ المعروف بابن زہرہ، متوفی: ۱۳۹۴ھ
- ★ خطبات محرم، فقیہ ملت مفتی جلال الدین احمد امجدی، متوفی ۱۴۲۲ھ
- ★ خلاصۃ الوفاء باخبار المصطفیٰ، امام علی بن عبد اللہ بن احمد سمہودی، متوفی: ۹۱۱ھ
- ★ خلاصۃ تہذیب تہذیب الکمال، علامہ احمد بن عبد اللہ، متوفی: ۹۲۳ھ
- ★ خلفائے راشدین، علامہ اختر حسین فیضی مصباحی
- ★ دلائل النبوة للبیہقی، حافظ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، متوفی: ۴۵۸ھ
- ★ دلائل النبوة لاسماعيل الاصمہانی، علامہ اسمعیل بن محمد تیمی اصفہانی، متوفی: ۵۳۵ھ
- ★ ذخائر العقبی، علامہ امام احمد بن عبد اللہ بن محمد الطبری، میلاد: ۶۱۵ھ
- ★ رجال حول الرسول، الدکتور خالد محمد خالد
- ★ روح المعانی، علامہ ابوالفضل شہاب الدین سید محمد آلوسی بغدادی حنفی، متوفی: ۱۲۷۰ھ
- ★ زاد المسیر، علامہ ابوالفرح عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی، متوفی: ۵۹۷ھ
- ★ سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، علامہ محمد بن یوسف شامی صالحی، متوفی: ۹۴۲ھ
- ★ سلوۃ الکلیب بوفاہ الحبيب، شیخ علامہ محمد بن عبد اللہ المعروف بابن ناصر الدین، متوفی: ۸۴۲ھ
- ★ سمط النجوم العوالی فی انباء الاول والاولی، علامہ عبد الملک بن حسین کمی، متوفی: ۱۱۱۱ھ

- ★ سنن ابن ماجہ، امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ، متوفی ۲۴۳ھ
- ★ سنن ابی داؤد، امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث، متوفی ۲۴۵ھ
- ★ سنن النسائی، امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی، متوفی ۳۰۳ھ
- ★ سنن سعید بن منصور، امام ابو عثمان سعید بن منصور، متوفی ۲۷۷ھ
- ★ سوانح کربلا، صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی، متوفی ۱۳۶۷ھ
- ★ سوانح حضرت ابو ذر غفاری، علامہ فیض احمد اویسی، متوفی ۱۴۳۱ھ
- ★ سیدنا محمد رسول اللہ، شیخ ابراہیم العرجون
- ★ سیر اعلام النبلاء، علامہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی، متوفی ۷۴۸ھ
- ★ سیر السلف الصالحین، حافظ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانی، متوفی ۵۳۵ھ
- ★ سیرۃ الصحابی الجلیل مصعب بن عمیر، شیخ عدنان بن سلیمان
- ★ سیرت الرسول، علامہ جسٹس پیر محمد کرم شاہ ازہری، متوفی ۱۴۱۸ھ
- ★ سیرت حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طالب ہاشمی
- ★ شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، علامہ عبدالحی بن احمد بن محمد، متوفی ۱۰۸۹ھ
- ★ شرح المسلم، علامہ محی الدین ابو ذر کریم یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ
- ★ شرح المواہب اللدنیہ، علامہ محمد عبد الباقی زرقانی، متوفی ۱۱۲۲ھ
- ★ شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی صاحب، متوفی ۱۴۳۷ھ
- ★ شرح ابن ماجہ لمغلطائی، امام مغلطائی بن قلیچ مصری حنفی، متوفی ۷۶۲ھ
- ★ شرح البخاری للسفیری، علامہ شمس الدین محمد بن عمر سفیری شافعی، متوفی ۹۵۶ھ
- ★ شرح السنۃ للبعغوی، امام حسین بن مسعود بعغوی، متوفی ۵۱۶ھ
- ★ شرح الشفا، امام ملا علی بن سلطان محمد قاری، متوفی ۱۰۱۴ھ
- ★ شرح بخاری لابن بطل، علامہ ابن بطل ابوالحسن علی بن خلف، متوفی ۴۴۹ھ
- ★ شرح صحیح البخاری للمحوی، شیخ ابواسحاق حوینی
- ★ شرح مشکل الآثار للطحاوی، امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی ۳۲۱ھ
- ★ شرح معانی الآثار، امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی ۳۲۱ھ

- ★ شرف المصطفى، امام ابو سعيد عبد الملك بن ابی عثمان، متوفی: ۴۰۶ھ
- ★ شعب الایمان، امام احمد بن حسین بن علی بن ابوبکر بہقی، متوفی: ۴۵۸ھ
- ★ صحیح ابن حبان، امام محمد بن حبان بن احمد، متوفی: ۳۵۴ھ
- ★ صحیح ابن خزیمہ، امام ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ، متوفی: ۳۱۱ھ
- ★ صحیح البخاری، امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی: ۲۵۶ھ
- ★ صحیح المسلم، امام ابوالحسن مسلم بن حجاج قشیری، متوفی: ۲۶۱ھ
- ★ صفوة الصفوة، علامہ جمال الدین ابوالفرج ابن جوزی، متوفی: ۵۹۷ھ
- ★ صور من حياة الصحابة، الدكتور عبد الرحمن باشا
- ★ طبقات ابن سعد، علامہ محمد بن سعد زہری، متوفی: ۲۳۰ھ
- ★ طبقات خليفه، امام ابو عمر وخليفه بن خياط، متوفی: ۲۴۰ھ
- ★ عارضة الاحوذی، الامام ابن عربي مالکی، متوفی: ۵۴۳ھ
- ★ عثمان بن عفان، شیخ محمد رضا، متوفی: ۱۳۶۹ھ
- ★ عطر الاحیاء، شیخ بدوی مطر
- ★ علی بن ابی طالب، شیخ ارمان سرحدی
- ★ عمدة القاری، علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی، متوفی: ۸۵۵ھ
- ★ عمر بن عبد العزيز، لعلی محمد الصلابی
- ★ عون المعبود شرح ابی داؤد، شیخ محمد اشرف بن امیر بن علی، متوفی: ۱۳۲۹ھ
- ★ عیون الاخبار، علامہ ابو محمد بن عبد اللہ المعروف بابن قتیبہ، متوفی: ۲۷۶ھ
- ★ عیون الاثر، امام محمد بن محمد بن محمد بن احمد بن سید الناس، متوفی: ۷۳۴ھ
- ★ غایة المقصد فی زوائد المسند، علامہ علی بن ابی بکر بن سلیمان یشی، متوفی: ۸۰۷ھ
- ★ فتاویٰ رضویہ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری، متوفی: ۱۳۴۰ھ
- ★ فتح الباری، علامہ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی: ۸۵۲ھ
- ★ فضائل الصحابة للامام احمد بن حنبل، امام احمد بن حنبل، متوفی: ۲۴۱ھ
- ★ کتاب المغازی للواقدي، علامہ محمد عمر بن الواقدي، متوفی: ۲۰۷ھ

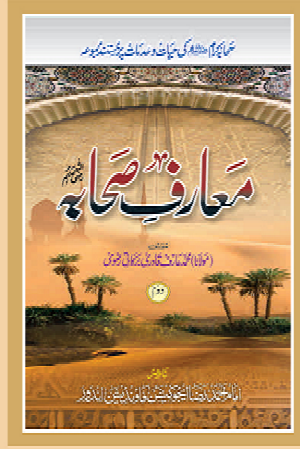
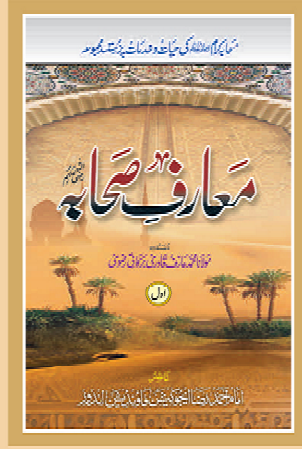
- ★ کرامات صحابہ، علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، متوفی: ۱۴۰۶ھ
- ★ کشف الاستار، امام نورالدین علی بن ابی بکر، متوفی: ۸۰۷ھ
- ★ کشف المشکل، امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی، متوفی: ۵۹۷ھ
- ★ کنز الایمان، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری، متوفی: ۱۳۴۰ھ
- ★ کنز العمال، علامہ متقی بن حسام الدین ہندی برہانپوری، متوفی: ۹۷۵ھ
- ★ کوثر المعانی الدراری فی کشف خبا یا، شیخ محمد خضر شفقیطی، متوفی: ۱۳۵۴ھ
- ★ گلستاں، علامہ، شیخ شرف الدین سعدی شیرازی، متوفی: ۶۹۱ھ
- ★ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، امام ابوالحسن نورالدین علی بن ابی بکر بیہقی، متوفی: ۸۰۷ھ
- ★ مختصر تاریخ دمشق، امام محمد بن مکرم المعروف بابن منظور، متوفی: ۷۱۱ھ
- ★ مدارج النبوة مترجم، علامہ شیخ عبدالحق دہلوی، متوفی: ۱۰۵۲ھ
- ★ مرقات شرح مشکوٰۃ، علامہ ملا علی بن سلطان محمد القاری، متوفی: ۱۰۱۴ھ
- ★ مرآۃ المناجیح، مفتی احمد یار خان نعیمی، متوفی: ۱۳۹۱ھ
- ★ مرآۃ الجنان و عبرۃ الیقظان، امام ابو محمد عقیف الدین عبداللہ بن اسعد، متوفی: ۷۶۸ھ
- ★ مستعذب الاخبار باطیب الاخبار، علامہ ابو مدین بن احمد، متوفی: ۱۱۳۲ھ
- ★ مسند احمد بن حنبل، امام احمد بن حنبل، متوفی: ۲۴۱ھ
- ★ مسند البزار، امام ابو بکر احمد بن عمرو المعروف بالبزار، متوفی: ۲۹۲ھ
- ★ مسند حمیدی، امام ابو بکر عبداللہ بن زبیر حمیدی، متوفی: ۲۱۹ھ
- ★ مشاہیر الصحابہ، شیخ علی بن نالیف شحود
- ★ مشاہیر علماء الامصار، علامہ محمد بن حبان دارمی، متوفی: ۳۵۴ھ
- ★ مصنف ابن ابی شیبہ، امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی: ۲۳۵ھ
- ★ مصنف عبدالرزاق، امام ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی: ۲۱۱ھ
- ★ معارف صحابہ، (مولانا) محمد عارف برکاتی رضوی
- ★ معاویہ بن ابی سفیان شیخ محمد بن صقر
- ★ معاویہ بن ابی سفیان للصلاہی، علی بن محمد محمد الصلاہی

- ★ مجتم البلدان، امام شہاب الدین ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ حموی، متوفی: ۶۲۶ھ
- ★ معرفۃ الصحابة، علامہ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصہبانی، متوفی: ۴۳۰ھ
- ★ مقالات سعیدی، علامہ غلام رسول سعیدی صاحب، متوفی: ۱۴۳۷ھ
- ★ موارد الظلمان الی زوائد ابن حبان، حافظ نور الدین علی بن ابی بکر پیشی، متوفی: ۸۰۷ھ
- ★ منتخب الافکار فی تنقیح مبانی الاخبار فی شرح معانی الآثار، علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی، متوفی: ۸۵۵ھ
- ★ نزہۃ القاری، حضرت مفتی محمد شریف الحق امجدی، متوفی: ۱۴۲۱ھ
- ★ نزہۃ المجالس، علامہ عبدالرحمن بن عبدالسلام صفوری، متوفی: ۸۹۴ھ
- ★ نعمۃ الباری، علامہ غلام رسول سعیدی صاحب، متوفی: ۱۴۳۷ھ
- ★ نہایۃ الایجاز فی سیرۃ ساکن الحجاز، شیخ رفاعۃ رافع بن بدوی، متوفی: ۱۲۹۰ھ
- ★ نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین، شیخ محمد بن عقیفی، متوفی: ۱۳۴۵ھ
- ★ وفاء الوفاء، امام علی بن عبد اللہ بن احمد سمہودی، متوفی: ۹۱۱ھ
- ★ وفيات الاعیان، امام ابو العباس شمس الدین احمد بن محمد، متوفی: ۶۸۱ھ



MA'ARIF-E-SAHABA

Vol. 1-2



اِمَامُ مُحَمَّدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُ اَبُو کَیْسٍ فَاؤُنْدِیْشَن اِنْدِیَا

- ★ امام احمد رضا ایجوکیشن فاؤنڈیشن خالص دینی ولی تنظیم ہے۔
- ★ فروغ اہل سنت کے لئے ۲۰۱۲ء میں اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔
- ★ یہ تنظیم عوام میں دینی و مذہبی بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہے۔
- ★ تنظیم علمائے اہل سنت کی تصانیف اور ان کے بیانات کی سبڈیاں تقسیم کرتی ہے۔
- ★ معاشرے کو متحرک رہانے کے لئے ہفتہ وار انہ، ماہانہ اور سالانہ جلسوں اور محفلوں کا انعقاد کرتی ہے۔
- ★ جن علاقوں میں اہل سنت کی مساجد و مکاتب نہیں ہیں وہاں انھیں قائم کر کے تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

**IMAM AHMED RAZA
EDUCATION FOUNDATION, INDIA**